ادب اردو کا ماہوار باتصویر رسالہ

العصر

مرتبہ

پیارے لال شاکر میرٹھی

جلد اول

مارچ لغایت جولائی سنہ ۱۹۱۳ء

جس مین

ساٹھ سے زائد نامور اہل قلم کے تقریباً پچاشی مضامین

پونے تین سو صفحات مین درج ہین

اور

تیس نایاب و نادر تصاویر شامل ہین

مقام اشاعت دفتر "العصر" لکھنؤ

فہرست مضامین

نثر

نظم

العصر کے قواعد

یہ باتصویر ماہوار رسالہ، جو اردو علم ادب کی ترقی کا اعلیٰ نمونہ ہی ہر ماہ کے آخر مین لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے۔ ملک کے نامور اہل قلم، مسلّم الثبوت اساتذہ، اور بہترین انشاپردازاسے وقیع، دلچسپ، اور مفید بنانے مین سرگرم ہین۔ مضامین کی نوعیت ایسی ہی جو ہر طبقہ کے لیے دلچسپ ہو۔ کوشش کیگئی ہے کہ اس کے مضامین نثر ہون خواہ نظم، تعلیم یافتہ مستورات کے لیے بھی اُسی قدر دلچسپ، مفید اور خوشگوار ثابت ہون جسقدر تعلیم یافتہ اصحاب اور بالغ نظر حضرات کے لیے۔

اسکی ضخامت ۵۶ صفحات ہوتی ہی اور صفحہ مین دو کالم ہونے کی وجہ سے اسمین معمولی تقطیع کے ایک سو صفحات سے زائد گنجائش رکھی گئی ہی۔ اس کے علاوہ ہر ماہ التزاماً ایک رنگین اور متعدد عکسی تصاویر دی جاتی ہین جنمین مشہور مصوّرونکی صنّاعی کے نمونے، مشاہیر حضرات کے فوٹو، تاریخی عمارات کے نقشے، اور دیگر دلچسپ واقعات کے مرقعے ہوتے ہین۔ بعض تصاویر کے متعلق مشہور شاعرونکی نظمین بھی حاصل کی جاتی ہین جو تصویر کی دلکشی کو دوبالا کر دیتی ہین۔ قدردانون کی ترقی کے ساتھ ساتھ اسکے حجم اور تصاویر کی تعداد مین اضافہ ہوتا رہیگا۔

تصاویر کے علاوہ اسکی لکھائی چھپائی مین بھی اعلیٰ درجے کا اہتمام کیا جاتا ہی، اور قیمتی کاغذ پر نہایت صفائی کے ساتھ تصاویر چھاپ کر اسمین اضافہ کیجاتی ہین جو اسکی مقررہ ضخامت سے علحدہ ہوتی ہین۔ بہر نوع قدردانان علم ادب کے لیے ایسا پرچہ مہیا کیا گیا ہی جو کمی قیمت کے ساتھ انگریزی میگزینون سے مشابہ ہی۔

اسکی سالانہ قیمت للعہ مع محصول ہی۔ اس قیمت مین ان خصوصیات کے ساتھ کوئی پرچہ نہین مل سکتا، بلکہ اس ارزانی کے ساتھ اسقدر تصاویر بھی کہین دستیاب نہین ہوسکتین۔ نظر برین معزز ناظرینِ رسالہ سے استدعا ہی کہ اگر یہ خدمات قابل قبول ہون تو علاوہ ذاتی قدردانی کے اسکی توسیع اشاعت مین بھی حتی الامکان امداد فرمائین۔

خریداری کے لیے پیشگی قیمت آنا ضروری ہی۔ نمونہ مفت نہین بھیجا جائے گا بلکہ ۲ر وصول ہونے یا وی پی ایبل کی اجازت آنے پر ارسال ہوگا۔ نام اور پتہ صاف اور خوشخط لکھا جائے تاکہ پرچہ پہنچنے مین دقت نہ ہو۔

اس رسالہ مین مذہبی مباحث اور موجودہ پالٹیکس پر کوئی مضمون نہ چھاپا جائیگا۔ ناتمام مضامین بھی نہین لیے جائینگے۔ جس مضمون کے ساتھ تصویر کی ضرورت ہو اُسکا مضمون نگار حضرات خود بندوبست فرمائین۔

طلبا، اور کم استطاعت صحاب کے لیے "العصر" کا ایک سستا اڈیشن بھی شائع ہوتا ہی۔ اسمین صرف ایک تصویر ہوتی ہی اور کاغذ ایوری فنش کے بجائے، دیسی استعمال کیا جاتا ہی۔ اسکی سالانہ قیمت سے مع محصول ہے۔

جملہ خط و کتابت پتہ ذیل پر ہونی چاہیئے:

پیارے لال شاکر (میرٹھی) مالک و اڈیٹر رسالہ العصر۔ لکھنؤ

العصر

العصر

زمانہ، عصر، وقت، تینون ایک ہی چیز ہین اور تینونکا اثر انسانی زندگی پر یکسان پڑتا ہی۔ یہ اثر کیا ہی؟ کیون ہی؟ اور کیونکر ہوتا ہی؟ اِن سوالات کا تفصیلی جواب خواہ کچھ ہی کیون نہو لیکن یہ امر عین الیقین کے درجے تک پہونچا ہوا ہی کہ بنی نوع انسان کی حیات و اعمال کے ساتھ اِس اثر کا ایک مستقل دائمی، اور استوار تعلق ہی حکمانے اِس مبحث پر دانشمندانہ خیالات کا اظہار فرمایا ہی اور دُنیا کے سرد و گرم چشیدہ لوگون نے تجربہ اور عمل کے بعد اِسسے اتفاق کیا ہی۔ زمانہ کی نیرنگیان مشہور اور زبان زد خاص و عام ہین۔ اسکی تلوّن مزاجیان چھپی نہین لیکن آدمی کے ساتھ من حیث المجموع اِسکے جو کچھ تعلقات ہین اس مین ہمواری اور یکسانیت کا ایک ایسا مضبوط رشتہ قائم ہی جو کبھی نہین ٹوٹتا۔

یہ ضرور ہی کہ زمانہ کے تاثرات موافق بھی ہوتے ہین اور خلاف بھی لیکن کسی نہ کسی صورت مین ہوتے ضرور ہین۔ اسکی مثال بعینہ ایسی ہی کہ شعاع آفتابی کی حرارت پودھونکے نمو اور نشو و نما کی بھی کفیل ہوتی ہی اور جب مخالف اسباب جمع ہو جاتے ہین تو یہی حرارت اُنکے لیے برق خرمن کا بھی کام کر جاتی ہی۔ دونون حالتین بلاشبہہ ایکدوسرے کی متضاد و متناقض ہین لیکن یہ کون کہہ سکتا ہی کہ اِن دونون نتیجونکا ماخذ ایک ہی شے نہین ہی۔ یہی حال زمانے کا بھی ہی۔ مثل ہی کہ "آدمی کا زمانہ یکسان نہین رہتا"۔ اِس سے بھی یہی مترشح ہوتا ہی کہ انسانی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کے ساتھ اِسکو ایک گہرا تعلق ہی جو روز ازل سے قائم ہی اور جبتک دُنیا کا عالم اسباب ہونا مسلّم ہی قائم رہیگا۔

یہان یہ سوال قدرتاً پیدا ہوتا ہی کہ اِس تعلق کو خوشگوار اور سود مند بنانیکا طریقہ کیا ہو سکتا ہی؟ یہ سوال دیکھنے مین چھوٹا اور مختصر ہی لیکن حقیقت یہ ہی کہ اِنھین دو چار لفظون مین فلسفۂ زندگی کا راز پوشیدہ ہی۔ اور اِسی لحاظ سے اسکا جواب چند حرفون مین ادا نہین ہو سکتا۔ آجتک اِس معرکۃ الآرا مسئلہ پر حکما، قدیم و جدید مین سے ہر ایک نے فرداً فرداً طبع آزمائی کی ہی اور اِس کوشش مین اگرچہ کئی ایک شاہراہ صداقت سے کسیقدر ہٹ گئے ہین لیکن مجموعی طور پر سب نے یہی خیال ظاہر کیا ہی کہ زمانہ کے ساتھ تعلقات کا عمدگی اور خوش اسلوبی سے برقرار رکھنا یہی ہی کہ "تم اُسکے نقشِ قدم پر چلو"۔

فلاطون کہتا ہی "وقت کی قدر و قیمت کرنا ہی مآل زندگی ہی"۔

ایک حکیم کا قول ہی "زمانہ اور وقت ایک ہی طاقت کا نام ہی۔ اِس طاقت کو کام مین لانا چاہتے ہو تو اِسی کے بن جاؤ"۔

ایک اور حکیم کا مقولہ ہی "تم زمانہ کے ہو جاؤ، وہ تمھارا ہو جائیگا"۔

اسی قسم کی اور مثالین معقول تعداد مین ملسکتی ہین، جن سے مترشح ہوتا ہی کہ "زمانہ شناسی" کامیابی اور کامگاری کی کلید ہی۔ اسی عقدہ کو کسی نکتہ سنج شاعر نے ذیل کے مصرعہ مین کسیقدر نزاکت اور لطافت سے قلمبند کیا ہی مصرع

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

اس مصرع پر سرسری طور سے غور کرنیسے یہ معمہ بھی خود بخود حل ہوجاتا ہی کہ زمانہ کوئی ایسی چیز نہین جو زور و زر کے اثر سے کسی کے قابو مین آسکے اور یہ بات بھی پیدا ہوتی ہی کہ زمانہ خود کسی کے ساتھ موافقت نہین کرتا بلکہ یہ کام آدمی کا ہی کہ وہ اُسکے ساتھ ساتھ رہنے مین کوشان ہو۔ بہرکیف اس مختصر بحث کا ماحصل یہی ہو سکتا ہی کہ انسان کو زمانہ شناسی کا ملکہ راسخ اپنی ذات مین پیدا کرنا چاہئیے اور یہی صفت اُسکی کوششون کے سر کامیابی کا سہرا باندھ سکتی ہی۔

پُرانی روایات کو تقویم پارینہ سمجھکر قابل توجہ نہ جانو۔ لیکن آجکل کرۂ ارض پر جو کچھ گذر رہا ہی وہ کم از کم دوربین طبائع کیلئے ضرور سبق آموز ہی ہمارا مطلب پولیٹکل حالت سے نہین، بلکہ دیکھنے کی بات یہ ہی کہ آج جو اقوام ضروریات زمانہ سے باخبر ہین اور وقت شناسی کا مادہ جنمین موجود ہی وہ سیاسی تفوق سے قطع نظر علمی، تمدنی، معاشرتی اور مادی ترقی کے لحاظ سے بھی، دوسرون کیلئے باعث رشک ہین اور جو ممالک ان صفات سے معرا ہین وہ قعر مذلت مین گرتے جاتے ہین۔ پُرانی تاریخون کی ورق گردانی کرو تو تمھین معلوم ہوگا کہ جو قومین آجتک پیدا ہوکر مٹ چکی ہین وہ اُسیوقت تک سرسبز و کامیاب رہی ہین جب تک کہ وہ زمانے کے قدم بہ قدم چلتی رہی ہین اور جونہی اُن سے یہ صفات سلب ہوگئی ہی اُنکا عروج خاک مین ملگیا ہی۔ موجودہ اقوام مین بھی جو اس وصف سے خالی ہین اور آئندہ کیلئے بھی اُنکی آنکھین اور اُنکے کان بند ہین وہ رفتہ رفتہ زوال کا شکار ہوکر اسطرح فنا ہونیوالی ہین کہ آگے اُنھین کوئی یاد بھی نہ کرے گا۔ مختصر یہ ہی کہ اس دُنیا مین بامُراد وہی ہو سکتا ہے جو "زمانہ" کی شناخت رکھتا ہو۔ یہ اُصول انفرادی اور مجموعی دونون حالتون پر یکسان صادق آتا ہی۔ جو قوم یا جو فرد قوم ترقی کرنا چاہے اُسے "زمانہ شناسی" کے مکتب مین سبق لینا چاہئیے اور وہ گُر، وہ قاعدہ، وہ قانون سیکھنا چاہئیے جنمین "انسانی زندگی" کے عقدۂ مشکل کے حل کرنے کا راز مستتر ہے۔

زندگی! عزیز زندگی!! اس نام مین کیا کچھ دلفریبی اور اس لفظ مین کیسی کچھ دلربائی پائی جاتی ہی۔ اس پنج حرفی مجموعے مین ایک خاص قسم کی مقناطیسی کشش چھپی ہوئی ہے جسکے گوناگون اثرات کا قلوب انسانی کے ساتھ ایک غیر معمولی علاقہ پایا جاتا ہے لیکن دیکھنا یہ ہی کہ اس علاقہ اور رابطہ کا اظہار جن جن طریقون سے کیا جاتا ہی وہ قابل ستائش بھی ہین یا نہین۔ جواب مین تفصیل کی ضرورت ہوگی لیکن بہ نظر اختصار صرف اسقدر سمجھ لینا چاہئیے کہ ہزارون، لاکھون، اور کرورون باشندگان عالم مین سے ایک فیصدی بمشکل ایسے عاقل اور دانشمند نکلین گے جو اس انعام خداوندی (زندگی) کے ساتھ حقیقی محبت و عزت کا سلوک کرتے ہون۔ وہ کون ہی جو اپنی زندگی کو قدر و قیمت کی نظر سے نہ دیکھتا ہو، اور اُسے عزیز نہ سمجھتا ہو لیکن جسطرح دوستون مین دشمن نکل آتے ہین بعینہ یہی حال زندگی کے چاہنے والون کا ہی۔ سب اُسکے نام پر مٹتے اور دوستی کا دم بھرتے ہین لیکن غور سے دیکھو تو شاذ ہی کوئی اُسکے حق محبت سے ادا ہوتا ہو۔ زندگی، زندگی! ہر ایک کی زبان پر ہوتا ہے لیکن یہ نہین سوچتا کہ آخر زندگی کا ماحصل کیا ہی اُسکی عظمت کا اعتراف حقیقت مین کیسے ہو سکتا ہی۔ ان باتون پر غور کرنیسے دانشمندانہ طرز زیست کی طرف رہنمائی ہوتی ہی۔ اور جو شخص اس دنیا مین حقیقی طور پر زندہ رہنا چاہتا ہی اُسے بار بار اسی مسئلہ پر ذہن دوڑانا اور بالآخر کسی صحیح اور صائب نتیجے پر پہونچنے کی سعی کرنا چاہئیے۔

وجود انسانی خلاق عالم کی خاص الخاص مصلحت شناسیون کا نتیجہ ہی - آدمی پیدا ہوتا ہی اور مرجاتا ہی - ابتک کتنے آئے اور کتنے اُٹھگئے لیکن اگر اسی آمد و رفت کا نام زندگی ہی اور یہ زندگی وہی ہی جسکا صرف نام انسانی دل و دماغ پر مافوق الفطرت اثر پیدا کردیتا ہی تو خوف ہی کہ یہ زندگی پامال ہین اور دوراندیش نظرونمین کسی واجبی عزت و احترام کا استحقاق نہ حاصل کرسکے گی بلکہ ظریفانہ اندازمین یون کہا جائیگا کہ بنی آدم نے اپنی کرتوتون سے اپنے ہیچکارہ ہونے کا ثبوت دیکر ملایک کے الزامات کو، جو ابتداے روز تخلیق عاید کیے گئے تھے، اور تقویت پہونچادی - حق یہ ہی کہ اگر اسی کو زندگی کہا جائیگا تو انسانی فضل و کمال کا دریاے ذخار ہمیشہ کیلیے خشک ہوجائیگا اور تمدن، معاشرت، فلسفہ، سائنس اور علوم و فنون کی برکتین دُنیا سے ہمیشہ کیلیے اُٹھ جائینگی -

دُنیا اور دُنیا والونکی شان نزول، اور اُنکی ضرورت تخلیق کا مسئلہ پیچیدگیون اور عقائد کی رنگارنگیون کے باعث ایک عقدہ لاینحل بن گیا ہی لیکن اس اختلافی مسئلہ کی ایک شق ایسی ہی جس پر مذہب اور فلسفہ دونون متفق ہین اور وہ یہ ہے کہ

"تم کام کے آدمی بنو"

"کام کا آدمی" دیکھنے مین تو ایسا ہی ہوتا ہی جیسے ہم تم، لیکن اُسکے خیالات مین بلندی اور جذبات مین پاکیزگی ہوتی ہی، اُسکا دماغ عجیب و غریب قوتونکا مجموعہ ہوتا ہی - آنکھ اور کان اُسکے بھی ہوتے ہین لیکن اُسکے دیکھنے اور سننے کی چیزین کچھ اور ہوتی ہین - اُنھین لوگونکو اسبات کا حق ہوتا ہی کہ وہ اپنے آپ کو "خلیفہ اللہی" کا مستحق سمجھین - لیکن اُنکے کام نام و نمود کیلیے نہین ہوتے بلکہ اُنھین صداقت اور حقیقت کی تلاش ہوتی ہی - اُنھین تمام دُنیا سے واسطہ نہین ہوتا ایک دُھن ہوتی ہی جو اُنکے دماغ کو کسی وقت فرصت سے نہین رہنے دیتی - ہان وہ زمانہ شناس ہوتے ہین - اُنکی دُھن وقت کے خلاف نہین ہوتی - بھیرویں مین پنچم کا جوڑ وہ نہین ملاتے بلکہ وہی راگ الاپتے ہین جسکا وقت ہوتا ہی - یہی وجہ ہی کہ اُنکی ایک ایک تان سننے والون کی روح تک کو متاثر کیے بغیر نہین رہتی - کاش یہ صفت عام و خاص مین پیدا ہوسکے کہ خاکدان عالم حقیقت کی روشنی سے منور اور صداقت کی مے سے مست بنجاے -

ہندوستان کو بھی ایسے ہی لوگونکی ضرورت ہی جو اپنے تن من دھن سے اُسکے نام کو اُجالین اور اپنے آپ کو محسن ملک ثابت کردکھائین - اسکے لیے ایسے آدمی درکار ہین جو زمانہ کی ضرورتونکو جانین اور وقت کے نقش قدم پر چلین - ابھی ہمارے یہان ایسے پاک نفوس ناپید ہین لیکن اُنکی ضرورت محسوس ہورہی - قومی اور ملکی ضروریات کی تکمیل مین "جرنلزم" کا بھی ایک حصہ ہوتا ہی - اسی مقصد کے پورا کرنے کیلیے اکثر اچھے اچھے پرچے اور رسالے نکل رہے ہین اور اسبات کی کوشش کیجارہی ہی کہ ملک غفلت کی نیند سے چونکے اور ہمارے یہان کارآمد عنصر کا اضافہ ہو - صنعت و حرفت، علم ادب، معاشرت، تمدن، اور اسی قسم کے کئی صیغے ہونگے جو اہل ملک کی خاص توجہ کے محتاج ہین - مبارک ہین وہ کوششین جو کسی نہ کسی پہلو سے بہتری اور فلاح کیلیے کیجارہی ہین - یہ وقت ہی کہ باہمت اور کارکن جماعتون کا ہاتھ بٹایا جاے اور اُن کے بوجھ کو تقسیم عمل کے اُصول کے مطابق فرداً فرداً بانٹ لیا جاے - اسی بلند پایہ خیال کے مرکوز خاطر ہونے کے بعد "العصر" کے اجرا کی جرأت کیگئی ہی اور خدا سے دُعا ہی کہ ہماری ناچیز کوششین مقبول ہون اور جن اغراض کو پیش نظر رکھکر العصر کی اشاعت کا انتظام کیا گیا ہی وہ باحسن الوجوہ پوری ہون -

العصر کے مقاصد کی توضیح غالباً یہان طوالت پیدا کرے گی - مختصراً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ملک کے فائدے اور بہبودی کے ہر ایک صیغے سے اسکو تعلق رہیگا - پالٹیکس اور مذہبی مباحثات البتہ اسکے

دائرۂ عمل سے خارج ہونگے۔ انکے علاوہ کسی پہلو سے بھی ہماری ناچیز کوشش کا دائرہ محدود نہوگا۔ لٹریچر کی خدمت کا خیال خصوصیت سے کیا گیا ہی اور نظر بحالات موجودہ اسکی سخت ضرورت تھی۔

پالیسی یا معیار عمل کے متعلق اسقدر سمجھ لینا چاہیئے کہ جانب دارانہ اُصول سے قطعی گریز کیا جائیگا۔ نشاۂ قدیم و جدید کی عظمت کا قایل ہونیکے باوجود کوئی سمکٹ، کوئی مضمون، کوئی خیال محض اسوجہ سے ناقابل قبول نہ سمجھا جائیگا کہ ہماری ذاتی رائے اُسکے برعکس ہی۔ مضمون نگارونکو تبادلۂ خیالات کی کامل آزادی ہوگی اور تمام معقول اور اعلیٰ مباحث کیلئے العصر کے صفحات یکسان وقف رہین گے۔ ذات پات کی تفریق، مذاہب و عقاید کا اختلاف، کوئی بات بھی اہل قلم کو العصر سے کام لینے مین مانع نہین آسکتی۔ العصر ہندو، مسلمان، مسیحی، پارسی، سب کا پرچہ ہے اور اسکی کامیابی ان سب کی متفقہ مساعی پر موقوف ہی۔

تمہیدی مضمون مین ہم بعید از خیال دعاوی کا دہرانا ناپسند کرتے ہین۔ بلاشبہہ ہمارے ارادے بلند اور مقاصد بالا ہین۔ ہماری ناچیز کوششین انھین کی تکمیل کے لیے وقف رہین گی۔ خدائے پاک سے دُعا ہی کہ وہ اِن ہیچ میرز مساعی مین برکت دے، العصر کو ارادون مین پکّا اور اغراض مین پورا کرے۔ ہمین سچّی اور حقیقی خدمت کے لیے ثابت قدم رکھے اور ملک اور قوم کو اُن سے نفع اُٹھانیکا موقع بخشے۔

العصر کا اجرا، ذاتی منافع اور تجارتی فوائد کے خیال سے نہین کیا گیا۔ بلکہ اسکا محرک وہ خیال تھا جو ہمارے دل مین زمانۂ دراز سے موجزن ہورہا تھا اور شکر ہی کہ آج وہ پورا ہو رہا ہی۔ مالی حیثیت سے العصر کچھ زیادہ خوش نصیب نہین ہی بلکہ دردِ دل سے مجبور ہوکر یہ بوجھ محض باری تعالیٰ کی عنایت و مہربانی کے بھروسے اور بہی خواہان ادب کی حوصلہ افزائیون کے سہارے پر نازک اور کمزور شانون پر اُٹھایا گیا ہے۔ اہل ملک سے ہماری التجا ہے کہ اگر اُنھین العصر کی خدمات قابل قبول نظر آئین تو اُسے امداد و عنایت اور سرپرستی سے محروم نہ رکھین۔

آخر مین ہمین بارگاہ بے نیاز مین سربسجود ہو کر پھر التجا کرنا چاہیئے کہ وہ ہمین صداقت شعاری اور راست روی کی توفیق عطا فرمائے اور جن منصوبون اور ارادون کے ساتھ العصر کی ابتدا ہوتی ہی وہ بخیر و خوبی انجام پاسکین۔

ایڈیٹر



زمانہ کا دن رات ہے یہ اشارا — کہ ہے آشتی مین مری یان گزارا

نہین پیروی جنکو میری گوارا — مجھے اُن سے کرنا پڑے گا کنارا

سدا ایک ہی رُخ نہین ناؤ چلتی

چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

حالی

دُنیا کی بربادی
کی نسبت عالمونکے خیالات

دُنیا کی تباہی کی عامیانہ افواہین

راقم مضمون پندرہ بیس سال سے دنیا کی بربادی کی بابت انواع واقسام کی افواہین سنتا چلا آتا ہے اور یہ افواہین غیر ملکی عالمونکی اختراع نہین بلکہ خالص سودیشی صنعت ہین - ان لغویات کے موجد او رمشتہر اگر ایک طرف خاص الہام غیبی کے مدعی تھے تو دوسری طرف جوتش ونجوم کے دعویدار پنڈت اور نجومی بھی تھے - بربادی کی مقررہ ومشتہرہ تاریخ کے روز جو دردناک حالت عوام اور جہلا پر طاری ہوتی تھی اُس سے کچھ وہی لوگ بخوبی آشنا ہین جو چینڈو بازونکی نہرلیات سے کماحقہ واقف اور اُن کی اصلیت کے محرم تھے - مگر جہلا ہین کہ جوتشی اور نجومی کی بات کو پتھر کی لکیر سمجھ لیتے ہین اور کسی سمجھدار کے سمجھانے بجھانے کی کوئی پروا نہین کرتے - گذشتہ دس بارہ سال کے عرصہ مین یہ افواہین بہت زور وشور سے گشت کرتی رہی ہین - یورپ کے بعض حواس باختہ عالمون نے بھی انکی تائید کرنے مین تامل نہین کیا تھا - چونکہ اہل نظر ان تازہ واقعات سے اچھی طرح واقف ہین اسلیے راقم انھین نظرانداز کرکے اس مسئلہ پر سائنسی نقطۂ نظر سے بحث کرنے کی طرف رجوع ہوتا ہے -

مضمون ہذا کے دوران مین یہ دکھانے کی کوشش کی جائیگی کہ بڑے بڑے عالمان طبیعیات جنکی عمرونکا ایک حصہ کثیر سائنسی تحقیقات کی نذر ہوچکا ہے "دُنیا کی بربادی" کی نسبت کیا کہتے ہین - یہ خیالات توجہ کے قابل ہین کیونکہ انکی بنیاد مین انکی مدتون کی غور وفکر اور سالہا سال کی تحقیق وتدقیق مخفی ہے - یہ محض چنڈوخانہ کی گپین نہین ہین بلکہ معقولات سے تعلق رکھتی ہین - محققان سائنس کے اشتیاق وتجسس سے زمین وآسمان کی شائد ہی کوئی چیز بچی ہوگی - بعض مسائل زمانہ قدیم سے ارباب تحقیق اور اہل فکر کی تحقیق وفکر کا مبحث چلے آتے ہین - ہر مہذب ملک کے عالمون نے انکی نسبت دماغ سوزی اور انھین حل کرنے کی کمال سعی کی ہے - ان معرکۃ الآرا اور کہنہ سال مسائل مین آفرینش عالم اور اسکی تباہی کا مسئلہ بھی ہے "دُنیا کس طرح معرض وجود مین آئی" اور یہ "کسطرح برباد ہوگی" جس زور شور سے اس سوال پر بحث ہوئی ہے شاید ہی اور کسی مسئلہ پر ہوئی ہو - عالمون نے کائنات کے سلسلہ اور اسکے قوانین کے مشاہدہ کی روشنی مین اسے حل کرنا چاہا ہے - جو کچھ اب ہورہا ہے اور جو کچھ ماضی مین ہوچکا ہے اسکی بنا پر اسکے آئندہ حشر کی بابت طرح طرح کے خیالات قائم کیے گئے ہین -

ماہیت مادہ کی نسبت خیالات

کئی برس ہوئے پروفیسر کلارک میکس ویل نے شہر بریڈ فرڈ (برطانیہ) مین برٹش ایسوسی ایشن کے سامنے ذرّون پر لکچر دیتے ہوے اپنا خاص نظریہ بیان کیا تھا - مگر یہ خیال مادہ کی ترکیب پر موقوف ہے یعنی کیا وہ ذرّون سے مرکب ہے؟ پُرانے زمانے کے بعض یونانی طبعی عالم مثلاً دمقراطوس اور رومی محقق طبیعیات لکرشیس وغیرہ سے پروفیسر میکس ویل کے خیالات بہت مشابہ تھے - نہ صرف یہی بلکہ کائنات کی نسبت انکے خیالات زمانۂ حال کے عالمون کے قیاسات اور مفروضات سے بہت موافقت رکھتے تھے - جو مائلٹ اور

مشابہت اِن قدیم و جدید خیالات کے درمیان پائی جاتی ہی اسپر پروفیسر ٹنڈل نے اپنے پریسیڈنشل اڈریس مین جو اُنے ۱۹۔ اگست ۱۸۷۴ء کو شہر بلفاسٹ (آئرلینڈ) مین برٹش اسیوسی ایشن کے سالانہ جلسہ مین دیا تھا خوب بحث کی ہی اور یہ خاص دلچسپی لئے ہوئے ہی۔ پُرانے زمانے کے علما کا یہ خیال تھا کہ موجودات ابتدائی اجزا سے مرکب ہین اور انکے مختلف خواص کی وجہ اختلاف ترکیب ہی نہ ابتدائی اجزا کے اختلاف سے اسے کوئی واسطہ نہین ہی جن سے وہ ترکیب پذیر ہوکر وجود مین آتی ہین۔ اور جدید خیال موجودات کی ترکیب اور ہستی کی بابت یہ ہی (اسے ذرا وضاحت سے بیان کرنا لازم ہی) کہ گیس جو گھڑی کے اندر پائی جاتی ہی کوئی مسلسل شے نہین ہی اور نہ خلا اس سے پُر ہی۔ یہ بیشمار ننھے ننھے ذرون سے مرکب ہی۔ کوئی آکسیجن کا ہی اور کوئی نائٹروجن کا ہی۔

مادہ کی صورتین اور انکے اجزاے ترکیبیہ۔ آکسیجن کے عام ذرے وزن اور بناوٹ مین ایک دوسرے کے نہایت قریب ہین۔ یہ ذرے کمرے کے اندر ساکن نہین ہین۔ بلکہ سترہ میل فی منٹ کی رفتار سے اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے ہین۔ انکے رُخ اور رفتار مین مخالف سمت کے ذرون کی گردش سے ذرا سا فرق واقع ہو جاتا ہی برعکس اسکے مائعات کے ذرے اپنی جگہ چھوڑ دیتے ہین۔ اسکا آسان تجربہ یہ ہی کہ پانی کا برتن بھر لو اور اسکے اندر ذرا سا نیلا رنگ ڈالدو پھر دیکھو کہ کتنی جلدی پانی مین نیلاہٹ نظر آنے لگتی ہی۔ مائعات کے ذرون مین پھیلنے کی خاصیت نہین ہی۔ وہ ہر وقت بدلتے اور ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہین۔ ٹھوس چیزون کے ذرون کی حالت اِس سے بالکل مختلف ہی یعنی ہر ایک ذرہ اپنی جگہ پر قائم رہتا ہی۔ گو یہ اپنی جگہ بدلنا چاہتا ہی مگر ارد گرد کے ذرے مانع ہوتے ہین۔

المختصر ترکیب مادہ کی نسبت آجکل کے علما کا یہی خیال ہی ان دونون مین جو اختلاف ہی وہ محتاج تشریح نہین ہی۔ جدید نظریہ بھی ڈانیل برنولی اور ڈالٹن کے زمانہ مین محض ایک قیاس تھا۔ مگر بعد ازان عالمون کی مسلسل کوششون اور انکے مدت کے تجربات سے اسکی تصدیق و تائید ہوگئی۔ اسوجہ سے پروفیسر کلارک میکس ویل کا یہ خیال بہت معقول نہین معلوم ہوتا کہ ذرے چونکہ ایک دوسرے کے مشابہ ہین اور شروع سے آجتک انمین کوئی تبدیلی واقع نہین ہوئی ہی اسلیئے انکا عمل ارتقا سے وجود مین آنا معلوم نہین ہوتا! اور عالم اِس نظریہ کے حامی نہین ہین۔ ذرے کی شکل و صورت کیسی ہوتی ہی اور وہ کس قسم کی تحریک قبول کرتا ہی اور ایتھر کے مقابلے مین اسکی کیا حالت ہی اور نیز یہ کہ وہ کسطرح وجود مین آیا؟ اسکی بابت عالم کچھ نہین جانتے ممکن ہی کہ زمانہ آئندہ کی تحقیق اسپر خاطر خواہ روشنی ڈالے۔

مطلب اِس بحث کا یہ ہی کہ موجودات کی موجودہ صورت آناً فاناً نہین ہوئی بلکہ اسے لاکھون برس کا عرصہ درکار ہوا تھا۔ بیشک ابتدا مین مادہ تھا، اور وہ ذرّون کی صورت مین تھا۔

زمین کی مختلف حالتین۔ قانون قدرت سے موثر ہوکر اُسنے صورت پکڑنا شروع کیا۔ اجرام فلکی اور زمین وجود مین آئی جو ابتدائی مرحلہ مین مائع تھی سخت حرارت سے اسکا مادہ کھول رہا تھا پھر بتدریج حرارت خارج ہوتی چلی گئی۔ اور آخر کار ایسی سرد ہوگئی کہ اسمین روئیدگی پیدا ہوئی اور جاندار نمودار ہوئے۔ یہ ڈیڑھ دو کروڑ سال کا واقعہ ہی۔ لارڈ کیلون وغیرہ اسی خیال کے حامی ہین۔ مگر سر چارلس لائل وغیرہ محققان ارضیات اسکے خلاف ہین۔ وہ پندرہ بیس کروڑ سال عرصہ قرار دیتے ہین۔ دن بدن زمین سرد ہوتی چلی جاتی ہی

۱؎ ملاحظہ ہو "لیکچرز اینڈ ایسیز" صفحہ ۱۳-۳۲ مطبوعہ واٹس کمپنی لندن۔

۲؎ ماخوذ از "لیکچرز اینڈ ایسیز" ڈبلیو کے۔ کلفرڈ صفحہ ۴۴-۴۸۔

جسکا بڑا ثبوت یہ ہی کہ جتنی زیادہ زمین کھودی جائے۔ درجۂ حرارت بڑھتا چلا جاتا ہی طبیعیات مین ایک مسئلہ حرارت کی رفتار کا ہی۔ یعنی اگر آہنی سلاخ کا ایک سرا آگ مین گرم کیا جائے تو باقی حصہ کس رفتار سے گرم ہوتا ہی' اور جب باہر نکالا جائے تو پھر کس رفتار سے ٹھنڈا ہوتا ہی۔ اس اُصول سے زمین کی مختلف حالتون کا اندازہ ہوسکتا ہی۔ وہ کسی زمانے مین گیس تھی' پھر مائع ہوئی' اور بعد ازان ٹھوس' اور اب ٹھنڈی ہوتی چلی جاتی ہی جب اسے اِن تین مرحلون سے گزرنا پڑا تو ہر ایک مرحلہ کے اختتام اور دوسرے کے آغاز پر ایک خاص انقلاب وقوع مین آیا۔ اور یہی حال ہر ایک جسم کا ہوتا ہی۔ اگر اسکی حالتونکا کھوج لگاتے چلے جائین تو ایک ایسا مرحلہ آجاتا ہی جب وہ ذرّون کی صورت مین پایا جاتا ہی۔ ذرے ملے اور ایک نیا جسم وجود مین آگیا۔ اور پھر کوئی ایسا زمانہ آئیگا جب کسی سانحہ سے اسکے اجزا ترکیبی منتشر ہوجائین گے' اور خلا مین دوسرے ذرّون سے اختلاط پذیر ہوکر کسی نئے وجود کے موجب ہونگے۔ زمین پر روئیدگی اور جاندار سورج کی روشنی اور حرارت کے عمل سے وجود مین آئے ہین۔

دُنیا کی بربادی کی نسبت خیالات

اور اُنکی زیست سورج ہی کی محتاج ہی اور یہ بھی معلوم ہی کہ سورج کا حجم عمل انقباض سے گھٹتا جاتا ہی۔ جو حرارت اس سے خارج ہوتی ہی وہ کسی نہ کسی طرح پوری ہوتی رہتی ہی مگر یہ عمل ہمیشہ جاری نہین رہیگا۔ جب حرارت کا منبع ختم ہوجائیگا تو آفتاب نظام شمسی کے لیے منبع حرارت نہین رہیگا۔ اگر زمین آفتاب کے گرد گھومتی رہے اور وہان سے حرارت آنا موقوف ہوجائے تو ہم اینٹھ کر مرجائین گے علاوہ ازین یہ بھی یقینی نہین ہی کہ زمین کا محور مستقل اور مستحکم ہی۔ عالمونکو یہ اندیشہ ہی کہ کوئی وقت ایسا آئیگا جب سیارونکی گردش کا حلقہ بہت تنگ ہوجائیگا اور وہ آفتاب کے اتنے قریب پہونچ جائین گے کہ اسکی کشش سے کھنچکر اسکی سطح پر جاگرین گے اور جلکر خاک سیاہ ہوجائین گے۔ عالمون کا ایک گروہ یہ کہتا ہی کہ جیسے آفتاب و ماہتاب کی کشش سے ارضی سمندرونمین مدوجزر پیدا ہوتا ہی ایسے سطح سیارونکی کشش کے اثر سے سطح آفتاب پر جوار بھاٹا آتا رہتا ہی۔ زمین کی کشش سے سطح آفتاب پر عین اُسکے بالمقابل کوئی لہر نہین اُٹھتی بلکہ وہ اسکی حرکت محوری کے سبب سے آگے کو بڑھ جاتی ہی جسکا اثر زمین کی حرکت کو تیز کرنا ہوتا ہی اور اسکا حلقۂ گردش وسیع ہوتا جاتا ہی جسکی وجہ سے کرۂ ارض سورج سے پیچھے ہٹتا چلا جاتا ہی۔ اور بالآخر اس سے بہت دور ہوجائیگا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ یا تو زمین کسی عظیم آوارہ گرد دُمدار تارے سے ٹکراکر تحس نحس ہوجائے گی اور یا حرارت شمسی سے محروم ہوکر سخت سرد ہوجائیگی اور عدم حرارت سے جاندار اینٹھ کر ہلاک ہوجائین گے۔

یقین کے ساتھ یہ کہنا دشوار ہی کہ سچ مچ کرۂ ارض کا کیا حشر ہوگا اگر یہ کشش شمسی سے متاثر ہوکر سطح آفتاب پر جاگرے تو ہم بھنکر کباب ہوجائینگے۔ اگر زمین کشش سے برگشتہ ہوکر خلا مین آوارہ گردی کرنے لگے یا آفتاب کا ذخیرۂ حرارت ختم ہوجائے تو ہم اینٹھکر رہجائینگے ایک گروہ علما کا یہ بھی مانتا ہی کہ کسی نامعلوم قوت سے خلا مین ایک ایسا سانحہ پیش آئیگا جس سے تمام اجرام فلکی ایک جگہ اکٹھا ہوکر ایک نہایت ہولناک ڈھیر لگ جائیگا۔ انکے تصادم سے حرارت پیدا ہوگی اور وہ کچھ عرصے تک رہیگی۔ بعد ازان وہ خارج ہوکر خلا مین چلی جائیگی اور وہ عظیم انبار سرد ہوجائیگا۔ اسپر روئیدگی اور جاندارونکے وجود کا کوئی امکان نہوگا لیکن آپسمین ملنے سے اتنا خوفناک زلزلہ آئیگا کہ جاندار طرفۃ العین مین عدم کا راستہ لینگے اور روئیدگی کثرت حرارت سے جل جائیگی۔

بعض فلکی عالم یہ کہتے ہین کہ کئی دُمدار تارے ایسے بڑے بڑے

ہین کہ انکی دمین کروڑون میل لمبی ہوتی ہین، اور بعض زمین سے یکایک تماشا گاہ آسمان پر نمودار ہو جاتے ہین چونکہ انکی حرکت بالکل بے قاعدہ ہوتی ہی، کرۂ ارض کو انمین سے کسی کی دم مین اُلجھکر کشان کشان عالم خلا مین پھرنے کا بہت احتمال ہی۔ یہ بھی بہت سے احتمالات مین سے ایک ہی۔ دُم دار تارونکی دُم مین اتنی قوت کہان جو زمین ایسے بھاری بھرکم جسم کو اُلجھا کر خلا کے انتہائی گوشونکی طرف لیجائین، کیونکہ عالمان فلکیات کہتے ہین کہ دُمدار تارہ کی دُم اتنی پتلی اور ہلکی ہوتی ہی کہ اسے لپیٹ کر کسی بڑے ٹرنک مین بھر سکتے ہین۔ چاہے وہ ہزارون لاکھون میل لمبی ہو۔ بعض عالمان طبیعیات کہتے ہین کہ کاربانک ایسڈ گیس زمین سے نکلکر کرۂ ہوا مین جمع ہوتی جاتی ہی اور آخر کار وہ اتنی مقدار مین جمع ہو جائیگی کہ یکایک اوپر سے گرے گی اور اہل زمین کا دم ناک مین کرکے انھین ہلاک کر دے گی۔ پروفیسر سائمن نیوکم کہتے ہین کہ آفتاب مع سیارگان دیگہ نکشتر کی طرف جا رہا ہی ممکن ہی کہ اثنائے مسافت مین کسی گمنام سیاہ ستارے سے جسکے وجود سے عالمان علم افلاک ناواقف ہون وہ ٹکر کھائے اور ایک ایسا سانحہ وقوع مین آئے جسکی نظیر تاریخ آسمان کے اوراق مین ڈھونڈنے سے نملے اور اسطرح ہماری ننھی سی دُنیا نیست و نابود ہو جائے۔

مادیین کی رائے | فرانس کے نامی فلکی عالم پروفیسر کمیل فلے مرون جنکی رائے کو مادیین کی رائے کا آئینہ سمجھنا چاہیئے کہتے ہین کہ اس سیارہ اور اسکی موجودات یعنی انسان وحیوان، چرند و پرند، سمندر، پہاڑ، دریا، براعظم وغیرہ کا کیا حشر ہوگا؟ کیا یہ دُنیا پرانی عمارت کیطرح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر برباد ہوگی۔ دُنیا فانی ہی نہ وہ ازل سے تھی اور نہ ابد تک رہیگی۔ اسکی ابتدا ہوئی ہی اسلیے اسکا خاتمہ بھی ہوگا۔ مگر کیسے ہوگا

ایک طرف پانی اور ہوا گھٹ رہے ہین۔ دوسری طرف براعظم رفتہ رفتہ فرسودہ ہو کر پانی مین ملتے جاتے ہین۔ پہاڑ بھی فرسودگی کی نذر ہو رہے ہین۔ کیا دُنیا پانی مین غرق ہو گی یا اسکی قلت سے برباد ہونیوالی ہی۔ زمین کی حرارت اور جاندارون کی زیست پانی سے قائم ہی اگر وہ معدوم ہو جائے تو روئیدگی اور جاندار نابود اور قدرت کا کل بیکار ہو جائے اگر سمندر خشکی کو نگل جائے تو بھی حیوانات اور نباتات کی نیستی امر یقینی ہی۔ مریخ کے سمندر اور دریا اور جھیلین وغیرہ خشک ہوتی جاتی ہین اور پانی دن بدن گھٹتا چلا جاتا ہی۔ وہان مطلع صاف رہتا ہی۔ بادل نمودار نہین ہوتے کرۂ ہوا رطوبت سے خالی ہی۔ کیا یہی حشر ہماری دُنیا کا ایک زمانہ مین نہین ہوگا؟

پانی ہمارے جسم مین جزو لازمی ہی جس نے تمام جسمانی عمل ہوتے رہتے ہین۔ زندگی کا دار و مدار اسی پر ہی ہستیون کے وجود کے لیئے جو حرارت درکار ہوتی ہی وہ بھی اسی سے پیدا ہوتی ہی۔ اگر پانی معدوم ہو جائے تو سمجھو کہ اسکے ساتھ زندگی کا چراغ بھی گُل ہو جائے۔ پانی کی قلت کا ہوا پر جو اثر ہوگا وہ بھی ہماری بربادی کا موجب ہوگا۔ آکسیجن اور ازوٹ کے دو سو ذرون مین ایک ذرہ بھی پانی کا نہین ہی۔ یہ ننھے شفاف ذرے کرۂ ہوا مین سورج کی کرنونکو روک کر مرکوز کر لیتے ہین۔ لیکن جب یہ پردہ اُٹھ جائیگا تو پھر کیا ہوگا؟ کرۂ ارض کا ٹمپریچر ۲۷۳ درجہ صفر سے نیچے ہوگا بلکہ وہ زمہریر بنجائیگا اور جاندار سخت سردی کے مارے اینٹھ جائینگے۔ پہاڑونکی چوٹیون سے برف لڑھک کر وادیون مین آجائیگی۔ نیویارک، لندن، پیرس، برلن، سینٹ پیٹرسبرگ، وائنا، کلکتہ، ٹوکیو وغیرہ دائمی برف کے ڈھیرون کے نیچے دبکر غائب از وجود ہو جائینگے۔ تمام جاندار اور نباتات نیست ہو جائینگی۔ حیات بخش عناصر معدوم ہوتے جاتے ہین۔ ہوا کی آکسیجن اور ازوٹ بھی ختم ہوتی جاتی ہی۔ ہر صدی کے بعد کرۂ ہوا کے اجزا مین معتد بہ تخفیف ہوتی جاتی ہی جس سے جاندارون کی زیست قائم رہتی ہی۔ دس لاکھ برس کے بعد کرۂ ارض کا ایک بڑا

حصّہ فرسودہ، بنجر اور سنسان ہوگا۔ اسکے شاندار ماضی کے کھنڈر اسکی سطح پر نظر آئینگے۔ ایف ڈبلیو ہنٹن کہتا ہو کہ زندگی کی ابتدا ہوئی تھی اسکی انتہا بھی ہوگی۔

روحانی قوت کا اثر۔ اگر کیا انسان مین ایسی قوت ہو جس سے وہ اس ہولناک سانحہ کی روک تھام کرسکتا ہو؟ اس سوال کا جواب اہل طبعیات نفی مین دیتے ہین۔ اسکی وجہ شائد یہ ہو کہ انکے دل مادیات مین اُلجھے رہتے ہین۔ وہ روحانیات کے اسرار کو سمجھنے کے بالکل نااہل ہین۔ وہ کہتے ہین کہ عقل کا عمل دماغ کے کیمیائی اثرون سے پیدا ہوتا ہو۔ اسے مظاہر قدرت سے کوئی سروکار نہین ہو۔ جرمن عالم ماڈوسلے اس خیال کا زبردست حامی ہو، اور ریکلے بھی اسی طرف مائل نظر آتا ہو مگر وہ ایک جگہ کہتا ہو "انسان کے اندر قوت (انرجی) کا ایک ایسا ذخیرہ ہو جسکا عمل عقلی ہوتا ہو، اور جو انرجی عالم کے اندر ہو اس سے وہ ایسی مشابہ ہو کہ اسکی بدولت انسان اگر چاہے تو عمل عالم کو متاثر کرسکتا ہو" انسان سوچتا ہو۔ کئی منصوبے باندھتا ہو۔ اسکے دل مین انوکھی تمنائین پیدا ہوتی ہین جنکا اسے پورا علم رہتا ہو۔ وہ فعل مختار ہو۔ ارادت اور تمنا ہمارے اندر موجود ہو جس سے کسی اہل مادہ اور اہل طبعیات کو انکار نہین ہو۔ کیا وہ ان قوتون کو اپنی زبردست روحانی قوت سے موثر نہین کرسکتا؟ عالم روحانیات اور روح کی مختلف قوتون اور اُسکے ظہورات کی نسبت تحقیقات کا سلسلہ جاری ہو۔ اسکے حامی بڑے بڑے دعوے کرتے ہین۔ اگر علمی اُصول کی کسوٹی پر کسنے سے وہ صحیح نکلے تو واقعی حیرت انگیز انقلاب واقع ہوگا اور انسان عمل عالم کو اپنی حسب منشار ترتیب دے ہدایت دے سکتا ہو۔ اہل دین مانتے ہین کہ انسان خدا کا بندہ ہو اور کئی روحانی قوتون کی بدولت خدا سے وصل کرسکتا ہو جو اسے خدا کے قریب پہونچا دیتی ہے۔ کیا انسان اس قوت کو کمال کے درجہ پر پہونچا کر عمل عالم پر اختیار نہین چلا سکتا؟ یہ قرین قیاس ہے۔ چاہے دُنیا کا کوئی حشر ہو۔ ہمین عرصہ دراز تک اس کے دیکھنے کا کوئی موقع نہین ملیگا، تا وقتیکہ کوئی خلاف توقع سانحہ پیش نہ آجائے۔ ان واقعات اور خیالات کی روشنی مین آئندہ کوئی پڑھا لکھا اور صاحب فہم نجومیون اور جوتشیون کی ہزلیات پر دھیان نہ کرے اور نہ ایسی باتین سنکر گھبرائے۔

ج۔ آر۔ رائے

آن شوخ بس کہ پایہ حسنش بلند بود 	ہر شیوہ اش بلائے دل دردمند بود
در شوق، پاس گرمی نازش بجا نماند 	باآن کہ کار باصنمے خود پسند بود
سنجیدہ ایم فتنۂ محشر بہ قامتش 	یک نیزہ قد فتنہ طرازش بلند بود
ہرگز حدیث شوق بہ پایان نیامدہ است 	یارب کدام جا سر این رشتہ بند بود
می بینم این کہ قیمت دل تا کجا کشد 	پرسد ز من کہ نرخ متاع تو چند بود
تو یک نگاہِ ناز زیان کردی ومرا 	سرمایۂ کہ بود دلِ مستمند بود
شبلی ز ہجر اوست کہ ذوقِ سخن نماند
شکر فشانیم ہمہ زان نوشخند بود

شبلی نعمانی

قوّتِ لامسہ

ایک مذہبی کتاب مین یہ قیمتی فقرہ درج ہی کہ انسان کو بہت تھوڑا لم دیا گیا ہی۔ اگر انسانی تصرّفات انسانی معلومات انسانی جذبات کا بائزہ لیا جائے تو ثابت ہوگا کہ واقعی یہ فقرہ ایک صحیح اور جامع مفہوم لھتا ہی۔

اگرچہ انسان کے جذبات اور تصرّفات و معلومات بہت ہی وسعت لھتے ہین اور اُنمین دن بدن اور بھی زیادہ وسعت پیدا ہوتی جاتی زاور اُسکے معلوماتِ جدیدہ کی طنابین روز بروز تیزی سے تنتی جا رہی ہین بلن غور سے دیکھنے پر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ باین ہمہ قدرتی مکتوبات اور اُن کے مقابلہ مین انسانی تصرفات اور انسانی جذبات کا تصاعد بت ہی کم ہی۔ اور پھر باوجود اِن تصرفات اور اِس تصاعد کے نسان کا بڑھتے بڑھتے ایسی منزلون پر پہونچ جانا کہ اُسکے آگے عقل بشری رمواوِ انسانی کا گذر ہی مشکل ہی ایک بیّن ثبوت اِس بات کا ہی انسانی جذبات اور انسانی عقل کی حد صرف حدِّ بشری تک ہی ہی اسمین انسانی فضل و تقدّم کی کوئی کسرِ شان نہین ہی۔ ہر چیز اور ہر ہستی کوئی نہ کوئی ظرف اور حد رکھتی ہی۔ اُسی حد تک اُسکی پہونچ در رسائی ہو سکتی ہی۔ اُس سے آگے گزرنے کی کوشش کرنا کشمکشِ نع سے مقابلہ کرنا ہے۔

خدا نے انسان کے حصّے مین جو کچھ اندرونی و بیرونی قوتین اور جذبات بکھے ہین، گو وہ حدِّ بشری تک ہی محدود ہین، لیکن پھر بھی اُن مین دکچھ طاقتین اور کمالات و مادہ رسائی رکھا گیا ہی، وہ اِس بات کی دلیل ہی کہ انسان بمقابلہ دوسری مخلوق کے بہت کچھ فضیلت اور کمال رکھتا ہی۔ یہ تمام قوتین، تمام طاقتین، تمام جذبات، اپنے اندرونہ مین ایسی ایسی مخفی صد اقتین رکھتے ہین کہ اُن کا ظہور رفتہ رفتہ اپنے اپنے رنگ مین ہو رہا ہی۔ جو لوگ خوبیِ قسمت سے اِن سے کام لینے کے عادی ہین اُنکی کوششون سے بازارِ عالم مین بہت کچھ ظاہر ہو رہا ہی اور اپنے اپنے وقت پر اسیطرح ہوتا رہیگا۔

بعض وقت انسان غلطی سے بعض قوتون اور بعض جذبات کی ضرورت اور افادت سے بیخبر ہوتا ہی، اور اُنکے ضائع کرنے مین دریغ نہین کرتا، اور اُنکی ضرورت اور صداقت سے کسی حد تک منکر ہوتا ہی۔ یہ ایک کفرانِ نعمت ہی۔ صحیح معنی مین جذبات شریفہ اور قواے لطیفہ سے کام لینا بھی ایک ریاضت ہی۔ اور نہ صرف اپنے لیے بلکہ ابنائے جنس کے واسطے بھی ایک صحیح اور مفید خدمت ہے۔

قواے انسانی مین قوّتِ لامسہ ادنی النظر مین، ایک کم درجہ یا کم حیثیت قوت سمجھی جاتی ہی۔ یعنی قوتِ شامہ باصرہ، سامعہ وغیرہ قوّتون کے مقابلہ مین اِس قوّت کا ذرا زمی سے ذکر کیا جاتا ہی، یہان تک کہ گویا وہ ایک کس مپرسی کی حالت مین ہی۔ اس کے استعمال مین بھی چندان دور اندیشی اور احتیاط سے کام نہین لیا جاتا۔ لوگ جسطرح بصارت، سماعت، شامہ کی قوتون کی خبر گیری مین مصروف رہتے ہین، اور اُنکی خدمات کا اعتراف کرکے اُنکی عظمت اور افادت کے مشکور رہین، اسیطرح اِس شریف قوت کی بھی

معتد بہ خدمات ہین جہان آنکھ، کان، ناک، کام نہین دیتے وہان یہ قوت کام دیتی ہی۔ جہان ناک، کان، اور آنکھ بیکار ہوجاتے ہین یا جواب دیدیتے ہین، وہان قوت لامسہ کی خدمات ایک بھاری احسان چڑہاتی ہین قوت لامسہ کیا ہی؟ جو بغیر آنکھ، کان، ناک وغیرہ کی قوتون کے محض اُس مادہ حساس کی بدولت زندگی کی خدمت گذار رہی، جو قدرت نے اُسے دے رکھا ہی؛

یہ قوت اور یہ احساس انسان کے ہر حصۂ بدن اور ہر حصۂ جسم مین قائم و ساری ہی۔ گو حکیمون اور فلاسفرون نے اِس قوت کی فضیلت اور ضرورت سے کسی وقت انکار نہین کیا، لیکن عام طور پر اس سے کسی حدتک ایک انحطاطی حالت مین کام لیا جارہا ہی۔ اگر علمی دائرہ مین لاکر اس قوت سے کام لیا جائے یا اُسکو بیکار نہ چھوڑا جائے تو یہ قوت بھی دیگر شریف اور کارآمد قوتون کیطرح بہت کچھ کام دے سکتی ہی۔ یہ امر پوشیدہ نہین کہ پہلے ہی یہ قوت خود بخود بہت کچھ کام دے رہی ہی۔ اگر ہم غور کرین تو اسکی بدولت ہم دُنیا کی اکثر صعوبتون اور مشکلات سے محفوظ رہتے ہین، اور بجائے خود یہ قوت ہماری خدمت کررہی ہی۔ ہماری زندگی کے واسطے یہ ایک ایسا بدرقہ یا سہارا ہے جو علمی رنگ مین بہت ہی کارآمد اور مفید ہی۔ آگ، گرمی، سردی، خشکی، تری وغیرہ موثرات کا احساس آنکھ اُس خوبی سے نہین کرسکتی، جس خوبی سے قوت لامسہ کرتی ہی اگر بدن یا جزو بدن گرمی، حدت، خشکی، تری سے متاثر ہو تو آنکھ، کان، ناک کو خبر بھی نہین ہوتی۔ اُسوقت یہی قوت لامسہ سب سے پہلے احساس کرکے متنبہ کرتی ہی۔ خواب کی حالت مین اگر بدن پر کوئی چیونٹی پھر جائے تو یہی قوت ہوشیاری سے محسوس کرتی ہی۔ آنکھ غنودگی مین، کان بے خبری مین، ناک لاعلمی مین ہوتی ہی اور کسی کو خبر تک نہین ہوتی، مگر قوت لامسہ بیدار رہتی اور خبرداری کے ساتھ اپنی خدمات ادا کرتی ہی۔ امراض اور عوارض مین بھی اس قوت سے ایک حدتک کام لیا جاتا ہی طبیب اور ڈاکٹر اس سے بہت کچھ کام لیتے ہین۔ وہ امراض اور وہ عوارض جو اک[...] اجلاد سے متعلق ہین، قوت لامسہ کے احساسات سے بہت کچھ ادراک مین آتے ہین اور اُن کے حق مین یہ قوت بہت کچھ مددگا[ر] ثابت ہوتی ہی۔ اُن ادراکات اور اُن دریافتون مین بھی جو کسی حدتک مشکل اور دقیق ہین یہ قوت خوبی سے کام دیتی ہی۔ یورپ مین اند[ھون] کے واسطے جو پڑہائی کا انتظام کیا جاتا ہی اُسکا اکثر حصہ قوت لامس[ہ] سے وابستہ ہی جست یا سکہ کی سلیٹ اور اُس کے پُرزے، اور اُ[ن] پرزون یا میخون سے حروف اور ہندسون کی شناخت جو اُنگلیو[ن] کی پورون سے اندھے کرتے اور عبارت بنا لیتے ہین، اور پڑہتے چلے[...] ہین، اس سب کمال کا موجب یہی قوت لامسہ ہی۔ اگر ہاتھون [...] اُنگلیون کی پورون مین ایسا احساسی مادہ اور یاور آفرینچ[...] تو اندھے ہرگز ایسا نہ کرسکین۔

جو کام اندھے اِس طریق عمل سے اِس قوت سے لیتے ہین و[ہ] آنکھون اور کانون سے نہین لے سکتے۔ قوت لامسہ دراصل ایک خا[ص] قسم کی قدرتی آنکھین رکھتی ہی۔ گو وہ اصلی آنکھون کیطرح نہین لیکن اُنکی احساسی بینائی سارے جسم مین پھیلی ہوئی ہی۔ ہر بن م[و] گویا ایک آنکھ یا چشم بصارت رکھی گئی ہی۔ جہان آنکھ، کان، اور [...] سے کام نہین لیا جاسکتا وہان یہ قوت سلامتی کے ساتھ اپنے فرائض ادا کرتی ہی اور خوش اسلوبی سے نبھاتی ہی۔

انسان کی بعض خوشیون اور احتظاظات کی بھی یہی قوت ہی۔ اور اسی پر بہت کچھ سلسلۂ نسل کی ابتدا موقوف ہی۔ اگر لام[سہ] تحریک اور احساس نہو تو بعض مسرتون، اور بعض جذبات کا وجو[د] نہو۔ اگرچہ اور قوتین موجود اور تندرست ہون مگر اسکی عدم موجو[دگی] یا تکلد ر ایک خاص نقصان رکھتی ہی۔ اگرچہ خواب اور نیند کا [...] تعلق قوت لامسہ سے نہین ہی، مگر پھر بھی اسکا بہت کچھ دار و مدار

قوت پر ہی۔ اگر لامسہ درست اور صحیح العمل ہو تو انسان خواب مین اُن موثرات سے ہرگز چوکنا نہین ہو سکتا جو بحالتِ خواب اُس پر طاری اور متاثر ہوتے ہین۔

فن مسمریزم کا اکثر حصہ اسی قوت لامسہ سے وابستہ ہی بلکہ اُسکا بہت کچھ دارومدار اسی پر ہی۔ عامل دوسرے شخص کو صرف لمس اور نظر ہی سے معمول بناتا ہی۔ اگرچہ بظاہر لمس بہت کم ہوتا ہی مگر معمول کے چہرے کے قریب ہاتھونکا لیجانا ایک قسم کا مس ہی ہی۔

قوتِ لامسہ مین مندرجہ ذیل اقسام کی طاقتین پا جاتے ہوتے ہین:-

الف۔ حاسۂ جلدیہ

ب۔ حاسۂ تحتیہ

ج۔ حاسۂ واسطیہ

جب کوئی چیز یا شے مثلاً تنکا، کنکر، روڑا، ہوا، چیونٹی وغیرہ، بدن سے مس کرتی ہی تو انسان کا سوتے جاگتے اُسکا احساس اور ادراک کرنا "حاسۂ جلدیہ" کا کام ہی کیونکہ اُسکا ادراک محض بذریعۂ جلد ہوتا ہی۔

"حاسیہ تحتیہ" وہ ہی جب بدن کے اندرونہ سے ایک قسم کا احساس اور ادراک ہو جیسے بعض دفعہ بدن مین خود بخود ایک قسم کی کھجلی وغیرہ ہونیسے انسان خبردار ہو جاتا ہی۔

اور "حاسیہ واسطیہ" وہ ہی جب آنکھ، کان، ناک وغیرہ کے ذریعہ سے احساس اور ادراک ہو۔ مثلاً آنکھ سے کوئی چیز دیکھنا اور مشاہدہ کرنا اور پھر اُسکے ذریعہ سے بدن مین ایک قسم کی تحریک احساس کا پیدا ہونا اور اُس سے انسان کا خوابی یا تاخیری رنگ مین متاثر ہونا۔

خیال اور قوتِ لامسہ | خیال اور قوتِ لامسہ مین ایک باریک لیکن کثیر الوقوع نسبت ہی۔ جب کبھی قوتِ لامسہ اپنا عمل کرتی ہی تو خیال مین بھی ایک تموج اور تجاذب ہوتا ہی۔ مثلاً جب کبھی کسی کے بدن پر چیونٹی پھرتی ہی تو قوتِ لامسہ کے ساتھ ہی خیال کا رجوع بھی اُسطرف ہوتا ہی یو دوسرے خیالات مین ایک تفرق پیدا کرتا ہی۔ ایسے حالات مین خیال عموماً قوتِ لامسہ کے تابع ہوتا ہی اور اُس کے متاثر ہونے سے خصوصیت کے ساتھ رجوع لاتا ہی۔

دماغ اور قوتِ لامسہ | دماغ اور قوتِ لامسہ مین بھی ایک قسم کی نسبت ہی یہ امر حل طلب ہی کہ ایک تاثیر اول دماغ پر ہوتی ہی کہ قوتِ لامسہ پر؟ میری رائے مین پہلے قوتِ لامسہ متاثر ہوتی ہی اور اُسکے ساتھ ہی بعد مین نہین، دماغ پر اُس کا اثر ہوتا ہی۔

دل اور قوتِ لامسہ | دماغ کے بعد دل پر اثر ہوتا ہی۔

اگر قوتِ لامسہ مکدر اور سُست ہو تو اُسکی طاقت اور احساس ایک مُردہ حالت مین ہوتا ہی اور انسان اس سے وہ کام نہین لے سکتا جو اس سے لینا چاہیئے۔ ڈاکٹرون نے اِس پر مفصل بحث کی ہی کہ قوتِ لا مین کیونکر اور کن اسباب کے ماتحت فرق آجاتا ہی۔ بہت کچھ غذائی اور بدنی اسباب ہین لیکن ان کے سوا جو خیالی اسباب ہین وہ بھی قابل غور ہین۔

خیال یا خیالات سے بھی قوتِ لامسہ پر برنگِ واسطیہ اثر پڑتا ہی۔ جب انسان کے خیالات مین تکدر اور اُلجھن ہوتی ہی تو خیالی نظام مین فرق آنے کے باعث نظام لامسہ بھی مکدر ہو جاتا ہی۔ مثلاً اگر کوئی اندھا ایک وقت خیالات مین ماؤف ہو تو اُسکی قوتِ لامسہ یا احساس قوت لامسہ بھی ماؤف ہونیکی وجہ سے کام مین ناقص ہوگا، جیسے دماغ ماؤف ہو یا دل مین کوئی گھبراہٹ ہو تو آنکھ یا آنکھ کی بصارت خوبی اور لطافت سے کام نہین کرسکے گی اور نظر عموماً تر بتر رہیگی۔

یہ ایک بڑا نازک مسئلہ ہی۔ گو بادی النظر مین اسکی تصدیق مین تامل ہو سکتا ہی لیکن حقیقت مین یہ ٹھیک اور صحیح مسئلہ ہی۔ بعض خیالی نظام کی خرابی بدن کے کل نظامات مین خلل انداز ہوتی ہی جسطرح

قوتِ لامسہ کی لطافت، وسعت، قوت قائم رکھنے کے واسطے بدن کی صفائی، صحت، خوبی قائم رکھنا ضروری ہی، اسیطرح خیالات کی صفائی بھی لازمی ہی، اور یہ ایک اخلاقی مسئلہ ہی کہ قوتِ لامسہ، دماغ، اور دلمین ایک قسم کی نسبت ہی، اور خیالات کا دماغ اور دل پر بہت کچھ احاطہ اور اثر ہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خیالات کی درستی اور صفائی دماغ، دل، اور قوتِ لامسہ کی صحت کا موجب ہی۔

چاند کے مشاہدہ سے دماغ اور دل پر جو اثر ہوتا ہی وہی اثر بدن پر بھی ہوتا ہی۔ خیال رفتہ رفتہ دل و دماغ سے ہوکر اجزائے بدنیہ تک بھی آ جاتا ہی۔ یہی صورت خیالات اور قوتِ لامسہ کی ہی۔

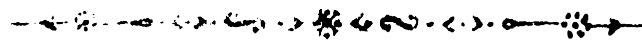
آنکھ، کان، شامہ کی غلطیان بہ نسبت قوتِ لامسہ کے اگرچہ کم نہین ہین مگر قوتِ لامسہ کی غلطیان عملی رنگ مین بہت کچھ اصلاح اور نوٹس کے قابل ہین۔

اگر ہم صحیح انداز پر کام کرین تو اس قوتِ لامسہ سے بہت کچھ کام لے سکتے ہین، اور وہ بہت کچھ مفید ثابت ہوسکتی ہی، نہ صرف اپنے مقابلہ مین بلکہ اورونکے مقابلے مین بھی۔

ہر عضو کی قوتِ لامسہ جُداگانہ ہی۔ ہاتھ کی قوتِ لامسہ کچھ اور طاقت اور کچھ اور کیفیت رکھتی ہی، اور پاؤن کی کچھ اور۔ آنکھ، کان، ناک مین بھی خاص قسم کی قوتِ لامسہ موجود ہی۔ آنکھ ایک واقعہ دیکھنے کے بعد جو بذریعۂ طاقتِ دماغی ایک نقشہ مکرر اپنے سامنے لے آتی اور اُسکا تماشا کرتی ہی، وہ بھی ایک قسم کا لمس ہی ہی۔

قوتِ شامہ کی قوتِ لمس ایک خاص قسم کی ہی۔ گو اُس کو شامہ کہا جاتا ہی مگر دراصل اُس مین بھی ایک قسم کا احساس پایا جاتا ہی۔ جانورون، پرندون، درندون، چرندون مین بھی یہ قوت ہوتی ہی۔ بلکہ بعض کے خیال کے مطابق جمادات اور نباتات مین بھی قوتِ لامسہ رکھی گئی ہی۔

سلطان احمد



مغلون کی سوشل زندگی

(ڈاکٹر ایس کے دتا بی اے ایم بی سی ایچ پی پروفیسر فارمن کرسچن کالج لاہور کے ایک لیکچر کا ترجمہ)

مغلونکی قدیم زمانہ کی تاریخ پر ایسا پردہ پڑا ہوا ہی کہ آجکل اُسکا پتہ لگانا سخت دُشوار ہی ہین یہ بھی نہ معلوم ہوسکا کہ اُنھون نے اول اول جب صفحۂ ہستی پر قدم رکھا تو کہان رہائش اور بود و باش اختیار کی[1]۔

ہمارے لیے سب سے پہلے مغلون مین صرف تین افراد موجب دلچسپی ہوے۔ یعنی چنگیز خان، تمرلنگ یا تیمور، اور بابر۔ اور یہ بھی اس وجہ سے کہ ان کا تعلق ہندوستان سے بہت گہرا رہا ہی۔ قدیم زمانہ مین جو خاصیتین مغلونمین تھین اور بعد مین بھی کم و بیش برقرار رہین وہ ذیل مین درج کیجاتی ہین:۔

[1] وسط ایشیا مین منگولیا نام ایک ملک ہی۔ اس کے ایک طرف ترکستان اور دوسری طرف چین واقع ہی۔ منگولیا کے باشندے منگل کہلاتے تھے، استداد زمانہ سے

(۱) مغل جنگجو۔ قوی ہیکل اور طاقتور تھے۔

(۲) اوّل اوّل وہ مذہب کے بہت پکّے نہ تھے بلکہ نمائش و نمود کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ بعض مورخوں کا گمان ہے کہ بعض مجتہد اور علماء دین اُنکو مسلمان کہنے سے بھی انکار کرتے تھے اور درحقیقت تعجب کی بات ہے کہ اورنگ زیب کے زمانہ حکومت تک کوئی بھی مغل شہنشاہ کٹر مسلمان نہ تھا۔ یہ واقعی امر ہے کہ خاندان مغلیہ رسم سنّت (ختنہ) کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے۔ سر طامس رو نے ۳۰۔ اکتوبر ۱۶۱۶ء کو ایک خط آرچ بشپ آف کنٹربری کے نام لکھا تھا۔ اسمین منجملہ دیگر اُمور کے یہ بھی ذکر کیا تھا کہ جہانگیر کا ختنہ نہیں ہوا تھا۔ غدر سے ذرا پہلے ۱۸۵۲ء مین بہادر شاہ بادشاہ دہلی نے اپنے چھوٹے بیٹے شہزادہ جوان بخت کو ولیعہد بنانے کی کوشش کی تھی اور وجہ یہ بیان کی تھی کہ جوان بخت کا ختنہ نہیں ہوا ہے اسلیے اسکو وارث تخت وتاج ماننا چاہیئے۔ چونکہ فخرالدین کی یہ رسم ادا کر دیگئی تھی اسلیئے اسکو اس اعزاز کے ناقابل سمجھا تھا۔ مغل بادشاہون کا اعلیٰ ترین وصف یہ تھا کہ وہ مسلمان عیسائی ہندو وغیرہ ہر مذہب اور ہر ملّت کے لوگونکو ایک آنکھ دیکھتے تھے بلکہ اُن کے ساتھ بہت ہی زیادہ رابطۂ اتحاد اور بے تکلفی پیدا کر لی تھی۔ جزیہ یک قلم موقوف کر دیا تھا، اور اگر اورنگزیب بھی اپنے آباؤ اجداد کے نقش قدم پر چلتا تو سکھون اور مرہٹون کی طاقت کو کبھی بھی عروج نصیب نہ ہوتا۔

(۳) اسجگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مغل کس حالت مین ہندوستان مین داخل ہوئے؟ انمین کون کونسی باتین جبلّی تھین اور نسلاً بعد نسل چلی آئی تھین، اور کونسی اُنھون نے یہان کے بادشاہون اور راجون کو دیکھکر اختیار کین؟ ابتدا مین وہ انگھڑ جنگجو تھے۔ مزاج مین تند خو اور بیرحم تھے۔ پرلے درجے کے شرابخوار بھی تھے۔ گو وہ بہادر تھے لیکن تعلیم وتربیت کا شوق ابتدا مین اُن کو بہت ہی کم تھا۔ اُس زمانہ کے مغلون کا ذکر امیر خسرو نے قرآن السعدین مین کیا ہے۔ اگر ہم شاعرانہ رنگ آمیزی اور مبالغہ کو چھوڑ کر دیکھین تو شاید مندرجہ ذیل اشعار سے اُسوقت کے مغلون کی عادات، جسمانی شباہت اور طریق واطوار کا صحیح اندازہ لگا سکین گے:-

کافر تاتار، برون از شمار — کردہ دگر گونہ بر اشتر سوار

اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب مغل ہندوستان مین آئے تو اُنکو اتنی تمیز بھی نہ تھی کہ اونٹ پر کیونکر سوار ہون۔

سخت سرانے بونا سخت کوش — ہر ہمہ پولاد تن و پنبہ پوش

یہ شعر اُن کے جنگجو ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ اُنکے جسم کی سختی اور گٹھیلے پن اور اُنکی پوشش اور لباس سے مطلع کرتا ہے۔

رُخ چو آتش و کلہ پشم میش — آتش سوزان شدہ با پشم خویش

یہان ہمکو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے چہرے کا رنگ سُرخ انگارے کی مانند تھا اور وہ لوگ عموماً پشم کی ٹوپیان پہنتے تھے۔ پشم خواہ بھینس کی دُم کی ہو یا بھیڑ یا بکری کی اسکے ثبوت کی چندان ضرورت نہین

سر ترا شیدہ ز بہر قلم — زان قلم انگیخت خذلان رقم

اُن کے سر منڈے ہوے تھے۔

رخنہ شدہ طشت مس از چشم تنگ — دیدہ درانداختہ در رخنہ سنگ

اس شعر سے اُنکی آنکھونکی ساخت ظاہر ہوتی ہے۔ اس سے یہ پتہ لگتا ہے کہ اُنکی آنکھین چھوٹی چھوٹی تھین۔

زشت تر از رنگ شدہ بوے شان — پست تر از پشت شدہ روے شان

یہی منگول رفتہ رفتہ مغل ہوگیا۔ کبھی کبھی انھین کو تاتاری اور ترک بھی کہتے ہین عرصہ تک یہ لوگ منگولیا مین رہے اور اسکے بعد انکی کچھ تعداد ترکستان کیطرف بڑھی۔ یہان یہ کسقدر عرصہ تک رہے یہ صحیح طور پر نہین بتایا جاسکتا۔ البتہ یہ قرین قیاس ہے کہ ان لوگون نے یہان کے قدیم باشندونکے ساتھ بیاہ شادیان کرکے تعلقات پیدا کرلیئے تھے۔ انھین کی اولاد ترک کہلائی اب اس بات کو سمجھ لینا چاہیئے کہ ہندوستان کے وہ بادشاہ جن کو ہم "مغل" کہتے ہین حقیقت مین مغل نہ تھے بلکہ ترک (یعنی ترکستان کے باشندے) تھے۔ (اڈیٹر)

اس شعر سے اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ جسمانی صفائی کی کچھ پروا نہ کرتے تھے۔ اور اسوجہ سے اُن کے جسم سے بو آیا کرتی تھی۔

چہرۂ شان دبہ، نم یافتہ ؛ جائے بجا کلک وخم یافتہ

اُن کا چہرہ لحیم شحیم ہونیکی وجہ سے ملائم تھا اور جا بجا بل پڑے ہوئے تھے۔

از رُخ تا رخ شدہ بینی پہن وز کلہ تا کلہ لبالب دہن

اس شعر سے اُنکے ناک کے چوڑا چکلہ ہونیکا پتہ لگتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اُنکا دہن بہت کشادہ تھا۔

بینیٔ پُر رخنہ چو گورے خراب یا چو تنورے کہ ز طوفان پر آب

اس شعر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُنکے ناک کے نتھنے بھی بہت کشادہ تھے۔

سوئے ز بینی شدہ بر لب فراز سبلت شان گشت بغایت دراز

مغلونکو اُس زمانے مین بالون کی کاٹ چھانٹ اور تراش خراش کی بھی کوئی فکر نہ تھی۔ اگر ناک کے بال بڑھکر ہونٹون تک آگئے ہین تو آجائین اور اگر مونچھین ناموزون طریقے سے نہایت ہی دراز ہوگئی ہین تو ہوجائین اُنکو اس قسم کے حسن وقبح سے کوئی سروکار نہ تھا۔

ریش نہ پیرا ہن چاہ زنخ سبزہ کجا بر دمد از روئے یخ

یہان معلوم ہوتا ہے کہ مغلونکی ڈاڑھی چھدری تھی۔

دو سفیدہ آمدہ ہر یک بروئے خلق زلا حول زہر چار سوے

یہ شعر بتاتا ہے کہ وہ رنگ مین سفید تھے اور نہایت قوی الجثہ تھے۔

مندرجۂ بالا اشعار سے مغلونکی جسمانی ہیئت اور طرق واطوار کا بہت کچھ پتہ چلتا ہے۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ اشعار اُس زمانہ کے مغلونکی نسبت ہین جو اول ہی اول ہندوستان مین آئے تھے۔ وہ یہان آکر تہذیب یافتہ قومون سے ملکر رفتہ رفتہ خوش پوش اور طرق واطوار مین درست ہوتے گئے۔

لڑائیونمین فتوحات حاصل کرنیکی وجہ سے یا یون کہو کہ خود جیت ہونیکی وجہ سے وہ اکثر بہت دون کی لیا کرتے تھے۔ اسمین شبہہ نہین کہ اُنکا شیخی بگھارنا ایک حد تک بالکل بجا تھا۔ اِس ضمن مین تواریخ شیر شاہی مین یہ فقرہ لکھا ہوا ہے۔ ترجمہ ذیل مین درج ہے:۔

جب شہنشاہ ہمایون لاہور پہونچا تو اُس سے چند ایسے مغل ملے جو اُن دنون اپنے ملک سے آئے تھے اور اُسوقت تک اُن کو افغانون سے جنگ کرنیکا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اُنھون نے ہمایون سے کہا "آپ ہمکو افغانون سے لڑنے کے لیے بھیجیۓ . . . . یہ افغان کون ہین۔ اور اُنکی کیا مجال ہے کہ یہ ہمسے میدان جنگ مین مقابلہ کرنیکی تاب لاسکین؟"

یہی لوگ ہندوستان کے حملہ آور تھے اور بعد مین یہی ہندوستان کے فاتح ہوئے۔ اب ہمارے سامنے غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ اُسوقت ہندوستان کی کیا حالت تھی جبکہ اول ہی اول مغلون نے اس سرزمین پر قدم رکھا تھا؟

(۱) یہان اُسوقت تک قدیمی تہذیب کا دور دورہ اور دیرینہ قسم کی تعلیم کا چرچا تھا۔ انتظامی اور سیاسی طریقے بھی پُرانے ہی برتے جاتے تھے۔ خاندان غزنوی اور خاندان غلامان اور خاندان تغلق کے بادشاہون مین اتنی سوجھ بوجھ کا مادہ کہان تھا اور آخری زمانہ مین اُنمین اتنی جسمانی شجاعت اور دلیری نہ تھی کہ وہ خود حکومت اور نظم ونسق کا کوئی نیا طریقہ ایجاد کرتے۔ اُنھون نے وہی طریقۂ حکومت برقرار رکھا جو معمولی سے معمولی آدمی کے لیے بھی کوئی خاص دلچسپی نہ رکھتا تھا بلکہ وہ اُن لوگونمین ایک طرح کا دستور چلا آیا تھا۔ یکے بعد دیگرے جو فاتح ہندوستان کا بادشاہ ہوتا گیا وہ قدیمی دستور حکومت کو قائم رکھتا البتہ فروعات مین کچھ تبدیلی کردیتا تھا۔ لیکن چوٹی کے اُصول وضوابط ویسے کے ویسے ہی رہتے تھے۔ غرض اسی سسٹم پر حکومت ہوتی رہی۔ تزک بابری کے پڑھنے سے ایک حد تک یہ نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ اُس زمانے مین بندوبست مالگذاری کا بھی ایک سلسلہ قائم تھا۔

(۲) قدیمی تہذیب کے ساتھ فارس اور عرب کی تہذیب کا بھی اعلیٰ جزو موجود
تھا جس کو اسلامی خاندانون نے پھیلایا تھا اور جس تہذیب کو مغلون
اور بھی ترقی دی تھی۔ ایک مصنف کا قول ہی کہ "فارس شاعری اور
گلاب کے پھولون کی سرزمین ہی" سولھوین صدی سے لیکر انگریزون
کی ابتداے حکومت تک ہندوستان کے اعلیٰ درجے کے لوگونمین علمی مذاق
زیادہ تر فارسی کا تھا۔ عدالت کی زبان بھی فارسی تھی۔ مغلون کے زمانۂ
حکومت مین علما، وفضلا و مورخ و مصنف زیادہ تر فارس نژاد تھے۔
شاہی حکیم اور طبیب بھی فارس سے آئے ہوئے تھے۔ شاہجہان اور
اورنگ زیب کے زمانہ مین وینس کا رہنے والا مینکسی نام ایک سیاح
ہندوستان کی سیاحت کی غرض سے یہان آیا ہوا تھا۔ وہ لکھتا ہی کہ "اسوقت
تمام پچیس کے پچیس شاہی حکیم فارس نژاد تھے" مینکسی کی بھی آؤبھگت
دربار مین اسوجہ سے ہوئی تھی کیونکہ وہ زبان فارسی خوب بول سکتا تھا۔

اوپر کے بیان سے ہم یہ نتیجے نکالتے ہین کہ (۱) مغلونکا طرز سیاست
ہندؤنکے قدیمی ضوابط حکومت پر مبنی تھا۔ (۲) مغلونکی تہذیب فارس
اور عرب کی تہذیب سے ملتی جلتی تھی۔ (۳) مغل شجاع اور بہادر تھے۔ اسوجہ
سے وہ ضعیف اسلامی حکومت پر غلبہ حاصل کرسکے۔

اب اسجگہ یہ ضروری معلوم ہوتا ہی کہ ہم جس زمانہ کا آگے ذکر
کرین گے اُس وقت کے بادشاہون کا نام اور سن جلوس و سن وفات
تحریر کرین۔ وہو ہذا:—

(۱) بابر شاہ سنہ ۱۵۲۴ع سے سنہ ۱۵۳۰ع تک تسخیر و فتح کا زمانہ۔

(۲) ہمایون سنہ ۱۵۳۰ع سے سنہ ۱۵۵۶ع تک مغلون کی بڑھتی ہوئی طاقت
مین مزاحمت۔

(۳) اکبر سنہ ۱۵۵۶ع سے سنہ ۱۶۰۵ع تک سلطنت مغلیہ کا عروج۔ استحکام
اور امن کا زمانہ۔

(۴) جہانگیر سنہ ۱۶۰۵ع سے سنہ ۱۶۲۷ع تک تعلیم و تربیت اور تہذیب و صلاح
کا زمانہ۔

(۵) شاہجہان سنہ ۱۶۲۷ع سے سنہ ۱۶۵۸ع تک تعلیم و تربیت اور تہذیب و صلاح
کا زمانہ۔

(۶) اورنگ زیب سنہ ۱۶۵۸ع سے سنہ ۱۷۰۷ع تک ہندؤنکی طاقتون
کے نشو و نما و عروج کا زمانہ۔

آگرہ، دہلی، اور لاہور کی تواریخ کا بغور مطالعہ کرنیسے مغلونکی سیاسی
اور سوشل حالت کا پتہ لگتا ہی کیونکہ یہی تین شہر مغلونکے زیر اثر زیادہ
رہے تھے۔

پردیسی کے لیئے نئے ملک مین آتے ہی سب سے پہلے اُس جگہ کا لباس
باعث دلچسپی ہوتا ہی۔ اُسکی نگاہ سب سے پہلے لوگون کے لباس پر
پڑتی ہی۔ اسلیئے ہم یہان سب سے پہلے لباس ہی کا ذکر کرتے ہین۔
اکبر کے زمانے مین کپڑا ہندوستان مین بُنا جاتا تھا اور وہی ادنیٰ اور
اعلیٰ سب لوگ استعمال مین لاتے تھے۔ لیکن ابوالفضل کا بیان ہی کہ کپڑا
فارس، یورپ، اور چین سے بھی ہندوستان مین آتا تھا۔ چنانچہ اُسنے
فرانس کی بانات کا خاص طور پر ذکر کیا ہی۔ اُن ایام مین جتنی قسم
کے کپڑے بازار مین فروخت ہوتے تھے اُنکی فہرست معہ نرخ کے آئین
اکبری مین مرقوم ہی۔ وہو ہذا:—

(۱) سُنہری زربفت اور زرکارچوبی کپڑے ۴۰ قسم کے فروخت ہوتے تھے۔
(۲) ریشمی کپڑے ۴۸ قسم کے فروخت ہوتے تھے۔
(۳) سوتی کپڑے ۳۰ قسم کے فروخت ہوتے تھے۔
(۴) اونی کپڑے ۲۶ قسم کے فروخت ہوتے تھے۔

لاہور مین مخمل اور ریشمی کپڑے بُنے جاتے تھے۔ ملتان چھینٹون
اور دریون کے لیے مشہور تھا۔ چھینٹ اور دریں ہندوستان سے
غیر ملکونمین بھی بھیجی جاتی تھی۔ ایک قسم کی مخمل چند قسم کے ریشمی
کپڑے، ململ اور بانات کی قسم کے کپڑے یورپ سے ہندوستان مین

آتے تھے۔ اُس زمانہ مین پگڑیان، "دوپٹے" اور کشمیری ٹوپیان معمولی لباس مین شامل تھین۔ امیر لوگ دوشالے اوڑھا کرتے تھے شہنشاہ اکبر کو شال دوشالون کا بہت شوق تھا۔ ابو الفضل لکھتا ہو کہ "جہان پناہ کو اونی کپڑونکا بہت شوق ہو بالخصوص شال کا" شال کشمیر مین بنائے جاتے تھے لیکن لاہور مین بھی شال بافی کے ہزار سے زیادہ کارخانے تھے۔ شال ہی پگڑیون کے طور پر سر سے باندھنے مین استعمال مین آتی تھین۔

لباس لوگ بالعموم چغے اور کمریان پہنتے تھے۔ شاہی توشے خانے مین جتنی قسم کے کپڑے تھے اُنکا ذکر "آئین اکبری" مین آیا ہو۔ بلحاظ لباس اُس زمانہ مین ہندوستان یورپ کے زیر اثر آچکا تھا۔ کیونکہ اُسوقت ایک قسم کا روئی کا کوٹ یورپ سے منگا کر یہان کے باشندے پہنا کرتے تھے۔ کہتے ہین کہ جہانگیر بادشاہ کے مزاج مین جیسوئٹ (عیسائیونکا ایک فرقہ) پادریون نے بہت دخل پا لیا تھا۔ اُسنے ایک مرتبہ یہ ارادہ کیا کہ وہ خود اور اُسکے دربار کے تمام اُمرا و رئین دولت یورپی فیشن کا لباس زیب تن کرین۔ چنانچہ کپڑے تیار کیئے گئے اور پہلے بادشاہ نے خود یورپی سُوٹ پہنا اور پہنکر وزیر اعظم سے پوچھا کہ یہ کپڑے پہنکر مین کیسا معلوم ہوتا ہون؟ ڈاکٹر برنیر رقمطراز ہو کہ اِس سوال کا جواب کچھ ایسا دلشکن تھا کہ بادشاہ نے فوراً کپڑے اُتار ڈالے اور بات مذاق مین آئی گئی ہو گئی۔

اُس زمانے کے درزیونکی اُجرت کا مقابلہ آجکل کے درزیونکی اُجرت سے کیا جاتا ہو تو یہ پتہ لگتا ہو کہ اُسوقت سلائی کی اُجرت نہایت ہی کم تھی۔ شاہی گھرانے کے کپڑونکی سلائی بھی کچھ بہت زیادہ نہ تھی۔ ۸؍ سے لیکر دو روپئے تک نفیس سے نفیس کپڑے کی سلائی لیجاتی تھی اور یہ اُجرت غیر معمولی اور حد سے زیادہ شمار کیجاتی تھی۔ مینکسی گو نیم درزی تھا لیکن محلسرا کے تقریباً تمام کپڑے وہی سیا کرتا تھا۔ اُسنے اُن کپڑون کا ذکر کیا ہو جو مالدار گھرونمین پہنے جاتے تھے اور جو خصوصاً شاہی محل کی محذرات استعمال مین لاتی تھین مینکسی لکھتا ہے کہ:۔

ہندوستان کی تمام عورتین ہاتھ پاؤن مین ایک قسم کی مٹی[1] لگاتی ہین جسکو وہ اپنی زبان مین مہندی یا حنا کہتے ہین۔ اِس سے اُن کے ہاتھ ایسے سُرخ ہو جاتے ہین گویا اُنھون نے ہاتھونمین دستانے پہنے ہین۔ وہ مہندی اسلیئے لگاتی ہین کہ اسجگہ کی گرمی کی وجہ سے وہ دستانے یا موزے استعمال مین نہین لا سکتین۔ وہ موسم گرما مین ازدیاد حدت کی وجہ سے ایسا باریک لباس پہنتی ہین کہ اُسمین سے چھن چھن کر اُنکا جسم صاف نظر آتا ہو۔ یہ لباس ململ وغیرہ باریک کپڑون کا بنایا ہوا ہوتا ہو۔ وہ عموماً دو یا تین کپڑے پہنتی ہین۔ کپڑونکا وزن ایک اونس سے زیادہ نہین ہوتا۔ اور قیمت ہر ایک کی چالیس یا پچاس روپے ہوتی ہو۔ اِس قیمت مین سُنہری لیس یا گوٹے کناری کے دام شامل نہین ہین جو وہ اکثر اپنے لباس کو خوبصورت بنانیکے لیے لگاتی ہین۔ وہی کپڑے پہنے سو جاتی ہین اور چوبیس گھنٹے کے بعد بدلتی ہین۔ ایکدفعہ پہننے کے بعد وہی کپڑا پھر وہ کبھی نہین پہنتین بلکہ اپنی خواصون لونڈی باندیونکو دے ڈالتی ہین۔ وہ اپنے بالونکو خوب اچھی طرح سنوارتی ہین پٹیان جماتی ہین اور بالونمین خوشبودار تیل لگاتی ہین۔ وہ زربفت کے دوپٹے سر پر اوڑھتی ہین جنمین مختلف قسم کے رنگ اور گُل بوٹے بنے ہوئے ہوتے ہین۔ موسم سرما مین (یعنی کسیقدر کم گرم موسم مین) بھی وہ یہی لباس زیب تن کرتی ہین۔ صرف اوپر سے نہایت ہی نفیس کشمیری اُونی قبا پہن لیتی ہین۔ وہ اِن کپڑونکے اوپر ایسا باریک شال اوڑھتی ہین کہ وہ چھوٹی اُنگلی کے چھلے مین سے آسانی سے گزر سکتا ہو۔

---

[1] مہندی یا حنا کو مٹی بتانا مینکسی کی سراسر غلطی ہو۔

امیر گھرانوں کی عورتیں زیور بافراط پہنتی تھیں۔ وہ ہاتھ کی کلائیوں مین کڑے اور پہنچے موتیوں کی پہنچیاں پہنتی تھیں۔ ایک خاص قسم کا چھلا قابل ذکر ہے۔ یہ داہنے ہاتھ کے انگوٹھے مین پہنا جاتا تھا اور اسمین ایک شیشہ جڑا ہوتا تھا جس کے گرد موتیوں کا دائرہ نہایت خوش اسلوبی سے بنایا جاتا تھا۔ اس زیور کے پہننے والی بار بار اپنا منہ شیشے (آرسی) مین دیکھا کرتی تھی۔ جواہرات سے مرصع طلائی تاگڑی بھی استعمال مین لائی جاتی تھی۔ پاؤن مین ٹخنون کے گرد موتیوں کی پازیب پہنی جاتی تھی۔ اور بعض اوقات ازار بند کے سرون مین بھی موتیوں کی پندرہ پندرہ لڑیوں کے گچھے ہوتے تھے۔

عام طور پر خوشبوئیات عطریات اور دیگر خوشبودار چیزین برتنے مین آتی تھیں۔ آنکھوں مین سُرمہ بھی لگایا جاتا تھا۔ مینکسی (جس کے بیانات محل کی مخدرات کی نسبت مستند سمجھنے چاہیئے) تحریر کرتا ہے کہ گلاب کا عطر اول ہی اول عجیب طریقے سے دریافت ہوا تھا۔ وہ اس ضمن مین ایک قصہ بیان کرتا ہے:—

ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ نورجہان اور جہانگیر کے درمیان کچھ شکر رنجی سی ہوگئی آخر جب دونون مین ملاپ ہوا تو صلح کی خوشی مین دعوت دیگئی۔ شاہی باغ کے تمام حوض عرق گلاب سے بھر دیئے گئے۔ دوسرے روز صبح اُٹھکر نورجہان نے دیکھا کہ گلاب کی سطح پر تیل کی سی جھلی ہے۔ یہ دیکھکر اسنے یہ سمجھ لیا کہ ضرور اس حوض مین کوئی نہایا ہے چنانچہ اُسکو بڑا غصہ آیا۔ اور اُسنے ایک خواص کو حکم دیا کہ انگلی سے جھلی کو چھوے پھر بیگم نے اُس خواص کی انگلی کو سونگھا۔ اس سے بیگم نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ تیل گلاب ہی مین سے نکلا ہے۔

عطر سو روپے کا ایک روپیہ بھر وزن مین آتا تھا لیکن بعد مین قیمت گھٹکر پندرہ روپے رہگئی تھی اور اسکی وجہ یہی تھی کہ ملک مین گلاب بکثرت اُگتا تھا۔

اُس زمانہ کے غربا کی حالت کا پتہ لگانا بہت مشکل ہے۔ ہیرز (جسکی شہرت اُس کے سچے عشق کی وجہ سے غیر فانی ہے) اسی حسرت مین رہی کہ اُسکو چند زیور مل جاتے اور اُسکے گنوار عشاق گاڑھے اور گزی کی چادر ہی مین خوشی کے مارے پھولے نہ سماتے تھے۔ اور موسم سرما مین کمل ہی انکے لیے نعمت غیر مترقبہ تھی۔

خوراک مغلون کے زمانہ مین اشیائے خوردنی کا نرخ بہت ارزان تھا۔ اس ضمن مین ہمنے بازاری نرخ کا اقتباس آئین اکبری سے کیا ہے جو ذیل مین مرقوم ہے:—

گندم۔ تقریباً پونے پانچ آنے یا پانچ آنے فی من۔
چاول۔ ساڑھے تین آنے۔
گھی۔ دو روپیہ دس آنے۔
سفید کھانڈ۔ تین روپے چار آنے۔
شکر۔ ایک روپیہ نو آنے۔
دال۔ پونے پانچ آنے سے سوا سات آنے۔
بھیڑ کا گوشت۔ ایک روپیہ دس آنے فی من۔ بکری کا گوشت اس سے بھی زیادہ ارزان تھا۔

چپاتی، چاول اور مختلف قسم کی کڑھی عام طور پر کھائی جاتی تھی۔ مسور کی دال اور سبزی ترکاری بھی کھانیکی اشیا مین شامل تھیں۔ آچارونکا استعمال بھی شروع ہو گیا تھا۔ اور مندرجہ ذیل اچار عوام مین مستعمل تھے۔ آم کا اچار تیل یا سرکے مین۔ لیموں کا اچار تیل کا یا سرکے کا۔ بانس کا اچار۔ ادرک کا اچار۔ شلغم اور گاجر کا اچار۔

غربا دودھ بافراط پیا کرتے تھے۔ سوجی کے لڈو مزیدار نعمت سمجھی جاتی تھی اور شاذ و نادر کھانے کو ملتے تھے۔ ایک دفعہ مشہور سفیر طامس رو اور اسکے وفادار پادری ایڈورڈ ٹیری کو نورجہان کے بھائی آصف خان نے مدعو کیا تھا۔ دعوت نہایت ہی خوبصورت اور وسیع شامیانے مین دیگئی تھی۔ زمین پر قالین رومی اور غالیچے بچھے

تھے جن پر دسترخوان اُس خاص مقام پر پھیلا ہوا تھا جہان کھانے کا سامان لاکر رکھا گیا تھا۔ دسترخوان بالکل سفید تھا۔ چاندی کی طشتریون اور رکابیون مین کھانا چُنا ہوا تھا۔ ان رکابیونکے کنارے سُنہری تھے۔

طامس رو آصف خان کی داہین جانب بیٹھا اور ٹیری صاحب آصف خان اور طامس رو کے سامنے بیٹھے۔ ان تینون کے سامنے علیحدہ علیحدہ متعدد رکابیان رکھی ہوئی تھین۔ ٹیری رقمطراز ہو کہ

"سفیر کے سامنے آصف خان کی نسبت دس رکابیان زیادہ تھین۔ اور میرے سامنے آصف خان کی نسبت دس کم تھین۔ مین نے اپنی رکابیون کا شمار کیا تو وہ تعداد مین پچاس تھین!! ہماری رکابیون اور طشتریون کے بیچ مین اتنی گنجائش تھی کہ خدام خوراک بہم پہونچانیکے لیے چل پھر سکین۔ کھانا مسلمانی طرز کا تھا۔ پلاؤ، کڑھی، متنجن، زعفرانی چاول سبز چاول، اور ارغوانی چاول، مُرتبے، کئی قسم کی کھیر، مختلف قسم کے پھلونکے مرتبے، کچے پھلون کے مرتبے، مقشر بادام کشمش وغیرہ خوردنی اشیا رکھی گئی تھین۔ ہمکو ان کھانونکے تیار کرنیکا راز معلوم نہ ہوسکا۔ مین نے اپنے سامنے چُنے ہوئے کھانے سب کھانے وہ سب کے سب نہایت لذیذ اور مزیدار تھے۔"

کھانا کھاتے ہوئے ان کے درمیان کیا گفتگو ہوئی اس کا پتہ کہین نہین چلتا۔

بازارون مین نانبائیون کی دوکانین تھین جہان سے لوگ مول لیکر روٹی کھاتے تھے ڈاکٹر برنیر نے لاہور سے کشمیر جاتے ہوئے راستے مین ایک چٹھی لکھی تھی جسمین وہ اس بات پر نہایت افسوس کرتا ہو کہ اُسکے آقا دانشمند خان کا ایک اونٹ کھو گیا تھا جس پر لوہے کی انگیٹھی لدی ہوئی تھی۔ وہ لکھتا ہو کہ "مجھے یہ اندیشہ ہو کہ مبادا اب مجھے بازاری روٹی کھانی پڑے"۔ بازار کی روٹی عموماً بہت خراب بنا کرتی تھی۔ چنانچہ اس بات کی سچائی ڈاکٹر برنیر کے ایک اور مراسلہ سے بھی ظاہر ہوتی ہو وہ تحریر کرتا ہو کہ "مجھے دہلی کے بازار کی روٹی کھانیکی چندان ضرورت نہ پڑی جو نیم پختہ اور جس مین برابر کی مٹی اور خاک بھی ملی ہوئی ہوتی ہو"۔

خوردنی اشیا کے ذیل مین ایک شئے قابل ذکر ہو وہ دہی ہو۔ اس جگہ اُس زمانے مین بھی دہی ہمیشہ بہت کھایا جاتا تھا۔ ڈاکٹر برنیر لکھتا ہو کہ اس ملک مین شربت لیمون اور دہی سے بڑھکر اور کوئی چیز مفرح نہین خیال کیجاتی۔

اشیائے نوشیدنی

پانی مین کثافت جیسی اُس زمانے مین پائی جاتی تھی ویسی ہی آجتک گاؤن اور قصبون مین موجود ہو۔ اس پر استعجاب کا کوئی مقام نہین، کیونکہ اُسوقت جس گھاٹ سے انسان پانی پینے کے لیے بھر کر گھر لاتے تھے اُسی گھاٹ پر مویشی بھی پانی پیتے تھے۔ اور اسطرح پانی بیشمار قسم کی غلاظت کا گھر بنجاتا تھا۔ پینے کا پانی صراحیون مین رکھا جاتا تھا۔ سفر کے لیئے ٹین یا کسی اور دھات کی بنی ہوئی صراحی مین پانی رکھ لیا جاتا تھا۔ گنگا جل خاص اوصاف ہونیکی وجہ سے شہنشاہ اپنے لیے منگوا کر محل مین ہر وقت موجود رکھتے تھے۔ سفر مین جاتے وقت گنگا جل کی صراحیان اونٹون پر لادی جاتی تھین پانی کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے صراحیون پر تر کپڑا لپیٹ دیا جاتا تھا اور پنکھا جھلکر یا صراحی کو ہوا مین ہلا کر پانی ٹھنڈا کیا جاتا تھا۔ شورے کے ذریعے سے بھی پانی ٹھنڈا کرتے تھے۔ یعنی پانی کی بھری ہوئی صراحی کو آب شورہ مین ڈبو دیتے تھے اسطرح فوراً پانی ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔ ابوالفضل نہایت مزے سے یہ لکھتا ہو کہ "شورہ باروت مین ملکر ایسی گرمی پیدا کرتا ہو کہ ہر چیز کو بھک سے اُڑا دیتا ہو وہی شورہ جہان پناہ پانی ٹھنڈا کرنیکے کام مین لاتے ہین۔ اور اسکو اسطرح برنا و پیر سب کی خوشی اور آسائش کا ذریعہ بنا رکھا ہو"۔ برف اُن وقتون مین لاہور مین دستیاب ہوتی تھی اور اسکا بھاؤ دو یا تین سیر فی روپیہ تھا۔

علاوہ ازین دیگر طاقتور اور مفرح نوشیدنی اشیا کے ذیل مین

گلاب اور بید مشک کا درجہ سب سے بلند تھا۔ یہ دونوں چیزیں بہت کمیاب تھیں اور انکی بڑی قدر و قیمت تھی۔ شربت لیموں بھی فرحت بخش اشیائے ذیل مین شمار ہوتا تھا۔

قہوہ بھی استعمال مین لایا جاتا تھا لیکن اسکا رواج خلائق عامہ مین نہین تھا۔ ہندوستان مین قہوہ بصرہ اور ہرمز کے بازارون سے ہندی جہازون کے ذریعہ سے آتا تھا۔ ٹیری کا بیان ہو کہ لوگ شراب کے بجائے قہوہ استعمال مین لاتے تھے۔ اور یہی شے ایسی تھی جو تمام نوشیدنی اشیائے کی قائم مقام سمجھی جاتی تھی۔ ٹیری تحریر کرتا ہو کہ

بہتیرے لوگ جو اپنے مذہب کے بڑے پکے اور کٹر ہین وہ شراب کو ہاتھ تک لگانا پاپ سمجھتے ہین لیکن وہ ایک قسم کا عرق پیتے ہین جو صحت بخش تو بہت ہوتا ہو مگر ذائقہ مین مزیدار نہین ہو۔ اِس عرق کو وہ قہوہ کہتے ہین اسکے بنانے کی ترکیب یہ ہو کہ سیاہ دانونکو لیکر پانی مین اُبال لیا جاتا ہو۔ اسطرح پانی سیاہی مائل ہوجاتا ہو لیکن پانی کا ذائقہ کسیقدر تبدیلی کے ساتھ برقرار رہتا ہو۔ قہوہ ہاضم ہو۔ دل کو طاقت بخشتا ہو اور خون کی اصلاح کرکے صاف کرتا ہو۔

شراب کیا امیر اور کیا غریب دونون ہی طبقے کے لوگ اعتدال سے زیادہ پیتے تھے۔ شراب کی عادت اسطرح مغلیہ بادشاہون کے عہد حکومت مین ترقی کرتی گئی اور جب خاندان مغلیہ کا چراغ گل ہونیکے قریب تھا اُسوقت اِس عادت ذمیمہ نے خوفناک شکل اختیار کرلی تھی۔ بابر بادشاہ حد درجہ کا شراب خوار تھا لیکن وہ طاقت مین کم نہ تھا۔ اُس نے توزک بابری مین یہ بات نہایت بے تکلفی کے ساتھ لکھی ہے بس۔۔۔

ہمنے اسجگہ بیٹھکر دن ڈھلے تک شراب پی۔ اسکے بعد ہم آگے روانہ ہوے۔ ہماری جماعت کا کوئی شخص ایسا نہ تھا جو نشہ مین چور نہ ہو۔ اور سید کریم تو نشہ کے مارے اتنا عقیل ہوگیا۔ اُسکو دو نوکرون نے گھوڑے پر سوار کیا اور پکڑ پکڑ کر بمشکل خرگاہ مین لائے۔ پھر صبح ہوتے ہی ہمنے اُسی خیمے مین شراب پینی شروع کی اور رات تک اسطرح علی التواتر میخواری جاری رہی۔ پھر صبح ہوتے ہی اور منھ اندھیرے ہی ہم نے پیالہ چڑھایا اور نشہ مین مدہوش ہوکر سوگئے۔ ظہر کی نماز کے قریب مین نے معجون کھائی۔

اکبر بادشاہ نے شراب کشید کرنے کی اجازت عیسائیون کو دیدی تھی۔ اِس سے شراب کی ناجائز تجارت اور بکری شروع ہوگئی اور رفتہ رفتہ یہانتک نوبت پہونچی کہ جب کوئی یوروپین مغل فوج سے یا محلسرا کی ملازمت سے برطرف کیا جاتا تو وہ شراب کھینچنے کا پیشہ اختیار کرلیتا تھا۔ جہانگیر کا اکثر یہ دستور تھا کہ وہ کلال خانون مین جاکر ادنیٰ سے ادنیٰ لوگونکے ساتھ بیٹھکر شراب پیا کرتا تھا۔ ایک دن وہ اسطرح ایک کلال خانہ مین جاکر شراب پینے لگا۔ جب نشہ نے رنگ جمایا تو اُسکا جھگڑا ایک جُلاہے سے ہوگیا جو بیٹھے ہوئے تھا اور جس پر نشہ کا عالم طاری ہوچکا تھا۔ جھگڑا یہ تھا کہ جُلاہا جہانگیر سے کہ رہا تھا کہ تم مجھے سکندر اعظم کہو لیکن جہانگیر کو سکندر اعظم کہنے مین عذر تھا۔ اورنگزیب کے عہد حکومت تک شرابخواری عوام مین نہایت ہی مکروہ عادت بنگئی۔ اُس نے شراب خواری کے نیست و نابود کرنے اور عوام کی عادات کی اصلاح کرنیکی اپنے امکان بھر بہت ہی کوشش کی لیکن کچھ نہ بنا۔ یورپ کی شرابین گوا سے ہوکر یوروپین کوٹھیونکی وساطت سے ہندوستان مین آتی تھین۔ حقیقت الامر یہ ہو کہ شراب کا رواج اتنا زور پکڑ گیا تھا کہ اگر کوئی شخص تحفہ کے طور پر یورپ کی شراب کی بوتلونکا ایک بکس شاہی دربار کے کسی امیر کی نذر کرتا تھا تو امیر اُسکو خوشی سے قبول کرلیتا تھا۔ اس قسم کی رشوت ستانی عام طور پر دیکھی جاتی تھی۔ اِس بدعادت کو روکنے کے لیے نہایت ہی سخت قوانین بنے ہوئے تھے۔ اور اکثر سنگین سزائین دیجاتی تھین لیکن پھر بھی میخوار ایکا

قلع وقمع نہ ہوسکا۔ جہانگیر کے وقت مین پان اور تمباکو بھی تکلفات کی فہرست مین داخل ہوگئے۔

مکانات مدت دراز تک مغلون کے طرز معاشرت سے یہ ظاہر ہوتا رہا کہ وہ ابتدا مین خانہ بدوش تھے۔ حالانکہ بڑے بڑے شہرونمین شاہی محل اور عمارتین کھڑی تھین لیکن پھر بھی اُمرا اور راراکین دولت خیمونمین رہنے سے خوش تھے۔ یا ایسے گھرونمین قیام رکھنا پسند کرتے تھے جو قول ٹیری جھونپڑیون سے بھی بدتر تھے۔ مغلونکے ہندوستان مین آنے کے بہت مدت بعد شاندار عمارتین تعمیر ہوئی تھین۔ اُس زمانہ کی یادگار اور قابل ذکر عمارت رنگ محل لاہور مین ہو جسمین آجکل مشن سکول ہو یہ عمارت شاہجہان کے وزیر اعظم نواب سعد اللہ خان نے بنوائی تھی۔

عمارات کی تعمیر مین جو مصالح کام مین آتے تھے اُنمین سے بعض یہ ہین (۱) سُرخ بھُربھُرا پتھر (۲) تین قسم کی اینٹین (۳) شیشم۔ بیر۔ شہتوت سرس دیار اور ببّانُن کی لکڑی۔ (۴) چونا (۵) لوہا مثلاً دروازونکے لیے لوہے کے کڑے اور کنڈے اور کیلین (۶) کھپریل (۷) چھت پڑ ڈالنے کے لیے بورے (۸) پلاستر (۹) شیشے کھڑکیون اور دروازون کے کواڑون کے لیے۔ غربا بانس کی جھونپڑیونمین رہتے تھے جنکی چھت چھپّر سے چھائی ہوئی ہوتی تھی چنانچہ ہیر اور رانجھے کے قصّے مین لکھا ہوا ہو کہ ہیر نے اپنے چچا کے تمام مکانون کے چھپّرونمین آگ لگادی تھی۔ اہل ثروت اپنے رہائشی مکانون کے اندر سفیدی بھی کرا لیتے تھے۔

مغل اپنی زندگی خوشی سے گزارنے کے لیے عیش باغ لگاتے تھے اِس قسم کا ایک باغ لاہور مین ہو جسکا نام شالامار باغ ہو۔ اِس شہر مین اور کئی باغ ہین جن کا مالک کوئی نہ کوئی صاحب دل ہو۔ اِن باغون کے دیکھنے سے اہل بصیرت کو یہ بات صاف عیان ہوگئی کہ مغل فاتحون کے دلمین ہمیشہ فارس کی یاد بسی رہتی تھی اور وہ پنجاب کے گرم میدانون مین بھی اِس قسم کے باغ لگا کر خطۂ فارس کی نظیر قائم کرنا چاہتے تھے چنانچہ نہر آبشار درخت، پھول، اور پھل اِس بات کی شہادت دیتے ہین۔

گھرونکا اندرونی حصہ بہت قیمتی مگر سادہ سامان سے آراستہ ہوتا تھا قالین، پلنگ، میز اور کرسی وغیرہ عام سجاوٹ کی چیزین تھین۔ قالینون اور نقش و شجر پر دون پر روپیہ پانی کیطرح بہایا جاتا تھا کھانا کھانے کے برتن بہت قیمتی ہوتے تھے خصوصاً آصف خان ایسے اُمرا کے گھرون مین تو اِس قسم کے برتنونکی کان ہوتی تھی چینی کے برتن اور اگالدان چین سے ہندوستان مین آتے تھے۔

سیر و تفریح کھیل تماشے (۱) مغلونکو شکار کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ تیراندازی کی مشق بہت کرتے تھے۔ توپ و تفنگ، بندوق۔ تمنچہ، بھی چلایا جاتے تھے۔ جہانگیر کے پاس ایک شکاری بندوق تھی جو دراصل اُسکے باپ کی تھی اور اُسکا نام "درست انداز" تھا۔ وہ اپنی توزک جہانگیری مین لکھتا ہو کہ "یہ بندوق نہایت ہی عمدہ ہو۔ میرے والد نے اِس بندوق سے ۲۰ ہزار چرند پرند کا مختلف اوقات مین شکار کیا ہو۔ مجھے بھی اِس بندوق کے چلانے مین خاصی مہارت ہو کیونکہ مین بھی ہر قسم کے شکار کا دل وجان سے شوقین ہون"۔

(۲) کبوتر بازی۔

(۳) ناچ اور نظر بندی کے کھیل۔ جہانگیر بنگالی بازیگر کے کھیلونکا حال نہایت ہی شرح و بسط کے ساتھ اِسطرح تحریر کرتا ہو کہ

بازیگرون نے ملکر ایک آدمی کے اعضا جُدا جُدا کر دیے اور اُسکا سر کاٹ ڈالا۔ اِن اعضا کو اُنھون نے زمین پر بکھیر دیا۔ جو دیر تک اِسطرح پڑے رہے پھر اُنھون ایک چادر اِن اعضا پر ڈالدی اور ایک بازیگر چادر کے نیچے گیا اور پھر چند ہی منٹ مین باہر نکل آیا۔ اُسکے بعد وہی شخص صحیح وسالم نکلا جس کے اعضا کاٹکر علیحدہ علیحدہ کر دیے گئے تھے۔ اُسکے جسم کے دیکھنے سے یہ بھی نہ ظاہر ہوتا تھا کہ اُس کے کبھی زخم یا چوٹ لگی ہو۔

(۴) ایکٹنگ یا سوانگ کرنا۔ شاہجہان کی نسبت ایک عجیب واقعہ بیان کیا جاتا ہو کہ ایک دفعہ بادشاہ کو خبر ملی کہ چند عجیب سوانگ

کرنیوالے آئے ہین اور وہ اپنا کھیل بادشاہ کو دکھانیکے خواہشمند ہین
چونکہ شاہجہان کو اس قسم کی دل لگی دل سے بھاتی تھی اسلیئے اجازت
ہوئی کہ حاضر ہون۔ ان کھیل دکھانیوالون نے ریاست گجرات کی بدانتظامی
کا کھیل دکھایا۔ وہان کے ظلمون کی نقل دیکھکر بادشاہ کو سخت حیرت ہوئی
اور اُن سے پوچھا "کیا دُنیا بھر مین کوئی ایسا ظالم ہو سکتا ہے جو اسقدر
ظلم کرے؟" تمام سوداگر جنھون نے بھیس بدلا ہوا تھا زمین خدمت
کو بوسہ دیکر بولے کہ "جہان پناہ سے یہ بات مخفی نہ رہے کہ جو کچھ ہمنے کھیل
کے طور پر حضور کی دل لگی کے لیے دکھایا ہے وہ درصل گجرات مین وقوع
مین آرہا ہے اور وہان کا حاکم ان ظلمون کا مرتکب ہے چونکہ اس سے
پہلے ہماری فریاد حضور تک نہ پہونچ سکی۔ اسلیئے ہمنے اس طریقے سے
اپنی شکایتین حضور کے گوشگذار کرنا مصلحت سمجھا۔" اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ
ظالم کو کافی و وافی سزا دیگئی۔

(۵) اکبر ایک قسم کی ہاکی کھیلتا تھا جس کو پولو نہین کہ سکتے۔ یہ کھیل
اُسکو بہت پسند تھا۔

(۶) شطرنج یا چوپڑ۔ آئین اکبری مین اس کھیل کی بساط کا نقشہ دیا ہوا ہے

(۷) تاش (گنجفہ) دو کھیل ہندوستان مین قدیم زمانہ سے رائج ہین۔

(۸) رقاصہ عورتین شہر کے بڑے بڑے وسیع چوکون مین ناچ گا کر لوگونکو
محظوظ کرتی تھین۔ ناچ ۶ بجے سے رات کے نو بجے تک مشعلونکی روشنی
مین ہوتا تھا۔ یہ عورتین گا ناچ کر روزی کماتی تھین۔

(۹) پیشہ ور عورتونکے علاوہ عوام بھی گانے کے مشتاق تھے۔ دارا لوگونکو
بہت پیارا تھا جب اورنگ زیب نے اُسکو قتل کیا تو لوگون نے ایک نوحہ
بنایا اور وہ گھر گھر گلی گلی اور کوچے کوچے گاتے پھرے جسمین مضمون
یہ باندھا تھا کہ "دولت و حشمت جاگیر اور ثروت سب ناپائیدار ہین۔
قسمت نے اورنگ زیب کو بادشاہ بنا کر تخت پر بٹھا دیا۔ شاہجہان کو
زنجیر زندان کا اسیر کیا۔ اور دارا کو سہام اجل کا نشانہ بنایا۔" جب اورنگزیب
نے یہ سنا تو اُسنے منادی کرادی کہ یہ نوحہ کوئی نہ گائے ورنہ آئندہ جو
شخص یہ نوحہ گاتا سُنا جائیگا اُسکی زبان کاٹ لیجائیگی۔ لیکن نوحہ
ایسا دردانگیز تھا کہ پھر بھی لوگ چھپ چھپا کر گاتے رہے۔

(۱۰) زراعت پیشہ لوگون کے لیے سال بھر ایک ہی طرح کی تھکا دینوالی
محنت سے ذرا سبکدوش کرنیکے لیے ہندوستانی میلے یا تیوہار ہی خوشی
کے موقع ہوتے ہین۔ آئین اکبری مین اُن تیرتھونکا ذکر ہے جہان اکثر
لوگ جایا کرتے ہین۔ خلاصہ التواریخ مین ایک میلے کا نقشہ ایسا ہو بہو
کھینچا گیا ہے کہ پڑھنے سے بڑا لطف آتا ہے۔ یہ میلا اصل واقع ضلع گورداسپور
مین ہوتا تھا۔ لیکن ایسے میلے صرف عوام کی دل لگی کا سامان مہیا
کرتے تھے۔ مغل بادشاہونکے بھی اولیاے کرام تھے مثلاً خواجہ معین الدین
حسن چشتی۔ آپ صوبہ سیستان مین پیدا ہوے اور اجمیر مین دفن ہوے۔
آپ کے مرقد منورہ پر ہزارون بنی نوع انسان کا ہجوم ہوتا تھا اور اکبر
بھی خود بنفس نفیس آپکے مزار کی زیارت کے لیے حاضر ہوا کرتا تھا۔

سواریان اور شاہراہین

تمدنی زندگی دور دراز خطون تک پھیلانے
مین سواریان اور شاہراہین ایسے ذرائع ہین جو اس باب مین مدد
معاون ہوسکتے ہین۔ لاہور کے بازار ابتدا سے ایسے ہی تنگ اور
سکڑے چلے آتے ہین جیسے کہ آجکل ہین۔ دہلی اور آگرہ کے نسبت
اسجگہ مکان بھی زیادہ اونچے تھے۔ ان وجوہ سے سواری کے لیے
پالکیان اور گھوڑے عام طور پر مروج تھے جینکسی جب کبھی اپنے مریضون
کو دیکھنے کو جاتا تھا تو گھوڑے پر سوار ہوکر جاتا تھا۔ امرا اور ذی مقدرت
لوگ ہاتھیون پر سوار ہوتے تھے۔ ہندوستان مین گھوڑے فارس، بلخ،
اور کابل سے آتے تھے۔ مال اسباب اور دیگر بوجھل اشیا اونٹ گاڑی
اور بیل گاڑی اور چھکڑون مین آتی جاتی تھین۔

سلطنت کی سڑکین بڑی بڑی شاہراہین تھین جنکا ذکر بطور خود
علیحدہ ہونا چاہیئے۔ غالباً شیر شاہ عمدہ عمدہ سڑکون کا بانی ہے۔

تواریخ شیر شاہی مین مندرجہ ذیل سطور مرقوم ہین:۔

غریب مسافرونکی آسائش کے لیے اُسنے (شیر شاہ نے) ہر سڑک پر دو دو کوس کے فاصلے پر ایک ایک سرائے بنوادی ہی۔ اور ایک سڑک رہتاس (پنجاب) سے لیکر سنارگاؤن (بنگال) تک جو سمندر کے نزدیک تھا نکالی ہی۔ ایک سڑک آگرے سے برہان پور تک جاتی ہی۔ ایک لاہور سے ملتان کو بنوائی ہی۔ اس پر بھی سرائین تھین۔ ایک سڑک آگرے سے جودھپور اور چتوڑ تک نکالی ہی۔ سڑک پر اسنے ایک ہزار سات سو (۱۷۰۰) سرائین تعمیر کرائین تھین جنمین ہندؤن اور مسلمانونکے لیے علیحدہ کمرے تھے۔ سرد اور گرم دونون قسم کے پانی کا انتظام تھا اور بچھونے اور خوراک بھی دیجاتی تھی۔ ہر سرا مین مویشیونکے آرام اور خوراک کا بھی پورا انتظام تھا۔ سرائے کے وسط مین پکی اینٹونکی بنی ہوئی ایک ایک مسجد تھی۔ مسجد مین ایک موذن اور ایک محافظ بھی ہوتا تھا۔ ہر سرائے مین ایک کنوان تھا۔ سڑک کے دونون طرف درختون کی قطار تھی۔ ڈاک کا بھی انتظام تھا اور ہر سرائے مین اس مطلب کے لیے دو گھوڑے بندھے رہتے تھے۔

جہانگیر نے سڑکونکی مرمت کرائی اور انکو خوب ترقی دی خصوصاً اس ضمن مین لاہور سے آگرہ تک جانیوالی سڑک قابل ذکر ہی۔ اُسنے شہتوت اور دیگر گھنے پتون کے درخت لگوائے۔ آٹھ آٹھ کوس کے فاصلے پر سرائین بنوائین۔ ان سراؤنمین حمام کا انتظام کیا۔ تالاب کھُدوائے اور مسافرون کے آرام کے لیے آدمی مقرر کیے۔ چھوٹے بڑے ہر دریا پر پتھر کے کٹوان پل تعمیر کیے۔ ۱۶۴۱ء مین سیاح ٹیورنیر یہ لکھتا ہی کہ لاہور سے دہلی تک کی اور دہلی سے آگرے تک کی سڑک دونون طرف کے خوبصورت درختون سے ایسی چھائی ہوئی ہی کہ وہ باغ کی روش معلوم ہوتی ہی۔ ٹیری اور برنیر نے ان سڑکون کے نقشے مین درخت خاص طور پر دکھلائے ہین اور ٹیری نے اس سڑک کا نام لمبی روش رکھا ہی۔ جب برنیر نے اس سڑک کو دیکھا تو اُسنے اسکو بہت ہی ردّی حالت مین پایا کیونکہ اُسکا بیان ہی کہ اس سڑک کو دیکھکر دل ذرا بھی مسرت و انبساط سے متاثر نہین ہوتا۔ اور وہ یہ بھی لکھتا ہی کہ

اس سڑک کے کنارے پر چند اوسط درجے کی خوبصورت کاروانسرائین ہین جو ایک دوسرے سے ایک دن کے راستے پر واقع ہین اور جہانگیر کے حکم سے درختون کی دوہری قطار ڈیڑھ سو فرسنگ تک لگائی گئی ہی۔ اس طریقے سے یہ سڑک اور دوسرے راستے آسانی سے پہچانے جاسکتے ہین۔ سڑک پر تھوڑی تھوڑی دور کے فاصلے پر کنوئین کھُدے ہوئے ہین جنکا پانی مسافرونکی پیاس بجھاتا ہی اور چھوٹے چھوٹے درختون اور پودون کے سینچنے کا کام دیتا ہی۔

مینکسی اور بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہی۔ وہ لکھتا ہی کہ

ملتان سے الہ آباد تک پانسو تیرہ (۵۱۳) فرسنگ کا فاصلہ ہی۔ اس فاصلے کو طے کرنے کے لیے ایک سڑک جاتی ہی جس پر ایک ایک فرسنگ کے فاصلے پر چوپہل مینار بنے ہوئے ہین جن سے معلوم ہوتا ہی کہ مسافر نے کتنی مسافت طے کی ہی۔ راہگیرون کی آسائش کے لیے ہر مینار کے قریب ایک گاؤن بھی آباد ہی۔ ان سڑکون کے کنارے پر عمدہ عمدہ سرائین اور باغات اور گاؤن ہین۔

اسجگہ یہ ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ پنجاب مین آثار قدیمہ کی چیزونکے ذیل مین کوس مینار بھی ہین۔ مندرجہ ذیل مینار ابتک موجود ہین:۔

پھلور اور نکودر مین ۷ مینار۔
لدھیانہ مین ۲ مینار۔
سانہوال ضلع لدھیانہ مین ۱ مینار۔
سرائے لشکری خان (واقع لدھیانہ) مین ۱ مینار۔
راجپوتان مین ۱ مینار۔

میزان = ۱۲۔

انکی تعداد اس سے بھی زیادہ ہی۔ ایک مینار لاہور سے تھوڑے فاصلے پر واقع ہی۔ اور اسی قسم کے دیگر مینارونکا ذکر ضلع انبالہ کے گزیٹیر مین مرقوم ہی

یہ یقینی طور پر کہا جاسکتا ہی کہ اِن مین سے بہت سے مینار شاہنشاہ جہانگیر نے تعمیر کرائے تھے۔

سرائیو نمین اینٹ اور پتھر کی چنائی ہوئی تھی اور اُنمین سے بہتیری ابتک موجود ہین۔ مثلاً سرائے امانت خان مغل سرائے وغیرہ وغیرہ۔ غالبًا ایک پڑاو یا منزل بارہ میل کا ہوتا تھا۔ یہ امر مسلمہ ہی کہ آٹھ آٹھ کوس کے فاصلے پر ایک ایک سرائے بنائی گئی تھی۔ برنیر کو لاہور سے وزیرآباد جانے مین چھ روز لگے تھے۔ وزیرآباد کا فاصلہ لاہور سے ۶۲ میل ہی۔ سڑک کے کنارے اِن سراؤن کا نظارہ بڑا دلچسپ اور دلخوش کن ہوگا۔ اِن سراؤن مین رہائش اور طرز زندگی کا نقشہ ہو بہو ذیل کی سطور مین کھینچا گیا ہی۔

"وہ (یعنی سرائین) بڑی مستحکم اور محفوظ جگہ ہین۔ اُنمین سے بعض پتھر یا پکی اینٹ کی بنی ہوئی ہین۔ ہر سرائے مین ایک سرکاری گماشتہ ہی جسکا یہ فرض ہی کہ آفتاب غروب ہونے پر سرائے کا دروازہ بند کر دے۔ پھاٹک بند کرنیکے بعد وہ آواز بلند ہر شخص کو آگاہ کرتا ہی کہ "بھئی!! اپنی اپنی چیزین دیکھ لو کہ سب موجود ہین!! اپنے اپنے گھوڑے باندھ دو" جب صبح کے چھ بجتے ہین تو چوکیدار پھاٹک کھولنے سے پہلے مسافرونکو پھر تاکید کرتا ہی اور خوب چلّا کر کہتا ہی کہ بھئی! اپنی اپنی چیزین دیکھ لو! اگر کسی کو یہ شبہہ ہوتا ہی کہ اُسکی کوئی چیز جاتی رہی ہی تو جب تک گم شدہ چیز نہین ملجاتی سرائے کا پھاٹک نہین کھولا جاتا۔ یہ سرائین مسافرون کے لیے مخصوص ہین۔ سپاہیون کو اِنمین جگہ نہین دیجاتی۔ ہر سرائے مین اتنی گنجائش ہی کہ آٹھ سو سے لیکر ایک ہزار مسافر تک معہ اپنے گھوڑون، اونٹون اور بگھیون کے سما سکین اور بعض سرائین تو اس سے بھی زیادہ فراخ ہین۔ سراؤن مین کمرے اور دالان اور برآمدے بنے ہوئے ہین اور صحن مین سایہ دار درخت کھڑے ہین۔ پرچونٹی کی بھی کئی دکانین ہین۔ زنانہ کمرے علیحدہ بنے ہوئے ہین اور جو ملازمین مسافرون کے لیے کمرے سجاتے ہین اور بچھونے وغیرہ بچھاتے ہین اُن کے رہائشی مکانات بھی بالکل جدا ہین۔"

کشتیون کے کرایہ کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہی۔ آئین اکبری مین کرایہ[۱] بھاڑے کی ایک فہرست ہی کسی شخص کو اُسوقت یا اجازت نہ تھی کہ وہ دریا مین پایاب پار اُتر سکے۔ کرایہ حسب ذیل لیا جاتا تھا۔

ہاتھی۔	۴ر
لدا ہوا چھکڑا۔	۲ر
خالی چھکڑا۔	۱ر
لدا ہوا اونٹ۔	.ر
خالی اونٹ۔	-ر
لدا ہوا گھوڑا یا بیل	-ر
خالی بیل۔	ایک دھیلا۔
لدا ہوا گدھا۔	ایک دمڑی۔
بیس آدمی۔	ڈیڑھ پیسہ۔

بہتیری کشتیان ایسی بھی تھین جو مسافرونکو مفت دریا کے پار اُتارتی تھین کشتی کے ذریعے سے ایک ہزار من بوجھ ایک کوس تک ایک دیے مین لیجایا جاتا تھا اورنگزیب کے زمانے مین مندرجۂ ذیل سڑکین شاہی سڑکین کہلاتی تھین۔

(۱) آگرہ سے دہلی تک۔
(۲) دہلی سے لاہور تک۔
(۳) لاہور سے گجرات اور اٹک تک۔
(۴) اٹک سے کابل تک۔
(۵) کابل سے غزنی اور قندھار تک۔
(۶) گجرات سے سری نگر تک۔
(۷) لاہور سے ملتان تک۔

مندرجہ بالا سڑکون پر یکسان فاصلے پر چوکیان اور سرائین بنی ہوئی تھین

تعلیم اور درسگاہین | ابوالفضل لکھتا ہی کہ تمام متمدن قومین بچون اور ر

[۱] ایک درم ایک روپیہ کا چالیسوان حصہ ہوتا ہی اسی پر کرایہ پھیلایا گیا ہی

نوجوانونکے لیے درسگاہین موجود ہین اور ہندوستان خصوصیت کے ساتھ مکتبون کے لیے مشہور رہا۔ اکبر کے زمانے کے ایک مکتب کی نسبت یہ مذکور ہی کہ اِس مکتب کے طلبا، عام طلبا، کی نسبت ہوشیار اور ذی لیاقت تھے۔ پہلے دو دن حروف تہجی کے پڑھانے مین صرف کیے جاتے تھے۔ اور پہلے ہی ہفتہ مین حروف کی بندشین اور الفاظ کی ترکیب بتا دیجاتی تھی۔ اسکے بعد نظم یا نثر کے ایسے فقرے پڑھاے جاتے تھے جنکے مطالب سے اخلاقی یا مذہبی نصیحت نکلتی تھی، اور جنمین وہ الفاظ شریک تھے جو وہ پہلے پڑھ چکے تھے معلّم شاگردون کو موقع بموقع کچھ بتا تا جاتا تھا۔ ہر روز کتاب کی نئی سطر پڑھائی جاتی تھی۔ اِس نئے طریقۂ تعلیم سے متعلم بہت ہی تھوڑے عرصہ مین اس قابل بنجاتا تھا کہ روان نہایت صفائی سے ساتھ پڑھ سکے۔ حالانکہ پُرانے طریقے پڑھنے والونکو ایسی استعداد حاصل کرنے تک سالہا سال گزرجاتے تھے۔ اعلیٰ جماعتون مین مندرجہ ذیل علوم پڑھائے جاتے تھے۔ علم الاخلاق، علم ریاضی، علم حساب، علم زراعت، اقلیدس پیمائش، علم ہیئت، علم رمل، علم خانہ داری، فن سیاسی، علم طبعیات، علم منطق طبعی، علم الٰہیات، علم تصوف، علم تواریخ۔

سیالکوٹ تعلیم کیلئے بہت مشہور تھا۔ سنہ ۱۰۶۴ھ مین مولوی کمال کشمیر سے سیالکوٹ آکر شاگرد پیشہ لوگونکو پڑھانے لگا۔ شاہجہان کے عہد حکومت مین ایک ور مدرسہ سیالکوٹ مین قائم ہوا تھا جسمین صرف دینیات کی تعلیم دیجاتی تھی۔ یہان یہ ذکر نا بیموقع نہ ہوگا کہ سیالکوٹ لکھائی کے کاغذ کے کام مین مشہور چلا آتا ہی۔ اُن دقتون مین علم یا علم ادب کا کتنا زور تھا۔ اِس بات کا اندازہ آج ہم نہین لگا سکتے۔ لیکن البتہ ابو الفضل جیسے علما کا نام نامی ہر زمانہ کے لیے موجب عزت و فخر ہوگا، اور مکتوبات اورنگ زیب مغلون کی تواریخ مین لازوال درجہ حاصل کر چکے ہین۔ ڈاکٹر برنیر کا آقا دانشمند خان نہایت ہی فاضل اور قابل شخص تھا۔ برنیر لکھتا ہی کہ دانشمند خان سہ پہر کو علم فلسفہ کا مطالعہ کیا کرتا تھا اور صبح وزیر دولت خارجیہ اور رداروغۂ اصطبل کی حیثیت سے نہایت ہی ضروری فرائض ادا کرتا تھا۔ علم ہیئت، جغرافیہ اور علم تشریح کا اسکو کمال شوق تھا۔ اور وہ گیسنڈی اور ڈکارٹ کی تصنیف کردہ کتابین بڑے ذوق وشوق سے پڑھا کرتا تھا۔ مطالعہ کی وجہ سے دربار کی دوسری حاضری اسکو معاف تھی۔

مورخ تعداد مین بیشمار تھے اُنکی کتابین اُنکی عام لیاقت تربیت اور واقفیت کا ثبوت دیتی ہین۔ عام طور پر ہر عالم شخص کے پاس ایک بیاض ہوتی تھی جسمین وہ نادر خیالات اور عمدہ نظم نوٹ کرلیتا تھا۔ اورنگزیب کی بیٹی زیب النسا کی شاعری اور فضیلت کے چرچے بھی امتداد زمانہ کے ساتھ دائم رہینگے۔

مرد و زن | پردے کے رواج کیوجہ سے مغلونکی اندرونی اور خانگی زندگی کی نسبت رائے زنی کرنا بہت مشکل ہی۔ اِس ضمن مین مورخ بالکل خاموش ہین اور سلاطین کی تواریخ کے مطالعہ سے ہمکو صرف اتنا پتہ لگ سکا ہی کہ آصف خان اپنے احباب کی دعوت و تواضع مین بڑی فراخ دلی سے کام لیتا تھا، اور دانشمند خان بڑا عالم و فاضل تھا۔ اُمرا کے گھرونکی نسبت یہ بھی معلوم ہوا ہی کہ بالعموم اِس طبقہ کے لوگونکے مکانات اور محل بہت آراستہ و پیراستہ ہوتے تھے۔

اگر محلسرا کا پردہ اُٹھا کر دیکھا جائے تو ایک جگہ جہانگیر اپنے باپ اکبر کے بستر مرگ پر بیٹھا ہوا نظر آتا ہی اور دوسری جگہ وہ ایک حرم موسومہ انارکلی کے عشق مین والا و شیدا نظر آتا ہی۔ اسکے علاوہ کہین کہین مغل مخدرات اور بیگمات کا قافلہ کسی پیر فقیر کی زیارت کے لیے جاتا ہوا سڑک پر دکھائی دیجاتا ہی۔ لیکن اِس سے زیادہ ہمکو بیگمات کی خوشی و غم میلان طبع اور آزردگی، مناسبت اور منافرت کے حالات کی کچھ خبر نہین۔ ہمکو مغل بچونکے نغمے اور نعرہائے خوشی نہین سنائی دیتے حرم سرا کی لونڈی باندیون کے قہقہے اور چہچہے ہمارے مشتاق کانون کی شنوائی سے پرے ہین۔

ڈپٹی لال نگم

بہادر شاہ ظفر

بعض آدمیون کی سرگذشت کچھ اس قبیل کی ہوتی ہے کہ جب اُنکا نام آتا ہے تو ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے بہادر شاہ ظفر کی زندگی سے بھی واقعات کی بوقلمونی اور واردات کی گوناگونی اس درجہ وابستہ ہے کہ ان کا نام لیا جاتا ہے تو آنکھون کے سامنے انقلاب عالم کی ایک عبرت انگیز تصویر پھر جاتی ہے۔ اسمین شک نہین کہ یہ سب تقدیری امور ہوتے ہین اور انسانی حیطۂ اقتدار سے قطعی خارج، اور یہ بھی سچ ہے کہ ہر متنفس کو اپنے سفر حیات مین عروج و زوال کی گھاٹیان طے کرنا پڑتی ہین لیکن بدنصیب ظفر کی داستان حسرت و درد کا کچھ اور ہی عالم رکھتی ہے اور ممکن نہین کہ کوئی اہل دل اس سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکے۔

یہ ضرور ہے کہ بہادر شاہ کے وقت مین سلطنت نام کی سلطنت رہگئی تھی اور حکمران وقت کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی تاہم حقوق مین فرق آگیا تھا اور حکومت کا رقبہ جو کبھی کابل و قندھار سے لیکر جنوبی ہند کی وسط تک پھیلا ہوا تھا اطراف دہلی تک محدود تھا تاہم وہ تخت دہلی کا مالک، خاندان تیموریہ کی عظمت و جلال کا علمبردار اور اپنے اسلاف کی ایک مٹی ہوئی یادگار تھا اور اس گئی گذری حالت مین بھی باشندگان ہند اُسکا نام ادب سے لینا ضروری سمجھتے تھے۔

سلاطین مغلیہ کے وقت مین ہندوستان کو جو علمی، اخلاقی، تمدنی، اور اقتصادی فوائد حاصل ہوئے ہین اُن کے تذکرے سے فارسی و انگریزی کی تاریخین لبریز ہین اور آج بھی اُنسے انکار کرنے کی کوئی جسارت نہین کر سکتا۔ انھین کارنامون کی بدولت بابر و اکبر و شاہجہان کے نام اس ملک مین اب بھی اُسی طرح عزیز ہین جیسے اُن کی زندگی مین تھے! اور چونکہ بہادر شاہ اُنھین نیک دل فرمان رواؤن کا جانشین تھا اس لیے باوجود بعض ذاتی کمزوریون کے اُسکے افسوسناک انجام پر تاسف کرنا ایک قدرتی بات ہے۔

سیاسی نقطۂ خیال سے ایک ایسے اسلامی خاندان کا خاتمہ یون تو کچھ کم المناک نہ تھا لیکن اس صدمہ کی تلافی اس صورت مین باحسن الوجوہ ہوگئی کہ قدرت نے ہماری قسمت کی باگ برطانیہ کے روشن ضمیر اور آزاد خیال افراد کے ہاتھ مین دیدی ہے جنکی بالغ نظری اور منصف مزاجی نے اورتو اور خود مسلمانون کو بھی قومی حکومت کا نقصان محسوس نہین ہونے دیا بلکہ وہ تو عنان سلطنت کا انگریزون کے تفویض ہونے کو قدرت کا ایک "عاقلانہ منشاء" سمجھتے ہین اور گورنمنٹ برطانیہ کو خدا کی رحمت خیال کرتے ہین اسی طرح اور اقوام ہند بھی اُن کی ہم نوا ہین۔ البتہ جو علمی دلچسپیان کسی زمانہ مین دہلی کو قرطبہ و نیشاپور بنائے ہوئی تھین اُن کا تذکرہ آتے ہی بابر و ہمایون کے نیک نیت اور سپوت اخلاف کی یاد دل مین پیدا ہو جاتی ہے انھین علمی روایات کو انھین اب دہلی کے کھنڈرون مین تلاش کرتی ہین اور نہین پاتین اور انھین کے لیے ہم اپنی شفیق گورنمنٹ کے گوشۂ چشم کے ایک اشارے کے امیدوار ہین۔

خاندان تیموریہ کی علم دوستی کے افسانے کسی تفصیل کے محتاج نہین۔ بابر سے لیکر بہادر شاہ تک اپنی اپنی حیثیت سے معارف پروری کا مادہ اپنی طبیعت مین رکھتے تھے۔ محمد شاہ کے وقت سے سلطنت کی جڑ مین عشرت پسندی اور عیاشی کا گھن لگنا شروع ہو گیا تھا لیکن خود محمد شاہ کے عہد مین بھی علمی چرچا کچھ کم نہ تھا، جو اُسکے جانشینون کے وقت مین بھی برابر قائم رہا۔

شاہ عالم کی سرگذشت اور بھی دلچسپ ہے۔ حکومت تو جو کچھ تھی، تھی لیکن اہل کمال کی جو پرسش اس عہد مین ہوئی اُسکی مثال کہین مشکل نظر آئیگی۔ سودا، میر، انشاء، اور انکے سوا بیسیون شاعر شاہ عالم کے خوان کرم

ریزہ چین تھے۔ اکبر شاہ جو شاعر تھے لیکن اُن کا دربار ہی شعراء و کملاء کا مرجع بنا ہوا تھا۔ یہی علمی شغف بہادر شاہ کو گویا بزرگون کے ترکے مین ملا تھا۔ وہ خود بھی اعلیٰ درجے کے سخن فہم اور سخن سنج تھے اس لیے انکے زمانہ مین باوجود تنزل پذیر ہونے کے دہلی پر عجیب جوبن تھا۔ یادگار غالب کے دیباچہ مین مولانا حالی بالقابہم اسی منظر کی دلفریبی بیان فرماتے ہین:-

تیرھوین صدی ہجری مین جبکہ مسلمانون کا تنزل درجۂ غایت کو پہونچ چکا تھا اور اُن کی دولت و عزت اور حکومت کے ساتھ علم و فضل اور کمالات بھی رخصت ہو چکے تھے، حسن اتفاق سے دارالخلافت دہلی مین چند اہل کمال ایسے جمع ہو گئے تھے جنکی صحبتین اور جلسے عہد اکبری و شاہجہانی کی صحبتون اور جلسون کو یاد دلاتی تھین اور جن مین سے بعض کی نسبت مرزا غالب مرحوم فرماتے ہین ؎

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود / باد در خلوت شان مشک فشان از دم شان
مومن و نیر و صہبائی و علوی انگاہ / حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شان

اگرچہ جس زمانہ مین کہ پہلی بار راقم کا دلی جانا ہوا اس باغ مین پت جھڑ شروع ہو گئی تھی، کچھ لوگ دلی سے باہر چلے گئے تھے اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے مگر جو باقی تھے اور جنکے دیکھنے سے مجکو ہمیشہ فخر رہیگا وہ بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دلی سے بلکہ ہندوستان کی خاک سے پھر کوئی ویسا اٹھتا نظر نہین آتا کیونکہ جس سانچے مین وہ ڈھلے تھے وہ سانچا بدل گیا اور جس ہوا مین انھون نے نشو و نما پائی تھی وہ ہوا پلٹ گئی

جن مشاہیر کا ذکر غالب کے فارسی اشعار مین آیا ہے اُن کی فہرست مین اور کئی نام ایزاد ہونے کے مستحق ہین مثلاً ذوق اور خود میرزا غالب۔ بہادر شاہ زمانۂ ولیعہدی سے اپنے علمی ذوق و شوق کے لیے نام پیدا کر چکے تھے۔ چنانچہ بہت سے شعراء خاص ان کے ملازم تھے بعضین دربار شاہی سے تعلق نہ تھا۔ اکبر شاہ کے دربار مین کئی قابل سخن سنج اشخاص کا مجمع تھا اُن پر بھی بہادر شاہ کی نظر نہایت یکسان تھی اور اسطرح دربار شاہی و بزم ولیعہدی اچھے اچھے شاعرون کا مجمع بنی ہوئی تھی اور بڑے بڑے آدمیون کو وہان کے مشاعرون مین جو خاص اہتمام سے قلعہ معلی مین ہوا کرتے تھے شریک ہونیکی تمنا رہتی تھی۔

بہادر شاہ کی تخت نشینی اور اُن کے عہد حکومت کے واقعات کچھ ایسے نمایان نہین جو تاریخ مین ممتاز جگہ پا سکین۔ مگر یہ ضرور ہے کہ چونکہ اُن کے ساتھ مغلون کے آخری تاجدار ہونے کی خصوصیت وابستہ ہے اس لیے اُن کے متعلق چھوٹی سی چھوٹی بات تاریخی اہمیت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس جگہ مختصر طور سے سمجھ لینا چاہیے کہ سنہ ۱۸۳۷ء ستمبر کی ۲۰ کو اکبر شاہ کا انتقال ہوا اور تخت دہلی کے مالک بہادر شاہ بنے۔ ان کے زمانۂ ولیعہدی مین اکبر شاہ خود اپنی ایک بیگم کی خاطر انھین حق سلطنت سے محروم کر دینے پر تلے ہوئے تھے لیکن قسمت نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا اور ایک دن انھین شاہنشاہ ہند کا باعظمت لقب اختیار کرنے کا موقع مل گیا۔ ملکی واقعات مین سب سے وسیع غدر ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے جسنے ہندوستان کی آخری کایا پلٹ دی اور ہندوستان کی زمام حکومت خاندان تیموریہ سے لیکر انگریزون کے سپرد کر دی۔

ہم اس مضمون مین اس آخری تاجدار دہلی کو بہادر شاہ کی حیثیت سے نہین بلکہ ظفر کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے ہین۔ دوسرے لفظون مین یون کہنا چاہیے کہ ہمین اُن کی شاعری پر نگاہ تنقید ڈالنا منظور ہے اس لیے غدر کے اسباب و نتائج پر رائے زنی کرنا ہمارے فرائض سے خارج ہے۔ یون بھی اس پرآشوب زمانے کے دردناک اور دلشکن واقعات کا دہرانا کوئی مفید نتیجہ نہین پیدا کر سکتا۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ بہادر شاہ تو کیا اُن کا مقبرہ تک اب باقی نہین۔ ان کی جگر خراش یاد پھر دل مین کیون رہے۔ اب جبکہ زمانہ بدل گیا ہے نہ اُنکی سیاسی کمزوریون اور لغزشون کے دکھلانے کی ضرورت ہے نہ اُن کی بے گناہی ثابت کرنے کی۔ ہمین تو

صرف یہ دیکھنا ہے کہ بہ حیثیت شاعر کے ظفر کا کیا درجہ تھا۔ اس لیے اس مضمون مین اُنھین باتون کا ذکر ہوگا جو کسی نہ کسی پہلو سے اُن کی شاعری سے متعلق ہین۔

کسی قدر چھان بین سے پتہ چلتا ہے کہ ظفر کی تعلیم کا انتظام بہت اچھا کیا گیا تھا اور اُنھین فارسی وغیرہ معقول طور پر سکھائی گئی تھی۔ وہ اعلی درجے کے خوشنویس بھی تھے اور علم و فن پر اُنھین خاص توجہ تھی شاعری کے ساتھ وہ طبعی مناسبت رکھتے تھے اور غالباً اوایل شباب سے اُنھین اسکا چسکا پڑ چکا تھا صحبت بھی انھین نامی گرامی شعرا کی نصیب ہوئی جنمین ذوق و غالب و شاہ نصیر کے علاوہ حکیم ثنا ءاللہ خان فراق، عبدالرحمن خان احسان، برہان الدین خان زار، حکیم قدرت اللہ قاسم میان شکیبا شاگرد میر تقی، مرزا عظیم شاگرد سودا، میر قمرالدین منت اور ان کے صاحبزادے میر ممنون دہلوی خصوصیت سے نام لیے جانے کے مستحق ہین

ظفر ابتدا مین شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے اور بقول مولانا آزاد کے پہلے دیوان کا ایک حصہ اُنھین کی نظر سے گذرا ہے۔ شاہ نصیر جب دکن چلے گئے تو صلاح سخن کی عزت میر کاظم حسین بیقرار کو ملی اور اُن کی علیحدگی کے بعد یہ خدمت مستقل طور پر حضرت ذوق کے سپرد ہوئی۔ اور عام طور پر ظفر کی اُستادی کا سہرا اُنھین کے سر سمجھا جاتا ہے جو سچ بھی ہے البتہ تذکرہ طور کلیم مین اس امتیاز کا حصہ دار غالب کو بھی بتایا گیا ہے اور اس بیان کی تصدیق یادگار غالب سے بھی ہوتی ہے کہ شیخ ابراہیم ذوق کی وفات کے بعد غالب سے مشورہ سخن لیا کرتے تھے۔ لیکن بظاہر حال یہ سلسلہ تھوڑے دن تک رہا ہے۔

اکثر لوگون کا خیال ہے کہ ظفر بذاتہ شاعر نہ تھے بلکہ اُن کا جسقدر کلام ہے وہ ذوق وغیرہ کا کہا ہوا ہے۔ آب حیات مین شیخ ابراہیم ذوق کے حالات مین جہان کہین ظفر کا ذکر آیا ہے اُس سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے بلکہ مولوی محمد حسین آزاد نے تو یہانتک لکھدیا ہے کہ اُستاد ذوق کی جو غزل بادشاہ کو پسند ہوتی تھی وہ اُنسے لے لیا کرتے تھے یا یہ کہ بادشاہ اگر کبھی کچھ کہتے بھی تھے تو اسی قدر کہ کسی طرح پر دو ایک مصرعہ کہکر اُستاد کے پاس بھیجدیے اور اُنھون نے اُسے ایک غزل کی صورت مین مکمل کر دیا۔ مولانا حالی مدظلہ نے بھی یادگار غالب مین جہان غالب کے بادشاہ کے کلام پر اصلاح دینے کا حال لکھا ہے وہان یہ سطور بھی موجود ہین :۔

ناظر حسین مرزا مرحوم کہتے تھے کہ ایک روز مین اور مرزا صاحب دیوان عام مین بیٹھے تھے کہ چوبدار آیا اور کہا کہ حضور نے غزلین مانگی ہین۔ مرزا نے کہا ذرا ٹھہر جاؤ اور اپنے آدمی سے کہا کہ پالکی مین کچھ کاغذ رومال مین بندھے ہوئے رکھے ہین وہ لے آؤ۔ وہ فوراً لے آیا۔ مرزا نے جو اُسکو کھولا تو اُسمین سے آٹھ نو پرچے جن پر ایک ایک دو دو مصرع لکھا ہوا تھا نکالے اور اُسیوقت قلم دوات منگوا کر اُن مصرعون پر غزلین لکھنی شروع کین اور وہین بیٹھے بیٹھے آٹھ یا نو غزلین تمام و کمال لکھکر چوبدار کے حوالے کین۔

لیکن کلیات ظفر کے غایر مطالعہ کے بعد جو رائے قائم ہو سکتی ہے اُسکی بنا پر ہمین افسوس کے ساتھ ان بزرگون کے خیال سے اختلاف کرنا پڑتا ہے۔ اول بات تو دیکھنے کی یہ ہے کہ اسطرح غزلین دوسرون سے کہلا کر اپنے نام سے مشہور کرنے کی غرض سوائے نام و نمود کے اور کیا ہو سکتی ہے لیکن ظفر کے لیے ولیعہدی اور پھر ہندوستان کی شاہنشاہی کی اضافی صفات ایسی تھین کہ اُن کی شخصیت کے نمایان کرنے کے لیے کافی تھین۔ خواہی نخواہی شاعر بن بیٹھنے سے اُن کی عزت و شان مین کیا اضافہ ہو گیا۔ اِس کے ماسوا دو اسباب خاص ایسے ہین جو اس امر کی زور کے ساتھ تردید کرتے ہین کہ ظفر کی غزلین دوسرون کی کہی ہوئی ہین۔

اول یہ کہ آپ ظفر کے چارون ضخیم دیوان غور سے دیکھ جائیے لیکن آپ کو زبان، تخیل، جذبات، طرز بیان، اسلوب عبارت، غرض کسی اعتبار سے بھی کہین امتیازی فرق نہ ظاہر ہو گا۔ حالانکہ جب مختلف غزلین مختلف لوگون کی لکھی ہوئی ہین تو ان کے درمیان کوئی نہ کوئی تفریق کا

ہونا ضرور تھا۔ یہ بات سمجھ مین نہین آتی کہ شاہ نصیر، بیقرار، ذوق، اور غالب، جب اپنے لیے لکھین تو ایک کا رنگ دوسرے سے نہ ملے اور یہی لوگ جب ظفر کے نام سے کہنے بیٹھین تو اسطرح کہین کہ کوئی تمیاز نہ ہوجائے۔ اسی خیال کو مدنظر رکھکر غالباً مولانا آزاد نے یہ لکھدینا ضروری سمجھا ہے کہ ذوق کے طرز صلاح مین :۔

خوبی یہ تھی کہ شاگرد کا کلام اُسکی حیثیت اور استعداد سے بڑھنے نہ پاتا تھا اور کیفیت اُسکی مشاعرون کی غزلون مین کھلتی تھی۔ مثلاً بادشاہ کی غزل بناتے تھے، ولیعہد کی غزل بھی بناتے تھے اور جب جُدا جُدا دیکھو تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ بادشاہ کا کلام ہے یہ ولیعہد کا۔ اور ہر شاگرد کا کلام بعد اصلاح کے اپنے انداز پر رہتا۔ ویران اپنی جگہ، داغ اپنی جگہ، اور اپنی غزل دیکھو تو سب سے الگ

اسمین شک نہین کہ قادرالکلام اُستاد ہونے کی سب سے بڑی علامت یہی ہے کہ وہ اپنے شاگردون کی طبیعت سے پورے طور پر واقف ہو اور کلام کی اصلاح ہر شاگرد کی قابلیت اور فکر کے اعتبار سے کیجائے لیکن مسلم غزلون مین شاعر کا اصلی رنگ ضرور جھلکتا ہے اور ذوق و شاہ نصیر اور سب سے زیادہ غالب کا انداز تو کبھی چھپا رہ نہین سکتا۔ غرضکہ ہمارے قیاس مین کلیات ظفر تمام و کمال ایک ہی شخص کا طبعزاد ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اُسے ظفر کہو یا ذوق یا نصیر لیکن یہ نہین ہو سکتا کہ اُسے ذوق، نصیر و غالب کا مشترکہ سرمایۂ فکر قرار دیا جائے۔

دوسری مابہ الامتیاز خصوصیت کلام ظفر کی سوز و گداز، دردمندی، ناکامی و محرومی کے مضامین اور جذبات ہین جنکی نظیر ذوق اور شاہ نصیر کے کلام مین تلاش سے بھی نہین ملتی۔ بیشک نارونالی اور حسرت و درد کی تصویرین غالب کے یہان ہین اور بکثرت ہین لیکن اُن کا زمانہ اُستادی اسقدر قلیل اور گریزپا رہا ہے کہ کوئی یہ نہین کہہ سکتا کہ ظفر کے مرقع مین آب و رنگ انھین کی بدولت ہے اور لامحالہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ شعر و سخن کے یہ لعل بیبہا جو کلیات ظفر کے صفحون پر بکھرے پڑے ہین بہادر شاہ ظفر کی ملکیت بلا شراکت غیری ہے۔

بہرکیف ہم ظفر کو شاعر اور فطرتی شاعر سمجھتے ہین اور اُن کے کلام کی تاثیر اور پختگی سے ان کے ایک گران پایہ سخنگو ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ حُسن قبول بھی ایک خدائی عطیہ ہے جو ہر کس و ناکس کے حصے مین نہین آتا لیکن اس اعتبار سے بھی ظفر خوش نصیب ہین کہ آج بھی اُن کی بہت سی غزلین اور کثیرالتعداد اشعار عام طور پر مشہور ہین مثلاً

یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا — یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
اپنا دیوانہ بنایا مجھے ہوتا تو نے — کیون خردمند بنایا، نہ بنایا ہوتا
خاکساری کے لیے گرچہ بنایا تھا مجھے — کاش خاکِ درِ جانانہ بنایا ہوتا
نشۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھکو — عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا
روز معمورۂ دنیا مین خرابی ہے ظفر
ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

کسی نے اُسکو سمجھایا تو ہوتا — کوئی یان تک اُسے لایا تو ہوتا
مزہ رکھتا ہے زخم خنجر عشق — کبھی اے بوالہوس کھایا تو ہوتا
نہ بھیجا تو نے لکھکر ایک پرچہ — ہمارے دل کو پرچایا تو ہوتا

دیا اپنی خودی کو جو ہم نے اُٹھا وہ جو پردہ سا بیچ مین تھا نہ رہا
رہے پردے مین اب نہ وہ پردہ نشین کوئی دوسرا اُسکے سوا نہ رہا
نہ تھی حال کی جب ہمین اپنی خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی بُرائیون پر جو نظر تو نگاہ مین کوئی بُرا نہ رہا
ظفر آدمی اُسکو نہ جانیے گا وہ ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش مین یاد خدا نہ رہی جسے طیش مین خوف خدا نہ رہا

ظفر کی غزلون پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ اُنھین مشکل اور طویل ردیف کی طرحون سے خاص دلچسپی تھی اور یہ صفت گویا اپنے اُستاد اولین شاہ نصیر سے مستعار لی تھی۔ لیکن ایک خصوصیت اُنمین ضرور ہے کہ زمین خواہ کیسی ہی ہو، یہ اپنے انداز گفتار کو

ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ اکثر مشاہیر شعرا نے نہایت ہی سنگلاخ زمینون مین طبع آزمائی کی ہے لیکن بسا اوقات انھین بھرتی کے مضامین سے کام لینا پڑتا ہے لیکن ظفر نے اپنی امتیازی سلاست زبان کے ساتھ تخیل کی شگفتگی بھی ہمیشہ مدنظر رکھی ہے اور اسلیے اُن کی مشکل سے مشکل زمین والی غزل روانی بیان اور ترتیب خیال کا بہترین نمونہ ہے ؎

واں کی مخلصی ہے وائے قسمت ہو تو کیونکر ہو | کہ مین آلودۂ عصیاں ہوں رحمت ہو تو کیونکر ہو
ہوس کہتی ہے چل لیجے کہے ہے حرص لا ان سے | توکل ہو تو کیونکر ہو قناعت ہو تو کیونکر ہو

کنار آب ہو مہتاب ہو ساغر ہو مینا ہو | جو یہ ساماں مگر کل ہو پھر تو چہلیں ہوں تماشا ہو
پڑا دریا میں ہو عکس چراغاں اور وہ شب ہو | کھڑا بالا لیے پل ہو پھر تو چہلیں ہوں تماشا ہو

پوچھتے ہو آج اگر ہمسے کیا! اچھے تو ہو | یہ کہو تم تھے کہاں اے دلربا اچھے تو ہو
زخم میرے چاہتے ہیں اے ظفر جب تازگی | مین انھین کہتا ہوں کمبختو ذرا اچھے تو ہو

ابروئے کج ہم ہین چشم یار پر تانے ہوئے | واہ کیا آہو کے سر پر سینگ آڑے ہوئے
حسرت و درد و الم رنج و تعب اندوہ و یاس | ساتھ دل کے دیکھا مین نے جمع کیا ڈھائے ہوئے

ساتھ میرے چلے چلو چپ چپ | راہ مین تم نہ کچھ کہو چپ چپ
راز پنہاں فغاں سے کھلتا ہے | حضرت دل بس اب ہو چپ چپ

کلام اُن کو ہر طرح فرمانے ٹیڑھے | جو سیدھے بھی ہوں تو کوئی جانے ٹیڑھے
عجب انقلاب آج ہے میکدے مین | کہ شیشے ہین اُلٹے تو پیمانے ٹیڑھے

کہاں وہ دور عیش افزا جہاں ہم تھے وہاں تم تھے
نہ رہتے تھے کبھی تنہا جہاں ہم تھے وہاں تم تھے
اگر ہم خار تھے تم گل تھے لیکن باغ الفت مین
جدا ہوتے نہ تھے اصلا جہاں ہم تھے وہاں تم تھے

ردایف کی لطافت پسندی کے ساتھ کہین کہین اسکو بالکل اڑا بھی دیا ہے اور صرف قافیہ پر قناعت کی ہے۔ ہم اس جگہ چند اشعار نقل کرینگے، ناظرین ملاحظہ فرمائین کہ باوجود فارسیت کے قافیے کس خوبی سے جمائے ہین ؎

مکتب عشق مین ہنگام شروع سبقے | پہلے مجموعۂ دل کے ہوئے پریشان ورقے
اپنے بیمار کی آئے وہ عیادت کے لیے | جب یہ جانا کہ ہو جان اسمین تو شاید رمقے
کچھ عوض دل کے وہ تکرار سے دیتا ہے کیا | اَلے بر اَلے یا قلقے بر قلقے
رخ گلگوں پہ ہے اُس گل کے نشے کی سرخی | جلوۂ صبح بہاراں و بہار شفقے

زبان کے اعتبار سے ظفر تعریف سے مستغنی ہین۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے اور اسیکا مولوی الطاف حسین حالی نے بھی اپنے مقدمۂ دیوان مین کئی جگہ اعتراف کیا ہے کہ موخرین مین جن لوگون نے زبان کی صفائی کا زیادہ خیال رکھا ہے انمین ظفر کا بھی شمار ہے۔ اُن کی زبان بغایت فصیح و دلپسند ہے اور سوائے خال خال متروک الفاظ کے جنکا استعمال تھوڑے عرصہ پیشتر تک دہلی مین ہوتا تھا مجموعی طور پر ظفر کا کلام موجودہ معیار کے بالکل مطابق ہے۔ خصوصاً بحر خفیف مین تو اُن کے بیان و طرز ادا کی لطافت کچھ اور ہو جاتی ہے ؎

واہ تم صبح کو نکلے آئے | دن چڑھے کہکے دن ڈھلے آئے
آج کیا مجھپہ مہربانی ہے | بن بلائے جو تم چلے آئے

کوچۂ یار مین ہزاروں دل
اے ظفر پاؤں کے تلے آئے

مرے جی مین ہے پوچھوں انجان بنکے | چلے کسکے گھر آج مہمان بن کے
مسی مل کے کاجل لگا کر چلے ہو | کہاں تم دھواں دھار اے جان بن کے

ظفر ہے وہی اپنے نزدیک دانا
بنے ہے جو دنیا مین نادان بن کے

دل کی مہمانسرائے خالی ہے | تم اگر آؤ جائے خالی ہے
نالہ وہ ہے کہ جسمین ہو تاثیر | بے اثر اک صدائے خالی ہے
دین بجز نقد جان تمھین کیا ہم | کیسہ اپنا تو ہائے خالی ہے
بوالہوس جانے درد عشق کو کیا | کر رہا ہائے وائے خالی ہے

نہین تم کو لازم برائی کی باتین | بھلوں کو ہین زیبا بھلائی کی باتین

غضب ہے کہ دل میں تو رکھو کدورت ۔ کرو منہ پہ ہم سے صفائی کی باتیں
لڑاتے ہو محفل میں غیروں سے آنکھیں ۔ صریحاً ہیں یہ تو لڑائی کی باتیں
جو کرتے ہو تم دلربائی کا دعویٰ ۔ کچھ آتی بھی ہیں دلربائی کی باتیں

زبان کے بعد جب کلام ظفر کی معنوی خصوصیات پر نگاہ پڑتی ہے تو سوز و گداز درد مندی بے وفائی دنیا انقلاب عالم کے مضامین خاص طور سے کیفیت انگیز اور موثر نظر آتے ہیں۔ دنیا کی نیرنگیوں کا تماشا چونکہ ظفر کے لیے ایک آپ بیتی جبر بھی اسلیے اُسمین صداقت و تاثیر کا ناقابل بیان وصف موجود ہے۔ حق یہ ہے کہ ان سے بہتر اور کون کہہ سکتا تھا ؎

جہان ویرانہ ہے پہلے کبھی آباد گھر یان تھے
شغال اب ہین جہان رہتے کبھی بستے بشر یان تھے
جہان پھرتے بگولے ہین اُڑاتے خاک صحرا مین
کبھی اُڑتی تھی دولت رقص کرتے سیمبر یان تھے
جہان سنسان اب جنگل ہے اور ہے شہر خاموشان
کبھی کیا کیا تھے ہنگامے یہان، اور شور و شر یان تھے
جہان اب خاک پر ہین نقش پائے آہوئے صحرا
کبھی محو تماشا دیدۂ اہل نظر یان تھے
ظفر احوال عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے
کہ کیا کیا رنگ اب ہین اور کیا کیا پیشتر یان تھے

ذیل کی ایک منتخب قطعہ بند غزل کس رنگ کی ہے؟ آخری شعر قلب پر عجیب کیفیت پیدا کرتا ہے ؎

اے ظفر جو شباب کے دن تھے ۔ بس وہی خورد و خواب کے دن تھے
دور عشرت تھا اور عہد نشاط ۔ جام صہبائے ناب کے دن تھے
تھا کلوا و اشربوا پر اپنا عمل ۔ کہ شراب و کباب کے دن تھے
یہ نہ راتین تھین آہ و زاری کی ۔ اور نہ یہ پیچ و تاب کے دن تھے
رہے پیری مین اس لیے بیٹھے ۔ دست کھینچے کچھ عذاب کے دن تھے

انسانی خصائل کی گوناگونی اور طبائع کی رنگ برنگی کی تصویر اس غزل مین کتنی صحیح اور نیچرل کھینچی گئی ہے ؎

ہمین مین رنج بھی ہے اور راحت بھی ہمین مین ہے
جہنم بھی ہمین مین اور جنت بھی ہمین مین ہے
کسی سے دوستی ہم کو کسی سے دشمنی ہم کو
محبت بھی ہمین مین اور عداوت بھی ہمین مین ہے
کہین مشہور ہم عاقل کہین بدمست لایعقل
کہ ہشیاری بھی ہم مین اور غفلت بھی ہمین مین ہے
کبھی ڈرتے ہین پشّے سے کبھی لڑتے ہین شیرون سے
کہ بے جرأت بھی ہم ہین اور جرأت بھی ہمین مین ہے
کبھی سر در گریبان ہین کبھی دست و گریبان ہین
تحمل بھی ہمین مین ہے جہالت بھی ہمین مین ہے
بھڑین تو سو پہاڑون سے دبین تو ایک تنکے سے
کہ بے طاقت بھی ہم ہین اور طاقت بھی ہمین مین ہے
نہین غیر از صلاح و خیر وان تو اور کچھ ہرگز
ظفر شر بھی ہمین مین ہے شرارت بھی ہمین مین ہے

تصوف اور اخلاق کے گرانمایہ نکتے بھی کثرت سے حل کیے ہین اور اسمین شک نہین کہ اگر اس قسم کے سبق آموز اشعار کا انتخاب کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی ؎

نہ درویشون کا خرقہ چاہیے نہ تاج شاہانہ ۔ مجھے تو ہوش دے اتنا رہون مین تجھ پہ دیوانہ
غنیمت جان جو دم گذرے کیفیت سے گلشن مین ۔ دیے جا ساقی پیمان شکن بھر بھر کے پیمانہ
نہ دیکھا وہ کہین جلوہ جو دیکھا خانۂ دل مین ۔ بہت مسجد مین سر مارا بہت سا ڈھونڈھا بتخانہ
کچھ ایسا ہو کہ جس سے منزل مقصود کو پہونچون ۔ طریق پارسائی ہووے یا ہو راہ رندانہ
یہ ساری آمد و شد ہے نفس کی آمد و شد پر ۔ اسی تک آنا جانا ہے نہ پھر آنا نہ پھر جانا

خواب غفلت سے تری جس وقت کھل جائیگی آنکھ ۔ ہے جو کچھ آنکھون کے آگے جلوہ گر چھپ جائیگا

اپنی ہستی پر نہ ہنس اتنا کہ ہستی ہے فنا — دیکھ ہنستے ہنستے ہی تیرا لے شرر چھپ جائیگا
زندگی جبتک ہے کوئی عیب دیکھے یا ہنر — ورنہ زیر خاک سب عیب و ہنر چھپ جائیگا

ہم نے دنیا مین آکے کیا دیکھا — دیکھا جو کچھ سو خواب سا دیکھا
ہے تو انسان خاک کا پتلا — لیک پانی کا بلبلا دیکھا

اخلاق و عظمت کے اشعار کا نمونہ حسب ذیل ہے ؎

نام سے کام نکلتا نہین بے جوہر اصل — تل سے عارض کے نہ ہرگز کبھی روغن نکلا
دل کو تو کر اپنے دولت سے قناعت کی غنی — بس بہت دست ہوس اتنا نہ اے غافل بڑھا
اُسکو انسان مت سمجھو سرکشی جسمین ظفر — خاکساری کے لیے خاک سے انسان بنا
کون تھا بار امانت کا اُٹھانے والا — گر جہ دنیا مین نہوتا ظفر انسان پیدا

متصلۂ ذیل اشعار کتنے پر کیف ہین ؎

کسیکو ہم نے یان اپنا نہ پایا — جسے پایا اُسے بیگانہ پایا
کہان ڈھونڈھا اُسے کس جا نہ پایا — کوئی پر ڈھونڈھنے والا نہ پایا
اُسے پانا نہین آسان کہ ہم نے — نہ جب تک آپ کو کھویا نہ پایا

ظفر دل جانے یا ہم، کون جانے
کہ پایا اسمین کیا اور کیا نہ پایا

غافلو دل سے اِدھر آنکھون پہ ہر ناحق نہ رہو — تم رہو بیٹھے کہین پر دھیان اُدھر باندھے رہو
جلوہ گر ہے وہ تو بے پردہ پر آئے کیا نظر — جبکہ تم غفلت کی پٹی آنکھ پر باندھے رہو
گلشن دنیا نہین جائے قیام اے غافلو — غنچہ سان تم دوش پر رخت سفر باندھے رہو

فخر دین و فخر دنیا ہے جو بس وہ فخر دین
تم ادب سے ہاتھ اپنے اے ظفر باندھے رہو

آخری شعر کی طرح اور بھی بیسیون مقطع مین حضرت فخرالدین کا ذکر آیا ہے غالبًا یہ ظفر کے پیر ہون گے۔ ظفر کو فقرا سے بدرجہ کمال عقیدت تھی اور غالبًا اسی نے اُن کی طبیعت مین تصوف کا مذاق پیدا کیا اور اُسے پختگی کے درجہ تک پہونچایا۔ اُن کے کلام مین جہان کہین دنیا کا ذکر آیا ہے وہان یہ پورے فقیرانہ رنگ مین نظر آتے ہین اور کلام مین عجب تاثیر پائی جاتی ہے۔

ان کی ایک تضمین ؎

پڑے دنیا یون ہی یک بیک کے عبث جان گنوائی — نہ دیا منزل عقبی کا مجھے رستہ دکھائی
مگر اب جی مین ہے یہ چھوڑ کے سب بیہودہ درائی — ملک ذکر تو گویم کہ تو پاکی و خدائی

نروم من بجز آن رہ کہ آن رہ نمائی

نہایت مشہور ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ عجیب چیز ہے، درد و تاثیر ہر صفت اسمین بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اب بھی اکثر مناجات کے طور پر عام طور پر پڑھی جاتی ہے مختصر یہ ہے کہ جہان تک شاعری کو تعلق ہے ظفر ایک خوش نصیب اور کامیاب شخص تھے اُن کی بادشاہی نرہی لیکن ملک سخن مین اُن کی عظمت مسلم ہے۔ اُن کا آخری زمانہ اُن کے لیے خوشگوار نہین رہا لیکن اُن کے یہی حالات دنیا کو عبرت کا سبق دے رہے ہین۔ گویا جسطرح اُن کا کلام شاعرون کے لیے چراغ ہدایت ہے اسی طرح انقلاب عالم کی حقیقت کے سمجھنے کے لیے اُن کی ذاتی سرگذشت بمنزلہ ایک آئینے کے ہے۔ بلاشبہ اُن کا ایک دور دراز مقام پر گمنامی کی حالت مین جان دینا قلق پیدا کرتا ہے لیکن اسکی خواہش تو انھین خود بھی تھی ؎

شاہون کے مقبرے سے الگ دفن کیجیو
ہم بیکسون کو گور غریبان پسند ہے

دوسرے اُسکی تلافی اس خیال سے بھی ہو جاتی ہے کہ اُن کے دامن پر فتنۂ غدر کی شرکت کے الزام کا جو اخلاقی دھبہ تھا وہ اُن کے بعد برطانیہ کے منصف مزاج اور فراخ حوصلہ افراد کی کوششون نے یک قلم دھو دیا اور اُن کی بے گناہی ثابت کر دی ہے۔ کئی موقر انگریزی مورخون نے اُن کے بے قصور ہونے کا اعتراف کیا ہے بلکہ انھون نے تو اسکے برخلاف یہان تک ثابت کر دیا ہے کہ بہادر شاہ نے بہت سے گرفتاران مصیبت کے ساتھ عملاً ہمدردی بھی دکھائی تھی۔

سید محمد فاروق

خلیفہ مامون الرشید کے وقت مین مسلمانون کی علمی ترقی

انصاف سے دیکھا جائے تو آج دنیا مین جسقدر علوم و فنون کی گرم بازاری ہے وہ سب مسلمانون کے طفیل مین ہے۔ انھون نے اپنے زمانہ مین جہان اور امور عالیہ کی جانب توجہ کی وہان علمی اشغال کو بھی لیا۔ تاریخین دیکھ لو کہ یورپ جو موجودہ زمانہ مین علمی دنیا کا سرتاج ہو رہا ہے سب مسلمانون کا طفیل ہے اور پروفیسر رینان۔ پروفیسر سیدیو۔ ڈاکٹر زاخو۔ ڈی ساسی وغیرہ ہم بڑے بڑے مستشرقین اس امر کا اعتراف کر چکے ہین کہ جتنے جو کچھ جانا اور سیکھا سب مسلمانون سے۔ ہم یہان صرف یہ دکھلانا چاہتے ہین کہ اسلام کے نامدار خلیفہ مامون الرشید عباسی کے وقت مین مسلمانون کی علمی ترقی کی کیا حالت تھی اور آگے چل کر وہ کیونکر سرسبز ہوئی۔ منصور و ہارون الرشید وغیرہ نے مدینۃ الاسلام بغداد مین اگرچہ ہر طرف علمی چشمے جاری کر دیے تھے لیکن عروج پر پہونچانا خلیفہ مامون الرشید کا کام تھا اسلئے خصوصیت سے یہ تذکرہ نامناسب نہین ہے۔

لٹریری کلب (علمی مجلس) خلیفہ مامون رشید کا ایجاد ہے جہان علماء و فضلاء و عوام جمع ہو کر مختلف مضامین پر بحث کیا کرتے تھے۔ دنیا کے ہر حصہ مین مختلف اقسام کے علمی کلب جو جاری ہین وہ سب مامونی کلب کے نمونہ پر ہین۔ اسکے علاوہ کتب فروشی بھی معراج کمال پر تھی اور یہ تاجران کتب محض سوداگر ہی نہین ہوتے تھے بلکہ خود صاحب تصانیف بھی تھے۔ ان کے کارخانون مین طلباء اور علماء کا ہجوم رہتا تھا اور لوگ آزادی کے ساتھ ہر قسم کی بحثون مین مشغول نظر آتے تھے۔ فن کتابت کو بھی نہایت ترقی تھی یہانتک کہ بعض کتابین سو دینار تک فروخت ہوتی تھین۔ مامون رشید کے وقت مین صرف و نحو۔ علم فصاحت۔ ادب۔ جغرافیہ۔ تاریخ۔ احادیث وغیرہ پر بیشمار تالیفات ہوئین اور خصوصًا فلسفہ و سائنس مین جو ترقی ہوئی اُس کا اثر آجتک باقی ہے۔ مورخ سیدی یو (فرنچ) لکھتا ہے:۔

خلیفہ مامون رشید عباسی کے زمانے مین ترقی ادب۔ قیمتی ایجادون کا وجود اور غرض ہر شعبہ علمی و عملی مین کمال اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ ہم مسلمانون کو اپنا اُستاد مانین۔ ایک طرف تو انھون نے وسط زمانہ کی تاریخ۔ جغرافیہ سیر و سیاحت اور لوگون کے حالات سے ہمکو مطلع کیا ہے اور دوسری جانب صنعت و حرفت انجنیری۔ اور دیگر فنون سے آگاہی بخشی ہے۔

مامونی زمانہ کا عالم ابو موسیٰ جعفر کوفی موجودہ علم کیمیا (کیمسٹری) کا بانی ہے۔ اُسکے بعد اور لوگون نے بھی اسی علم مین ترقی کی اور موجودہ زمانہ کے علماء یورپ کس قدر متعجب ہوتے ہین کہ مسلمانون کا دماغ کیسا روشن اور زبردست تھا کہ انھون نے ایسا علم ایجاد کیا۔ طب اور جراحی کو تو کمال پر پہونچا دیا تھا انھون نے علم الدوا (ڈرگ) ایجاد کیا اور ہسپتالون و دواخانون کی بنیاد رکھی۔ موجودہ شفاخانے و دواخانے اُسی نمونہ کے ہین۔ علم نباتات (بوٹانی) کی عملی تعلیم کے واسطے بغداد اور دوسرے بڑے بڑے شہرون مین وسیع باغات لگائے گئے تھے اور علماء وہان تحقیقات کرتے تھے۔

اُس علمی تحریک کی وجہ سے جو نوین صدی مین علم کو درجہ کمال پر پہونچانے مین کامیاب ہوئی تھی، مسلمانون کو سیر و سفر کا شوق ہوا اور انھون نے جغرافیہ و سیر و سیاحت مین وہ بیش بہا کتابین تالیف کین جن پر یورپ باوجود ادعائے تحقیقات ناز کر رہا ہے۔ اِن بزرگون مین مسلم بن حمار۔ جعفر بن احمد مروزی۔ ابن فضلان۔ ابن خرداد بہ۔ جیہانی۔ مسعودی۔ اصطخری۔ ابن حوقل البیرونی۔ یاقوت حموی۔ البکری۔ المقدسی۔ ادریسی کے نام بحیثیت جغرافیہ دانان مشہور ہین اور اکثر تصانیف ان کی یورپ کے مطبعون مین چھپ گئی ہین۔

بیرونی نے ہندوستان کا سفر کیا اور یہان رہکر سنسکرت زبان مین

له مضمون ہذا مین مندرجہ ذیل کتب سے امداد لی گئی ہے:۔
تاریخ اسلام (ڈاکٹر سید امیر علی صاحب) تاریخ الخلفاء (علامہ سید جلال الدین سیوطی)
صناجۃ الطرب فی تقدمات العرب (علامہ نوفل آفندی)

بہت بڑا تبحر پیدا کرلیا۔ اُنھنے ایک نہایت بیش قیمت کتاب الہند لکھی ہے جس مین ہندوستان کے جغرافی و طبعی حالت کو مشرح و مفصل بیان کیا ہے اس کتاب کو یورپ مین مستشرق ڈاکٹر زاخو نے بہت محنت سے تلاش کر کے مع مفصل حواشی شایع کیا ہے[1]۔

حکیم ناصر خسرو علوی اصفہانی بھی بہت بڑا سیاح ہوا ہے۔ وہ ۴۳۷ھ مین مرو سے روانہ ہوا اور نیشاپور۔ قم۔ تبریز۔ خلاط۔ میافارقین حلب ہوتا ہوا شام پہونچا۔ اور طرابلس۔ صیدا۔ بیروت۔ بیت المقدس کی سیر کرکے مکہ اور وہان سے حرمین شریفین کی طرف روانہ ہوا۔ اسکا سفرنامہ نہایت دلچسپ ہے[2]

علامہ بلاذری کی بیش بہا تصانیف قابل قدر ہین۔ فتوح البلدان (تاریخ) ایسی تحقیق و کمال کے ساتھ لکھی ہے کہ بے اختیار دل سے تحسین نکلتی ہے اور اُسے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب اس فن مین کیا مرتبہ رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ ہمدانی۔ طبری۔ ابن الاطہر۔ مقریزی ابن خلدون۔ ابوالفدا کی تاریخین بھی اس پایہ کی ہین۔ شکر ہے کہ انمین سے بعض کتابین ہالینڈ کے مشہور مطبع برل مین طبع بھی ہوگئی ہین[3]۔

مسعودی، اسلام کا مشہور زبردست جغرافیہ دان ہے۔ اس کی لاجواب کتاب مروج الذہب یادگار زمانہ ہے۔ دوسری تصنیف مراۃ الزمان بھی عجیب ہے۔

ابن الاطہر نے تاریخ الکامل ایک بے نظیر و نادر تاریخ لکھی ہے۔ یہ بھی یورپ مین طبع ہوگئی ہے۔

سائنس کی مختلف شاخون مین بھی اہل عرب نے کمال حاصل کیا۔ مامون رشید کے زمانہ مین سیند بن علی۔ یحیی بن ابی منصور۔ خالد بن عبدالملک ایسے فخر روزگار مہندس و ہیئت دان گذرے ہین کہ ان کا جواب نہین۔ وشوید۔ گرہن۔ سیارون اور اجرام فلکیہ کے متعلق ان کی تحقیقات نہایت بیش قیمت ہین۔ مامون کے حکم سے محمد بن موسی خوارزمی نے سدھانتا کا عربی ترجمہ کیا۔ یعقوب کندی نے مختلف مضامین (ریاضی۔ اقلیدس۔ فلسفہ۔ کرۂ ہوائی۔ مناظر و مرایا اور طب) پر قریب ۲ سو کے تصانیف کین۔

ابومعشر فلکی (موجد گھڑی) نے اجرام فلکیہ کی بابت بڑی نادر تحقیقات کین۔ موسی بن شاکر۔ ابوالحسن (موجد دوربین) النظیری۔ محمد بن عیسیٰ۔ ابوعبداللہ علی بن الجور۔ ابوالحسن علی ابن الجور یہ سب سائنس دان گذرے ہین۔

(آئینہ اشاعت مین "مسلمان اور علم ہیئت" کے عنوان سے ایک مفصل مضمون لکھا جائیگا جس مین ہر قابل شخص کا تذکرہ ہوگا)

ابوالوفا۔ حسین بن ہیثم۔ ابن شاطر۔ عمر خیام[4]۔ بہت بڑے ریاضی دان تھے۔ ان کے بھی اکثر تصانیف یورپ مین چھپ گئے ہین۔

علم مابعد الطبیعت و فلسفہ مین کندی[5]۔ ابونصر فارابی[6] بوعلی سینا[7] بہت مشہور ہین۔ اہل عرب ابونصر کو ارسطوے ثانی کہتے ہین۔

فن شعر مین بھی عرب کسی سے پیچھے نہین ہین۔ اُن کا فصیح و بلیغ کلام آج بھی یکتاے زمانہ ہے۔ ابونواسی، خلیفہ امین کا مشہور شاعر بڑا زبردست ناظم تھا۔ ابوتمام حبیب ابونواسی سے دوسرے درجہ پر تھا۔ ابن خلکان ... کی بابت لکھتا ہے "بلحاظ شستگی کلام۔ خوبی نظم۔ طرز ادا اپنے تمام ہمعصرون پر سبقت لے گیا تھا"

البحتری[8]۔ متنبی۔ النعمانی بھی اسی ذیل مین ہین۔

---

[1] الہند۔ لیوزک اینڈ کو لندن کے یہان سے مل سکتی ہے ۱۲

[2] حکیم ناصر خسرو کے سفرنامہ کا ترجمہ مین نے شروع کردیا ہے ۱۲

[3] یہ دونون کتابین ہالینڈ کے مطبع برل مین چھپ گئی ہین ۱۲

[4] عمر خیام کی اکثر تصانیف فرانس مین طبع ہوئے ہین اور اسکی اصل رباعیات مین نے بھی مرتب کیے ہین ۱۲

[5] کندی کی دو ایک کتابین برل پریس ہالینڈ مین طبع ہوگئی ہین ۱۲

[6][7] ابونصر فارابی کی ایک کتاب اور بوعلی سینا کی دو کتابین ہالینڈ مین طبع ہوگئی ہین ۱۲

[8] البحتری کی ایک تصنیف ہالینڈ مین چھپ گئی ہے ۱۲

علامہ ابن الندیم کی کتاب الفہرست[1] ایک عجیب تصنیف ہے جسمین ہر علم کی ہر شاخ پر بحث ہے ۔

ابن خلکان کا قاموس اسمار وسیع واقفیت کا دریا ہے ۔

ابوالفرج اصفہانی مصنف الاغانی[2] بھی بڑے پایہ کا شخص ہے کتاب الاغانی مین ان شعرار کا کلام درج ہے جو راگ مین کام آتے ہین اور ہر شاعر کی سوانح عمری کے علاوہ اُنکے کلام پر صرفی و نحوی بحث بھی ہے ۔ اس مختصر مضمون مین اس قدر گنجائش نہین کہ ہم مفصل طور پر علمی ترقی کا ذکر کرسکین ۔ جو کچھ لکھا گیا ہے سمجھدارون کے لیے یہ بھی بہت ہے ۔

محمد شفیع الدین خان مرادآبادی

نواب سالار جنگ ثالث

سالار جنگ کا خطاب حب الوطنی، وفاداری، دلیری، اور اعلےٰ انتظامی قابلیت کا مرادف بن چکا ہے ۔ یہ صفات سر سالار جنگ اعظم مین پائی جاتی ہین ۔ ان سے ورثہ مین نواب سالار جنگ ثانی کو ملین اور اب جب کہ ریاست حیدرآباد کا قلمدان وزارت نواب سالار جنگ ثالث کے سپرد ہوا ہے اس بات کی توقع بالکل قرین قیاس ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس عظیم الشان عہدہ کے فرائض کی انجام دہی اور ان مین کامیابی کے ہر طرح اہل ثابت کرسکین گے ۔

یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ نواب سالار جنگ کا سلسلہ نسب عرب کے مشہور و معروف بزرگ شیخ اویس قرنی سے ملتا ہے ۔ اس رشتہ کی توضیح ذیل کے شجرہ نسب سے ہوتی ہے ۔

شیخ اویس قرنی
شیخ محمد علی
شیخ محمد باقر (دیوان) — شیخ حیدر
شیخ محمد تقی
شیخ شمس الدین محمد حیدر (منیر الملک اول)، دیوان
دیوان شیخ صفدر جان شجاع الملک — علی زمان حیدر یار خان منیر الملک ثانی دیوان — تہ گیر خان ذوالفقار
محمد تقی خان اکرام الملک — حسن رضا خان شوکت الدولہ — منیر الملک ثالث (انکی شادی میر عالم کی دختر سے ہوئی)
میر محمد علی خان سالار جنگ
سر سالار جنگ اعظم نواب میر تراب علیخان جی سی ایس آئی
نواب میر لائق علیخان سالار جنگ ثانی کے سی ایس آئی
نواب میر یوسف علی خان سالار جنگ ثالث

حضرت اویس قرنی مع اپنے فرزند کے ۱۶۵۶ء سے ۱۶۶۰ء تک بیجاپور مین سلطان علی عادل شاہ کے دربار مین رہے ۔ ان کے بیٹے شیخ محمد علی کی شادی دربار کے ایک منصبدار کی دختر سے ہوئی اور وہ سلطان عادل شاہ کے پرائیویٹ سکرٹری مقرر ہوئے ۔ محمد علی کے بیٹے شیخ محمد باقر کے ساتھ چونکہ سلطان سکندر علی شاہ کے وزیر نے بدسلوکی کی تھی اسلیے انھون نے سلاطین مغلیہ سے تعلقات پیدا کیے اور اس زمانہ کی امپیریل گورنمنٹ نے انھین دکن بھیجدیا۔ اس خاندان کا یہ پہلا شخص تھا جو منصب وزارت پر مامور ہوا ۔

شیخ محمد باقر کے پوتے نے ہز ہائنس نظام صفدر جنگ کی ملازمت اختیار کی جہان سے انھین منیر الملک کا خطاب اور بعد مین دیوان کا عہدہ ملا ۔ اس کے بعد ان کا بیٹا صفدر خان جو ۱۷۳۲ء مین پیدا ہوا تھا دیوان بنا اور اسے شجاع الملک کا خطاب عطا ہوا ۔

معلوم ہوتا ہے کہ سالار جنگ کا خطاب اس خاندان کے ارکان کو اس وقت سے حاصل ہوا ہے جبکہ شیخ صفدر خان کی شادی ۱۷۵۱ء مین درگاہ قلی خان سالار جنگ کی دختر سے ہوئی ۔ ان کے بعد ان کے تیسرے بیٹے علی زمان حیدر یار خان کو دیوان کا عہدہ عطا ہوا ۔ انھین اپنے دادا کا خطاب منیر الملک بھی حاصل تھا جو ان کے بعد ان کے بیٹے کو

---

[1] الفہرست مصر مین طبع ہوگئی ہے ۱۲

[2] کتاب الاغانی مصر مین طبع ہوگئی ہے ۱۲

ورثہ مین ملا جسکی شادی اس زمانہ کے دیوان میر عالم کی دختر سے جو ایران کے ایک معزز خاندان سے تھے ہوئی۔ چنانچہ جب ۱۸۰۸ء مین میر عالم نے رحلت کی تو وزارت کا عہدہ منیر الملک ثالث کے سپرد ہوا۔ ان کے بیٹے میر محمد علی خان کی شادی سید کاظم علی خان کی دختر سے جو نیشاپور کے خاندان سادات مین سے تھے ہوئی اور انھون نے دوبارہ سالار جنگ کا لقب اختیار کیا جو اس کے بعد پشت در پشت قایم چلا آیا ہے۔ میر محمد علی خان کے گھر مین میر تراب علی خان (سالار جنگ اعظم) پیدا ہوئے جنھون نے نہ صرف اپنے خاندان بلکہ سب سے بڑھ کر لفظ "سالار جنگ" کا نام روشن کیا۔ حقیقت مین دیکھا جائے تو میر محمد علی خان سالار جنگ اول اور میر تراب علی خان سالار جنگ ثانی تھے لیکن چونکہ انھون نے اپنے عہد مین وہ شہرت اور عروج حاصل کیا جو اس سے پیشتر اس مشہور خاندان کے کسی رکن کو حاصل نہ ہوا تھا اس لیے عام طور پر انھین کا نام سالار جنگ اول یا سالار جنگ اعظم پڑ گیا۔

اس جگہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس دانا اور نامور مدبر کے واقعات زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔ سر سالار جنگ اعظم ۱۲۴۴ ہجری مطابق ۱۸۲۹ء مین پیدا ہوئے تھے۔ ابھی بچے ہی تھے کہ تپ محرقہ مین مبتلا ہوئے۔ اس موقع پر ان کے دادا منیر الملک ثالث نے جو اس زمانہ مین ریاست حیدرآباد کے وزیر اعظم تھے ان پر سے صدقہ اُتارا اور دعا کی کہ ان کی تکلیف مجھ مین منتقل ہو جائے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس روز سے ان کا مرض بتدریج کم ہونے لگا اور ان کے جد منیر الملک ثالث نے چند ہی یوم بعد رحلت کی۔

منیر الملک کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے سراج الملک اپنے خاندانی اعزاز کے مالک ہوئے۔ یہ سالار جنگ اعظم کے حقیقی چچا تھے چونکہ سالار جنگ بچپن ہی مین ایک حد درجہ کے خوفناک مرض مین مبتلا رہ چکے تھے اس لیے ان کی جسمانی حالت کمزور تھی اور اس وجہ سے ۱۳ - سال کی عمر تک ان کی تعلیم باقاعدہ اور مسلسل طور پر جاری رکھی گئی نواب سراج الملک نے ۲۷- مئی ۱۸۵۳ء کو انتقال کیا اور اس کے صرف پانچ یوم بعد نواب ناصر الدولہ فرمان روائے دکن نے سالار جنگ کو باوجود ان کی صغر سنی کے عہدۂ وزارت پر مامور کیا۔ اس وقت نواب سالار جنگ کی عمر بمشکل ۲۳ - سال کی ہوگی۔

اس صغر سنی مین جب کہ تجربہ بہت ہی کم حاصل تھا اتنا وسیع بار کندھون پر آ پڑنے سے اگر کوئی شخص اُن سے کم استقلال رکھنے والا ہوتا تو یقیناً مضطرب ہو جاتا لیکن ان کی ہمت بہت بلند تھی اور عزم و استقلال اُن کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ جن لوگون نے ان کے تقرر کی اس خیال سے حامی بھری تھی کہ ان کے زمانہ مین من مانی کارروائیان کر سکین گے انھین بہت جلد اپنی غلطی معلوم ہو گئی۔ انھون نے اپنی زندگی مین جسقدر نمایان کامیابی حاصل کی اس کا راز ایک انگریزی اخبار نے آشکار کر دیا ہے:-

وہ حد درجہ کے صابر اور مستقل مزاج تھے۔ انتہائی کارروائیون سے انھین ہمیشہ سے نفرت تھی۔ جہانتک ممکن ہوتا صلح اور آشتی سے کام لینے کی وہ کوشش کرتے وہ اپنے مخالفون کو بڑی خوبی سے لاجواب کر دیتے تھے اور انھین اصلاحات سے بوجہ ان کی جدت کے کسی قسم کی نفرت تھی ۱۸۵۷ء تک جب کہ ہندوستان مین غدر پھیلا ہے وہ لگاتار ایک مناسب سلسلہ کے ساتھ اپنی ریاست مین اصلاحات عمل مین لاتے رہے اور زمانہ غدر مین ہر چند کہ حضور نظام اور سالار جنگ کی جانون کے لیے حد درجہ کا خطرہ بتایا گیا تھا تاہم آخر دم تک وفادار اور مستقل مزاج رہے۔ اس موقع پر نظام دکن نے جو قابل ستایش خدمات انجام دین انھین کی بنا پر گورنمنٹ آف انڈیا نے ان کی نسبت "ہمارا وفادار معاون" کے الفاظ استعمال کیے تھے۔

ریاست کے باشندون کو سالار جنگ اعظم سے جس قدر عقیدت تھی اس کا اظہار بخوبی طور پر قابل یادگار ۸- فروری ۱۸۸۳ء کو ہوا تھا جب کہ سر سالار جنگ نے ہیضہ سے انتقال کیا۔ اس دن بقول ایک انگریزی

ہمعصر کے ،، شہر حیدر آباد دودن کا شہر نظر آتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر کس و ناکس پر کوئی ناگہانی اور غیر متوقع آفت نازل ہو گئی ہے،،

سر سالار جنگ اعظم کے دو بیٹے تھے۔ نواب میر لائق علی خان سالار جنگ اور نواب میر سعادت علی خان منیر الملک۔ میر لائق علی خان نے جو سالار جنگ ثانی کے نام سے مشہور ہوئے پہلے پرائیویٹ طور پر اور بعد مین نظام کالج مین بخوبی تعلیم حاصل کی اور آخر کار اسی جگہ سے امتحان میٹرک پاس کیا۔ ذہانت اور قابلیت انھین بہت بڑی حد تک اپنے روشن خیال والد سالار جنگ اعظم سے ورثہ مین ملی تھی اور وہ ہر کام کو بڑی محنت اور استقلال سے انجام دیا کرتے تھے۔ ۱۸۸۲ء مین دونون بھائی انگلستان کی سیر کے لیے تشریف لے گئے جہان ہز رائیل ہائنس پرنس لیوپولڈ ہز رائل ہائنس پرنس میری آف ٹیک مارکوئیس آف بیالسبری، ڈیوک آف سدرلینڈ۔ لارڈ میئر آف لندن وشہنشاہ ایڈورڈ ہفتم ملکہ الگزنڈرا سے جو اس زمانہ مین پرنس و پرنسس آف ویلز تھے شرف ملاقات حاصل ہوا۔

۱۸۸۴ء مین جب حضور نظام غفران مکان کامل اختیارات کے ساتھ گدی نشین ہوئے تو نواب سالار جنگ کو وزارت کا خلعت عطا ہوا بعض وجوہ سے جن کے اعادہ کی اس جگہ ضرورت نہین وہ ۱۸۸۷ء مین اپنے عہدہ سے مستعفی ہو گئے اور بغرض سیر و سیاحت انگلستان تشریف لے گئے جہان ہز مجسٹی ملکہ معظمہ وکٹوریہ مرحومہ نے آسبورن مین انھین کے۔ سی آئی ای کا نشان عطا کیا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ۱۳۰۶ ہجری مطابق ۱۸۸۹ء مین انھون نے بمقام پونا جہان وہ تفریحاً مقیم تھے بیوقت انتقال کیا۔

جس وقت نواب سالار جنگ ثانی نے رحلت کی ہے تو نواب میر یوسف علی خان بہادر کی عمر جو اب سالار جنگ ثالث کے خطاب سے وزارت حیدر آباد دکن پر مامور کیے گئے ہین صرف ۲۴ دن کی تھی کیونکہ ان کا یوم پیدائش ۲۴۔ شوال ۱۳۰۶ ہجری مطابق ۱۴ جون ۱۸۸۹ء تھا۔ اپنے جد بزرگوار کی طرح ان کی جسمانی صحت بھی یوم اول سے نازک ہی رہی ہے یہانتک کہ ابتدا مین کچھ مدت تک ان کی صحت کے متعلق سخت فکر لگی رہتی تھی لیکن جسمانی تربیت کی طرف پوری توجہ دینے سے اسقدر ہوا ہے کہ گو شکل وصورت مین بدستور دبلے پتلے ہین تاہم ان کی صحت خدا کے فضل سے بہت اچھی حالت مین ہے۔ وہ ایک سے زیادہ باتون مین اپنے جد نامور سر سالار جنگ سے مشابہت رکھتے ہین۔ آخر الذکر کی صحت بھی ۲۶ سال کی عمر کے بعد ہی اچھی حالت مین ہوئی تھی۔ بچپن مین انھین بہت سے حادثات پیش آچکے ہین لیکن فضل ایزدی کے شامل حال ہونے سے وہ ہر حالت مین محفوظ و مصئون رہے ان کی عمر ابھی صرف پانچ سال کی تھی کہ پانی مین غرق ہونے سے بچے۔ اس کے بعد ۱۳ سال کی عمر مین گھوڑے پر سے گر پڑے اور ان کے بائین بازو مین سخت چوٹ آئی ۱۶ سال کی عمر مین فٹ بال کھیلتے ہوئے دائین بازو کی ہڈی پر چوٹ آئی۔ اس کے دو ہی سال بعد پولو کے میدان مین ان کا گھوڑا ان پر لڑھک پڑا اور اگر اتفاق سے وہ نشیب زمین پر نہ گرتے تو شاید خدانخواستہ مہلک چوٹین لگتین۔ شروع ہی سے اس بات کا بڑی سختی سے خیال رکھا گیا تھا کہ ان کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے والے صرف اعلی سوسائٹی اور ارفع خیالات کے لوگ ہون اور اسی وجہ سے ان کی طبیعت مین وہ تمام محاسن اور خوبیان پائی جاتی ہین جن کا کوئی شخص ایک ایسے نامور خاندان کے رکن مین متوقع ہو سکتا ہے۔

چھوٹی ہی عمر مین انھین مدرسہ عالیہ مین داخل کر دیا گیا اور حضور نظام غفران مکان نے ان کی پرائیویٹ تربیت کے لیے بھی قابل اتالیق مقرر کر دیے۔ جب انھون نے ہائی اسکول مین اپنی تعلیم ختم کر لی تو ہز ہائنس نے اس دوراندیشی سے کام لیکر جو ان کا خاصہ تھا یہ انتظام فرمایا کہ انکی تعلیم خاص خاص لائینون پر ہو۔ چنانچہ انھین تاریخ، سیاست مدن، قانون، اور السنہ انگریزی کی تعلیم دی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی فارسی کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا حتی کہ آخر کار وہ اعلی ترین انگریزی

سوسائیٹی مین حصہ لینے کے قابل ہو گئے۔ اسکول مین وہ بڑے ہونہار طالب علم سمجھے جاتے تھے اور اسکول کے پرنسپل مسٹر اسٹین نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اگر ان کی صحت اچھی حالت مین رہے تو وہ ۱۹ سال کی عمر مین ڈگری حاصل کر سکتے ہین۔ ایک موقع پر مسٹر اسبرج نے جو نظام کالج کے پرنسپل تھے ان کی نسبت فرمایا تھا کہ

مدرسہ کے لڑکون کے لیے جو خوبیان ضروری ہین مثلاً باقاعدہ حاضری اپنے کام پر توجہ، استادون، اور اپنے ہم سبق طلبہ کے ساتھ متواضعانہ برتاؤ ان سب باتون مین وہ دوسرے طلبا کے لیے ایک بیش بہا نمونہ تھے۔ اسکی تقلید دوسرے لڑکون نے کی مگر وہ اسمین عہدہ برآ نہ ہو سکے۔

سنہ ۱۹۰۱ء مین انھین ایک دم چوتھی سے چھٹی جماعت مین کر دیا گیا او گو اکثر حالتون مین ایسے موقعون پر طلبہ اپنے آپ کو اس قسم کی غیر معمولی ترقی کے ناقابل ثابت کرتے ہین تاہم انھون نے بہت جلد اپنے آپ کو ہر مضمون مین نمبر اول پر ثابت کر دکھایا۔ صاحب پرنسپل انھین غیر معمولی طور پر ذہین طالب علم سمجھتے رہے اور ان کا خیال تھا کہ وہ ملک کے بہترین طلبا مین شمار ہو سکتے ہین۔ وہ استقلال اور مستعدی جو ان کے جد بزرگوار کی خصوصیت تھی ان کے اندر زمانہ طالب علمی ہی مین نمایان تھی

نواب سالار جنگ ثالث کے اخلاق و اطوار ہر پہلو سے حمیدہ و پسندیدہ اور ہر طبقہ مین مقبول اور طمانیت بخش پائے جاتے ہین حضور نظام خلد اللہ ملکہ کی سالگرہ مبارک کی تقریب مین ایوان شاہی مین پچھلے دنون جو ڈنر تھا اس موقع پر کرنل پنھے (رزیڈنٹ) نے نواب سالار جنگ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے "بے داغ چال چلن" کے الفاظ خصوصیت سے استعمال کیے تھے۔ ۱۰۔ سال ہی کی عمر مین ان کے اطوار ایک مسلمہ جنٹلمین کے سے ہوا کرتے تھے۔

پرائیویٹ زندگی مین نواب موصوف فطرتاً شرمیلے اور اطوار مین بیحد سادگی پسند ہین ورزشی کھیلون مین انھین کرکٹ، فٹ بال، ٹینس، پولو، اور نیزہ بازی کا شوق ہے۔ مصوری اور فنون لطیفہ سے بھی دلچسپی رکھتے ہین۔

سنہ ۱۹۱۲ء مین نواب سالار جنگ نے مالی اور عدالتی کامون کی تعلیم حاصل کرنی شروع کی اور بہت جلد مہارت تامہ حاصل کر لی۔ ۱۷ جمادی الاول ۱۳۳۱ ہجری (مطابق ۱۹۱۳ء) کو حضور نظام آن جہانی نے انھین خطابات خان بہادر و سالار جنگ سے ممتاز فرمایا تھا۔ اب سات آٹھ ماہ کا عرصہ گذرتا ہے کہ ان کی جاگیرات پر سے سرکاری نگرانی ہٹالی گئی ہے اور وہ اپنے علاقہ کا انتظام خود ہی کرتے ہین۔

نواب سالار جنگ کی جاگیرات بہت بڑی یعنی پدوکوٹہ یا کوچین سے بھی وسیع ہین۔ وہ چھ تعلقات پر مشتمل ہین اور ان کا مجموعی رقبہ ایک ہزار چار سو اسی میل مربع ہے اور سالانہ آمدنی کم و بیش ۱۰۔ لاکھ خیال کی جاتی ہے۔ ان جاگیرات کی مردم شماری ۲۔ لاکھ ہے اور ان مین بہت سے تاریخی دلچسپی کے مقامات مثلاً قلعہ کوسگی اور کوپال اور مشہور و معروف غارہائے اجنٹا واقع ہین۔

یہ بات قبل ازین بیان کی جا چکی ہے کہ وزارت حیدر آباد اس خاندان کا خاصہ اور حق ہے۔ لیکن اس بارے مین مسٹر راجا رام نے رسالہ "انڈین ریویو" مین ایک دلچسپ پوائنٹ کی طرف ناظرین کی توجہ منعطف کرائی ہے کہ

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ اس خاندان مین دادا ۲۴۔ باپ ۲۱۔ اور بیٹا ۲۳۔ سال کی عمر مین منصب وزارت پر مامور ہوا۔

نواب موصوف کی روشن خیالی اور عملی قابلیتون کے ثبوت ابتدا ہی سے ملتے رہے ہین وہ ملکی اور قومی تحریکون مین اچھی طرح دلچسپی لیتے ہین اور پچھلے دنون مسلم یونیورسٹی فنڈ کو ایک لاکھ کی گران قدر رقم عطا فرما کر اسکی ایک روشن مثال قائم کر چکے ہین۔

نواب سالار جنگ ثالث ایک فخر روزگار خاندان کے نامور رکن ہین،

ان مین وہ تمام خوبیان پائی جاتی ہین جو کسی اعلے درجہ کے منتظم اور مدبر مین پائی جا سکتی ہین اس حالت مین یہ توقع کسی طرح پر خارج از امکان یا بعید از قیاس نہین سمجھی جا سکتی کہ وہ اپنے فخر زمان بزرگون کے مایۂ ناز جانشین ثابت ہون گے۔

حفظ صحت اور علاج

اپنی زندگی مین انسان سب سے اچھی اور نہایت قیمتی شے کی خواہش کر سکتا ہے وہ صحت ہے۔ ممکن ہے کہ ایک شخص کے پاس پہاڑون کے برابر دولت ہو، اصطبل مین بیشمار گھوڑے اور گاڑیان ہون۔ اچھا کھانا کھانے کو ملتا ہو اور نرم گدون پر سوتا ہو۔ لیکن اگر اسے صحت حاصل نہین تو یہ سب چیزین ہیچ ہین۔ باوجود ان تمام اور اس قسم کی اور صدہا آسائشون کے وہ رات کو اچھی طرح سو نہین سکتا۔ بخلاف اس کے مقابلہ مین ایک غریب مزدور جو روز کماتا اور کھا لیتا ہے وہ مزے کی نیند سوتا اور اپنے کنبہ مین خوش رہتا ہے۔ چونکہ اسکی جسمانی صحت اچھی ہے اس لیے لیٹتے ہی نیند خود بخود اسکی آنکھون مین آ بستی ہے۔ اگلے روز جب وہ صبح کو بیدار ہوتا ہے تو نیند کی بدولت تازہ دم ہو چکا ہے اور خوشی خوشی اپنے دن بھر کے کام مین مصروف ہو جاتا ہے۔ بتاؤ ان دونون مین حقیقی راحت کسے حاصل ہے؟ میرا خیال ہے کہ دولتمند کا بس چلے تو وہ اپنی دولت کا کچھ حصہ دیکر غریب مزدور سے اسکی صحت کا کچھ حصہ لینے مین ہرگز دریغ نہ کریگا بلکہ اپنے نفع کا سودا سمجھے گا لیکن ایسا ہونا بعید از امکان ہے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ دولتمند اس غریب کی سادہ اور ناکافی غذا کھانا گوارا کریگا جسے وہ دیکھنا تک نہین چاہتا یا اس کے برابر پیدل چلنا یا کام کرنا پسند کریگا؟ ہرگز نہین! اس صورت مین غریب آدمی کا اسے یہ جواب دینا بالکل بنا بر انصاف ہے کہ "صاحب تمھارا میری حالت پر رشک کرنا فضول ہے جب تک تم عیش و عشرت اور کاہلی کی زندگی بسر کرتے رہوگے صحت کا دروازہ تم پر بند رہے گا۔ رات کے وقت تم اپنے بستر پر بے خوابی کے عالم مین لیٹا کروگے اور صبح کے وقت جب بیدار ہوگے تو طبیعت خوش ہونے کے بجائے کسلمند ہوگی"۔

صحت قدرت کا انعام ہے۔ مول نہین بکتی اور نہ مانگے سے ملتی ہے تم اسے قایم رکھنا اور اس مین اصلاح پیدا کرنا چاہو تو صرف تھوڑی سی سمجھ اور دوراندیشی کی ضرورت ہے۔ قوانین قدرت کی پابندی کرو تو وہ بھی ضرور تمھاری مدد کریگی۔ لیکن اگر تم اس کے قاعدہ سے ذرا بھی انحراف کرو تو وہ تمھین صحت کے بجائے بیماری دیگی بلکہ ممکن ہے کہ تمھاری موت قبل از وقت ہو۔ قدرت کا قانون اٹل ہے۔ زمانے گذر جائین سلطنتون مین انقلاب آجائے۔ قومین پلٹ جائین، مگر اس کے قاعدون مین فرق نہین آتا۔ جن لوگون کے دماغ مین فتور آجاتا ہے یا جن کی ذہنی حالت کمزور ہوتی ہے لوگ انھین پاگل کہنے لگتے ہین۔ بیوقوف لوگ! انھین تو وہ پاگل کہتے ہین مگر ان کو نہین کہتے جو خود قوانین قدرت کے انحراف سے بیماری اور موت مول لیتے ہین۔ اگر تم دماغی فتور والے شخص کو پاگل اور دیوانہ کہتے ہو تو اس سے کیون ہمدردی اور رحم کا اظہار کرتے ہو جسنے اپنے ہاتھون بیماری سہیڑ کر ڈاکٹر یا طبیب کی تلاش شروع کی ہے۔ مغرور انسان! جسے اپنی تہذیب اور تمدن پر اسقدر گھمنڈ ہے کس لیے اپنے بناؤ سنگھار اور اچھی اور خوشنما پوشش پر اسقدر توجہ دیتا اور اسقدر وقت صرف کرتا ہے جب کہ وہ ان بیشمار سامان کو جو قدرت نے اس کے جسم مین غلاظت اور کثافت کے نکاس کے لیے مہیا کر رکھے ہین صاف نہین رکھتا! کس لیے وہ چٹپٹے اور لذیذ کھانون کی دھن مین چٹورا بنا پھرتا ہے جب کہ اس کے جسم کو اچھی حالت مین رکھنے کے لیے صرف تھوڑی سی سادی غذا درکار ہے

وہ بھیڑون مین جاکر روپیہ ضائع کرتا ہے۔ وہان سے راحت نصیب نہین ہوسکتی وہ ہواسپہ گاڑی مین بیٹھکر خوشنما نظارون کی سیر دیکھنے جاتا ہے اس سے اسے آرام مہیا نہین ہوسکتا!

قوانین قدرت کی پابندی سے صحت کو برقرار رکھنے کے علم کو ہم (حفظ صحت) کہتے ہین مختصر طور پر ہم اسے ایک ایسا سائینس قرار دے سکتے ہین جو ہمین برقراری صحت اور دفعیہ امراض کا راستہ دکھاتا ہے۔

ہمین اس جگہ یہ دیکھنا ہے کہ علم حفظ صحت کا علاج سے کیا تعلق ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ حفظ صحت کے اصول ہی علاج کی تہ مین نظر آتے ہین۔ تم مریض کے پیٹ مین جا ہے جتنی دوائین ٹھونس دو اگر اصول حفظ صحت پر توجہ نہ دوگے تو مریض کی صحت سے اور شفایابی سے ہاتھ دھو رکھو۔ فی الحقیقت حفظ صحت کے مقابلہ مین علاج کی کچھ بھی حقیقت نہین ہے۔ مزا یہ ہے کہ حفظ صحت کے اصول اور اس کے لوازم بالکل سادہ اور آسان ہین۔ اس کے واسطے جن تین چیزون کی ضرورت ہے وہ صاف ہوا، صاف پانی، اور کافی روشنی ہین اگر یہ چیزین مہیا ہین تو اول تو مرض نمودار ہی نہ ہوگا اور جو ہوگا بھی تو آسانی سے دور کیا جاسکے گا۔ ایک وقت تھا جب ہر ایک مرض کے لیے لوگ فصد لیا کرتے تھے۔ اسی طرح اب لوگ اطبا کے پاس اس غرض سے دوڑے جاتے ہین کہ ان سے کھانے کی کوئی دوا لے آئین۔ فصد لینے کے پرانے طریقہ مین مریض کو اخراج خون اور بیماری دونون کی زحمت گوارا کرنی پڑتی تھی۔ اگر مریض بچ جاتا تو جراح کو نہایت قابل اور ماہر تصور کیا جاتا تھا۔ اگر مرجاتا تو اسے خدا کی مرضی پر محمول کیا جاتا۔ یہی بات زمانہ موجودہ کے طریق علاج پر بھی صادق آتی ہے۔ مریض کو مرض کی تکلیف، اور دوا پینے کی دقت دونون باتین برداشت کرنی پڑتی ہین طبیب کا کام اسی قدر ہے۔ بچ گیا تو مریض کی خوش نصیبی اور مرگیا تو طبیب کی بلا سے۔

لوگون مین ایک عام اعتقاد یہ بھی پھیلا ہوا ہے کہ ہر مرض کا علاج صرف دوا ہی سے ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر ہم غور کرین تو معلوم ہوگا کہ کثیر التعداد حالتون مین ایسا نہین ہوتا۔ اب سے چند صدی پیشتر لوگ نشتر پر اتنا ہی اعتقاد رکھتے تھے جتنا آجکل دوا پر رکھتے ہین۔ امریکہ کے بہت سے بڑے بڑے ڈاکٹرون کا خیال ہے کہ مہذب ممالک مین دوا کے استعمال کا جو رواج پایا جاتا ہے وہ درحقیقت نشتر کے استعمال کا نعم البدل ہے لیکن ان کے نقطۂ خیال سے یہ بدل کچھ اچھا نہین۔ اگر قیمتی اور عمدہ دوائین ہی انسان کو بچا سکین تو امیرون مین کبھی موت ہی واقع نہ ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ جسنے اصول حفظ صحت کی پابندی نہ کی اسنے اگر قیمتی سے قیمتی دوائین بھی کھائین تو بے سود۔ اگر اسنے قبل از وقت موت حاصل نہ کی تو یقیناً مرکبر تکلیف تو ضرور اٹھائی ہوگی۔

بہت سے لوگ یہ دیکھکر حیران ہوا کرتے ہین کہ ایک شخص کی صحت اور طاقت دوسرے سے اچھی کیون ہے! اسکا جواب سادہ ہے صرف اس لیے کہ ان مین سے ایک تو قوانین قدرت کا پابند ہے دوسرا نہین۔ مہذب اور ترقی یافتہ ملکون مین آجکل ڈاکٹر مریض کو فوراً ہی دوا دینا شروع نہین کردیتے بلکہ کافی غور و پرداخت کے بعد قدرت کو مدد دیکر مرض کے بواعث کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہین۔ ان ڈاکٹرون کی دوائین صاف ہوا، صاف پانی، اور روشنی، بس یہی تین چیزین ہین۔ دوا کے استعمال سے انسان کو صحت حاصل بھی ہوجائے تو وہ مکمل صحت نہین کہلا سکتی۔ ایک زہر کو دور کرنے کے لیے دوسرا زہر جسم مین داخل کیا جاتا ہے گو ممکن ہے کہ اس زہر کا اثر بعد مین اور بھی خراب ثابت ہو۔ بخلاف اس کے علم حفظ صحت کی رو سے جس مرض کا علاج ہو اسے بیخ و بنیاد ہی سے دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مریض کے پیٹ مین دوائین نہین ٹھونسی جاتین۔ ایک امریکن شاعر نے لکھا ہے

Joy and Temperance and Repose,

Slam the door on the doctor's nose.

مطلب یہ کہ راحت، اعتدال اور آرام یہ چیزیں ڈاکٹر کے لیے دروازہ بند کر دیتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ مرض کیا ہے اور اسے کیونکر دور کیا جا سکتا ہے؟ ڈاکٹر جیمز ولسن نے لکھا ہے:-

بیماری وہ سزا ہے جو قدرت ہمیں خلاف ورزی قانون کے لیے دیتی ہے اس سزایابی کے معاملہ میں کوئی شخص اس عذر پر بچ نہیں سکتا کہ وہ اس قانون سے واقف نہ تھا

ہر ایک کاشتکار جانتا ہے کہ کھیتوں کی کاشت کے لیے کونسا موسم موزون ہے؟ وہ خوب اچھی طرح سمجھتا ہے کہ کب مجھے قلبہ رانی کرنا کھاد ڈالنا اور بیج بونا چاہیے۔ اس پر بھی اگر وہ وقت پر فصل کو پانی سے سینچے یا دوسرے طریقوں پر اس کی حفاظت نہ کرے تو یقیناً فصل ماری جائیگی۔ یہی حال انسانی جسم کی کاون کا ہے۔ وہ بیوقوف ہے جو نہیں جانتا کہ اسے صاف ہوا میں سانس لینا صاف پانی پینا، اور اچھا قابل ہضم کھانا کھانا چاہیے۔ انسان کو سردی اور گرمی سے بچنا اور امراض کے بواعث کو دور کرنا لازم ہے۔

ڈاکٹر ولسن کا یہ بھی بیان ہے کہ قریب قریب ان تمام امراض کو جو انسانی زندگی کا سلسلہ منقطع کرتے ہیں یا اسے کم کرتے ہیں کھانے کی نالی سے تعلق ہوتا ہے اس نالی ہی کی صفائی کے ذریعہ سے امراض کو دور کرکے مریض کو شفایاب، اور راحت اور طویل العمری کو بحال کیا جا سکتا ہے۔

اسقدر تمہید کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصول حفظ صحت بیان کیے جائیں اور بتایا جائے کہ امراض کو کیونکر روکا اور صحت کو برقرار رکھا جا سکتا ہے؟

(۱) خالص ہوا کی ضرورت | کثیف ہوا کے نقصانات بیشمار ہیں اور اس سے صدہا بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ کلکتہ کا سانحہ کلبۂ تاریک اس تاریخ پر ثبت ہے۔ پس ہمیں سب سے اول اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ گھروں میں پاک وصاف ہوا کی بخوبی آمدورفت ہو۔

(۲) پاک وصاف پانی | بہت سے امراض پانی کے راستہ جسم میں داخل ہوتے ہیں جن میں سے قابل ذکر یہ ہیں تپ نوبتی، اطال اسہال پیچش، قبض، وغیرہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ ہیضہ، تپ محرقہ، چیچک وغیرہ متعدی امراض بھی پانی ہی کے ذریعہ سے پھیلتے ہیں

بہت سے لوگ ان تالابوں سے جن میں آدمی نہاتے کپڑے دھوتے یا مویشی پانی پیتے ہیں یا ایسے کنوؤں سے جن میں چہ بچوں کا گندہ پانی ملتا رہتا ہے پانی پینے پر مجبور ہوتے ہیں، اس حالت میں انھیں لازم ہے کہ پانی کو جوش دیکر اور پھر سرد کرکے پئیں۔ جوش دینے سے نہ صرف بہت سی کثافتیں دور ہو جائیں گی بلکہ جو باقی بچ رہیں گی وہ بھی تہ پر بیٹھ جائیں گی۔

(۳) روشنی | جو شخص تاریکی میں رہنے کا عادی ہو وہ یقیناً امراض کا شکار ہوتا رہے گا۔ ضروری ہے کہ دن میں کم از کم ایک گھنٹہ بدن کو دھوپ میں کھلا رکھا جائے اس سے یہ مطلب نہیں کہ انسان چلچلاتی دھوپ میں چل کر لو لگنے سے بیمار ہو جائے بلکہ مراد صرف یہ ہے کہ بدن کو روشنی میں لایا جائے۔

تمام جسم کو براہ راست گرمی لگنے سے بچانا نہایت ضروری ہے۔ ممکن ہے اس سے بخار یا دم گھٹنے کی حالت پیدا ہو جائے تیز دھوپ میں چلتے وقت سر کو ہلکی ٹوپی یا پگڑی سے محفوظ رکھنا ضروری ہے کپڑوں کے اندر فلالین کا کرتا اور سایہ کے لیے چھاتہ ہاتھ میں رکھا جائے۔

(۴) مسکرات | الکحل، تمباکو، اور افیون نے بہت سے لوگوں کو صحت سے محروم کر دیا ہے۔ سیکڑوں ان چیزوں کی بدولت طاقت اور ہوش وحواس کھو بیٹھے ہیں۔ ان سب چیزوں سے حتی الامکان احتراز ہی واجب ہے۔

(۵) غذا | غذا جہانتک ممکن ہو سادہ ہونی چاہیے۔ ہندوستان ایسے روحانیت کے ملک مین سبزی خوری ہی بہترین غذا سمجھی جاسکتی ہے ایک ہی وقت مین بہت سا کھانا ٹھیک نہین نہ یہ کہ بہت سی چیزون کو ملا کر پکایا جائے۔ غذا جسقدر سادہ ہوگی اسی قدر جلد ہضم ہوسکے گی۔ جلد جلد کھانا کھانے کی عادت نہ ڈالو بلکہ خوب اچھی طرح چبا چبا کر کھاو۔

(۶) غسل | روزمرہ کا غسل سب سے بہتر چیز ہے۔ اس سے نہ صرف بدن کا میل دور ہو کر مسامات صاف ہوتے ہین بلکہ جسم مین طاقت اور توانائی آتی ہے اور نظام جسمانی موسم کے اثرات بد سے محفوظ رہتا ہے۔ پانی کا گرم شیر گرم یا سرد ہونا نہانے والے کے مزاج پر موقوف ہے۔

(۷) پوشش | کپڑے صاف اور سادہ ہون۔ ہندوستانی لباس ہمارے بالکل موافق ہے۔ کپڑون مین فلالین بہت اچھی چیز ہے۔

(۸) ورزش | برقراری صحت کے لیے مناسب ورزش کرنا بھی ضروری ہے۔ جو لوگ باقاعدہ ورزش کرتے ہین ان کی صحت سب سے اچھی رہتی ہے۔ معدہ کی باقاعدگی، دوران خون، جگر کی کارکردگی ان سب باتون کا دارومدار ورزش پر ہے۔ پیدل چلنا، زین سواری پیراکی، ٹینس، کرکٹ کھیلنا، بائیسکل کی سواری، یہ سب ورزش مین داخل ہین۔ خواہ کسی قسم کی ورزش کی جائے وہ اپنی حد سے زیادہ نہ ہونی چاہیے کیونکہ تکان پیدا کرنے والی ورزش بجائے فائدہ مند ہونے کے مضرات ہوتی ہے

(۹) رہائشی مکان | مکانات کی کرسی آس پاس کی زمین سے چند فٹ اونچی ہونی چاہیے تاکہ مکان زمین کی نمی سے محفوظ رہین اور ان مین سانپ وغیرہ زہریلے جانور داخل نہ ہوسکین۔ مکان کے کمرے بڑے اور کھلے ہونے چاہیین دیوارین ۱۲۔ یا ۱۵۔ فٹ بلند ہون اور کھڑکیان اور دروازے بکثرت رکھے جائین۔ صرف اسی حالت مین ہوا کی آمد و رفت اچھی طرح قائم رہ سکے گی۔ کمرون کو باقاعدگی سے دھوتے اور صاف کرتے رہنا چاہیے اور کوڑے کرکٹ کو تالاب یا کنوئین مین ڈالنے کے بجائے ایک جگہ جمع کر کے جلا دینا چاہیے۔ شاگرد پیشہ اور پاخانے مکان سے فاصلہ پر ہون اور ان کو وقتاً فوقتاً جراثیم کش ادویہ سے صاف کرتے رہنا چاہیے

(۱۰) جذبات پر قابو پانا | تمام خواہشات اور جذبات مین اعتدال کو مدنظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اسی طرح کھانے پینے، کاروبار یا خوشی مین، حد سے زیادہ جوش مین آنا بھی صحت کے لیے نہایت ضرر رسان ہے۔

اخیر مین یہ جتلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میرا منشا ہرگز یہ نہین کہ دوا کا استعمال بالکل ترک کر دیا جائے یا یہ کہ دواؤن مین مطلق کسی قسم کا فائدہ نہین ہوتا۔ فی الحقیقت دوسرے تمام علوم کی طرح علم الادویہ مین بھی ترقی ہو رہی ہے اور فن جراحی کی بدولت حیرت خیز معجزات ظہور مین آرہے ہین لیکن اس مین شک نہین کہ قوانین متذکرہ بالا کی پابندی استعمال ادویہ سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ اس بارے مین ہر شخص مجھ سے متفق الرائے ہوگا کہ دوا کے بغیر علاج کرنا استعمال ادویہ سے بدرجہا بہتر ہے اور جو بات خاص طور پر قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ جن قواعد کی پابندی درکار ہے وہ نہایت سادہ، عام فہم اور سہل ہین ۔

تیرتھ رام

رازداری

واضح ہو کہ جب یکبار کوئی بات تمسے راز کے طور پر کہدی گئی تو ہر طرح سے اُسکا مخفی رکھنا تمھارا فرض ہی۔ جو راز کسی نے تمکو اپنا دوست سمجھکر کہا ہو وہ اِس اعتبار پر کہا ہی کہ تم اُسے عام نہونے دوگے۔ بہت سی باتین جو تمھارا دوست کسی خاص تکلیف یا غصّہ کی حالت مین یا کسی اور طرح سے دلکی بھڑاس نکالنے کے لیئے تمسے کہتا ہی مخفی رکھنے کے قابل ہین۔ تمھاری ہمدردی کے بھروسے پر اُسنے تمسے اسقدر صفائی سے گفتگو کی گویا تم اُسکا دل اُسکا ضمیر ہو۔

آپس کی گفتگو مین جو کچھ تم سنتے ہو اُسکو دوسری جگہ کہنا اکثر ایک افسوسناک افشائے راز ہوتا ہی۔ اسے اگر پیمان شکنی نہین تو نادانی ضرور کہینگے۔ بات یہ ہی کہ جب کوئی سنی ہوئی بات کہوگے تو تم اُسے تمام وکمال تو کہہ نہین سکتے ہر حال اُسکا کچھ حصہ ہی کہکر رہ جاوگے۔ بفرض محال تمنے اُس خاص حصے کو نہایت عمدہ اور صاف پیرایہ مین ادا بھی کیا تو بھی ممکن ہی کہ اُسکے معنی اور مفہوم مین فرق آجائے جسطرح کسی خاص زبان کا بامعنی لفظ اپنے قریب کے الفاظ اور فقرون سے جدا ہوکر اگر بے معنی نہین ہو سکتا تو اُسکے معنی مطالب مین فرق ضرور پیدا ہو سکتا ہی۔

معمولی سے معمولی عام سے عام گفتگو مین بھی چند باتین ایسی ہوتی ہین جو مخفی رکھی جانیکے قابل ہین۔ علاوہ اُن باتونکے جو بالخصوص راز کے طور پر کہی جاتی ہین ایسی باتین بھی ہوتی ہین جو چھپانے کے قابل ہین گو راز نہین کہلاتین۔ مثلاً کسی شخص نے کوئی بات ایک خاص مجمع مین کہی کسیکو اُسنے خاص طور سے رازدار نہین بنایا مگر اُسکا مدعا یہ ہی کہ وہ بات اُس مجمع کے باہر نہ جائے۔ ایسی حالت مین یہ خیال پہلے ہی سے کر لیا جاتا ہی کہ جو صحاب وہان موجود ہین وہ بے کہے بھی اِس مدعا کو سمجھتے ہین کسی سنی ہوئی بات کو بالعموم لوگونسے کہتے پھرنا گویا اپنے ہاتھ اپنی بے عزتی کرنا ہی اسکے یہ معنی ہوئے کہ جو کچھ اُس سے کہا گیا ہی وہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی سے کہا جا سکتا تھا۔ تو گویا یہ آدمی ایک بہت ہی ادنیٰ اور بے وقار آدمی ٹھہرا اور کوئی شخص دنیا مین یہ پسند نہین کرتا کہ اُسکی وقعت ایک دنی او کم ظرف آدمی کی سی ہو۔

اسکے برخلاف بعض آدمیونمین خواہ مخواہ ہر بات کے چھپانیکی عادت ہوتی ہی۔ اِس سے بحث نہین کہ وہ بات کس پایہ اور کس وقعت کی ہی وہ اُسے چھپائے جائینگے۔ ہر موقع پر اور ہر وقت وہ رازداری کی سخت ذمہ داری سر پر لیئے رہتے ہین اُنکی اِس عادت کی نسبت ملایم سے ملایم الفاظ مین یہی کہا جا سکتا ہی کہ وہ بے ضرورت ہی اکثر یہ عادت طبعی شرمیلے پن اور بزدلی سے پڑجاتی ہی۔ یہ عادت اکثر اُن لوگونمین بھی پائی گئی ہی جنکے امزجہ خاص طور سے تنگی واقع ہوئے ہین۔ کبھی کبھی ایسا بھی دیکھا گیا ہی کہ جب کسی کے راز ایکبار بے ضرورت اور بکثرت فاش ہو گئے اور اِس افشا سے اُسے دلی رنج پہونچا تو یہ بے ضرورت رازداری اُسکی عادت ہو گئی۔ یا یہ کہ احتیاطاً ہی بے ضرورت رازداری کا اُسنے خود کو عادی بنا لیا۔ خواہ اِس عادت کی کچھ ہی وجہ کیون نہو۔ یہ بذات خود ایک تکلیف دہ کمزوری ہی۔

جسطرح بعض لوگ چالاکی اور ہوشیاری کو ایک خاص طرح کی طاقت سمجھتے ہین اسیطرح ایسے لوگ اِس قسم کی رازداری کو دانائی خیال کرتے ہین۔ یہ ضرور سچ ہی کہ جب آدمی کو یہ تمیز نہو کہ کس قسم کے اسرار کا کن اشخاص کو اور کیسے موقع پر رازدار بنانا چاہیئے اُسکے لیے یہی مناسب اور بہتر ہی کہ وہ بالکل ہی خاموش رہے یہی اُسکے لیے سب سے اچھی تدبیر ہی اور اُسے واجب ہی کہ اپنے طرز عمل کو کسی حال مین بدلنے نہ دے۔ ہان اسے دانائی بھی نہ سمجھے۔ یہ ایک فائدہ مند احتیاط ہی دانائی نہین ہی کسی طبیعت مین صاف گوئی کم سخنی اور سنجیدگی کی وہ ترکیب جو واقعی قابل تحسین ہی کوشش سے یا فوائد خاموشی کے پڑھنے سے پیدا نہین ہو سکتی۔ یہ ایک قدرتی بات ہی اور اسے حاصل کرنیکی سعی بے سود ہی۔ جو آدمی فطرتاً معاملات کے سیدھے سادے طریقہ پر کہہ گذرنے اور دوسرونکے جذبات اور احساسات کا پورا پورا لحاظ رکھنے کے عادی ہوتے ہین اُنھین کے طبائع مین

مذکورہ بالا خوبیاں مجتمع پائی جاتی ہیں اور ایسے اشخاص میں یہ تمیز بالکل فطری ہوتی ہے کہ اپنے معاملات میں کتنے اسرار مخفی رکھنے کے قابل ہیں اور کتنے رازداروں سے کہنے کے قابل ہیں اور اسیطرح دوسروں کے معاملات میں کتنے ظاہر کیے جانے کے قابل اور کتنے چھپانے کے قابل ہیں۔ پتھر جسمیں کچھ نہیں دکھائی پڑتا اور وہ دھات جسمیں ہر چیز منعکس ہوجاتی ہے برابر سخت اور بے حس ہیں۔ ایک ضمیر جسکی ہر بات مخفی ہو اور ایک طبیعت جس سے رفقا کا مادہ ہی معدوم ہو برابر ناکارہ ہیں۔

جب کوئی بات عام ہوجاتی ہے تو عموماً یہ بات بہت بری نہیں سمجھی جاتی اور عام طور سے لوگ ایسا کہہ بھی گذرتے ہیں کہ فلاں بات تو مجھے پہلے ہی سے معلوم تھی۔ ممکن ہے کہ یہ کوئی بڑی تقصیر نہ ہو آئین رازداری کے خلاف نہو لیکن یہ تو دیکھو کہ تم ایسے وقت میں اس سے زیادہ افشائے راز کر ہی کیا سکتے ہو۔

اب ہی یہ بات کہ کس قسم کے آدمی قابل اعتبار ہوتے ہیں اور راز کو ان کے طور پر رکھ سکتے ہیں۔

یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ سنجیدہ آدمی جسمیں ذرا خود بینی کی بو بھی ہو نہایت قابل اعتبار لوگ ہوتے ہیں۔ اور اسیطرح وہ اشخاص بھی معتبر ہوتے ہیں جنکو کبھی ایسے معاملات سے سابقہ پڑچکا ہو جنمیں خواہ مخواہ انکو رازداری کرنی پڑی ہو کیونکہ پہلے جس کام کو وہ فرض کے طور پر شروع کرتے ہیں وہی کچھ دنوں بعد انکی عادت ہوجاتی ہے یہ بات صحیح طور پر نہیں کہی جاسکتی کہ کم فہم مغرور کا راز جلدی فاش ہوتا ہے یا بیوقوف کا۔

اکثر لوگوں میں یہ عادت ہوتی ہے کہ اگر وہ کوئی راز جانتے ہیں تو اسکو صاف طور سے تو نہیں کہتے لیکن اسکے متعلق ایسی باتیں کہتے ہیں کہ سامعین میں سے کوئی تیز فہم شخص ضرور اسکو دریافت کرلیتا ہے۔

ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جنسے راز کہنا ہی نہ چاہیئے کیونکہ انسے راز کہنا خطرہ سے خالی نہیں ہوتا۔ اسمیں کئی طرح کے لوگ ہوتے ہیں بعض ایسے ہوتے ہیں کہ کسی خاص راز کو جاننا اپنا اعزاز سمجھتے ہیں اور اسپر فخر کرتے پھرتے ہیں بعض میں رازداری کا مادہ ہی نہیں ہوتا۔ وہ راز کو بیوقوفانہ غلطی سے یکایک افشا کردیتے ہیں بعض ایسے بھی ہیں جو کسی ایسے راز کو دریافت کرکے اس سے بیجا اور ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اور ان سب سے جدا ایک جماعت ایسے لوگوں کی بھی ہے جنکو دنیا کے فراز و نشیب کا کوئی تجربہ نہیں ہے جنکا زمانہ ہمیشہ یکساں موافق رہا ہے ایسے لوگ راز کو اسلیئے نہیں افشا کرتے کہ وہ اس سے واقعی کسیکو نقصان پہنچاویں بلکہ بیچارے سیدھے سادے لوگ جانتے ہی نہیں کہ اسرار کے ظاہر ہوجانے سے کیا کیا نقصانات ممکن ہیں بلکہ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ راز فاش ہوجانے سے واقعی کوئی نقصان ہوسکتا ہے یا نہیں قبل اسکے کہ تم کسیکو اپنا رازدار بناؤ یہ غور کرلینا بہت ضروری ہے کہ جو بات تم کہنا چاہتے ہو وہ واقعی راز ہے یا نہیں اور کیا اسمیں کافی ذمہ داری کی ضرورت ہے اکثر لوگوں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ تھوڑے دنوں تک کسی راز کو مخفی رکھنا گویا رازداری کا پورا پورا حق ادا کرنا ہے ایسے لوگ جب کچھ عرصے تک کسی بات کو چھپا چکتے ہیں تو اسکے افشا کرنے میں انھیں کچھ پس و پیش نہیں ہوتا اور اسمیں کچھ تعجب نہیں اکثر باتیں ایسی ہلکی اور معمولی ہوتی ہیں کہ کچھ عرصے کے بعد ہمکو یاد بھی نہیں رہتا کہ وہ کبھی ہمسے بطور راز کے کہی گئی تھیں

اکثر اپنے عزیز ترین دوست سے بھی بات چھپانیکی ضرورت ہوتی ہے وجہ یہ کہ جب تم کسی خاص بات کے بھولجانیکی کوشش کروگے تو جلد بھول سکوگے اور تمھاری پریشانی جلد ختم ہوجائیگی مگر برعکس اسکے اگر تمنے دوست سے کوئی بات کہدی اور کچھ عرصہ بعد اسکو بھولنا چاہتے ہو تو یہ ممکن ہے کہ تم اسے اپنے دلسے نکال ڈالو لیکن دوسرے کے دلسے اسکا نکالڈالنا خواہ وہ تمھارا عزیز سے عزیز اور سچے سے سچا دوست کیوں نہو آسان نہیں ہے ایسی حالت میں پریشانی کا کانٹا بالکل نہیں نکل جاتا بلکہ وقتاً فوقتاً کھٹکا ہی کرتا ہے۔

یہ تمیز بہت کم لوگوں کو ہوتی ہے کہ کسوقت سکوت اختیار کرنا چاہیئے اور کسوقت نصیحت اور ہمدردی کی باتیں کرنی چاہیئے۔ یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ تم کسیکو بضرورت اپنا رازدار مت بناؤ اور نہ ایسے شخص سے اپنے مخفی اسرار کہو جسکا رازدار ہونا اگر ظاہر ہوجائے تو کسیکا دل دکھے۔

امداد کی تمنا اور ہمدردی کی آرزو یہ باتیں کیسی ہی کیوں نہوں لیکن دوسروں کو خواہ مخواہ اپنی مصیبت کا شریک بنانا عقلمندی کی بات نہیں تلسی داس جی نے کیا اچھا کہا ہے۔

تلسی ہر گھر جائکے دکھ نہ کہیو روئے ۔ آپن بھرم گنوائکے بات نہ پوچھے کوئے

اپنے راز دوسروں سے کہنے میں ایسی ہی ذمہ داری ہے جیسی دوسروں کے راز جاننے اور انکے راز ظاہر کرنے میں

خامشی بہ کہ ضمیر دل خویش ۔ با کسے گفتن و گفتن کہ مگوے

(ترجمہ)

جگت موہن لال

دردِ عشق

اے دردِ عشق! ہے گہرِ آبدار تو   نامحرمون مین دیکھ نہو آشکار تو
پنہان تہِ نقاب تری جلوہ گاہ ہے   ظاہر پرست محفلِ نو کی نگاہ ہے
آئی نئی ہوا چمنِ ہست و بود مین   اے دردِ عشق! اب نہین لذت نمود مین
ہان! خود نمائیون کی تجھے جستجو نہو   منت پذیرِ نالۂ بلبل کا تو نہو
خالی تری شراب سے گلشن کا جام ہو   پانی کی بوند گریۂ شبنم کا نام ہو
پروانہ سوئے شمع نہ قسمت کو روکے آئے   ذوقِ تپش سے بزم مین آزاد ہوکے آئے
پوشیدہ کنجِ دل مین کہین راز ہو ترا   اشکِ جگر گداز نہ غماز ہو ترا
گویا زبانِ شاعرِ رنگین بیان نہو   آوازِ نَے مین شکوۂ فرقت نہان نہو

یہ دور نکتہ چین ہے کہین چھپکے بیٹھ رہ
جس دلمین تو مکین ہے وہین چھپکے بیٹھ رہ

غافل ہے تجھ سے حیرتِ علم آفریدہ دیکھ   جویا نہین تری نگہِ نارسیدہ دیکھ
اس بزم مین کسی کو نہین آرزو تری   موتی ہے تو، ہٹے نہ کہین آبرو تری
رہنے دے جستجو مین خیالِ بلند کو   حیرت مین چھوڑ دیدۂ حکمت پسند کو
جس کی بہار تو ہو یہ ایسا چمن نہین   قابل تری نمود کے یہ انجمن نہین
یہ انجمن ہے کشتۂ نظارۂ مجاز   مقصد تری نگاہ کا خلوت سرائے راز
ہر دل مئے خیال کی مستی سے چور ہے   کچھ اور آجکل کے کلیمون کا طور ہے
محفل یہ مرمٹی ہے شرابِ مجاز پر   ادراک طعنہ زن ہے سرورِ گداز پر
رہبر تو خضرِ فکر ہے اور ذوقِ دید ہے   ہاتھون مین انجمن کے پرانی کلید ہے
نایاب ہوکے اپنی حقیقت دکھا انھین   جو عجز مین نہان ہے وہ رفعت دکھا انھین
فکرِ بلند غرقِ شرابِ غرور ہے   اس بے خبر کو راہ پہ لانا ضرور ہے
طے کرکے آسمان کو جو بے مدعا پھرے   دیوانہ وار تیرا پتہ پوچھتا پھرے

بیتاب پھر جہان ہو ترے اشتیاق مین
گریان ہو چشمِ حسن بھی تیرے فراق مین

اقبال

سحرِ حسن

ہائے کیون دلدادۂ خوبی و زیبائی ہو نمین   کسکی محفل ہے کہ محوِ محفل آرائی ہون مین
حسن کی کثرت نے آخر مجھپہ جادو کر دیا   ابتو اک وارفتۂ اندازِ یکتائی ہون مین
کنت کنزاً مخفیاً آیا ہے اب فہمید مین   منظرِ انی انا اللّٰہ کا تماشائی ہون مین
برہمن اور شیخ دونون ایک ہی جوہر سے ہین   گوشۂ دیر و حرم کی رونق افزائی ہون مین

اے نمودِ حسن قدرت میرے دلکو بھی تو دیکھ   تیری عشق انگیزیون نے کسکا سودائی ہون مین
آئینہ خانہ ہے دنیا کیون نہ ہو حیرت مجھے   بنکے بیخود شائقِ اسرارِ دانائی ہون مین
کس قیامت کا تحیر خیز نکلا "سحرِ حسن"   اے حسینون حسنِ عشق افزا کا شیدائی ہون مین
بند ہین لب دل مگر مضطرِ فریاد ہے   کیسی خاموشی ہے کسکی تابِ گویائی ہون مین

ہون تو اک بلبل مگر گلشن سے دور افتادہ ہون
ہمنشین سنبھلین کہ مین فریاد پر آمادہ ہون

چمن مین بھی آکے مینے چین کچھ پایا نہین   جب سے دل ہاتھون سے نکلا لوٹ کر آیا نہین
کونسا جلوہ ہے وہ جسنے نہ دی حیرت مجھے   وہ نظارہ کونسا ہے جس نے تڑپایا نہین
عشقِ سامانِ سوز دلمین آنکھ ہے محوِ جمال   مجھکو جز حسنِ مقدس اور کچھ بھایا نہین
ہائے کوئی دل جلا ہمساز ہو اِس سوز کا   کیا کسی نے رازِ میرے درد کا پایا نہین
جل رہا ہے دل کہ کیون ٹھنڈی پڑی ہے انجمن؟   کیون دلونکو گرمیِ الفت نے گرمایا نہین

پھونک ڈالا اِس چمن کو آتشِ بیکار نے
سردمہری کو دکھایا گرمیِ گفتار نے

ٹکڑے ہو جائے وہ دل جس دلمین دانائی نہو   قوم وہ کیا ہے جسے احساسِ رسوائی نہو
وہ دھرم کیسا ہے سکھلائے جو باہم نفرتین   دین وہ کیسا کہ جسمین الفت افزائی نہو
اے برہمن مت سکھایا رونکو نفرت کے طریق   شیخ تو نے بھی کہین یہ آگ لگوائی نہو
چھوڑ کر سب کام کیون بیٹھا ہے خلوت نشین   بزمِ جانان مین کہین شامت تری آئی نہو
جوگیانہ ڈھنگ تیرا اور یہان کا مونکا زور   تو نے بہکایا کسی کو یا کہین قسم کھائی نہو

"لیس للانسان الا ما سعیٰ" بھولا ہو کیوں؟
ضعفِ دانش اسقدر اور اُسپہ تو بھولا ہو کیوں؟

قاضیِ مسند نشین اب رونقِ میخانہ ہو — توڑ کر سب عہد و پیمان بر سرِ پیمانہ ہو
رات دن رکھتا تھا جو رندونکی میخواریکا غم — یہ تماشا دیکھئے اب وہ جو ادرِ خمخانہ ہو
پی مئے گلرنگ زاہد چھوڑ ذکرِ حور و خلد — وہ تو رندانِ خرد پرور کا اک افسانہ ہو
کام دنیا سے نہین شیخی ہے یہ سب شیخ کی — اپنے ڈھب کی گفتگو میں یہ برا فرزانہ ہو
نقد کچھ پا کر کسی سے خوش بہت ہو برہمن — سچ تو کہنا کیا یہی وہ جلوۂ جانانہ ہو
واعظا تو نے بھی ڈالی اس بھری مجلس مین دھول — ہمتو سمجھے تھے کہ شاید شیخ ہی دیوانہ ہو
کیا بجھائیگا تو زاہد میرے دلکی آگ کو — تو بھی جل جائے یہان ایسا آتش خانہ ہو
کیون برا مانین گے وہ نالونسے تیرے اے حمید — نغمۂ توحید کا یہ نعرۂ مستانہ ہو
سحرِ حُسنِ عالم آرا سے جہان تسخیر ہے — ہو وہی دانا جو رُخِ یار کا دیوانہ ہو

زاہدِ ظاہر پرست از حالِ ما آگاہ نیست
در حقِ ما ہر چہ گوید جای ہیچ اکراہ نیست (حافظ)

حمید کوٹلوی

کلام اکبر

روح پرور نہ سہی نشہ ذرا تیز تو ہے — نوجوانون کے لیے ولولہ انگیز تو ہے
نہ سہی معنیٔ قومی فقط الفاظ سہی — چند احباب کا اک شغلِ دل آویز تو ہے

شیخ اپنی رگ کو کیا کرین ریشے کو کیا کرین — مذہب کے جھگڑے چھوڑین تو پیشے کو کیا کرین
فرہاد سے کہا کہ مناسب ہی تجھ کو صبر — کہنے لگا "بتائیے تیشے کو کیا کرین؟"

اک برگِ مضمحل نے یہ اسپیچ مین کہا — موسم کی کچھ خبر نہین اے ڈالیو! تمھین
اچھا جوابِ خشک یہ اک شاخ نے دیا — "موسم سے باخبر ہون تو کیا جڑ کو چھوڑ دین؟"

ممدوحِ شرق و غرب شمال و جنوب تھے — تعریف تھی ہنر کی بری از عیوب تھے
اب کچھ نہین تو کیا کہین مٹتے کہ کیسے ہین — ہان اسمین شک نہین ہو کہ جب تھے تو خوب تھے

بے دینون کو جوشِ مستی کیا ہے — بندون مین یہ خود پرستی کیا ہے
کہتی ہو فلک کی گردش ان سے — تم کیا ہو تمھاری ہستی کیا ہے

ابھرا ہی رنگِ سودا دیوانگی ہری ہو — ہو جوشِ موسمِ گل جو پھول ہو پری ہو
شمع اور پتنگ سے ہو ہر صبح وعظِ عبرت — یہ بھی مرے پڑے ہین وہ بھی بجھی دھری ہو

چھائی جاتی ہو مرے دل پہ اداسی کیسی — ہمنشین ہے یہ بڑی بات ذرا سی کیسی
کیا ملے دادِ سخن بنگلہ نشینونسے مجھے — وہ سمجھتے ہی نہین قدر شناسی کیسی؟

نہ مسجد مین نظر آتے نہ رہتے ہین محلونمین — ترقی پا کے بس ملجاتے ہین برگڈ کے گلونمین
یہی یورش رہی آزادی و تقلیدِ بیجا کی — تو غائب قوم کی تمکین ہو دو چار ہلّونمین

ہم مین وہ خوبی و نکوئی نہ رہی — پاکیزگی و خجستہ خوئی نہ رہی
تعلیمِ جدید سے ہوا کیا حاصل؟ — ہان کفر کے ساتھ جنگجوئی نہ رہی

صبح سرما کا ساقی نامہ

ساقی! مئے دو آتشہ بھر کر پلا مجھے — گرمائے جس سے طبع وہ ساغر پلا مجھے
بید رد تیز و تند و معطر پلا مجھے — آتش لباس بادۂ احمر پلا مجھے
دلکی لگی بجھائے وہ دے آگ ساقیا!
سوتا ہے کیا سحر ہوئی، اب جاگ ساقیا!

چھٹتی ہیں ماہتاب کے رُخ پر ہوائیاں ہیں زرد زرد شمع کی گوری کلائیاں
کبتک سہیں خمار کی زور آزمائیاں کبتک بخارِ دل کا نکالیں جمائیاں
لا جام آتشیں ترے قربان ساقیا!
تو روح دخت رز ہی مری جان ساقیا!

سرما سے کھوئے جاتے ہیں آئے ہوئے حواس سرمایہ کب ہے پاس کہ سرمائی کی ہو آس
جاگے تمام رات ہیں لب خشک منھ اداس داتا ترا بھلا ہو! بڑھا بھر کے اک گلاس
اعضا شکن ہے ہر نفسِ سرد ساقیا!
رگ رگ میں بند بند میں ہے درد ساقیا!

کملی کو بھی ترستے ہیں محتاج آب و نان لائیں کہاں سے شال و دشالے رضائیاں
اُٹھ اُٹھ کے تاپتے رہے شب بھر انگیٹھیاں بیٹھے ہیں دھوپ کھانے کو اب زیرِ آسمان
کب سے ہیں منتظر ترے جامِ شراب کے
ذرّے سب انتظار میں ہیں آفتاب کے

جیبِ شفق سے تارِ شعاعی کا ہے ظہور کرنیں سنہری پھیلتی جاتی ہیں دور دور
جنگل کا ہر شجر نظر آتا ہے نخلِ طور چھایا ہوا ہے دشت و در و بحر و بر میں نور
ساقی! یہ عکس مہر نہیں سطحِ آب پر
قلعی چڑھی ہے سونے کی جامِ حباب پر

گرتی تھی برف جو کرۂ زمہریر سے پانی ہوئی ہے شعلۂ کانِ اثیر سے
ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جو چلتے تھے تیر سے گرمائے اب حرارتِ مہرِ منیر سے
لبریز تھے جو لڑیوں سے دُرِّ خوشاب کے
بھر کر چھلک گئے وہ کٹورے گلاب کے

سبزے نے رکھدی چادرِ شبنم اُتار کر کلیاں بھی مسکرانے لگیں رو لکر گہر
نرگس بھی آنکھیں ملتی جو اُٹھی جھکائے سر سوسن زبان دراز تھی بول اُٹھی بے خطر
اے خفتگانِ خاک! دمِ نائے و نوش ہے
ہنگامۂ گرم خیزی جوش و خروش ہے

میکش پکارتے ہیں کہ فریاد ساقیا! وعدہ نہیں ہے کل کا تجھے یاد ساقیا!
زندانِ رنج و غم سے کر آزاد ساقیا! تو شاد میکدہ ترا آباد ساقیا!
سرما کی پھر یہ صبح کہاں! یہ سماں کہاں؟
پھر تو کہاں؟ یہ گل کہاں؟ یہ گلستاں کہاں؟

روحی فداک جامِ صبوحی پلا مجھے تازہ ہو جس سے روح ملے وہ مزا مجھے
کیا فکر راحتِ ابدی کے سوا مجھے دے موت میں حیات فنا میں بقا مجھے
زندہ شفق کا شام و سحر نام ساقیا!
وہ جام دے بخیر ہو انجام ساقیا!

شفق عماد پوری۔

لطفِ دریا

نگاہ لوٹ ہے دریا کی اس روانی پر کسی جبین پہ شکن ہے کہ لہر پانی پر
بھنور سے گردشِ چشمِ حسین نظر آئی

یہ میل چند حبابوں کا اور یہ سرگوشی جھلک دکھا کے یہ پھر مچھلیوں کی روپوشی
وہ سرخ رنگ کی مچھلی ذرا اُبھر آئی

وہ پیرتی ہوئی قازیں[*] اُدھر کو جاتی ہیں بطیں وہ تنتی ہوئی بال و پر ہلاتی ہیں
ہوا پہ جاکے وہ اک کُنج پھر اُتر آئی

جو بال و پر ذرا بھی مچھلی کے واسطے ڈوبا تو شک ہوا کہ یہ غوطہ اب اسکو لے ڈوبا
حبابِ بحر کی آنکھ اشکِ غم سے بھر آئی

کہاں سے لوٹ کے دابل پہ آگئی بحری و بچگیا مگر انجن کو پاگئی بحری
جو اُسکے سر سے ٹلی بھی تو اسکے سر آئی

چھپے بہت ہیں وہ دریا کے اُس کنارے پر سپید اور سیاہ اُنکے پیارے پیارے پر
اُدھر سے اُڑ کے وہ اک مرگٹی اِدھر آئی

نوٹ بنام: قاز۔ بط۔ کُنج۔ بالور۔ دابل۔ انجن۔ چہا۔ مرگٹی۔ سارس۔ یہ سب پانی پر تیرنے والی یا پانی کے کنارے رہنے والی چڑیاں ہیں ۱۲ –

وہ سارس اور پرندکی وہ دودھیا رنگت نظر فریب وہ جو بچونکی خوش نما رنگت
سرو نپہ آئی جو سُرخی تو کس قدر آئی

وہ چر[۱] پڑا ہی وہ ہین اُسکی ریت پر سرخاب دبائے بیٹھے ہین اپنے پرونمین سر سرخاب
وہ چونک اُٹھے۔کوئی آہٹ نہین مگر آئی

کنارے سبز سوار[۲] اُسمین کچھ سیاہی ہی رولے آب سپید اور گوٹ کاہی ہی
سوار ہلگئی۔مچھلی کوئی ادھر آئی

ڈراکے ایک مگر نے کیا یہ اندھیر آج تڑپکے آگیا کشتی مین اک مہاشیر[۳] آج
جو آئی ناؤ مین مچھلی۔قضا کے گھر آئی

شعاعِ مہر سے پانی ہے آبِ زر گویا ہی مچھلیونکے رُخون پر نقابِ زر گویا
فلک سے دھوپ جو آئی تو لیکے زر آئی

وہ عکس مہر نے جلوہ دکھایا پانی مین کسی حسین نے غوطہ لگایا پانی مین
نظر مین موج سے اک برقِ جلوہ گر آئی

ہوا جو کم ہی تو دریا خموش ہی اسوقت اُچھل رہے ہین نہ مینڈھے نہ جوش ہی اسوقت
سکون سے جو مری کشتی چڑھا ؤ پر آئی

چمک ہی ریت کے ذرّونمین دیکھنا انکو فلک پہ شب کو ہین تارے زمین پرن کو
چمک چلے یہ جو شب گزری اور سحر آئی

وہ اک حسین کے گھونگھٹ کا رُخ سے ہٹ جانا چھپا کے رُخ کو وہ پھر شرم سے سمٹ جانا
نگاہِ شوق مگر اپنا کام کر آئی

چلی جو مجھپہ نگاہ اُسکی آنکھ کے تل سے تو گدگدا کے کہا عشق نے مرے دل سے
نظر کے تار پر کچھ حسن کی خبر آئی

چمک رہا ہے چکا چوند مین پرین آئینہ وہ صاف رنگ وہ اُسکی بڑی بڑی آنکھین
چلی نگاہ کی برچھی تو تا جگر آئی

لڑی یہ جن سے اُن آنکھونمین آب ایسی ہی شباب حسن کی اُنمین شراب ایسی ہی
نگاہ بھرکے مری پتلیون مین تر آئی

مرے ہر ایک نفس مین بھی آہ در پردہ مین چاہتا تھا کہ ہو رسم و راہ در پردہ
مگر پلٹ کے مری آہ بے اثر آئی

اُتر کے ناؤ سے اے شوق ہٹ گئی وہ شوخ جو بڑھ چلا مین تو کترا کے کٹ گئی وہ شوخ
کہان یہ دوسری جانب کی رہ گزر آئی

شوق۔قدوائی

رُباعیات
(۱)

تسخیر کی تاثیر ترے نام مین ہی ڈوبا ہوا عالم ترے انعام مین ہی
کیا شکر ہو منھ چھوٹا ہی اور بات بڑی اتنا ہی کہ بندے کی زبان کام مین ہی

تقدیر مین ہی ازل سے لکھی گردش کیسا آرام جب ہو ایسی گردش
گردش سے فلک کی آج تک تھے برباد اب خاک بنا دیگی زمین کی گردش

پہلی سی مسلمانونکی شہرت بھی نہین جاتی رہی دولت تو فراغت بھی نہین
نکبت کے گڑھے مین کیون پڑے ہو اُٹھو مانا کہ حکومت نہین ہمت بھی نہین

قسمت مین جو ہو وہی ہوتا ہے حالت پہ مسلمانون کی دل روتا ہے
کیونکر لگے پار اب اے خدا یہ بیڑا کشتی ہے بھنور مین ناخدا سوتا ہے

ہے خالق بحر و بر خدائے وہاب جو جسکو عطا کیا وہ ہی نیک و صواب
ہمنے بھی صفی خشک و ترِ عالم سے پائے ہین لبِ ساحل و چشمِ گرداب

صفی حیدرآبادی

---

۱ جاڑون مین جب پانی ہاٹ کا گھٹتا ہی تب چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ریت کے بیچ دریا مین نکل آتے ہین۔ اُنھین چر یا چڑ کہتے ہین ۲ سوار دریائی گھاس ہی ۳ مہاشیر ایک قسم کی مچھلی کا نام ہی نام کے ساتھ تذکیر ہے۔

(۲)

نالہ بنکر دلِ حزین سے نکلے
نکہت تھے کہ زلفِ عنبرین سے نکلے

جی بھر کے نہ دوستونسے ملنے پائے
کیا جلد وطن کی سرزمین سے نکلے

ایام نشاط و کامرانی کب تک
آخر یہ غرورِ نوجوانی کب تک

گذری شب عیش و صبحِ پیری آئی
ہشیار ہو مست سرگرانی کب تک

بلبل کو پڑھائی آہ و زاری کسنے
بجلی کو بتائی بیقراری کس نے

ہین سوزِ درون سے شمع و شبنم گریان
دونون کو سکھائی اشکباری کس نے

انداز و ادا و دلربائی دیکھی
مخلوق مین شان کبریائی دیکھی

بن ٹھنکے جو بتکدے مین جائے وہ صنم
بت بول اُٹھین تیری خدائی دیکھی

اب ہے نہ شباب و نوجوانی باقی
وہ عیش و طرب نہ شادمانی باقی

پیری مین شباب کی اُمنگین کوثر
طالع ہوئی صبح اور کہانی باقی

کوثر خیرآبادی

گلچینِ اجل

کون ہو جو نہین مضطر ترے ہاتھونسے اجل!
کوہ ہو یا کہ ہو صحرا ہو دشت و جبل

باغِ عالم مین نہ دہر رگ بھی شاخ کی تیرا
دیکھ تو کتنے یہ کیا ہین کفِ حسرت مل مل

تو نے اُن شاخون کو افسوس اقلم کر ڈالا
جنمین پھول آئے نہ پھل آئے نہ پھوٹی کوپل

گو ریاضت ہو کسیکی اِسے کچھ فکر نہین
اپنے دامن کو بھرے لیتا ہی گلچین اجل

تو نے اُن پھولونکو چُن چنکے کیا پژمردہ
پتے ڈالے تھے جدھر بہر تحفظ آنچل

گل بھی پامال کیئے سبزۂ خوابیدہ کے ساتھ
تیری رفتار بُری ہی یہ ذرا دیکھ کے چل

کیا تجھے بھاتا ہو اور کیا نہین بھاتا تجھکو
آج تک تیرا یہ عقدہ نہ کسی سے ہوا حل

کل جہان پر تھے قرینے سے گل و برگ و ثمر
آج دیکھا تو وہ گلزار ہے سارا جنگل

خونِ دل سے جنھین سینچا تھا کہان ہین وہ گل
دیکھنے سے دلِ پژمردہ کا کھلتا تھا کنول

حق یہ ہی ہر دل انسان کا کانٹا تو ہی
نام لینے سے ترے جاتے ہین دل سب کے دہل

تیری ہی وجہ سی ہی ہر گل و بلبل مین فراق
تیری ہی وجہ سی ہی باغ جہان مین ہلچل

صبح کو شمع سے پروانہ خبر اڑتا ہے
کیون جلے دلکو جلاتا ہی ذرا اب بھی سنبھل

تجھسے فریاد ترے ظلم کی کیا کوئی کرے
جو معین ہی ترا وقت نہین جاتا وہ ٹل

کون سے دل پہ ترا خوف نہین طاری ہی
ہلگئے ظلم و تعدی سے ترے دشت و جبل

اس جہان مین کوئی کیا آس لگا کر بیٹھے
دل تو رکتا ہی مگر موت یہ کہتی ہی کہ چل

ایک حالت پہ سدا اسکی بسر ہوتی ہی
...ی زمانے نے جو کروٹ تو گیا رنگ بدل

دلکے دل ہی مین سب ارمان ہے جاتے ہین
ظلم سے تیرے ہر اک عیش مین آتا ہی خلل

نام جنکا نہین باقی تو نشان پھر کیسا
خاک کا ڈھیر نظر آتا ہی کسریٰ کا محل

ان مکانونمین بس اب بوم ہے آبادی ہی
ایک سے ایک جہان رہتے تھے اعلیٰ افضل

وان لکیرین نظر آتی ہین بجائے تحریر
جہان تصویرین کھنچ سکتے تھین وہ شیش محل

مکڑیان جالا لگاتی ہین وہان آ آ کے
پردے رہتے تھے جہان اور مندھی تھی مخمل

دیکھنے کو انھین اب قلب ترس جاتا ہی
نہوئے تھے جو کبھی آنکھونسے دم بھر اوجھل

اب کہان آنکھو نکے تارے وہ نظر آتے ہین
مہر و مہ کی بھی اگر ڈھونڈیے لیکر مشعل

قبر مین پاؤن کو پھیلائے ہوئے سوتے ہین
بستر خاک ہی اُنکے لیے فرشِ مخمل

سب کی لیتے تھے خبر جو انھین سدھ اپنی نہین
ہائے کس خواب گران مین ہین پڑے اہل دل

اِس پہ بھی خواہش دُنیا پہ مرے جاتے ہین
ساتھ کچھ بھی نہین جاتا ہی بجز نیک عمل

ماہ عظیم آبادی

رباعی داغ

بیگانہ یہان ہر اک یگانہ دیکھا
اپنے مطلب کا سب زمانہ دیکھا

جس کو دیکھا غرض غرض کا اپنی
دُنیا کا عجب کارخانہ دیکھا

قناعت

دل مرا میرے لیے اک سلطنت سے کم نہین ۔۔۔ حکمرانی نفس پہ کرتا ہون وہ محکوم ہے
زندگی اچھی گذرتی ہے مری کچھ غم نہین ۔۔۔ جانتا ہون مین کہ دنیا ہستی موہوم ہے

مین قناعت سے بسر کرتا ہون اپنی زندگی ۔۔۔ اور اسی پر زندگی کا ہے مرے دار و مدار
کی ضرورت سے زیادہ کی نہ خواہش آج تک ۔۔۔ مین حکومت کر نہین سکتا کسی پر زینہار

جب کسی شے کی ضرورت ہو یہی ہے حال ۔۔۔ قدرت حق سے مہیا اسکا سامان ہوگیا
نفس کی خواہش کو کر دیا ہے مین نے پامال ۔۔۔ جس طرح تلوار سے کٹتا ہے دشمن کا گلا

منعمونکو کثرت دولت سے گو راحت ہوئی ۔۔۔ زندگانی انکی کٹتی ہے بہت آرام سے
مجکو ان جھگڑون بکھیڑون نے بہت نفرت رہی ۔۔۔ سابقہ دانکو نہ تھا ان آفت و آلام سے

دوسرونکے مین کبھی نقصان کا بانی نہین ۔۔۔ اور نہ ہے رشک و حسد مجکو کسی سے زینہار
ہے سکون قلب بیسا میرا ہمدم ہمنشین ۔۔۔ عیش سے مین لوٹتا ہون زندگانی کی بہار

آہ انسان کو ہوس دیتی ہے بالکل خراب ۔۔۔ گو کہ انکے واسطے سب کچھ بہم سامان نہین
جانتے ہین دولت دنیا کو ہے شغل شراب ۔۔۔ رات دن ہے جستجو اسکی بڑے نادان ہین

ہے طلسمی کارخانہ عالم ایجاد کا ۔۔۔ کون قانع ہے کوئی ہے ہوس کا ہمنشین
تجربہ سے اوج کو یہ مسئلہ ثابت ہوا ۔۔۔ بڑھکے اس صبر و قناعت سے کوئی دولت نہین

(ماخوذ از انگریزی) اوج گیاوی

تخمیس کلام اکبر

نئی صورت نئی سیرت کے جب انسان دیکھینگے ۔۔۔ تو پھر کس رنگ مین ہین قالب ارمان دیکھینگے
کھلین گی جبکہ آنکھین جانچکر ایمان دیکھینگے ۔۔۔ سدہارین شیخ کعبے کو ہم انگلستان دیکھینگے
وہ دیکھین گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھینگے

د نوید شوق مین جان نذر شمشیر ہلالی کی ۔۔۔ اور اب حسرت ہی حسرت ہے جگر کی پائمالی کی
جگہ رکھتے مین اپنے دلمین تصویر خیالی کی ۔۔۔ جو انکو ذرا پروا نہین بے اعتدالی کی
بڑہاپے مین نتیجے اسکے یہ نادان دیکھینگے

تجھے کیا اسکی فکر اے ناصح نادان کیا ہوگا ۔۔۔ وہی ہوگا ہے جو پہلے لوح قسمت مین لکھا ہوگا
مری نظرونمین ہر وقت ایک عالم دوسرا ہوگا ۔۔۔ سیہ پان عدو سے اتقا کا سامنا ہوگا
مین دیکھونگا انہین اور وہ مرا ایمان دیکھینگے

یہ نا ہوش کیسے وجہ بے تابو دل مضطر ۔۔۔ گرانا چند آخر زور جذب الفت دلبر
ٹھکانا برطرف کر دیگا آزادی سے اے محشر ۔۔۔ تری دیوانگی پہ رحم آتا ہے ہمین اکبر
کوئی دن وہ بھی ہوگا جب تجھے انسان دیکھینگے

محشر لکھنوی

سیتا کا بن باس

(سیتا کی زبانی)

یہ تیرہ اختر نصیب میرا ۔۔۔ یہ بخت ہے یا رقیب میرا
عدم کے جہان مین پلا مین ۔۔۔ جنمی ہی تھی کیون جنم جلی مین؟
تھنڈے پیڑون رہی نہ سیتا ۔۔۔ سیتا کو جنا بچے ہی مین بیتا
لنکا مین تھی شوک مین بلا مین ۔۔۔ تھی گرچہ اشوک واٹکا مین
لنکا سے جب اودھ مین آئی ۔۔۔ جب بج گئی راج کی بدھائی
رنواس کی جب مجھے ہوئی آس ۔۔۔ بخت بد نے دکھایا بن باس
گھر آکے ہوا نصیب جنگل ۔۔۔ جنگل ہی مین مجھکو اب منگل!

جنگل جو نصیب بخت ہو اب — پتھر کی چٹان تخت ہو اب
اے پھل سے لدے شجر تناور — رہنا تم مجھ پہ سایہ گستر
بے جان ہوا درخت ہو تم — انسان سے کم ہی سخت ہو تم
تم چپ رہے لگا کے خسروانی — سیتا کو بتاؤ بن کی رانی
اے شیر تو سنگھ ہے دلاور — میں بھی تو سنگھ کی ہوں دختر
بوٹی بوٹی مری چبانا — میری آنکھیں مگر نہ کھانا
آنکھوں کو ہے آرزوئے دیدار — دیکھیں یہ رام کو پھر اک بار
آئے اور آکے بن کا چیتا — دیکھے دل داغ دار سیتا
نا اہل ہے نابکار دنیا — ہوتی ہے کس کی یار دنیا
ہے سنگِ ستم یہاں پھلوں پر — پتھر کی مار ہے پھلوں پہ
دولت کی وفا وفا نہیں ہے — دولت کی ولا ولا نہیں ہے
آرام ہے رام کے الم سے — دل رام ہے رام کے کرم سے
مچھلی کھانیسے لگتی ہے پیاس — مر کر بھی ہے اسکو میت کی آس
سیتا کی پتی ہی سے گتی ہے — سیتا ہر حال میں ستی ہے
اے بادِ صبا! تو جا کے کہنا — اُن سے میری سنا کے کہنا
کہنا اے خوش خرام میری — رگھناتھ سے رام رام میری
فرمایا جو رام چندر جی نے — دی جان رضا میں جانکی نے
اے مور چکور چاہ رکھنا — بارش سے قمر سے راہ رکھنا
دے ساتھ مرا، تو اے پپیہا! — تو بھی پی پی صدا کیے جا
جل جا! ہاں اے پتنگ جل جا — اپنے پریتم کے سنگ جل جا
دل اینٹ نہیں کہ ٹوٹ جائے — پتھر نہیں یہ کہ پھوٹ جائے
دل گوشت جلیگا، نرم ہوگا — جل بھن کر بھی یہ نرم ہوگا
سیتا کی سدا وفا شعاری — گائے گی یہیں ہر ایک ناری
سیتا ہی کا نام پہلے لیں گے
"سیتا رام" آدمی جپیں گے

طالب بنارسی

تازہ غزلیں

مہاراجہ بہادر راجہ سر کشن پرشاد صاحب شاد دام اقبالہم

شخص ہے یا عکس ہے صورت مری آنکھوں میں ہے — کون آئینہ ہے یا حیرت مری آنکھوں میں ہے
مختلف اشکال میں ہر چند عالم میں مگر — ذرہ ذرہ یار کی صورت مری آنکھوں میں ہے
دیکھ کر حیران ہے کیوں عالم تحیر میں مجھے — جلوۂ دیدار کی حسرت مری آنکھوں میں ہے
شرم ہے آنکھوں میں اُسکی وصل کی شب اور یہاں — مضطرب نظارہ کی حسرت مری آنکھوں میں ہے
پتلیاں اسواسطے روتی ہیں میری ہر دم — دیکھوں پھر اُسکو یہ حسرت مری آنکھوں میں ہے
دیر و کعبہ میں تجھے ہی دیکھتا ہوں برملا — اے صنم تیری ہی اک صورت مری آنکھوں میں ہے
ہے تماشا یا کوئی جلوہ ہے کوہِ طور کا — بن گیا ہوں حیرتی حیرت مری آنکھوں میں ہے
دونوں عالم میں نظر آتی ہے اپنی ہی بہار — کیا بہارِ گلشن قدرت مری آنکھوں میں ہے
کیوں نہ سجدہ میں کروں اب جانب اجمیر شاد
خواجہ اجمیری کی صورت مری آنکھوں میں ہے

مجدد الوقت مولانا سید احمد حسن صاحب شوکت (میرٹھی)

مشرب جام و صراحی رقصِ آزادانہ تھا — دستِ ساقی رات رہنِ بیعتِ خمخانہ تھا
سنگِ استغنا سے گو پیمان شکن پیمانہ تھا — خود نگاہِ مستِ ساقی کیف صد میخانہ تھا
مل گئے شوقِ تجلی سے ہزاروں خاک میں — طورِ سینا سے بھی بالا کس کا بالاخانہ تھا
ماسوا کی دل میں گنجائش نہ تھی اے گنجِ حسن — سوزنِ چشمانِ قارون روزنِ کاشانہ تھا
جانِ شیریں دی کفِ دشمن میں شیریں کو دیا — کوہکن کتنا دلیرِ جونِ نامردانہ تھا
نام سے مرغِ تجلی کو مسخر کر لیا — دامِ مژگاں میں مرے ہر اشک گوہر دانہ تھا
خوابِ غفلت نے تھپکا تھا گوشِ ہوش کو — صرف ایک افسون ہماری عمر کا افسانہ تھا
طرفہ دانائی سے نادانوں کو کرتا تھا شکار — دام در بر شیخ کی تسبیح کا ہر دانہ تھا
سرمہ کرنا چشمِ خاموشی کا تھا مدِ نظر — شمع کو کتنا غمِ خاکسترِ پروانہ تھا
چشم پوشی شمع کی دیوار نظارہ نہ تھی — پردۂ فانوس نورِ دیدۂ پروانہ تھا
کیوں خجالت کش ہوا خمیازۂ دردی طلب — خونِ دل جب جمع یکجا ہو گیا میخانہ تھا

آئے وہ دامن کشان تھا جو پر اسکا داغ — خاکِ تربت مین بھی میری نازِ معشوقانہ تھا
گبرووں کو ہنس ہنس دیو اہر ہمواری کیا — رشتۂ تسبیح تیر سینۂ صد دانہ تھا
سخت جانی تھی کہ زندہ تھا گاوِ تنو تن — وا نت سر تسبیح تھی تیغ مین دندانہ تھا
آنکھ جب شوکت کھلی دیکھے بتان ماسوا
کعبۂ دل بنتے تھے جس کو ہم بتخانہ تھا

سید نظیر حسن صاحب نظیر

اسے بھی خوہی نہین کسیطرح ستانے کی — کبھی نہین شب فرقت مین نیند آنے کی
کبھی ہو دلمین ادا انکے مسکرانے کی — یہی تو وجہ ہے بجلی کے تلملانے کی
گئے ہین عاشق گیسو نے خلق پر احسان — بلائین ایک جگہ ہو گئین زمانے کی
وہی خیال وہی بدگمانیان اب تک — کچھ انتہا ہے کوئی حد ہے آزمانے کی
بہار آئی بھی آخر بھی ہو چلی صیاد — ہمین ملی نہ اجازت چمن مین جانے کی
پہاڑ غم کے جو ٹوٹین تو کچھ نہ ہو پروا — وہ کیا دبے جسے عادت ہو ناز اٹھانے کی
وہ چلے اپنی خبر لین کہ خود مین نقش برآب — نصف دل ہی جنھین کوشش ہین مٹانے کی
ہمارے دلمین ترے درد نے کہا ٹھکر — یہی تو ایک جگہ ہی مرے ٹھکانے کی
تعلقات کے پھندون کو دم نے توڑا ہی — یہ وجہ ہی دم آخر عرق کے آنے کی
مرے قیام کو پوچھو نہ اے عدم والو
حباب نے تو بہت سیر کی زمانے کی

منشی عبد الحمید صاحب حمید (میرٹھی)

ہوئی رسوائی بازار حیا مین حسن صورت کی — تماشائی ہمین نظر ہین نظر بازان الفت کی
کہان تصویر کھنچتی ہی تمھاری بھولی صورت کی — نہین لے راہ ہی کلک مانی کا قدرت کی
کسی سے ہم شکایت کیا کرین خوبی ہی قسمت کی — کہ دل بیٹھے بٹھائے کھو دیا اچھی محبت کی
نگاہین مجھسے پھیرین سو دشمن چشم الفت کی — یہ کیا رسم وفا تو نے ادا او بیمروت کی
قلق کی رنج کی حرمان کی غم کی درد فرقت کی — محبت مین ہمین راتین ملین کس کس مصیبت کی
نہین چھپتی چھپانے سے نظر مہر و محبت کی — اثر ہی ہمین جادو کا یہ بجلی ہی قیامت کی
بہت اچھا ہون ایسی کیا ضرورت تھی عیادت کی — عدو کے ساتھ آئے بڑی مجھپر عنایت کی
ذرا اے شام ہجران آنکھ اگر میری جھپک جائے — تو ایسا سوؤن غافل ہوؤن خبر صبح قیامت کی
حرم مین دیر مین جلوہ کسی کا ہی تو مجھکو کیا — کرونگا خانۂ دل مین پرستش تیری صورت کی
جو کوئے یار کا ہم ایک نقشہ دل مین کھینچین گے — ہوا کچھ اور ہی ہو جائے گی گلزار جنت کی
وہ بیٹھے بھی تو کیا بیٹھے ہمین جب اٹھنے والے تھے — وہ آئے بھی تو کیا آئے گھڑی جب آئی رخصت کی
جنھین سمجھا ہو قاتل ہیں وہ بیٹھے اپنے دامن کے — وہ ہین گلکاریان خون شہیدان محبت کی
شب وصل صنم ہی حضرت دل شاد ہو بیٹھے — ابھی دم بھر نہ پائیگی گھڑی صبح قیامت کی
وفا پر اپنی نازان ہون اداپر جان دیتا ہون — مروت اس ہی ڈالیگی مجھکو بے مروت کی
تمھارے در کے سجدے پھر میسر کب مجھے ہونگے — مٹاؤن آج ہی گھسکر جبین تحریر قسمت کی
چلا آتی ہی پیچھے پیچھے کیون تھام ہوئے دامن — قیامت کیا سہیلی بن گئی ہی فتنۂ قامت کی
مری بیتابیان دیکھین مرا مرنا بھی تو دیکھیں — ابھی آتے ہی تمکو پڑ گئی اے جان رخصت کی
برا کہنے لگے کوئے بتان کو کچھ خلل آیا — ہوا کھا مین کوئی دن شیخ صاحب باغ جنت کی
عدم تک لے ہی پہنچیگا یہ شوق دشت پیمائی — سلامت ہے اگر گردش ہماری پائے وحشت کی
مجھے دیوانگی کا شوق انھین ذوق خود آرائی — یہان ہی نام کا ارمان وہان خواہش ہی شہرت کی
خدا زندہ رکھے تا حشر میرے سوگوارون کو — سرہانے بیکسی ہی اور گریان شمع تربت کی
جو پوچھا انسے ہمنے کیا سبب ہے کیون ستاتے ہو — تو بولے تم نہین واقف یہ باتین ہین محبت کی
حمید آئینہ مین شاید کوئی جادو کا پتلا تھا
وہ جسکو دیکھتے ہی بن گئے تصویر حیرت کی

منشی درگا سہائے صاحب سرور جہان آبادی مرحوم

نہ دو چرکا رگِ جان حزین کو — سنبھالو نشترِ چین جبین کو
تمھاری چال ہے آشوب محشر — اُٹھائے پھرتی ہے سر پر زمین کو
کرو خالی نہ آغوش تمنا — ذرا دیکھو مہ ہالہ نشین کو
کوئی خارِ تمنا چبھ نہ جائے — نہ چھونا تم دلِ درد آفرین کو
ہوا اچھی مرے نالون نے باندھی — کہ بھڑکایا مزاجِ آتشین کو
اگر پیرِ کہن ہوتا نہ ظالم — اُٹھا لیتا فلک سر پر زمین کو
کنارہ کر کے بیٹھا ہی جہان سے — نہ چھیڑو وحشتِ گوشہ نشین کو

ایڈیٹوریل

کچھ اپنی نسبت

توکل علی اللہ العصر کا پہلا نمبر ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ مضامین کے لحاظ سے پبلک خواہ کچھ ہی رائے قائم کرے، اُسکو اختیار ہے، مگر ہم درخواست کرتے ہین کہ سب سے پہلے اُس تمہیدی مضمون کو جسمین کسی حد تک توضیح مقاصد کی گئی ہے، ملاحظہ فرما لیا جائے کہ العصر کے ذریعہ سے کن خدمات کی انجام دہی کا ارادہ کیا گیا ہے۔

یہ بات بے تامل بالیقین کر لینی چاہیے کہ مین معمولی استعداد کا آدمی ہون۔ نہ تو مجھے زباندانی کا غرہ ہے، نہ تجربہ کاری کا ادعا۔ ہان، چونکہ گزشتہ دس بارہ سال سے اخباری دنیا سے مجھے خاص تعلق رہا ہے اسلیے اب اسی کوچہ کی ہوا سر مین سما گئی ہے، اور اس کا شوق بدرجہ اتم دامنگیر ہو گیا ہے، اور اسی وجہ سے خیال ہے کہ ملک کے علم دوست حضرات کی بدولت شاید کسی قابل ہو جاؤن۔

ملک مین بہت سے موقت الشیوع رسالے شائع ہوئے اور ہوتے ہین۔ مگر باستثنائے چند، انکا اجرا زیادہ تر تجارتی اغراض سے ہوا ہے۔ یہ ایک بہت بھاری نقص ہے جو اخبارات و رسائل کے حق مین زہر قاتل کا اثر رکھتا ہے کیونکہ تجارتی پرچون کے ایڈیٹر عموماً بدلتے رہتے ہین، اور ایڈیٹرون کی تبدیلی کے ساتھ پرچون کا مقررہ معیار یا امتیاز خصوصی قائم نہین رہتا۔ ع ہر کہ آمد عمارت نو ساخت

اس جگہ اس امر کا اظہار کر دینا نامناسب نہوگا کہ العصر میرا ذاتی پرچہ ہے یعنی مین صرف ایڈیٹر ہی نہین بلکہ مین ہی اس کا پروپرائٹر بھی ہون۔ پس اگر ملک نے اس کی قدر کی تو کچھ شک نہین کہ کم از کم میری حیات مستعار تک العصر جاری رہیگا انشاءاللہ تعالے۔

العصر کو مین نے اپنی معاش کا ذریعہ نہین بنایا ہے، بلکہ اسکو مین محض اپنا شوق پورا کرنے کے لیے خالص علمی و ادبی خدمات کی غرض سے شائع کرتا ہون۔ اِس سے جو کچھ آمدنی ہوگی، وہ اسی کی بہتری مین صرف ہوگی۔ ہان اُس روز کا نہایت بیتابی کے ساتھ انتظار کرتا ہون کہ مین اپنا تمام وقت اسکو زیادہ بہتر اور کارآمد بنانے کی سعی مین صرف کر سکون۔

اب اِس مختصر نوٹ کو ختم کر کے مُلکی اخبارون، رسالون، اور اہلِ قلم کی سچی رایون کا انتظار کرتا ہون، اور گوش برآواز ہون۔ کاش !

ندائین آنے لگین ان سعیکم مشکور

ایک گزارش

ہم سمجھتے ہین کہ ہمارے معاونین العصر کو اُس حالت سے گرا ہوا نہ پائینگے جسکا اشتہار مین وعدہ کیا گیا تھا۔ تاہم ترقی کی ابھی بہت گنجائش ہے، اور ہماری بھی یہ کوشش ہوگی کہ ہر نمبر گزشتہ نمبر سے بدرجہا بہتر ہو۔

تصاویر کے متعلق چند باتین خاص طور پر قابل گزارش ہین۔ ہمین گندم نما جو فروشی منظور نہین، اس لیے ہم پہلے ہی اس بات کو جتا دینا مناسب و ضروری خیال کرتے ہین کہ العصر کی تصاویر کی کوئی خاص تعداد مقرر نہین کی گئی ہے۔ اس نمبر مین ایک رنگین اور چھ سادہ تصویرین دیگئی ہین۔ ممکن ہے کہ آئندہ نمبر مین اس سے زیادہ تصویرین ہون، اور اسی طرح اس تعداد سے کم تصویرین ہونیکا بھی امکان ہے۔ لیکن اس سے یہ نہین سمجھنا چاہیے کہ ہم مصارف سے گھبراتے ہین۔ ہرگز نہین۔ پرچے کے مصارف کا جو بجٹ تیار کیا گیا ہے اُسمین کسی طرح تخفیف نہین ہوسکتی۔ اگر کسی نمبر مین تصویرون کی تعداد کم ہوگی تو ہم اُس کمی کو اُس نمبر کے صفحات کی تعداد بڑھا کر پورا کر دین گے۔ ہماری رائے مین خوش معاملگی کا اقتضا بھی یہی ہے !

العصر کے متعلق ہم نے ہر قسم کی خوش سلیقگی کا خاص لحاظ رکھا ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ صورت و سیرت دونون کے لحاظ سے العصر بہترین رسالہ ثابت ہو۔ اگر ہمارے معاونین کو کوئی نقص محسوس ہو، تو وہ صفائی کے ساتھ ہمین تحریر کر دین۔ ہمین اُن کے مشورون سے فائدہ اُٹھانے مین ہرگز عار نہوگا۔

ہمارے ارادے بہت وسیع ہین اور یہ ظاہر ہی ہے کہ ایسے مہتم بالشان مقاصد کی کامیابی کُل ابنائے وطن اور حامیانِ اُردو کی دستگیری پر منحصر ہے۔ جو

اصحاب خود مالی اعانت فرمانے کے علاوہ اپنے احباب کو بھی اسکی خریداری کی جانب مائل کرین گے وہ ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہون گے۔ اس طور سے وہ نہ صرف العصر کی مالی حالت کو بہتر کرین گے، بلکہ اُس فائدہ کو بھی جو وہ ملک کو پہونچانا چاہتا ہے وسعت دینے کا ذریعہ ہون گے ؎

دل کی قیمت اک نگاہِ ناز ہے آگے جو آئے ترے ایمان مین

ردِّ تحقیق

بہت شور سنتے تھے پہلو مین دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خون نہ نکلا

ایک مشہور و معروف ادبی رسالہ کے ایڈیٹر نے ایک مضمون کے دوران مین ہندوستان کے علمی رسائل کا ذکر فرماتے ہوئے تحریر کیا ہے :—

"۱۹۰۱ء مین پہلے پہل رسالہ دلگداز مولانا عبد الحلیم صاحب شرر نے نکالا تھا اس لیے اولیت کا فخر ممدوح کو ہے ......"

افسوس ہے کہ ہم اس بات کو ماننے کے لیے ہرگز تیار نہین۔ وجہ یہ کہ ہم اُن علمی کوششون سے بخوبی واقف ہین، جو دلگداز کے ظہور سے پیشتر اردو زبان مین کی جا چکی ہین۔ ۱۹۱۰ء مین ہم نے ایک مضمون دکن کے رسالہ زبان مین اُردو رسائل پر ایک سرسری نظر کے عنوان سے لکھا تھا۔ اُسمین ہم نے اُن پرچون کی ایک فہرست بھی دی تھی جو ۱۸۹۶ء سے پیشتر خالص علمی مذاق کے لیے شائع ہوئے تھے۔ ذیل مین ہم اُس فہرست کو نقل کرتے ہین۔ اس سے ناظرین اندازہ فرما سکین گے کہ دلگداز کے وجود مین آنے سے پیشتر علمی مذاق مفقود نہ تھا۔

نمبر	نام رسالہ[لہ]	مقام اشاعت	نام ایڈیٹر	سنہ اجرا
۱	مراۃ العلوم +	بنارس	بابو بھیرون پرشاد	سنہ ۱۸۴۹ء
۲	مخزن علوم و فنون	"	منشی نیاز علی	سنہ ۱۸۵۰ء
۳	آب حیات ہند	آگرہ	بابو بنسی دھر	سنہ ۱۸۶۲ء
۴	مخزن العلوم	گوجرانوالہ	منشی گیان چند	سنہ ۱۸۶۶ء
۵	انسٹی ٹیوٹ	مظفر نگر	لالہ نہال چند	سنہ ۱۸۶۷ء
۶	اتالیق پنجاب	لاہور	مولانا آزاد	سنہ ۱۸۷۰ء
۷	مخزن مہابھارت	آگرہ	لالہ جوالا پرشاد	سنہ ۱۸۷۱ء
۸	دہلی سوسائٹی	دہلی	مولوی ذکاء اللہ	سنہ ۱۸۷۱ء
۹	معلم شفیق	حیدرآباد دکن	محب حسین محب	سنہ ۱۸۷۲ء
۱۰	انجمن مذاکر علمیہ	پٹنہ	حاجی سید ولایت علی	سنہ ۱۸۷۳ء
۱۱	مخزن الفوائد	حیدرآباد دکن	مولوی مسیح الزمان	سنہ ۱۸۷۴ء
۱۲	آستانۂ حکمت	آگرہ	حاجی سید الطاف علی	سنہ ۱۸۷۹ء
۱۳	اشاعت السنہ	امرتسر	مولوی محمد حسین	سنہ ۱۸۷۹ء
۱۴	تیرھوین صدی	آگرہ	خواجہ یوسف علی	سنہ ۱۸۸۰ء
۱۵	زمانہ	آگرہ	خواجہ یوسف علی	سنہ ۱۸۸۱ء
۱۶	مفید عام	لاہور	منشی گلاب سنگھ	سنہ ۱۸۸۱ء
۱۷	نظم الزراعت +	میرٹھ	حکیم مقرب حسین	سنہ ۱۸۸۲ء
۱۸	متھرا سماچار	متھرا	پنڈت رام نرائن بھارگو	سنہ ۱۸۸۲ء
۱۹	والا جاہی	ریاست بھوپال	نواب صدیق حسن خان	سنہ ۱۸۸۳ء
۲۰	علوم و فنون	حیدرآباد دکن	حافظ منصب علی	سنہ ۱۸۸۳ء
۲۱	اشراق	لکھنؤ	مرزا ہادی	سنہ ۱۸۸۴ء
۲۲	ذخیرۂ تعلیم	حیدرآباد دکن	منشی عزیز الدین	سنہ ۱۸۸۴ء
۲۳	زراعت	بجنور	پنڈت سری لال	سنہ ۱۸۸۴ء
۲۴	نور البصر	کلکتہ	مولوی غلام حضرت	سنہ ۱۸۸۴ء
۲۵	طبیب	لاہور	حافظ فخر الدین	سنہ ۱۸۸۵ء
۲۶	مفید المزارعین	کانپور	خواجہ محمد حسین	سنہ ۱۸۸۵ء

[لہ] + جن پرچون کے نام کے ساتھ یہ نشان دیا گیا ہے، وہ اردو اور ناگری دونون زبانون مین شائع ہوتے تھے :—

نمبر	نام رسالہ	مقام اشاعت	نام ایڈیٹر	سنہ اجرا
۲۷	مرآۃ الہند	لکھنؤ	پنڈت کشن لال	۱۸۹۵ء
۲۸	افسانۂ ایام	دہلی	مولوی نصرت علیخان	۱۸۹۵ء
۲۹	زمیندار	لاہور	منشی محبوب عالم	۱۸۹۶ء
۳۰	باغبان	”	”	۱۸۹۶ء
۳۱	شمس العلوم	احمدآباد	———	۱۸۹۶ء
۳۲	مجمع علوم و فنون	لاہور	مولوی عبداللہ خان	۱۸۹۶ء
۳۳	مرچنٹ	انبالہ	پنڈت شیو پرشاد	۱۸۹۶ء

ہم نے عمداً اُن رسالون کے نام نظرانداز کر دیے ہین جو ۱۸۹۷ء مین یا اس کے بعد شائع ہوئے ہین۔ اس بات کا بھی دعوی نہین کیا جا سکتا کہ یہ فہرست مکمل ہے۔ ممکن ہے، ان کے علاوہ اور بھی علمی مذاق کے پرچے جاری ہوئے ہون۔ بہرحال اب اس بات کو مان لینا چاہیے کہ اولیت کا فخر مولانا شرر کو حاصل نہین ہے۔

ہم ایڈیٹر صاحب موصوف کی اُن معلومات کی ضرور داد دینگے جو آپ کو "تجربات اور تحقیق و تدقیق کے بدولت حاصل ہو گئی ہین"، مگر ہمین سخت افسوس ہے کہ اس تاریخی مضمون مین اور بھی چند غلطیان اس قسم کی ہو گئی ہین کہ ہم اُن کی بھی تردید کیے بغیر نہین رہ سکتے۔ مثلاً آپ ادیب کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہین:

"اس نام کے دو رسالے جاری ہوئے تھے... ایک تو حیدرآباد سے نکلتا تھا"

اور دوسرا غالباً ۱۸۹۶ء مین فیروزآباد سے جاری ہوا تھا"

اس بات کے ظاہر کرنے کی چندان ضرورت نہین کہ حیدرآبادی ادیب اب تک جاری ہے، اور کہ فیروزآبادی ادیب ۱۸۹۶ء مین نہین بلکہ ۱۸۹۹ء مین جاری ہوا تھا! مگر ہم یہ دریافت کرنے کی جرأت کرتے ہین کہ لکھنؤ کے ادیب نے کیا قصور کیا جو آپ نے اُسکا ذکر نہین فرمایا۔ شاید آپ کو معلوم نہین ہے کہ ۱۸۸۷ء مین لکھنؤ سے بھی اسی نام کا ایک رسالہ مولوی ہدایت رسول کی ایڈیٹری مین جاری ہوا تھا۔

آگے چل کر آپ فرماتے ہین:—

"ہندوستان مین موجودہ طرز کے رسالون کا پیشرو ادیب فیروزآباد ہی تھا۔"

"موجودہ طرز" سے غالباً آپ کا منشا نظم و نثر کے مستقل الحاق سے ہے۔ مگر جاننے والے جانتے ہین کہ معارف مین یہ خوبی موجود تھی، اور یہ ظاہر ہے کہ ادیب (فیروزآباد) معارف کے بعد معرض وجود مین آیا اور معارف کے بند ہونے سے پہلے ہی ختم بھی ہو گیا۔ اور اگر "موجودہ طرز" سے آپ کی مراد جدید شاعری سے ہے، تو یہ نشانہ بھی خالی گیا۔ ۱۸۹۲ء مین جب منشی نثار حسین صاحب نثار نے پیام یار جاری کیا تھا تو مولوی عبدالحلیم صاحب شرر کبھی کبھی اُسمین یورپ اور ایشیا کا رنگ ملا کر نظم لکھتے تھے، اور جب اُنھون نے دلگداز جاری کیا تو اسمین بھی جدید طرز کی نظمین درج کرنے لگے۔ انبالہ سے بھی ایک ماہوار رسالہ جاری ہوا تھا جس کا نام غنچۂ مراد تھا۔ غزلون کے علاوہ اسمین جدید طرز کی نظمین بھی ہوتی تھین۔ گویا علمی و ادبی مذاق کے علاوہ جدید شاعری کی بنیاد بھی فیروزآبادی ادیب سے بہت پہلے پڑ چکی تھی۔

ہم محقق نہین ہین، اور نہ ہمارا "مشاہدہ و تجربہ" وسیع ہے، باوجود اس کے ہم نے جو کچھ لکھا ہے، نہایت تحقیق سے لکھا ہے، اور وہ بھی محض اس غرض سے کہ رسالۂ مذکور کے مضمون زیر بحث کی وجہ سے بعض ناواقف حضرات مغالطہ مین نہ پڑ جائین۔ امید ہے کہ ہماری اس نیک نیتی کو مخالفت پر محمول نہ کیا جائے گا۔

میکاڈو یوشی ہتو (جدید شہنشاہ جاپان)

جدید شہنشاہِ جاپان، یوشی ہتو، ۳۰۔ اکتوبر ۱۸۷۹ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام، مغربی طریق پر، نہایت وسیع پیمانہ پر کیا گیا تھا۔ چینی، و جاپانی لٹریچر سے خوب واقفیت رکھنے کے علاوہ، آپ انگریزی و جرمنی زبانین بھی جانتے ہین۔ فرنچ زبان مین تقریر بھی کر سکتے ہین، جاپانی زبان سے انھین کمال انس ہے، اور اپنے تمام کام اسی زبان مین کرتے ہین۔

آپ کی صحت اچھی حالت مین نہین ہے۔ عرصہ تک مرض تپ دق مین مبتلا رہے۔ اگرچہ ایک جرمن ڈاکٹر کے علاج سے آپ صحتیاب ہو گئے ہین

تاہم اب بھی کمزور ہیں۔ اپنے نامور والد کی طرح آپ تنومند نہیں بلکہ نحیف البحثہ ہیں۔ سیر و سیاحت کے بڑے مشتاق ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں بہت دور دور کی سیر کی۔ طبیعت کے نرم ہیں۔

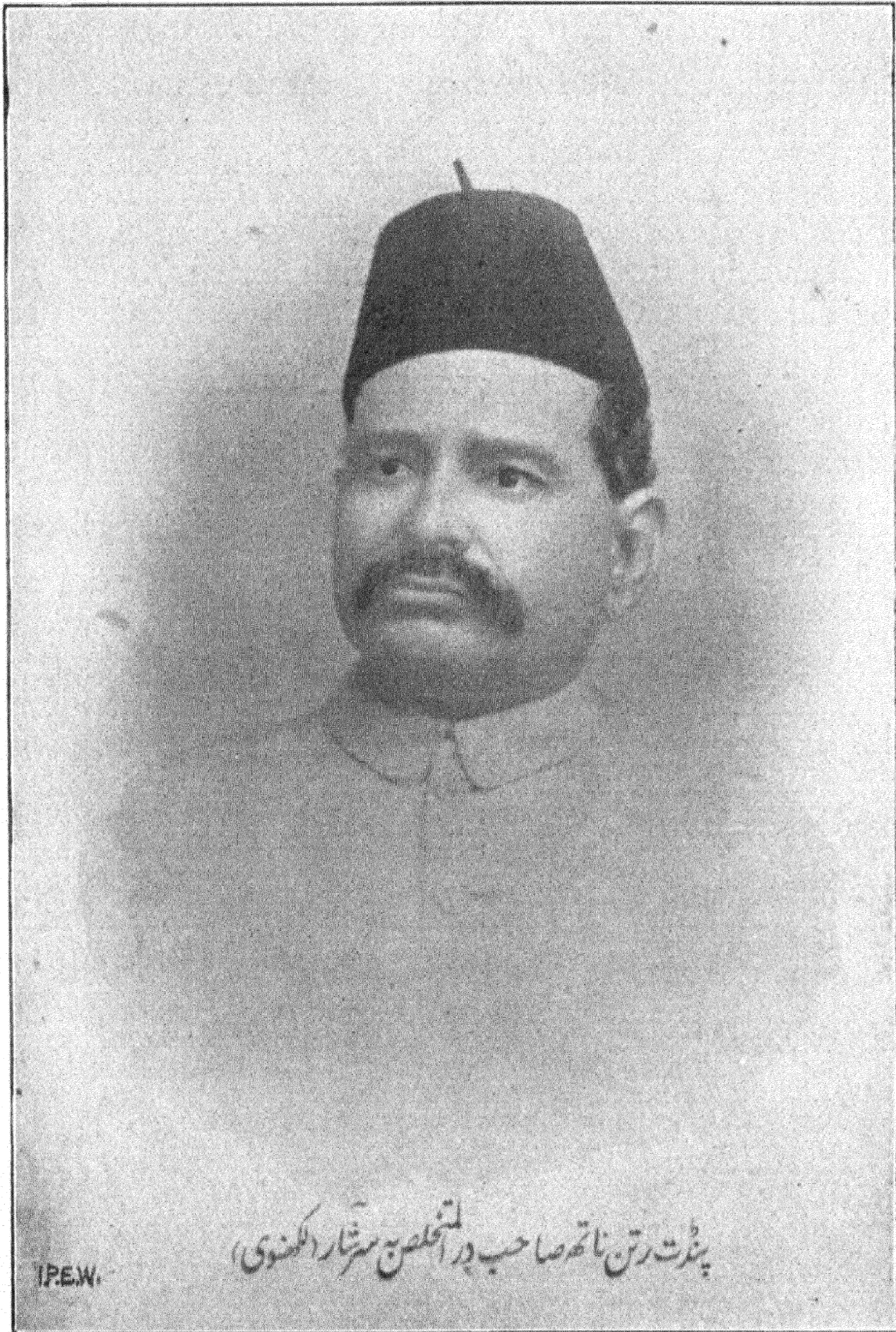
۱۷۔ اکتوبر کا دن جاپان میں اس خیال سے قومی دن منایا جاتا ہے کہ اسی روز بادشاہ نئے چاول کی فصل کے بعد نئے چاول پہلی مرتبہ تناول کرتے ہیں جدید شہنشاہ جاپان نے اس رسم کو ادا کرنے کے بعد اپنے معلموں کو جنھوں نے بچپن سے ابتک آپ کو تعلیم دی انعام و اکرام بخشے، اور اُن کی محنت کا شکریہ و اعتراف کر کے حق شاگردی ادا کیا۔

۱۲۔ نومبر کو شہنشاہ مذکور نے ایک دوسری قومی رسم ادا کی۔ جاپان کے قریباً دو سو جنگی جہاز بندر یوکوہاما میں جمع کیے گئے، اور بادشاہ نے ایک کشتی میں سوار ہو کر اُنکا ملاحظہ کیا، گویا انھیں برکت دی۔ اس عظیم الشان رسم کی ادائگی کے لیے نہایت اعلیٰ پیمانہ پر تیاریاں کی گئی تھیں۔

ماتم کی وجہ سے آپ ابھی تک کاروبار سلطنت میں زیادہ حصہ نہیں لیتے اسوقت ان کی عمر ۲۶ سال کی ہے۔ ان کے تین لڑکے ہیں۔ رسم تاجپوشی ۱۹۲۸ء میں سابق دارالسلطنت کیوٹو میں ادا ہوگی۔ جاپانی رسم کے مطابق نئے شہنشاہ کو تخت نشینی کے بعد فوراً ہی اپنے بزرگوں کے مقابر پر جا کر اظہار اطاعت کرنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دربار تاجپوشی ٹوکیو کے بجائے کیوٹو میں ہوگا۔

جدید شہنشاہ طبیعت وغیرہ میں اپنے والد مرحوم سے بالکل مختلف ہیں۔ مرحوم عمدہ صحت کے مستقل مزاج اور گوشہ نشین بزرگ تھے اور جدید شہنشاہ صحت کے کمزور، زمانۂ حال کے خیالات کے دلدادہ، اور سیر و سیاحت کے شائق نوجوان ہیں۔ جاپان کی آیندہ حالت کیا ہوگی؟ زمانۂ دربار تک اسی بحث پر طبع آزمائی ہوتی رہے گی۔

پنڈت رامچندر رینشادری از ٹوکیو



پنڈت رتن ناتھ صاحب در المتخلص بہ سرشار (لکھنوی)

PRINTED BY U. RAY & SONS, CALCUTTA.

العصر

انتہائے سائنس

گذشتہ صدی عیسوی کی ابتدا سے سائنس نے اس قدر حیرت انگیز ترقی کی ہو اور حقائق قدرت اس برق رفتاری سے سائنس کی جادو نما تحقیق کے سامنے حضرت انسان کو منکشف ہو رہے ہین کہ بادی النظر مین خیال پیدا ہوتا ہو کہ سائنس اپنے معراج کمال کی انتہائی منازل کو عنقریب پہنچ جائیگی۔ ہمارا مقصد اس مضمون کی اشاعت سے اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا ہو۔ سائنس نے فی الواقع انسانی علم کو بے انتہا وسعت دی ہو لیکن بعض مسائل ابھی تک بالکل سائنس کی دسترس سے باہر ہین اور جب تک سائنس ان مسائل کو طے نکرے ہم ہرگز سائنس کو مکمل مجموعۂ معلومات کہنے کے مستحق نہین ہین۔ جو لوگ جانتے ہین کہ سائنس نے کن کن مسائل پر روشنی ڈالی ہو انکو خوب معلوم ہو کہ ابھی بہت سے مسائل سائنس کے حدود مین بھی نہین آئے۔ آپ ترکیب مادہ ہی کو بغور سوچیے۔ یہ تمام کتب یوروپی زبانون مین اس بحث پر شائع ہوچکی ہین لیکن سب کا ماحصل یہ ہو کہ مادہ کے متعلق کسی اصلی بات کا پتہ نہین لگایا جا سکتا۔ مادہ کی ترکیب صرف ادھورے طور پر بیان کی جاسکتی ہو۔ چونکہ اس مضمون پر حال ہی مین جدید انکشافات نے بہت سی نئی روشنی ڈالی ہے ہم چاہتے ہین کہ ناظرین کو اس اجمال کی تفصیل سے آگاہ کردین۔

قاعدہ کی بات ہو کہ انسان ان باتون کے متعلق جو اسکے روزمرہ کے مشاہدہ مین آتی ہین اور جن سے اکثر اُسے واسطہ پڑتا ہو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ تحقیق اور تفتیش کرتا ہو۔ مختلف اشیا کو اپنے گرد و پیش دیکھکر شروع ہی شروع مین انسان کو جستجو پیدا ہوئی کہ مادہ کی خواصیات عامہ کی کسی معقول پیرایہ مین تشریح ہو سکے۔ سب سے اول یہ خیال پیدا ہوا کہ مادی اشیاء نہایت ہی چھوٹے ذرات سے مرکب ہین اس خیال کا موجد دیما قطریس تھا جو آج سے ڈھائی ہزار برس قبل انھی سخت ذرات کی توصیف بیان کرچکا ہو۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ذرے اور چھوٹے ذرات مین منقسم نہین ہو سکتے اس لئے ذرات دیما قطریسیہ کو بعد ازان اجزائے لا یتجزی کہا گیا۔ نمک پانی مین ڈالیئے دونو اشیا مل کر ایک جسم ہو جاتے ہین اور حجم مین بالکل

اضافہ نہیں ہوتا۔ سخت سے سخت جسم مین بھی نوکدار مینخ ٹھونکی جاسکتی ہو اس قسم کے مختلف مشاہدات اور تجارب سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہو کہ ذرات کے درمیان خالی جگہین بھی ہوتی ہین۔ فلارنس کے فلسفیون نے زمانہ قدیم مین اس امر کے متعلق اپنا اطمینان اسطرح کیا تھا کہ اُنھون نے سونے کا ایک مجوف کرہ بنایا اور اس مین پانی بند کرکے کرہ کی جسامت کو نہایت زبردست دباؤ سے کم کرنا چاہا۔ فی الاصل ان فلسفیون کا منشا اس بات کی تحقیق کرنا تھا کہ پانی دباؤ سے حجم مین کم ہوسکتا ہو یا نہین؛ لیکن تجربہ کا طریقہ غلط ہونے کی وجہ سے انھین یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ سونا جس کو سب اشیاء سے زیادہ ٹھوس اور سخت سمجھا جاتا تھا وہ بھی مسامدار ہو۔ لیکن اس کے ذرات کے درمیان خالی جگہین ہین۔ گیسون کی حالت مین یہ تجربہ نہایت آسان ہو۔ اگر ایک بند منھ والے بہت بڑے برتن مین جس مین سے آلۂ مخراج الہوا سے ہوا خارج کردیگئی ہو کوئی گیس مثلاً ہائیڈروجن یا کلورین تھوڑی سی مقدار مین بھی داخل کردی جائے تو وہ قلیل مقدار گیس کی برتن کے سب حصو مین یکسان پھیل جاتی ہو۔ اگر اجسام ذرات سے مرکب ہین اور انکے ذرات کے درمیان کوئی خالی جگہ نہین تو یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہو کہ قلیل مقدار گیس ایک بہت بڑی جگہ مین پھیل جائے۔

حاصل کلام۔ دیماقراطیس سے لیکر انیسوین صدی عیسوی تک یہ مسئلہ سالمات یعنی ایٹم ایک تھیوری سائنس مین ایک مسئلہ تھیوری تھی۔ بیسوین صدی کے شروع مین ریڈیم کی دریافت کے بعد اور برقی رو (Electric Current) کے خواص کے مطالعہ سے جبکہ برقی رو انابیب[1] خلائی مین گذاری جاتی ہو بہت سی ایسی باتین ثابت ہوئین جنکی تسلی وہ تشریح مسئلہ سالمات کی بنا پر کرنی ناممکن تھی۔ اب سائنس دان اس امر پر مجبور ہین کہ ذرات کو غیر منقسم نہ مانین بلکہ تازہ ترین قیاس جو کہ نظریہ برقیہ (Electron Theory) کی شکل مین ظاہر ہوا ہو یہ ہو کہ مادی ذرات (Atoms) برقی سالبہ یعنی Negative Electricity کے نہایت ہی چھوٹے اور ننھے ننھے ذرات سے مرکب ہین۔ اگر مین آپ کو بتاؤن کہ ایک پانی کے قطرے مین اربہا مادی ذرات ہوتے ہین اور ایک مادی ذرہ بھی ہزارہا برقی ذرات سے مرکب ہوتا ہو اور پھر آپ کو یہ بھی بتاؤن کہ موجودہ سائنس نے اس قدر حیرت انگیز ترقی ہو کہ ہر ایک برقی ذرہ اور ہر مادی ذرہ کا حجم اور وزن ہم کو معلوم ہو تو آپ ضرور شروع مین میری بات کا یقین نہ کرینگے لیکن اگر مین آپ کو ایک مثال سے ان ذرات کا صحیح اندازہ کرادون تو شاید آپ کا تعجب اور بھی زیادہ ہوجائیگا۔ لارڈ کیلون ایک نہایت قابل اور زبردست سائنس دان ہوگزرا ہو اُسنے ایک دفعہ تقریر کرتے ہوے سامعین کو مادی ذرات کا حجم اور وزن سمجھانے کیلئے یہ مثال دی تھی۔ فرض کرو کہ پانی کا ایک قطرہ زمین کے برابر بڑا کیا جاتا ہو[2]۔ اور اس قطرہ کے ذرات اس تناسب سے حجم مین بڑھتے ہین تو اس زمین کے برابر بڑے قطرے پانی مین ذرات یعنی مالیکیول Molecules ٹینس بال کے برابر دکھائی دینگے۔

یہان یہ سوال پیدا ہوتا ہو کہ اگر سائنس نے یہان تک ترقی کی ہو کہ مادے کے چھوٹے سے چھوٹے ذرات تک کی ترکیب کا مطالعہ صحیح طور پر کرلیا ہو تو پھر مادہ فی الاصل کن اشیاء کا مرکب ہو۔ مانا کہ مادی ذرات برقی ذرات (Electrons) کا مجموعہ ہین لیکن یہ نہین معلوم کہ برقی ذرات یا وہ نامعلوم الہیئت طاقت جسے ہم لوگ عرف عام مین بجلی کے نام سے تعبیر کرتے ہین کیا ہو۔ بعض سائنس دان اس سے بھی آگے ایک قدم بڑھتے ہین۔ ان کا دعوی ہو کہ بجلی اس ایتھر سے پیدا ہوتی ہو جو فضائے بسیط مین پھیلا ہوا ہو۔ یہ تشریح اصلی مسئلہ پر بہت کم روشنی

---

[1] Vacuum Tubes جن کو بعض اوقات Giesslar's Tubes بھی کہا جاتا ہو۔

[2] یاد رہے کہ زمین کا قطر تقریباً آٹھ ہزار میل ہوتا ہو اور پانی کے قطرہ کا قطر زیادہ سے زیادہ انچ کا بارھوان حصہ ہوسکتا ہو۔

ڈال سکتی ہو اسواسطے کہ خود ایتھر کے متعلق ہماری معلومات نفی کے برابر ہین نہ ہم اسے تول سکتے ہین نہ چھو سکتے ہین نہ سونگھ سکتے ہین کسی حس سے اسکا پتہ نہین لگا سکتے اور نہ ہی کوئی اور سیدھا ذریعہ اس کے خواص کو مطالعہ کرنے کا ہمین معلوم ہو۔ ہم چونکہ یہ بات مانتے ہین کہ نور (Light) ایک طرح کا تموج ہو اور تموج کے لیے ضرور کوئی ایسی چیز ہونی چاہیے جس مین تموج پیدا ہو سکے اس لیے اس شرط کو مان کر ہمنے نوری تموج کے میڈیم کو ایتھر کے نام سے ملقب کیا ہو۔ اب صرف یہ کہنے سے کہ بجلی ایتھر مین ایک طرح کی مڑوڑ (Strain) پیدا ہونے سے حاصل ہوتی ہو بجلی یا مادہ کے متعلق ہماری معلومات مین ایک ماشہ بھر بھی اضافہ نہین ہوا۔ ہان ایک لمحہ کے لیے اگر یہ بھی مانا جائے کہ بجلی ایتھر پر مخصوص طریقون سے عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہو تو بھی سوال یہ باقی رہتا ہو کہ ایتھر کیا ہو؟ کیسے حاصل ہوتا ہو؟ اور کس چیز سے بنا ہو؟

اس لمبی بحث سے ہمین چند ایک مفید مطلب نتائج حاصل ہوتے ہین۔ سائنس دان کا کام صرف یہ ہو کہ اشیاء اور حوادثات کو ایک خاص حد تک لفظون مین بیان کر دے۔ وہ ہرگز اصلی اور حقیقی اسباب کی تحقیق نہین کر سکتا۔ اس کا دریافت کردہ سلسلہ علت معلول کبھی ختم نہین ہو سکتا پس ہماری رسائی صرف ثانوی اسباب یعنی Secondary Causes تک ہو سکتی ہو اصلی اسباب Primary Causes ہماری عقل و فہم سے بالاتر ہین۔ ہم چیزون کے متعلق کیون کا جواب دینے کی طاقت نہین رکھتے ہم یہ نہین بتا سکتے کہ مادہ مین یہ خواص کیون ہین؟ ہم صرف اتنا بتا سکتے ہین کہ یہ خواص اسطرح پر ہین زیادہ سے زیادہ ہم ایک نظریہ (Theory) قائم کرتے ہین اور کہتے ہین کہ چونکہ یہ خواص اس نظریہ کی رُو سے صحیح طور پر سمجھ مین آ سکتے ہین اس لیے یہ نظریہ صحیح ہو۔ باوجود اپنی تمام کوششون کے

سائنس دان نہین جانتے کہ مادہ کا ایک ذرہ کس طرح بنا ہو؟ اور یہ مشکل ایسی ہو کہ باوجود اتنی ترقی کے سائنس دان اعتراف کرتے ہین کہ سردست یہ خیال بھی ان کے دماغ مین نہین آ سکتا کہ مادہ کا ایک ذرہ کیسے بنا ہو چہ جائیکہ یہ دعویٰ ہو کہ ہم مادہ کا ذرہ بنا سکین جب یہ حالت ہو تو آفرینش عالم کے متعلق ہزار نظریے دوڑائے جائین سب کے سب محدود و غیر مکتفی ثابت ہون گے۔ ڈارون کا مسئلہ ارتقا بتاتا ہو کہ دُنیا کی ترقی کس طرح ہوئی ہو۔ کس طرح چند سادہ قسم کے حیوانات سے ترقی کرتے کرتے موجودہ زمانے کے بیشمار مختلف الانواع چرند پرند و غیرہ مخلوقات پیدا ہوئے ہین۔ لیکن یہ بتانا اصلیب ترین اور ناممکن ہو کہ کس طرح سب سے اول "چند سادہ قسم کے حیوانات" پیدا ہوے۔

اس مقام پر پہنچ کر یہ بتا دینا لطف سے خالی نہ ہوگا کہ گذشتہ سال انگلستان کے سائنس دانون مین اس امر کی ہل چل تھی کہ ایک صاحب مسئلہ حیات پر روشنی ڈالنے والے تھے جس طرح مین نے مادہ کے متعلق بتایا ہو کہ وہ برقی ذرات وغیرہ نامعلوم الہیئت اجزاء سے مرکب ہے اسی طرح سائنس نے زندگی کے مسئلہ کے متعلق بھی بہت کچھ اختصار کی کوشش کی ہو۔ مثلاً کثلۃ الاولی (Protoplasm) اور سیلون (Cells) کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہو لیکن ابتک مسئلہ حیات اور روح کے اصلی حل کے متعلق ہنوز روز اول کا معاملہ ہے اور نہ ہی سائنس کو امید ہو کہ صدیون کے بعد بھی ایک ادنیٰ سے ادنیٰ کیڑا پیدا کر سکے۔

یہی مسئلہ ارتقا نظام عالم کے مختلف افراد کی خلقت کے متعلق بھی بحث کرتا ہو۔ کہا جاتا ہو کہ اجرام سماوی مثلاً ستارے سیارے آفتاب وغیرہ اجسام شروع مین گیسی (Gaseous) یا بخورون کی حالت مین تھے۔ صدیون کے انجماد سے موجودہ حالت پر آئے ہین ہمارے نظام شمسی کے متعلق یہ قیاس ہو کہ تمام سیارے فی الاصل

لہ انگریزی اصطلاح مین ایسے جسم کو Medium کہتے ہین اُردو مین ہمین کوئی اصطلاح اسکے مترادف نہین ملتی۔

آفتاب کے حصے تھے جو کسی وجہ سے علیحدہ ہوگئے اور جسطرح کہ لوہے کا ایک گرم گیند ہوا مین پڑے رہنے سے ٹھنڈا ہوجاتا ہے اسی طرح سیال کرے ٹھنڈے ہوکر منجمد ہوگئے ہین۔ لیکن چونکہ آفتاب بہت بڑا ہے اسلیے ابھی تک اس کی حرارت بغیر کسی قسم کی نمایان تبدیلی کے اسی درجۂ حرارت پر قائم ہے۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ آفتاب مین کونسی ایسی چیز ہے جس کی بدولت یہ آگ سے زیادہ گرم رہتا ہے پیشتر اس کے کہ مین حرارت شمسی کے مسئلۂ بقا پر چند خیالات ظاہر کرون مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہان حرارت شمسی کے متعلق چند اعداد بتا دون۔

مختلف دلائل سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ آفتاب ٹھوس نہین ہے بلکہ اس کا اندرونی حصہ مائع اور سیال ہے اور بیرونی حصہ پر جلتی ہوئی گیسون اور معدنی انجرون کے بادل ہین جو سورج کے گرد بمنزلہ زمین کے کرۂ ہوائی کے ہین۔ بہت سے تجارب کی بناء پر یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ سورج کی گرمی ۶۰۰۰ سنٹی گریڈ درجۂ حرارت کی ہے جس سے مراد یہ ہے کہ اگر برف اور بھاپ کی گرمی کے درمیان ۱۰۰ درجے سنٹی گریڈ کا فرق سمجھا جائے تو آفتاب کی گرمی اتنی تیز ہے کہ اسے ۶۰۰۰ سے تعبیر کرین گے۔ اگر آپ کو مختلف معدنی اور غیر معدنی اجسام کے پگھلنے اور کھولنے کے درجہ ہاے حرارت کا اندازہ معلوم ہے تو آپ دیکھین گے کہ سورج کی گرمی مین سب ٹھوس جسم مائع اور ہوائی حالت مین ہین۔ سورج کی گرمی کا اندازہ ایک اور طریقہ سے بھی ہو سکتا ہے مختلف آلات کی مدد سے (جن کو مقیاس حرارت الشمس کہتے ہین) اس بات کا اندازہ لگانا کہ ایک مربع فٹ سطح زمین پر فی منٹ کس قدر حرارت پڑتی ہے چندان مشکل نہین ہے لیکن ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ ہمارے اور سورج کی گرمی کے درمیان ہوا کی ایک کثیف تہ ہے جو اس گرمی کا بہت بڑا حصہ یا تو جذب کرلیتی ہے یا فضاے بسیط مین منعکس کردیتی ہے۔ بہرکیف یہ مشکل بھی حل ہوسکتی ہے اور پھر ہم صحیح طور پر اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہین کہ ۹ کروڑ ۲۴ لاکھ میل کی مسافت کے بعد ایک مربع فٹ پر کس قدر گرمی کی بارش ہوتی ہے۔ اب خیال فرمائیے کہ کرۂ زمین کی سطح کے ہر ایک مربع فٹ پر یکسان مقدار مین گرمی کی بارش ہوتی ہے اور پھر خیال فرمائیے کہ سورج زمین کا خاص طور پر لحاظ نہین کرتا کہ زمین کی جانب زیادہ گرمی بھیجے اور باقی اطراف مین کم بلکہ امر واقع یہ ہے کہ گرمی کی بارش سورج کی سطح سے تمام اطراف وجوانب مین یکسان ہو رہی ہے گویا سورج کو مرکز مان کر ایک وسیع دائرہ کے اوپر جسکا نصف قطر ۹ کروڑ ۲۴ لاکھ میل ہے، ہر منٹ مین اسی حساب سے گرمی پڑتی ہے جس حساب سے کہ سطح زمین کے ایک مربع فٹ پر پڑتی ہے۔ اس سے پوری مقدار گرمی کی جو سورج کی سطح سے باہر کی طرف آتی ہے معلوم ہوجاتی ہے۔ اب اگر اس مقدار کو سورج کی سطح سے تقسیم کردیا جائے تو فی مربع فٹ سورج کی سطح سے جتنی گرمی فی منٹ نکلتی ہے اُس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

صحیح تجربون سے نتیجہ نکالا گیا ہے کہ فی منٹ سطح زمین کے فاصلے پر تین کیلوری[۱] گرمی پڑتی ہے جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اس دائرہ کا رقبہ جس پر اسی حساب سے گرمی پڑتی ہے $(\frac{22}{7} \times 924000000)^2$ مربع میل ہے اور سورج کی سطح کا رقبہ $(\frac{22}{7} \times 430000)^2$ مربع میل ہے گویا کہ فی مربع فٹ سورج کی سطح فی منٹ $3 \times (\frac{92400000}{430000})^2 = 4600 \times 3 \times 2$ کیلوری نکلتی ہے۔ لارڈ کیلون نے اندازہ کیا ہے کہ اگر سوا مربع گز سطح سورج پر ایک برتن رکھا جاے اور اُس مین پانی کھولنے کے لیے ڈالا جائے تو فی منٹ جس قدر بھاپ اس برتن مین پیدا ہوگی اُس سے ۷۰ ہزار گھوڑون کی طاقت کے برابر کام لیا جا سکتا ہے۔ اب اگر اسی حساب سے تمام سطح

---

[۱] ایک سیر پانی کو ایک درجۂ حرارت گرم کرنے کے لیے جتنی حرارت درکار ہوتی ہے اس مقدار کو کیلوری کہتے ہین۔ انگریزی زبان مین ایک اور کیلوری بھی مروج ہے جسے چھوٹی کیلوری کہتے ہین اور وہ اس کیلوری کا ہزاروان حصہ ہوتی ہے۔ ایک سیر پانی کو درجۂ حرارت سے بھاپ کے درجۂ حرارت تک گرم کرنے کے لیے سو کیلوری کی ضرورت ہوگی۔

سورج کی گرمی کی طاقت کا اندازہ لگایا جائے تو عقل کو سخت حیرت ہوتی ہو۔ بعض سائنس دانوں نے حساب لگایا ہو کہ اگر سورج محض کوئلہ بنا ہوا ہو اور یہ کوئلہ آکسیجن گیس کی مدد سے پورے طور پر جلایا جائے تب بھی جس حساب سے سورج میں سے گرمی خارج ہو رہی ہو اس حساب سے یہ کوئلہ کی گ بہت تھوڑے عرصے میں جو چند ہزار سالوں سے زیادہ نہ ہوگا ختم ہو جائے گی۔ سائنس کے ذریعہ سے ہم کو معلوم ہو کہ سورج کی گرمی اسی طرح لاکھوں برس سے اسی حساب سے خارج ہو رہی ہو لہذا یہاں وہ نہایت اہم اور مہتم بالشان مسائل حل طلب پیدا ہوتے ہیں (۱) سورج کی گرمی کے ذخیرے کی بقا کن وجوہات پر مبنی ہو (۲) فی الاصل شروع میں یہ ختم ہونیوالا گرمی کا ذخیرہ کس طرح پیدا ہوا تھا۔ سائنس کی ترقی ملاحظہ ہو کہ ایسے ادق مسائل کا جواب بہم پہنچاتی ہو، وہ مسائل جو کہ قطعاً انسانی دسترس سے باہر ہیں۔ کہاں سورج اور کہاں چھوٹا سا انسان! لیکن خداداد دماغ کے کارنامے دیکھئے! یوروپ والوں نے ایک بہت بڑی حد تک ان سوالات کا جواب بھی خاطر خواہ طور پر دیدیا ہو۔ اس تحقیقات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا ایک چھوٹے سے مضمون میں ممکن نہیں ہو۔ ہم یہاں صرف اشارات کے طور پر اس تحقیقات کے نتائج بیان کرتے ہیں۔

کسی زمانے میں پہلے یہ نظریہ قائم ہوا تھا کہ بیرونی اجسام کے گرنے سے اور ان کی رگڑ سے سورج کی گرمی بڑھتی رہتی ہو۔ آپ نے دیکھا ہوگا شہاب ثاقب جب زمین کے کرۂ ہوائی میں پہنچتے ہیں تو ہوا کی رگڑ سے جل اٹھتے ہیں اور ریزہ ریزہ ہو کر فنا ہو جاتے ہیں۔ اگر اسی طرح بیرونی اجسام کافی مقدار میں سورج کی سطح پر گرتے ہوں تو سورج کی گرمی کے نقصان کی تلافی ہو سکتی ہو۔ لیکن مشاہدات سے ثابت ہوتا ہو کہ نظام شمسی میں اسقدر وافر مقدار میں ایسے مادی اجسام نہیں ہیں جو سورج کی گرمی کو اپنے صدموں سے قائم رکھ سکیں کیونکہ حرارت شمسی کے سالانہ خرچ پورا کرنے کے لیے اتنے مادی اجسام کافی تیزی کے ساتھ سورج کی طرف گرنے چاہئیں کہ ان کی مجموعی مقدار چاند کے برابر ہو جائے۔

اس کے علاوہ اور بہت سی تشریحات شمسی حرارت کے بقا کے متعلق پیش کی گئی ہیں لیکن وہ سب کی سب فی زمانا متروک ہیں۔ لہذا ہم ان سے قطع نظر کر کے موجودہ زمانہ کے آخری اور اغلب قیاس کو جسے سب سائنس دان تسلیم کرتے ہیں بیان کرتے ہیں: ایک جرمن سائنس دان ہیلم ہولٹز کے دماغ میں کیا ہی عمدہ خیال آیا۔ زمین کی کشش کی وجہ سے تمام چیزیں جو زمین کی سطح پر ہیں زمین کے مرکز کی طرف اس رفتار سے گرتی ہیں کہ ہر ثانیہ میں انکی رفتار میں ۳۲ منٹ کا اضافہ ہو جاتا ہو گویا ایک غیر متحرک جسم پہلے ثانیہ میں ۱۶ فٹ گرے گا۔ اسی طرح سورج کی کشش سے تمام جسم سورج کی سطح پر اس سے ۲۸ گنا زیادہ رفتار سے یعنی پہلے ثانیہ میں ۴۴۸ فٹ گریں گے۔ اس مقام پر ایک اور مسئلہ کا مختصر سا ذکر لازم آتا ہو۔ مالیکیولر تھیوری (نظریہ اتصالی) کے مطابق اجسام کے ذرے ہمیشہ متحرک ہوتے ہیں اور ان کی حرکت کا نام حرارت ہو گویا جتنی تیزی کیساتھ جسم کے ذرے ہلتے ہوں اسی قدر زیادہ بڑھا ہوا اس جسم کا درجہ حرارت ہوتا ہو۔ اب خیال فرمائیے۔ گرمی کے اخراج یعنی شمسی حرارت کے سالانہ خرچ سے، سورج کے مادہ کے ذرات کم تیزی سے حرکت کرتے ہیں لیکن سورج کی کشش کی وجہ سے یہ کمی پوری ہوتی ہو۔ یہ اجمال بہت لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئیگا۔ اس کی توضیح اسطرح بھی ہو سکتی ہو کہ اگر ایک جسم ایک خاص فاصلے سے نیچے گرے تو اسکے صدمہ سے جو اسکی حرکت کے رکنے سے پیدا ہوتا ہو خاص مقدار گرمی کی پیدا ہوتی ہو۔ سورج چونکہ مائع اور ہوائی گرم اجسام سے بنا ہو، اندازہ لگایا گیا ہو کہ اگر ہر سال ٹھنڈا ہونے سے حجم میں جو کمی واقع ہوتی ہو اس سے سورج کا قطر صرف سوا دو سو فٹ چھوٹا ہو تو جو اجسام بیرونی سطح پر واقع ہیں انکے مرکز کی طرف گرنے سے اتنی گرمی پیدا ہو سکتی ہو کہ سالانہ خرچ کو پورا کر سکے۔ یہ سوا دو سو فٹ سالانہ قطر کی کمی اتنی قلیل مقدار ہو کہ

سورج جیسے بڑے جسم مین صدیون کے بعد بھی اس گھٹاؤ کا اثر ہمکو ہماری زبردست سے زبردست دوربینون کے ذریعہ سے بھی معلوم نہین ہو سکتا۔ اس لیے اس قیاس کی براہ راست تصدیق ہونا مشکل ہی لیکن چونکہ جو دلائل اس قیاس کے ثبوت مین پیش کی گئی ہین سب نقص سے مبرا ہین اس لیے کسی اور بہتر قیاس کے ہونے کی حالت مین اسے عام طور پر علمی دُنیا مین صحیح مانا جاتا ہی۔

اب ہمنے یہ تو ثابت کر دکھایا ہی کہ سورج کی گرمی باوجود اس قدر اصراف کے بھی کم ہونے سے محفوظ ہی۔ لیکن دوسرا سوال باقی رہجاتا ہی کہ شروع مین یہ گرمی کیسے پیدا ہوئی؟ اسکے متعلق زیادہ رائے زنی ابھی تک نہین ہوئی لیکن قیاس کیا جاتا ہی کہ اگر کرۂ زمین سے نصف قطر کے زمین کے مانند دو ٹھوس کرے ۹۱ کروڑ میل کے فاصلے پر واقع ہون اور بغیر کسی قسم کی مزاحمت کے وہ ایک دوسرے کے مرکز کیطرف کھنچ آئین تو گو شروع مین ان کی حرکت بہت سست ہوگی لیکن چھ ماہ کے بعد وہ اسقدر زور کے ساتھ ایک دوسرے سے ٹکرائین گے کہ حرارت جو اس خوفناک صدمہ سے پیدا ہوگی سورج کی حرارت کے برابر ہوگی اور جو جسم صدمہ کے بعد ان دونون کے اجتماع سے پیدا ہوگا وہ حرارت کی شدت سے سورج کے برابر ہوگا اور اس کی گرمی کئی کروڑ سال کے لیے سورج کی طرح کافی ہوگی اسطرح بعض سائنس دانون کا خیال ہی کہ ہمارے سورج کی بھی ابتدا ہوئی ہوگی کیونکہ آئے دن کے مشاہدات ثابت کرتے ہین کہ ستارون کی دُنیا مین نئے نئے سورج پیدا ہو رہے ہین جن کے یک لخت ظہور کی وجہ اسی طرح بیان کی جا سکتی ہی۔

یہ ہین حضرت انسان کے مزاج کی جولانیان لیکن سائنس ترقی کے باوجود یہ نہین بتا سکتی کہ وہ دو کرّے جن سے سورج پیدا ہو سکتا ہی ان مین کا ایک ذرہ بھی کسطرح پیدا ہوا؟ سائنس روح اور مادہ اور خلق عالم کے متعلق آج اسی طرح عاجز ہی جس طرح صدیون پہلے عاجز تھی۔ کیونکہ جو آگے سائنس آج اتنی ہی دور ہی جتنی ہمیشہ رہی ہی۔ گویا سائنس ان انتہائی مسائل پر کبھی روشنی نہین ڈال سکی اور ہمارا یہ خیال ہی کہ کبھی بھی ان پر روشنی نہین ڈال سکے گی اور اسی طرح ابدالآباد تک غیر مکمل رہیگی۔ البتہ سطحی معلومات ہم پہنچاتی رہیگی۔ ہمارے بعض ناظرین شاید اس مضمون کے مطالعہ سے ہماری ان یاس آمیز توقعات سے اختلاف کرین۔

فیروز الدین مراد

علم النجابت[۱]

چارلس ڈارون نے اپنی عمر بھر کی تحقیقات سے انسان کے جسمانی قوا کے نمو اور ارتقا کے تمام قوانین کو واضح کر دیا ہی اور اپنی وسیع اور کہنہ سال تحقیقات کے جملہ نتائج کو دو کتابون مین ظاہر کیا ہی انمین ایک تو آغاز الانواع ہی اور دوسری "انسان کی ابتدا کس طرح ہوئی"

۱؎ یہ لفظ یوجنکس (Eugenics) کا ترجمہ ہی۔ یوجنکس یونانی زبان کی اصطلاح ہی جو "یوجن" سے نکلی ہی جس کے معنی "شریف زادہ اور نہایت شائستہ" ہین۔ ڈاکٹر فرنسیس ڈالٹن نے ۱۸۸۳ء مین پہلے پہل اس کو استعمال کیا۔ اس کے ذریعہ سے اُنھون نے علم المعاشرت کے ایک جدید شعبہ کی بنیاد ڈالی اور اس کو ایک جداگانہ شعبہ علم سے موسوم کیا۔ اس کا مقصد اُن اسباب و اثرات کی تحقیقات کرنا ہی جن کے طفیل سے بنی آدم کی جبلی خوبیون کی نمو درجۂ کمال تک ہو سکتی ہی۔ یا بالفاظ دیگر یون کہئے کہ نسل انسانی کی اعلیٰ درجہ کی اخلاقی جسمانی اور ذہنی تربیت و ترقی اس نو زائیدہ علم کا مقصود اولی ہی۔ اگرچہ علم النجابت کے حامیون مین کلی اتفاق نہین ہی کہ اس کے بنیادی اصول کیا ہون مگر عام طور پر قانون توارث اور جدی اثر اسکی اصل ہین۔

جسمین انسان کے پیٹ مین پڑنے اور مضغہ کے پرورش پانے اور پھر عالم موجودات مین ظہور پذیر ہو کر رفتہ رفتہ بڑھنے کا ذکر پایا جاتا ہی۔ اِن دونون کتابون کی اشاعت سے انسان کے علوم کی تاریخ مین ایک جدید دور کا آغاز ہوا اور بالکل نئے خیالات معرض وجود مین آئے۔ ارتقا کے دو مشہور اور معرکۃ الآرا اصولون کی اختراع بھی ڈاروِن کے نام سے ہمیشہ وابستہ رہیگی۔ ایک مشہور قانون نیچرل سیلکشن یعنی انتخاب طبعی یا فطری ملبت ہی جسکا مطلب یہ ہی کہ قدرت نے جن جاندارون کو زیست کے واسطے منتخب کیا ہی انھین اُسنے سامان بھی ویسے ہی دیئے ہین اور جنھین وہ زندہ اور قائم نہین رکھنا چاہتی انھین اسنے محروم کر دیا ہی اور وہ تھوڑے ہی عرصے مین نابود ہو جاتے ہین۔ مگر وہ کسطرح ہلاک ہو جاتے ہین یہ عمل کیفیات یعنی اردگرد کے حالات اور اسباب کے ذریعے سے ہوتا رہتا ہے، اور یہ قانون نباتات اور جاندارون پر یکسان عائد ہوتا ہی کشاکش زیست یا جہد الحیوٰۃ کی طبعی صلاحیت جن جاندارون مین موجود نہین ہی وہ اسباب کا شکار ہو جاتے ہین۔ دوسرا قاعدہ انتخاب زناشوئی (Sexual Selection) ہی یعنی جاندار اپنے حسب منشا اپنے واسطے نر اور مادہ منتخب کرتے ہین اور اس سے نوع یعنی اولاد کی جسمانی خوبیون مین تغیر اور ترقی ہوتی ہی۔ انھین دونون اُصولون کی بدولت بن مانس اپنی حالت بدلتے بدلتے آخرکار انسان بنگیا، جو اشرف المخلوقات اور خداوند خلقت کہلاتا ہی۔

اب سوال یہ ہی کہ کیا اِن ہر دو قدرتی اصولون کے عمل مین رخنہ اندازی کرنا مناسب ہی؟ اسکا جواب بہم پہنچانے سے پیشتر اسلاف کی تاریخ پر غور کرنا واجب معلوم ہوتا ہی۔ انھون نے اس مسئلہ کو کس طرح حل کیا تھا، اور اُن کے ہان افراد قوم کی جسمانی اور ذہنی تربیت اور ترقی کے لیے کیا انتظام تھا۔ تاریخ کے ابتدائی زمانہ مین ملک اسپارٹہ نے اپنی تمدنی ترقی اور ملک گیری کے لیے خاص شہرت حاصل کر رکھی تھی۔ اہل اسپارٹہ کا طرز معاشرت اور ملکی انتظام نہایت اعلیٰ سمجھا گیا تھا۔ وہان لائکرگس نامے ایک نہایت مقتدر مقنن اور نہایت مشہور مدبر تھا۔ وہ سیاسیات کا ماہر اور موجد خیال کیا جاتا ہی۔ اس نے تربیت جسمانی کا ایک طریقہ وضع کیا تھا جسکی رُو سے مان باپ اپنے کمزور اور ناتوان بچّون کو جنگلون اور پہاڑون مین پھینکنے پر مجبور تھے تاکہ وہ بھوک پیاس سردی اور گرمی کی شدت سے ہلاک ہو جائین۔ اسکا مقصود یہ تھا کہ قوم کے درمیان دائم المریض اور ناتندرست افراد نہ رہنے پائین جو اسکی قومی ملکی اور عام حالت کے زوال کے موجب ہو سکتے ہین۔ لائکرگس کے قانون کے مطابق پیدا ہوتے ہی بچہ شہریونکی ذیل مین تصور ہوتا تھا۔ سرکار کی طرف سے اسکی نگرانی اور پرورش ہوتی جب جوان ہو جاتا تو اسکی جسمانی قابلیت اور طاقت کا امتحان ہوتا۔ اس غرض سے اسے ارتمس دیوی کے مندر مین لیجاتے اور کوڑے مار مار کر اسکی پیٹھ ادھیڑ دیتے بہتیرے مرجاتے مگر اُف تک نہ کرتے اور اس آزمائش مین پورے اُترنے والے "مشاہیر کے زمرہ" مین شامل ہو جاتے۔ اسکی روزانہ زندگی سخت قواعد کے تابع رہتی اور جب پورا جوان ہو جاتا اور شادی کر لیتا تو اسے خاص قانون کی پابندی کرنی پڑتی۔ لائکرگس نے سب سے زیادہ زور تربیت جسمانی پر دیا تھا اور اسکا انجام یہ ہوا کہ وہان نہایت قوی ہیکل اور توانا آدمیون کی قوم پیدا ہو گئی۔ مگر انکی عقلی اور اخلاقی تربیت کا کوئی خاص انتظام نہ تھا جسکی وجہ سے وہ نرے جفاکش دلاور سپاہی رہے اور ملک گیری مین نام پیدا کیا مگر اپنے ہمسائے یونانیون کیطرح علوم و فنون اور تمدنی لوازم کی ترقیون مین غیرفانی شہرت حاصل نہین کی اور نہ اپنا اثر اپنے اردگرد کی قومون پر ڈالا۔ مگر جیسا زرق سیص (Xerxes) نے یونان پر بیشمار فوج کے ساتھ حملہ کیا تو لیونیداس شاہ اسپارٹہ نے درہ طرماپلی مین صرف تین سو سپاہیون کے ساتھ اس بیقیاس لشکر کا مقابلہ کیا اور اسے ایک قدم آگے نہ بڑھنے دیا۔ ہان جب ایک بے ایمان غدار ملک کی غداری سے ایرانی لشکر دوسرے راستے سے گزرا اور اسنے ان

مرد شہی بھر دستہ کے عقب پر جا پڑا تو ملک یونان کے ایک حصہ پر اُسکا تسلط ہو گیا۔

طب کے وسیلے سے بنی آدم کو بیحد فائدہ پہنچا ہو۔ سیکڑون امراض کی اصلیت ظاہر ہو چکی ہو اور انکے مختلف علاج بھی معلوم ہو گئے ہین۔ اسکے وسیلے سے انسان کو بہت آرام و آسائش پہنچ رہی ہو مگر یوجنکس یعنی علم النجابت کے وسیلے سے اسے اس سے بھی زیادہ فیض پہنچنے والا ہو جن بیماریون سے بنی آدم کو تکلیف پہنچتی ہو اسکے ذریعے سے انکا استیصال ہو جائیگا۔ اہل سپارٹہ نے تربیت جسمانی کے وسیلہ سے اس گتھی کو سلجھایا تھا۔ مگر اس کا ایک بڑا نقص یہ تھا کہ اسکے رُو سے جن کمزور بچون کو جنگل مین پھینکدیا جاتا تھا انمین کئی ایسے بھی ضرور ہونگے جو اگر زندہ رہتے تو انکی غیر معمولی لیاقت اور دانائی نہ صرف اپنی قوم ہی کے لیے مفید ہوتی، بلکہ بنی آدم بھی مستقل فائدہ حاصل کرتے کیونکہ غیر معمولی ذہانت والے ہمیشہ توانا اور قوی ہیکل آدمی نہین ہوتے۔

اب علم النجابت کے مسائل کی طرف رجوع ہونا چاہیئے۔ کس وسیلے سے انسان کی عقلی اور جسمانی قوتون مین ترقی ہوسکتی ہو؟ مرد و عورت کے تعلقات کیسے ہونے چاہئین؟ کیا مختلف نسلون کے مرد و عورت کی شادی اس مقصد مین معاون ثابت ہوسکتی ہو؟ تمدنی معاملات مین حکومت کو کس حد تک دست انداز ہونا چاہیئے؟ اور اس مقصود کی کامیابی کا معیار کیا ہو جس سے معلوم ہو کہ اس وسیلے سے ایک جماعت کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا ہو؟ ان سوالات پر یکے بعد دیگرے بحث کی جائے گی۔

شادی

شادی کا دستور نہایت پُرانا اور واجب الاحترام ہو۔ اسے کچھ ایسے ادب کی نظر سے دیکھا جاتا ہو کہ بڑے سے بڑا رند بھی اسے ناپاک کرنے کی جرأت نہین کرسکتا۔ گھر کے اندر جو راحت و آرام انسان کو حاصل ہوتا ہو اسے وہ بدیے زمین پر کسی دوسری جگہ یا کسی دوسری حالت مین ہرگز حاصل نہین ہوسکتا۔ گھر اسکے خیالات کا مرجع اور اُسکے جذبات کا مرکز ہو۔ دُنیا کے دکھون اور تکلیفون سے بچنے کی پناہ یہی گھر ہو۔ یہان اسے کیسے کیسے تجربے حاصل ہوتے ہین جن سے وہ کسی اور جگہ دوچار نہین ہوتا ہو۔ ہر زمانے کے شاعر اور فلاسفر گھر کی خوشیون کا چرچا کرتے رہے ہین۔ جابجا میان بیوی اور مان باپ اور اولاد کے نازک اور خوشگوار تعلقات کی تعریف کیگئی ہو، اور یہ مضمون ہمیشہ تازہ اور پُرلطف رہتا ہو۔ مگر زمانۂ حال کے تمدن کی ضروریات اور نمود و نمائش کی وجہ سے رہنے سہنے کے اخراجات کچھ ایسے بڑھ گئے ہین کہ شادی صرف امیرون کیلئے مخصوص ہو رہی ہو۔ معمولی لوگون مین یہ مقدرت کہان کہ وہ اس سے حظ اور خوشی حاصل کرین اور آرام و آسائش کی زندگی گزارین۔ نر و مادہ کے درمیان جو کشش باہمی موجود ہو وہ قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی ہو اور کشش نسل بڑھانے اور قائم رکھنے کی موجب ہوتی ہو۔ اگر یہ نہو تو تمام جاندار حیوان اور انسان نابود ہوجائین۔ زناشوئی کے جذبات قدرت کے عطیہ ہین جنھین اگر ناجائز طریقے سے پورا کیا جائے تو انسان کو اسکا خمیازہ اُٹھانا پڑتا ہو اور قدرت کا اصل مقصد فوت ہوجاتا ہو۔

نہایت ابتدائی زمانے مین جب بنی آدم تمدن کے نہایت ابتدائی مراحل مین تھے تو عورت کو زبردستی پکڑ کر بیوی بنا لیا جاتا تھا۔ یہ کام صرف شہزور اور بہادر آدمی انجام دے سکتا تھا اور وہی اس سے مستفید ہوتا تھا۔ مگر جب اسنے شائستگی مین ترقی کرلی تو اسکے خیالات مین تبدیلی واقع ہوئی۔ تمدنی طریق مین بھی نمایان انقلاب ہوا۔ عورت کو پکڑنے کے بجائے انتخاب اور باہمی رضامندی سے باقاعدہ بیاہ ہونے لگا اور یہ ایک دستور قرار پا گیا۔ مان باپ کو اپنے لڑکے لڑکیون کے بیاہنے کا خاص اختیار مل گیا۔ اور انکی رضامندی اس معاملے مین ضروری قرار پائی۔ پروہت نے اپنی پروہتی کا اسمین بھی دخل دیا اور اسے ایک مقدس رسم مین منتقل کر دیا۔ اسنے یہان تک اقتدار حاصل کرلیا کہ جسمین وہ شریک نہوتا وہ کام واجب اور درست نہ سمجھا جاتا۔ مسلمانون اور مسیحیون مین قانون کے وسیلے سے شادی فسخ ہوسکتی ہو

اور میان بیوی کے تعلقات منقطع ہو سکتے ہین مگر ہندوؤن مین یہ نہین ہو۔ لیکن علمی ترقی کے ساتھ ساتھ شادی کو اُسکی مذہبی اہمیت سے خارج کرنے اور اسے بالکل ایک معاہدہ بنانے کا خیال پیدا ہو گیا ہو۔ لیکن وہ زمانہ دور ہی جب مرد و عورت تھوڑے عرصے کیلئے ایک دوسرے سے تعلق پیدا کیا کرینگے۔ لیکن جب کبھی ایسا دستور رائج ہوگا اسوقت نظام تمدن مین عظیم تغیر واقع ہوگا۔ اسکی موجودہ صورت بالکل قائم نرہیگی۔ یہ گھر گھر نہ رہیگا بلکہ ایک قسم کا کلب ہوگا۔ تعلقات زناشوئی بالکل کمزور ہونگے۔ مان باپ اور اولاد کے تعلق ہی برائے نام ہونگے۔ مرد کے بجائے عورت کا درجہ ترقی پکڑیگا جسطرح اَب عورت مرد سے ڈرتی رہتی ہو اُسوقت مرد خوف کھایا کریگا۔ عورت کا جب جی چاہیگا کسی اور مرد سے تعلق پیدا کریگی اور مرد کو دوسری جگہ جانا پڑیگا۔ زندگی کا کاروبار مرد کریگا۔ عورت گھر کی ملکہ ہوگی اور وہ جیسا چاہیگی حکومت کرے گی۔ جو عورتین مان بننے کے ناقابل ہونگی وہ اپنی اور مرد کی خوشنودی طبع کے واسطے زندگی بسر کرینگی۔ افلاس عورتون کو اس رشتے سے باز نہ رکھے گا۔ ویلز کہتا ہو "بچے جننا حکومت کی خدمت کرنا اور زندہ رہنے کا جائز استحقاق ثابت کرنا ہو۔ جو عورت مان ہو یا جو مان بننے والی ہو، وہ مشاہرہ، عزت، آزادی اور پرورش کی ویسی ہی مستحق ہو جیسا پولیس کا کانسٹبل"۔ مگر یہ ایسا خیال ہو جو صدیون کے بعد پورا ہوگا۔

مختلف نسل کے لوگون کا ناطہ رشتہ۔ کیا دو مختلف نسلون کے مرد و عورت کی شادی مصلحت آمیز ہو؟ اسکی بابت عالمون کے خیالات مختلف ہین۔ ایک جاپانی مدبر نے چند برس ہوئے ہربرٹ اسپنسر سے یہ مشورہ طلب کیا تھا کہ ہم جاپانیون کی نسل بڑھانے کے لیے یوروپین قومون سے شادیان کرنیکے خواہشمند ہین۔ آپ کی کیا رائے ہو۔ اسپنسر نے اس تجویز سے اختلاف کیا تھا۔ یوروپ والے غیر نسلون سے شادیان کرنے کو تیار نہین ہین اور اسکی وجہ محض قومی گھمنڈ ہو۔ وہ خود کو دوسرون سے برتر سمجھتے ہین اور اسلیئے انسے شادی کرنے کے خلاف ہین۔ آریہ قوم مین بھی یہ گھمنڈ تھا جب وہ وسط ایشیا سے نقل مکان کرکے جنوبی ملکون کو آئے اصل باشندون سے انہین نفرت تھی اور آج کے دن تک یہی بات پائی جاتی ہو۔ مگر تاریخ سے یہ ظاہر نہین ہوتا کہ دو مختلف نسل کے مرد و عورت کی شادی سے بُرے نتائج نکلتے ہین۔ انگریز تمدنی ترقیون مین سب قومون سے بڑھے ہوئے ہین حالانکہ وہ کئی مختلف نسلون کا مجموعہ ہین صدیون کے اختلاط سے یہ قوم وجود مین آئی ہو لیکن نتائج خلاف توقع نہین نکلے۔ اونچی ذاتون کے ہندوستانیون اور انگریزون کی رشتہ داریون سے کوئی برا نتیجہ برآمد نہین ہوا ہو۔ مہذب آدمیون کو خواہ وہ کسی ملک و نسل کے ہون ایک نمونہ اور ایک ڈھنگ کا ہونا چاہیئے مناسب نہین ہو کہ آرین، منگولین، ٹیوٹانی، اور سمیا قیطی نسلین ایک دوسرے سے جدا جدا رہین مگر بعض قومین اپنے کو دوسرون سے افضل تر اور انکی حکمران سمجھتی ہین اسلیئے وہ سب سے الگ رہنا پسند کرتی ہین لیکن جب ملک گیری کا خیال بالکل کمزور ہو جائیگا اور لشکر کشیان بند تو البتہ شاہ پرستی اور حکومت کے گھمنڈ کا خیال بھی مٹ جائیگا۔ اسوقت ایسے لوگون کی ایک عظیم قوم ہوگی جو معمولی نسلی تعلقات سے پاک اور نہایت شاندار ہوگی۔ وہ گھمنڈ اور غرور سے بیگانہ ہوگی۔ خون کے رشتہ کی اتنی قدر دان نہین ہوگی جتنی فوائد کے اشتراک کی۔ ویلز مشہور ناول نویس اس حالت کو کمالی تمدنی حالت قرار دیتا ہو۔

قرابت کی شادیان اگر اولاد مین کوئی خاص قسم کی خصوصیات پیدا کرنا چاہو، تو بہت قریبی رشتہ کے لڑکے لڑکی کی شادی کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر اس اُصول کے عملدرآمد مین حد اعتدال سے تجاوز کیا جائے تو نسل بگڑ جاتی ہو۔ بلکہ اسکے غائب ہو جانیکا اندیشہ ہو۔ مسلمانون مین چچیرے بھائی بہنون کی شادی جائز ہو۔ مگر اس سے جو نتیجہ نکلا ہو وہ بہت حوصلہ افزا نہین ہو۔ قوی ہیکل اور قدر آور افغانون کی اولاد صدیون تک

بعد بونون مین تبدیل ہوگئی ہی۔ گو اس امر کو بھی مدنظر رکھنا چاہئیے کہ ہندوستان کی آب و ہوا کا جسم پر مضر اثر ہوتا ہی لیکن مسلمانون کے سوا اور قومین بھی تو ہین جن کی قوت جسمانی اور دماغی جون کی تون ہے۔ آب و ہوا کے ناگوار اثر سے ان مین کوئی انقلاب واقع نہین ہوا۔ ایسے چند اور بھی اسباب ہین جنھون نے افغانون کی نسل کو بگاڑ دیا ہی ان مین سب سے بڑا چچیرے بھائی بہنونکی آپس کی شادی ہی۔ خالہ، مامون، پھوپی کی بیٹی سے بھی شادی روا سمجھی جاتی ہی اور اسکا فزیالوجیکل اثر نسلی زوال ہی۔

تمدنی معاملات مین حکومت کی دست اندازی

جون جون تہذیب ترقی کرتی ہی انسان کی آزادی پر نئی پابندیان عائد ہوتی جاتی ہین جس سے مقصود فلاح عامہ ہی۔ مہذب حکومت کے زیر اثر رہنے والے آدمی بخوشی اپنی کردار کی آزادی اسکے سپرد کر دیتے ہین اور اسکے قوانین و احکام کی بے چون و چرا متابعت کرتے ہین۔ مگر تمدنی معاملات مین ریاست کی دست اندازی مناسب نہین تاکہ افراد بطور خود اپنی آنیوالی نسل مین جیسی خصوصیات چاہین اپنے حسب منشا پیدا کرلین مگر حفظان صحت کے قواعد پر عمل پیرا ہونا تمام وفادار شہریونکا فرض ہی جو حکومت انکے فائدے کیلئے وضع کرتی ہی اور جب موجودہ نظام تمدن برہم ہو جائیگا تو حکومت کو نئے قواعد وضع کرکے حق ملکیت، ورثہ، مان، باپ کی آمدنی مین اولاد کے حصے کے متعلق نافذ کرنے پڑینگے۔ حکومت کیلئے مناسب ہوگا اگر وہ شادی کی نسبت خاص قواعد جاری کرے تاکہ مرد و عورت قومی بہتری کی خاطر خاص مقصد سے شادی کرین۔ مگر گھر کے انتظام اور تعلقات زناشوئی مین حکومت کو کوئی دخل نہین دینا چاہئیے۔ سردست یہ کہنا دشوار ہی کہ آئندہ زمانہ مین نظام مجلس کیا ہوگا۔ مگر رخ زمانہ سے اسکی نسبت کچھ خیال ہو سکتا ہی۔

مرد و عورت کے تعلقات

آنے والے زمانے کے نظام تمدن مین مرد غالبًا زیادہ محنت اور مشقت کے کام کرینگے جیسے انتظام ملک، انجنیری، ریل کا انتظام سپاہ بحر و بر وغیرہ، معلمی اور ڈاکٹری، فنون لطیفہ، پوشاک تیار کرنا اور اسی قسم کے ہلکے کام عورتون کے سپرد ہونگے۔ زندگی کے تمام کاروبار مردون اور عورتون مین مساوی منقسم ہونگے گو اس سے یہ مراد نہین ہی کہ کوئی خاص کام مردون یا عورتون کے لیئے مخصوص ہوگا۔ اس کا یہ انجام ہوگا کہ سوسائٹی کے تمام کام باحسن الوجوہ انجام پذیر ہونگے۔ انتظام بہت عمدہ ہوگا کیونکہ مرد و عورت آپس مین ایسے کام بانٹ لین گے جن کے انجام دینے کی ان مین طبعی قابلیت اور میلان ہوگا۔

آنے والے زمانے کے آدمی

دور افتادہ مستقبل مین کیسے آدمی ہونگے؟ انکی عقلی اور جسمانی حالت کیسی ہوگی؟ اسپر غور کرتے وقت دماغ چکر مین آجاتا ہی وہ شہزوری مین اسفندیار اور وجاہت مین یوسف اور عقل مین خدا کی مانند ہونگے۔ اس سے کسی کو انکار نہین ہو سکتا۔ وہ پانی پر چلے گا۔ ہوا مین اڑیگا۔ منگل اور سکر کے لوگون سے نامہ و پیام جاری کریگا۔ عالم ایتھر کی سیر کرے گا۔ کائنات کے اسرار مخفی کو افشا کرے گا اور آب حیات ڈھونڈھ نکالے گا۔ سنگ پارس بھی بنالے گا۔ الغرض ایسے ایسے کام کریگا جو اسوقت وہم و گمان سے بعید معلوم ہوتے ہین۔ اسوقت علم کے حدود نہایت وسیع ہونگے۔ ٹینی سن کہتا ہی "عورت کا جس بات سے بھلا ہوتا ہی اس سے مرد کا بھی بھلا ہوگا۔ وہ دونون ایک ساتھ آسمان شہرت پر چڑھین گے یا قعر ضلالت مین گرین گے"۔ اس زمانے کے انقلاب مین عورت کو بڑا دخل ہوگا۔ اسکے توسط سے بڑے بڑے کام ہون گے وہ حسن مین ماہتاب سے بھی بڑھ جائیگی۔ وہ اپنے شوہر کے لیئے دیوی اور آنے والی پود کی مان، اور عیش پسند لوگون کے لیے پری ہوگی۔ وہ اپنی موجودگی سے زندگی کے تاریک حصون کو روشن اور زحمتون کو رحمتون مین منتقل کرے گی۔ وہ "زندگی کا تاج" اور "دنیا کا نور" ہوگی۔

کامیابی کا معیار

اہل استفادہ کہتے ہین کہ زندگی کا مقصد سب سے زیادہ

فیض پہنچانا اور حاصل کرنا ہو مگر قدرت اسکی قائل نہین ہو۔ وہ مکیفات اور گرد و پیش کے حالات کے مطابق انواع تیار کر لیتی ہو۔ وہ ایک خاص نمونہ قائم رکھنے کے لیے سیکڑون جانون کو قربان کر دیتی ہو جیسے روزمرہ کمزور بچون کے مرنے سے ظاہر ہوتا ہو۔ مگر جنھین وہ زندہ رکھنا چاہتی ہو انھین اسنے جہد الحیوٰۃ کیلئے ویسے ہی سامان بھی عطا کر رکھے ہین، اور اسی طرح وہ ترقی کرتے ہین۔ موجودات ایک منزل کی طرف بڑھ رہے ہین، جہان وہ سب ایک نئی صورت اور ڈھنگ مین ظاہر ہونگے، اور وہ کائنات اس سے بہت مختلف ہو گی۔

شمس الہدیٰ

نظام شمسی

کائنات کے اندر جتنی عجیب وغریب اشیا ہین ان مین شاید آسمانی درخشان کرہ سب سے زیادہ عجیب ہے جسمین بعض وقت گول چکردار بادل دکھائی دیتے ہین جو "چکردار سحاب" کے نام سے مشہور ہین جب انسان انکے ہولناک حجم اور انکی ماہیت پر غور کرتا ہو تو عقل چکر مین آجاتی ہو۔ علما کہتے ہین کہ اجرام فلکی شروع مین اسی درخشان بادل سے ماخوذ ہوئے تھے اور

افلاک کا مبدا درخشان سحاب ہے

آئندہ زمانے کے سورجون اور عالمون کی ہستی بھی اسی نورانی مادہ مین مضمر ہو۔ یہ خیال بظاہر بہت عجیب معلوم ہوتا ہو لیکن جب اصلیت پر نگاہ ڈالی جائے تو اسکی معقولیت عیان ہو جاتی ہو جب ریاضیات اور طبیعیات کے اصول سے کام لیکر مشاہدہ فلکی کرتے ہین تو یہ امر بہت معقول معلوم ہونے لگتا ہو کہ اس سحاب مین نظام ہائے شمسی اور عالم ستارگان پنہان ہین۔ مسٹر ولیم سدرلینڈ نے حال ہی مین مشاہدونکی بنا پر استدلال کرکے یہ ظاہر کر دیا ہو کہ شروع مین ہمارے نظام شمسی کا مادہ بھی ایک اسی قسم کا سحاب تھا جسکے دو بازو تھے۔ وہ اندرونی حرکت کے سبب سے رفتہ رفتہ سرد ہو گئے اور اسکے سبب سے الگ ہو کر خلا مین ادھر ادھر پھیل گئے جیسے بدھ جو نظام شمسی مین سب سے چھوٹا ہو اور جسکی کثافت آٹھ نیلم تن اور برہسپت جو عظیم ترین ہو، اسکی کثافت اس سے بھی کہین زیادہ ہو اور آفتاب جو مرکز مین ان کو سنبھالے ہوے ہو ان سب سے لاکھون گنا زیادہ کثیف ہو اور یہ سب اجرام اسی عظیم الوسعت سحاب سے بنے ہین۔ یہ خیال مسئلہ سحاب کی تازہ ترین صورت ہو۔ اس سے فرانسیسی فلکی لاپلیس کے نظریہ کی تردید ہوتی ہو جسنے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ آفتاب اور اسکے لواحقین گول قرص ایسی شکل کے سحاب سے پیدا ہوئے تھے، جو سورج کے کرہ کے ارگرد پھیلا ہوا تھا مگر رفتہ رفتہ سرد ہو کر سکڑتا گیا اور اس سے اجرام فلکی بنتے چلے گئے، اور کئی قسم کے خیالات بھی اجرام فلکی کی ابتدا کی نسبت مشہور ہین جو "ارتقائے سیارگان" مین مذکور ہو۔ مگر یہان پر انکے تذکرہ کی چندان ضرورت نہین ہو البتہ سیارون کا ذکر بہت ضروری ہو۔

نظام شمسی کے چار گروہ

سورج کے قریب مختلف فاصلون پر چار سیارے ہین۔ منگل (مریخ) ان چارون مین آفتاب سے بہت دور ہو یعنی چودہ کروڑ دس لاکھ میل اور بدھ قریب ترین ہو یعنی تین کروڑ ساٹھ لاکھ میل پر واقع ہو۔ گو یہ چارون سیارے جسامت مین ایک دوسرے سے بہت مختلف ہین مگر یہ ایک جداگانہ طبقہ سے تعلق اور ایک دوسرے سے مشابہ ہین۔ یہ ارکین نظام شمسی کا اول گروہ ہو۔ دوسرا طبقہ اس سے چونتیس کروڑ میل پر واقع ہو اور یہ فاصلہ بہت وسیع ہو۔ اس دوسرے طبقے مین چار سیارے ہین۔ برہسپت۔ سنیچر۔ یورےنس اور نپچون۔ برہسپت کرہ ارض سے تیرہ سو گنا بڑا ہو۔ باقی سیارے اس سے بہت چھوٹے ہین مگر سب کے سب بہت دور دور رہین یعنی آفتاب سے تین ارب میل کے درمیان گردش کرتے ہین۔ گو یہ سیارے اس دنیا کے پیمانہ کے مطابق ایسے ہولناک فاصلہ پر

واقع ہین لیکن اگر ان کے ناپنے کے لیے آسمانی پیمانہ سے کام لیا جائے تو یہ فاصلہ ایسا ہی جیسا دس پندرہ گھنٹے کا تیز رو ریل گاڑی کا سفر کیونکہ دوسرا نظام شمسی (الفاسنٹاور) ہمارے آفتاب سے دو پدم ساٹھ کھرب میل کے فاصلے پر واقع ہی اور اس سے ادھر اور کوئی آفتاب نہین ہی برہسپت نپ چون سے پندرہ سو گنا بڑا ہی، اور سنیچر سے صرف دو چند یون کہنا بجا ہوگا کہ برہسپت (مشتری) سورج کو چھوڑ کر باقی تمام اراکین نظام شمسی سے چھ سو گنا بڑا ہی اور آفتاب ان سب سے سیکڑون گنا بڑھکر ہے۔

ان دونون قسم کے سیارون مین جنکا ذکر ہوا ہی، نہ صرف جسامت ہی کا فرق ہی بلکہ انکی طبعی حالت بھی بہت مختلف ہی یعنی چھوٹے سیارے بہت وزنی اور ٹھوس ہین اور بڑے سیارے اپنے حجم کے مقابلے مین ہلکے ہین۔ یا یون کہئے کہ سیارگان صغیر کثافت مین بڑے بڑے سیارون سے بڑھکر ہین۔ مثلاً اگر کوئی ایسا عظیم الحجم تالاب ہو جسکا طول و عرض لاکھون میل کا ہو اور اسمین سنیچر کو ڈالا جائے تو وہ تیرتا رہیگا اور مشتری آہستہ آہستہ ڈوب جائے گا۔

ان دونون طبقون کے درمیان جو فاصلہ ہی اسمین چھ سو کے قریب ور چھوٹے چھوٹے سیارے ہین۔ انمین جو سب سے بڑا ہی اسکا قطر پانچ سو میل اور خوردترین کا دس میل ہی۔ یہ اسٹرائڈ (Asteriods) کہلاتے ہین۔ یہ متعلقین آفتاب کا تیسرا گروہ ہی جو کئی باتون مین دوسرے طبقون سے مختلف ہی یہ ننھے ننھے سیارے ایک دوسرے کے مرجع آپ ہی بنے ہوے ہین۔ چوتھا طبقہ متعلقین شمسی کا ذمدار ستارے ہین جنکی سفید سفید چوٹیان گاہے بگاہے ہزارون لاکھون میلون تک پھیلی ہوئی نظر آیا کرتی ہین۔

آفتاب عالمتاب آفتاب کا درجہ نظام شمسی مین وہی ہی جو ایک خاندان مین باپ کا ہی جیسے باپ کے بغیر اولاد ناممکن ہی اسیطرح اراکین نظام شمس کا وجود و قیام سورج کے بغیر محال ہی۔ اسکا حجم دیگر سیارون کے مجموعی حجم سے آٹھ سو گنا زیادہ ہی، اور کرۂ ارض سے تین لاکھ بتیس ہزار گنا بھاری ہی۔ اسکی جسامت سے یہ ظاہر ہوتا ہی کہ نظام شمسی کے ارتقا مین آفتاب نے ایک نہایت شاندار اور ضروری حصہ لیا ہی۔ عالمون کا یہ خیال ہی کہ سورج کا انقباض ہنوز جاری ہی اور وہ ابتک بالکل دخانی حالت مین ہی اور اسکی جو قوت انتشار حرارت سے ضائع ہوتی ہی اسکی کمی اسکے عمل انقباض سے پوری ہوتی رہتی ہی۔ اسکی موجودہ کثافت پانی سے ۱ ۲/۵ گنا ہی۔ عالم کہتے ہین کہ انتشار حرارت کا خسارہ عمل انقباض سے اسی صورت مین پورا ہو سکتا ہی کہ ڈھائی سو فٹ قطر ہر سال سکڑتا رہے چونکہ آفتاب کا قطر آٹھ لاکھ ساٹھ ہزار میل ہی، اسلیے اسکے انقباض کا اثر دس ہزار سال تک ہمارے آلات پر ظاہر نہین ہو سکتا۔

یہان پر یہ سوال پیدا ہوتا ہی کہ اگر اسی طرح آفتاب سکڑتا چلا جائے تو کتنے ہزار سال بعد اسکا منبع حرارت ختم ہو جائیگا۔ اگر حرارت موجودہ شرح سے خارج ہوتی رہی ہو تو حساب سے یہ ظاہر ہوگا کہ ڈھائی کروڑ سال سے یہ عمل جاری ہی اور اگر آئندہ بھی اسکا سلسلہ اسی طرح جاری رہے تو پچاس اور ستر لاکھ سال کے اندر مین اسکا قطر سکڑ کر نصف رہ جائیگا انقباض کے ساتھ اسکی کثافت اب سے آٹھ گنا ہوگی اور درجۂ حرارت اتنا بڑھ جائیگا کہ اراکین نظام شمسی تک اتنی حرارت نہین پہنچے گی کہ وہ آبادی کے قابل ہون۔ عالمان ارضیات کا یہ خیال ہی کہ کرۂ ارض دس کروڑ سال سے جاندارون کی زندگی کی پرورش اور قیام کے قابل چلی آتی ہی۔ اس تضاد کے رفعداد کے لیے فلکیون نے خیال قائم کیا ہی کہ سورج کی حرارت اگلے زمانون مین اسی شرح سے خارج نہ ہوتی تھی، جس سے آج کل ہو رہی ہی۔ حال ہی مین عالمون نے سورج کی معزول قوت کی بہم رسانی کی بابت یہ قیاس لگایا ہی کہ اس کے اندر ریڈیم ہی جسکی بدولت اسکا وجود لاکھون اور کروڑون برس تک قائم رہے گا۔

تھوڑے عرصے سے بعض عالمون نے یہ اندازہ لگایا ہو کہ سورج کی حرارت زمین پر یکسان نہین پہنچتی بلکہ اسمین بھی کمی بیشی ہوتی رہتی ہو، اور یہ تفاوت دس فیصدی ہوتی ہو۔ یہی حال باقی اراکین شمسی کا بھی ہو یعنے سورج کی گرمی ان کے ہان بھی اسی حساب سے نہین پہنچتی۔ اسکی ایک وجہ وہ داغ ہین جو کبھی کبھی سطح آفتاب پر ظاہر ہوتے رہتے ہین اور کبھی کبھی عجیب قسم کی گیسین پھوٹ نکلتی ہین، جیسے آتش فشان پہاڑ سے آگ اور دھوان نکلتا ہو۔ اس سے سورج تغیر پذیر ستارہ معلوم ہوتا ہو مگر یہ تبدیلیان آسانی سے نہین پہچانی جاتی ہین یہ تبدیلیان آئندہ بھی ہوتی رہین گی لیکن وہ کیسی ہونگی؟ اسکا جواب دینا محال ہو لیکن عالمون نے حال مین یہ دیکھا ہو کہ تارہ مائرہ سیٹی (Miraceti) کے تبدلات سورج کے نسبت ہزار دن گنا زیادہ وسیع دیکھے گئے ہین اور وہ اپنی نوعیت مین شمسی انقلابات کے بہت مشابہ پائے گئے ہین۔

سیارۂ عطارد عطارد (بدھ) سب سیارون مین چھوٹا ہو۔ بظاہر وہ آفتاب کے کچے بچون مین سب سے چھوٹا معلوم ہوتا ہو۔ مگر اسکو سن رسیدہ ہونا کہنا چاہیئے۔ اسکی حرکت کی تیزی کا سبب اسکی قربت آفتابی ہو۔ اسکا دائرہ گردش بے ٹھکانے ہو۔ اسلیئے چھ ہفتون کے اندر اسکی رفتار تینتیس اور پینتیس میل فی سکنڈ کے درمیان رہتی ہو اور اس اثنا مین جو حرارت اور گرمی آفتاب سے نکل کر اسکے ہان جاتی ہو وہ کبھی دوچند اور کبھی نصف ہو جاتی ہو۔ بدھ کرۂ ہوا سے محروم ہو اسلیئے وہان پانی کا وجود عنقا سمجھا جاتا ہو۔ اسکی کثافت سیسہ اور پارہ کے برابر سمجھی جاتی ہو۔ یہ اپنے محور پر ایسی تیزی سے نہین گھوم سکتا جس سے دن اور رات پیدا ہوتے ہین چونکہ سورج کے بہت قریب ہو اسلیئے اسکی سطح سخت اور خشک ہو گئی ہو۔ ان باتون سے فلکیون نے یہ نتیجہ نکالا ہو کہ بدھ ارتقا کے آخری مرحلہ مین ہو۔ مگر اس سے یہ نہین مفہوم ہوسکتا کہ بدھ آفتابی خاندان مین پہلوٹا ہو۔ بلکہ اسکا اصل سبب یہ ہو کہ اسکا حجم بہت چھوٹا ہو اسلیئے بہت جلد سحابی بخارات اُڑ گئے اور یہ ٹھوس ہو گیا۔ اسکا قطر تین ہزار میل اور اسکا سال اٹھاسی دن کا ہوتا ہو۔

زہرہ کی سرگزشت زہرہ (شکر) آفتاب اور چاند کے سوا سب سے زیادہ درخشان ہو صبح یا شام کو نظر آتا ہو۔ کرۂ ارض سے دوسرے درجے پر اگر کوئی سیارہ جاندارون کے رہنے کے لیے موزون ہو تو وہ شکر ہو اسکا قطر سات ہزار سات سو میل ہو۔ گویا یہ کرۂ ارض کا توام بھائی ہو۔ اسکی کثافت زمین سے کچھ کم ہو یعنی اگر ہم مین سے کوئی آدمی سطح زہرہ پر جا سکے تو اسکا وزن یہان سے قدرے زیادہ ہوگا۔ یہ سیارہ سورج سے پونے سات کروڑ میل ہو۔ وہان پر سورج کی حرارت اور روشنی زمین کی بہ نسبت دوچند پہونچتی ہو۔ چونکہ اسکا دائرۂ گردش سب سیارون سے زیادہ مدور ہو اسلیئے سالانہ تبدیلیان بہت کم ہوتی ہین۔ علاوہ ازین اسکا کرۂ ہوا بہت وسیع ہو جسکی بدولت وہ آفتاب کی تیزی سے بچ سکتا ہو اسکی سطح دوربین سے دکھائی نہین دیتی اسلیئے اس کے جغرافیہ سے ہم ناواقف ہین۔ پروفیسر پرسی ول لوئل کا یہ خیال ہو کہ یہ سیارہ اپنی محوری قوت سے اتنا محروم ہو گیا ہو کہ وہ آفتاب کے گرد صرف ایک مرتبہ چکر لگاتا ہو جسکی وجہ سے اسکے ایک حصہ پر دائمی رات اور دوسرے پر استمراری دن رہتا ہو۔ مگر اور عالم اس خیال کو تسلیم نہین کرتے۔ بوپلسکی روسی فلکی نے اپنے مشاہدون سے یہ امر ظاہر کیا ہو کہ شکر کا دن ساڑھے چونتیس گھنٹے کا ہوتا ہو۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہو سکتا ہو کہ وہان ہم سے زیادہ ذہین ہستیان رہ سکتی ہین جب شکر زمین اور آفتاب کے درمیان سے گزرتا ہو تو اسکا فاصلہ ہم سے صرف دو کروڑ ساٹھ لاکھ میل ہوتا ہو۔ اس سے نزدیک تر کوئی سیارہ نہین آتا ہو۔ اس سے بعض دل چلے عالمون کے دل مین یہ خیال پیدا ہو گیا ہو کہ ایتھر تار برقی کے ذریعے سے شکر کے باشندون سے نامہ و پیام کا سلسلہ قائم کرنا چاہیئے۔ مگر سائنس ایسی باتون کا قائل نہین ہے

مریخ کا قصہ | مریخ (منگل) اول طبقہ میں سب سے دور افتادہ اور بدھ کے سوا سب سے چھوٹا ہے۔ اسکا قطر بیالیس سو میل ہے اور اسکی مساحت کرۂ ارض کے ۰.۲۸ کے برابر ہے۔ اسکی کثافت زمین کی کثافت کے ۰.۷۲ مساوی ہے یعنی پانی سے چارگنا زیادہ اور کشش کا تناسب ۳۸ اور ۱۰۰ کا ہے جسکے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی جانور سطح مریخ پر چلا جائے تو اسکا وزن دو تہائی کم ہوجائیگا۔ اس امر کو مدنظر رکھکر یہ خیال کیا گیا ہے کہ منگل میں انسان کا قد بارہ تیرہ فٹ ہوتا ہے مگر اس سے اسکی چستی و چالاکی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر یہ گمان کیا گیا ہے کہ منگل میں دیو بستے ہیں جنہوں نے عظیم الشان نہریں تیار کی ہیں۔ مگر دانشمند فلکی ایسی قیاسی باتوں کو چنداں اہمیت نہیں دیتے۔ اصل یہ ہے کہ منگل کی حالت جانداروں کے قیام و وجود کے متناقض ہے۔ منگل میں کرۂ ارض سے آدھی شمسی روشنی اور گرمی جاتی ہے۔ اسپکٹروسکوپ اور دوربین سے ظاہر ہوتا ہے کہ مریخ کی ہوا بہت لطیف ہے اور وہاں کی سردی و گرمی کا درجہ صفر سے بھی نیچے ہوگا۔

عالم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ منگل کے ڈھانچے میں کوئی ایسی خاص چیز ہے جس سے مظاہر طبعی یعنی فطری انقلابات وقوع میں آتے رہتے ہیں۔ ایک تو یہ امر خاص توجہ کے قابل ہے کہ وہاں قطبین میں برف پڑتی ہے جو موسم گرما میں گھل جاتی ہے جیسا کہ ہمارے ہاں شمالی اور جنوبی قطبوں میں دیکھا جاتا ہے۔ وہاں برف ضرور رہتی ہے اگر یہ نہو تو کہر ہوگا۔ دوم سطح مریخ پر زمین کے ایسے قطعات نظر آتے ہیں جیسے ہمارے ہاں ہیں جنکے رنگ مختلف ہوتے بعض نیلگوں جس سے سمندروں اور جھیلوں کا گمان ہوتا ہے اور بعض زرد گویا یہ بنجر خطے اور ممالک ہیں اور وہاں روئیدگی بھی دکھائی دیتی ہے۔ نہروں کا جال انہی لال پیلے خطوں میں نظر آتا ہے۔ لوول اور اسکے ہم خیال کہتے ہیں کہ بنجر سے تو خشک ہو چکے ہیں مگر اتنی رطوبت باقی ہے جس سے قطبوں میں برف پیدا ہوتی ہے، اور سبزی کے قیام کی موجب ہوتی ہے جس سے جانوروں کی زندگی قائم ہو بشرطیکہ وہ وہاں پر ہوں اس نظریہ کے رو سے جب برف پگھلتی ہے تو پہلے پانی ایک حصہ میں اور پھر دوسرے میں جمع ہوتا ہے۔ اور پھر "نہروں" کے وسیلے سے "مریخی باشندے" "شہروں" اور "کھیتوں" میں لیجاتے اور سیراب کرتے ہیں۔ یہ کھیت سیاہ دھاریوں کی صورت میں دوربین میں نظر آتے ہیں جسکی بنا پر اہل مریخ کرۂ ارض کے باشندوں سے زیادہ ذہین اور عقلمند سمجھے جاتے ہیں۔ نہروں کی بناوٹ سے انکی عجیب و غریب انجینئرانہ عقلمندی اور قوائے طبعی سے کام لینے کی بے مثال دانائی اور علم عیاں ہوتا ہے۔ مگر یہ محض قیاس ہے مریخی سال ۶۸۷ دن کا ہوتا ہے اور موسمی تبدیلیاں ہمارے ہاں کے موسمی تبدلات سے مشابہ ہوتی ہیں۔ اسکا دن چوبیس گھنٹے ۳۷ منٹ کا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مریخ کی سطح بہت اچھی طرح نظر آتی ہے۔

سیارگان صغیرہ | آفتاب کے لواحقین کے گروہوں میں ایک طبقہ سیارگان صغیرہ کا ہے جو تیسرے طبقہ میں ہیں۔ انکا شمار کئی سو ہے اور ہر سال انمیں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ انمیں بڑے بڑے چار ہیں۔ سیرس اسکا قطر ۴۸۰ میل؛ پلاس اسکا قطر ۳۰۴ میل؛ وسٹا کا قطر ۲۳۹ میل اور جونو کا ۱۲۰ میل ہے اور باقی کا قطر بیس میل بھی نہیں۔ گویا وسیع خلا میں یہ ننھے ننھے مونگے کے جزیرے ہیں۔ انکی شکل و صورت بیقاعدہ ہے جرمن عالم آلبرکی رائے میں یہ سیارے کسی بڑے سیارے کے پھٹنے سے پیدا ہوئے تھے۔ ان کے گرد کے دوائر بہت غیر معین ہیں۔ یہ سب کے سب مریخ کے دائرۂ گردش کی سرحد سے لیکر مشتری کے گھومنے کے خط کے مابین واقع ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ مشتری کے چاند بھی انہی صغیر سیاروں میں سے ہیں جو اسکی کشش سے کھنچکر اسکے قریب چلے گئے اور گھومنا شروع کر دیا۔ اسی طبقہ میں اروس نامی چھوٹا سیارہ ہے جو گردش کرتا ہوا زمین کے پاس ایک کروڑ چالیس لاکھ میل پر پہنچ جاتا ہے۔

مشتری کا حال | مشتری (بہ حیثیت) سیارگان نظام شمسی میں عظیم ترین ہے۔

سورج سے اسکا فاصلہ اڑتالیس کروڑ بیتیس لاکھ میل ہی۔ زمین سے یہ تیرہ سو گنا بڑا ہی مگر اسکی کثافت زمین کا چوتھا حصہ ہی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہی کہ اسکا وزن زمین سے صرف ۳۱۶ گنا ہی۔ اسکی حرکت محوری بہت تیز ہی یعنی دس گھنٹے مین گھومتا ہی۔ قطبون کے پاس چپٹا اور خط استوا کے قریب ابھرا ہوا ہی۔ اسکی گردش محوری اسکے مختلف حصون مین مختلف ہوتی ہی۔ سورج کی بھی یہی کیفیت ہی جو اس امر پر دال ہی کہ وہ ہلکا ہی گیسون کی نہایت کثرت ہی جسکی وجہ سے گردش کی تیزی سے اسکی سطح پر ٹیکے یا چھلے نمودار ہو جاتے ہین۔ مگر قطبون کے پاس دھاریان ظاہر نہین ہوتی ہین۔ عالم خیال کرتے ہین کہ مشتری ہنوز ارتقا کے تمام مراحل طے کرنے مین کامیاب نہین ہوا ہی۔ چونتیس سال کا عرصہ گزرا کہ مشتری کے جنوبی ٹیکے کے پاس ایک سرخ داغ نمودار ہوا تھا جسکا طول تیس ہزار میل تھا۔ فلکیون نے اسکی ہر چند تحقیقات کی مگر اسکی نوعیت معلوم نہوسکی اور آج کے دن تک وہ ایک راز سربستہ ہی۔ یہ عظیم داغ مختلف قسم کی تبدیلیون سے بھی دوچار ہو چکا ہی۔

مشتری کے حصہ مین آفتابی حرارت اور روشنی کرہ ارض کے مقابلے مین صرف پچیسوان حصہ آتی ہی اگر کچھ عرصہ کے بعد وہ سخت ہو جائے تو وہان کسی جاندار کا زندہ رہنا محالات سے ہوگا۔ کیونکہ سردی کی کثرت سے وہ اینٹھ کر مرجائیگا۔ مشتری کے چار بڑے اور چار چھوٹے چاند ہین۔

عجیب غریب سیارہ زحل | مشتری سے دوسرے درجہ پر جسامت مین زحل (سنیچر) ہی جو سب سیارون مین عجیب وغریب ہی۔ اسکے کرہ کے اردگرد کئی درخشان حلقے اور چھلے ہین جو مسلسل ایک دوسرے کے اندر واقع ہین۔ اسکا قطر ۷۳ ہزار میل ہی۔ اگر درخشان چھلون کو بھی کرہ کے ساتھ شامل کرلیا جائے تو قطر کا کل طول ایک لاکھ اڑسٹھ ہزار میل ہو جاتا ہی اندرونی چھلا زحل کے استوا کے پاس دس ہزار میل پہنچتا ہی اور اسکا بیرونی کنارا ساڑھے سولہ ہزار میل چوڑے چھلے مین ملجاتا ہی۔ گو یہ حلقے دوربین مین سخت نظر آتے ہین، مگر دراصل گیس کے بنے ہوئے ہین جو کرہ زحل کے اردگرد گردش کرتے رہتے ہین۔ ایسا معلوم ہوتا ہی کہ جب زحل کے مرکز کا سحاب سکڑ گیا تو یہ حلقے اس سے باہر رہ گئے۔ اسکے کرہ پر بھی ویسے ٹیکے نظر آتے ہین جیسے مشتری کے قرص پر دکھائی دیتے ہین۔ زحل کی کثافت پانی کی کثافت سے ۳/۱۰ حصہ کم ہی۔ زحل کے اردگرد دس چاند گردش کرتے ہین۔ انکا حجم ایک دوسرے سے مختلف ہی اور یہ مختلف فاصلون پر واقع ہین۔ اسکا فاصلہ آفتاب سے اٹھاسی کروڑ ساٹھ لاکھ میل ہی۔

یورے نس اور نپ چون | یورے نس اور نپ چون نظام شمسی کے بچھڑے ہوئے بھائی ہین۔ تھوڑے ہی عرصے سے انکے وجود کا پتہ عالمون کو لگا۔ اول الذکر کا فاصلہ سورج سے ایک ارب ۸ کروڑ بیس لاکھ میل اور دوسرے کا دو ارب ۹ کروڑ بیس لاکھ میل ہی۔ یہ دونون سیارے اُس عظیم الحجم سحاب کے بیرونی حصون سے بنے ہین جس سے نظام شمسی کے باقی ارکین وجود مین آئے تھے۔ اسکی کثافت پانی سے بھی کم ہی۔ یورے نس کا قطر بتیس ہزار اور نپ چون کا پینتیس ہزار میل ہی۔ اول الذکر کے چار اور موخر الذکر کا صرف ایک چاند ہی۔ نپ چون کے وجود کا پتہ اسکے اُس اثر سے چلا تھا جو یورے نس کی حرکت پر نمایان ہوتا تھا۔ انکے چاندون کی گردش سے یہ ظاہر ہوتا ہی کہ انکی حرکت محوری اسی سمت مین نہین ہوتی ہی جسمین باقی سیارون کی ہوتی ہی۔ نپ چون کی گردش مشرق سے مغرب کی جانب اور یورے نس کی قائم الزاویہ کے رُخ پر ہوتی ہی۔

یہ ہی مختصر داستان متعلقین آفتاب کی مفصل کیفیت تو بڑی بڑی علمی کتابون ہی مین ملسکتی ہی لیکن ناظرین العصر کی معلومات مین اس سے خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہی اور فلکیات کی کل باتون کا لطف اس خلاصہ سے حاصل کر سکتے ہین۔

جے۔ آر۔ رائے

مایا کی فلاسفی

مغرب کے بڑے سے بڑے محقق اگر ہندو فلسفہ کے رموز و اسرار کو سمجھنے سے قاصر رہے ہین تو اسکی وجہ یہ نہ سمجھنی چاہیئے کہ اول الذکر کی قابلیت مین کچھ کلام یا آخر الذکر کی فضیلیت مین کسی طرح کا شک ہے۔ اس کا باعث اگر کچھ قرار دیا جا سکتا ہی تو یہ کہ دونون قومون کی تہذیب کے بنیادی اُصول مین بعد المشرقین ہی۔ دُنیا کے ہر حصے مین ہر زمانہ کے اندر ہشیار، مہذب و متمدن اقوام ہو گذری ہین لیکن شاید یہ کہنا بیجا نہو گا کہ اِن سب مین صرف ہندوؤن ہی نے حقیقت کا معیار ذہنی قائم کرنے اور معیار ذہنی کے مطابق اُمور کو حقیقت مین لانے کی کوشش کی ہی۔ ہندوؤن کی تہذیب لازمی طور پر ایک روحانی تہذیب تھی اور اس اعتبار سے ان اقوام کی تہذیب سے جو اس کے مقابلے مین جوان کھلا سکتی ہین بدرجہا آگے بڑھی ہوئی تھی۔ بس یہی وجہ ہی کہ لوگ اسکے اسرار کو سمجھنے سے قاصر و معذور رہین۔

بڑے بڑے راجاؤن کا ذراسی بات پر راج پاٹ چھوڑ کر فقیر ہو جانا، اعلیٰ قابلیت اور فضل و لیاقت کے آدمیونکا سنیاس اختیار کر کے جنگلون اور بنون مین رہنا، ہزارون کی تعداد رکھنے والی فوج کے مقابلے مین مٹھی بھر جوانون کا محض اپنی آن کو بچانے اور تلوار ہاتھ سے نہ دینے کے لیے لڑ کر کٹ مرنا، سینکڑون عورتون کا بڑے استقلال اور ثابت قدمی سے پروانہ دار آگ کے شعلون مین جل کر بھسم ہو جانا، یہ اور اسی قسم کے بیسیون عجیب و ناقابل فہم ظہورات ہندو تہذیب کی واحد خصوصیات ہین۔

غرض یہ کہ اس تہذیب کا منشا سب سے بڑھکر انسان کو تیاگ اور روحانیت کے لیے مادیت سے دست بردار ہونے کا سبق سکھانا ہے۔

اُپ نشد مین آیا ہے:۔

غیر فنائیت کام سے، نہ اولاد سے، نہ دولت سے، بلکہ صرف تیاگ سے حاصل ہو سکتی ہے۔

ایک اور موقعہ پر مذکور ہے:۔

وہ چیز جو کبھی تبدیل ہونے والی نہین، قابل تبدیل چیزون کے ذریعے حاصل نہین ہو سکتی۔

بس یہی ہندوؤن کے تیاگ کا راز ہی۔ فنائیت یا روحانی زندگی کی تکمیل ان دُنیاوی اسباب کے ذریعے سے حاصل نہین ہو سکتی جو لازم طور پر بدلنے والے اور غیر حقیقی ہین۔ ایک انگریزی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:۔

ترجمہ۔ صرف ایک باقی رہتا ہی۔ کثیر التعداد چیزین جو نظر آ رہی ہین تبدیل ہوتی اور گذر جاتی ہین۔ آسمان کی روشنی ہمیشہ چمکتی ہی۔ زمین کے سائے تیزی سے گذرتے جا رہے ہین۔ زندگی بہت سے رنگون والے شیشہ کے گنبد کی مانند بقا کی سفید روشنی کو داغدار بناتی ہے

ہان صرف ایک ہی باقی رہتا ہی۔ کثیر التعداد چیزین تبدیل ہوتی اور گذرتی جاتی ہین۔ وہ اِس حقیقت کے محض سائے ہین۔ تم اگر حقیقت کے خواہشمند ہو تو ان سایون کی طرف دلبستگی کی نظر سے نہ دیکھو۔ دوسرے لفظون مین دُنیا جو نظر آ رہی ہی حقیقت کے نقطۂ نظر سے محض ایک نظری دھوکا یا مایا ہی۔ اسی لیے تیاگ کی فرضیت ہی۔ ہندوؤن کی تمام مجلسی ساخت کا دار و مدار صرف اِسی بات پر ہی کہ انسان ان چیزونکو جو محض نمائشی ہین تیاگ کر اس چیز کے حصول کے لیے جو بقا کی حقیقت رکھتی ہی کوشش کرے۔ اُنھون نے زندگی کو چار منازل پر تقسیم کیا جن مین سے ہر ایک مین یہی راز مخفی ہی۔ طالب علم (وِدیارتھی) یا برہمچاری کا کام ریاضت اور حظوظ نفسانی کو ترک کرنا ہی۔ جس وقت طلب علم کا زمانہ گذر چکے تو اسوقت وہ گرہست آشرم مین داخل ہوتا ہی۔ اسوقت اسکا فرض ہے کہ

وہ تحصیل علم و دولت مین اس طرح منہمک رہے گویا کبھی بوڑھا نہو گا اور نہ مریگا اور دھرم پر اس خیال کو مدنظر رکھکر عمل کرے کہ گویا موت نے اُسے بالون سے پکڑ رکھا ہے۔

گرہست کا زمانہ حد درجہ کی محنت کا زمانہ قرار دیا گیا ہی جس مین انسان کو کامل ایثار اور بے غرضی سے کام لینا چاہیے۔ گویا ایک طرح پر اِس زمانہ مین اسے آنے والے زمانہ بان پرستھ اور سنیاس کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔

چونکہ روحانی تکمیل کو مدعائے زندگی قرار دیا گیا ہے اس لیے ظاہر ہو کہ نفسانی زندگی کو اچھی نظر سے نہین دیکھا گیا۔ اسی اعتبار سے بیوہ عورت کو اِس کا عمدہ موقع حاصل ہوتا ہو کہ وہ حظوظ نفسانی کو خیرباد کہکر تجرد کی زندگی بسر کرے، خدا کی یاد مین اپنی ذات کو بھلا دینا اسکا فرض ہو۔ مختصر یہ کہ وہ اپنی زندگی کو پورے طور سے روحانی بنانیکی کوشش کرے۔ اِس لحاظ سے دیکھا جاے تو ہندوؤن کا مذہب کبھی عقد بیوگان کی اجازت نہین دیتا بلکہ اسے قطعاً ممنوع قرار دیتا ہے۔ بیوگان کی شادی کے خلاف یہ ایک قسم کا غیر تحریری حکم ہو۔ برہمن کیلئے جو مجلسی طور پر تمام ہندوؤن مین اعلیٰ درجہ رکھتا ہو لازم ہو کہ وہ سادہ زندگی بسر کرنے اور اعلیٰ خیالات سوچنے کی ایک شاندار مثال ہو۔ ہرچند کہ علم و اثر اس کے اختیار مین ہین تاہم ضروری ہے کہ وہ دُنیاوی جاہ و حشم کے معاملے مین غریب ہو۔ روحانی پاکیزگی اور رفاست کے لیے ضروری ہو کہ وہ افلاس ہی کی حالت مین قانع رہے۔ جو شخص دولت کا خواہشمند ہو اسکے اندر صداقت کیونکر موجود رہ سکتی ہی؟ اور علم کے لیے تو سب سے بڑھ کر ضروری ہو کہ وہ صداقت کا پرستار ہو۔ اسی ضمن مین ہارورڈ کے پروفیسر جیمز کے مندرجہ ذیل خیالات قابل ملاحظہ معلوم ہوتے ہین:-

درحقیقت افلاس ہی جدوجہد کی زندگی ہو۔ وہ افلاس جس مین باجے کی آواز، شاندار وردی، پرجوش اظہار خوشنودی، یا جھوٹ یا فریب کو دخل نہ ہو۔ جس وقت ہم دیکھتے ہین کہ دولت کمانے کی دھن کسطرح ہماری موجودہ نسلون کی ہڈیون کے عرق تک مین اپنا اثر قائم کر چکی ہو تو یہ سوچکر تعجب ہوتا ہو کہ آیا اِس اعتقاد کی از سر نو اشاعت کہ افلاس ایک مستحسن مذہبی وسیلہ نجات ہو اس روحانی اصلاح کے لیے ضروری سمجھی جاسکتی ہو جس کی ہمین بے حد ضرورت ہو۔ حقیقت یہ ہو کہ خصوصیت سے ہم لوگون مین جو انگریزی زبان بولنے والے ہین سب سے بڑی ضرورت اِس بات کی ہے کہ افلاس کی تعریف مین پھر ایک بار راگ گائے جائین۔ ہم ایک طرح پر افلاس سے خوف کھانے لگ گئے ہین۔ جو شخص اپنی زندگی کو سادگی سے بسر کرنے یا اپنی اندرونی زندگی کو بچانے کے لیے غریب رہنا پسند کرتا ہے ہم اسے نفرت کی نظر سے دیکھتے ہین۔ اگر کوئی شخص عوام مین ملکر روپیہ پیدا کرنیکی جدوجہد مین شریک نہ ہو تو ہم یہ سمجھنے لگتے ہین کہ وہ بے حوصلہ اور ہر قسم کی خواہشات سے عاری ہو۔ ہم اب اِس بات کا اندازہ ذہنی طور پر بھی نہین کر سکتے کہ زمانۂ قدیم مین افلاس کا جو معیار مقرر تھا اسکے معنی کیا ہو سکتے ہین، اور نہ ان فوائد کو سمجھ سکتے ہین جن کا اس معیار سے لازمی طور پر تعلق ہو یعنی مادی تعلقات سے آزادی، روحانی پاکیزگی، سفلی باتون کی حرص مردانہ وار عدم توجہی کا اظہار، زندگی کا معیار دولت کے بجائے کامون کے ذریعے سے کام کرنا، غیر ذمہ دارانہ طریق پر اپنی زندگی کو جس وقت جی مین آئے خیرباد کہہ دینا، اور وہ تمام اخلاقی آزادیان جو اس سے تعلق رکھتی ہین۔

لیکن ہر معاملہ کے لازمی طور پر دو رُخ ہوتے ہین اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہو کہ ہم اِس دوسرے رُخ کو بھی شروع ہی مین پیش کردین۔

ہندوؤن مین دو جُداگانہ طبقے موجود ہین جو ان کی تہذیب کے دو مختلف پہلوؤن کے نمایندے سمجھے جا سکتے ہین۔ انھین عام طور پر اعلیٰ اور ادنیٰ طبقات کہا جاتا ہو لیکن حقیقت مین ان کے اندر اختلاف

صرف تعلیم کا ہی۔ قدیم موروثی تہذیب دونون مین موجود ہی فرق
اگر ہی تو محض اتنا کہ تعلیم یافتہ فرقے مین اسکا اثر محلول ہوکر پورے طور
سے بس چکا ہی لیکن غیر تعلیم یافتہ لوگون کے کثیر التعداد گروہ مین اسکا اثر
صرف خارجی ہی گو اسکا وجود دونون صورتون مین پایا جاتا ہے۔

تہذیب کا خود بخود پیدا ہونا اسکی جان ہی۔ جو باتین لوگون پر
محض رواجاً عائد کی جاتی ہین وہ ایسی ہی ہین جیسے اصلی پھول کے بجائے
کاغذی پھول لگا دیا جائے یعنی محض اس قسم کی جن سے دیکھنے والون
کو یقین پیدا ہو سکے۔ اس صداقت کی کیفیت ہندوستان کے اندر ہماری
نظرون سے گذرتی ہی۔ ہر چند کہ ہندویت نے صدیون کے عرصے
مین اس زبردست آلہ رواج کے ذریعہ سے اپنی تہذیب کو عوام
کے اندر داخل کرنے کی کوشش کی، اور گو اس تہذیب کا اثر لوگونکی
ہڈیون تک مین بس چکا ہی تاہم اس سے ان کا دلی جوش اب تک
متاثر نہین ہوا۔ کثیر التعداد ہندوستانیون مین تہذیب موجود تو ہے
لیکن وہ حسی نہین رواجی ہی۔ دوسرے لفظون مین یون کہا جا سکتا
ہی کہ وہ خود رو نہین آٹومیٹک ہے۔

اسکی تشریح اسطرح پر ہوسکتی ہی کہ کیا باعث ہی باوجودیکہ ایک ہی
خمیر کے سارے آٹے مین موجود ہونے کے اسکا اثر صرف جزوی
ہوا ہی؟ جو حصہ اس خمیر سے اثر پذیر ہوا، وہی ہی جو تعلیم کی برقی
چکی مین سے گذر چکا ہی۔ اس حصہ کی نسبت مختصر الفاظ مین کہا جا سکتا
ہی کہ وہ رکاوٹ پیدا کرنیوالے مادہ سے پاک، آزاد، ذمہ دار اور ترقی
یافتہ ہے۔ دوسرا حصہ روایت کی دقیانوسی پن چکی کے نیچے دبا
ہوا ہی۔ قرنہا قرن سے عوام کو اس تعلیم سے محروم رکھا گیا ہی
جو انکے اندر روشنی کا باب کھول سکتی تھی۔ بس یہی فرق ہی اور
اسی نے ہندو قوم کو ایک قوم کی حیثیت مین کسی قابل بننے
نہین دیا۔

اس قدر جملہ معترضانہ کے بعد اب ہم پھر نفس مضمون کی طرف
رجوع کرتے ہین۔ مایا کے عجیب و غریب مسئلہ کی ابتدا کے متعلق لوگون
کے خیالات مختلف ہین کوئی اسے "شیطانی تعلیم" سے منسوب کرتا ہے،
کوئی "آب و ہوا کے اثر" سے۔ غرض لوگون کے اندر اسی قسم کے صدہا
متضاد خیالات اس کے متعلق پھیلے ہوئے ہین۔ ممالک غیر کے نکتہ
چینون مین سے بعض نے بڑے غور و فکر کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ
یہ ہندوؤن کی ہر بات کو اندیشہ کی نظر سے دیکھنے کے مسئلہ کا انتہائی
پہلو ہے۔ ایک انگریزی شاعر کہ گیا ہے :-

نقابت کا فخر، طاقت کا غرور، اور دولت اور حسن کا ناز، یہ سب باتین
یکسان طور پر اس اٹل گھنٹہ کی منتظر ہین۔ فتح اور شان و شوکت کے
راستے بھی آخر کار قبرستان ہی کو جاتے ہین۔

ان غیر ملکی نکتہ چینون کا خیال ہی کہ جس بات کو مد نظر رکھکر شاعر
نے یہ الفاظ لکھے ہین انہی کو بدرجۂ اتم بڑھا کر ان کی فلسفیانہ صورت
کا نام "مایا" رکھ لیا گیا ہے۔

بعض یہ کہتے ہین کہ انسان نے زندگی کی عارضی نمائش کو دیکھکر
اپنی ذات کو اس کے مطابق بنانے کے لیے اس مسئلہ کو اختراع کیا ہے۔
دوسری طرف بعض کا خیال یہ ہی کہ جس وقت ہندو فلاسفر زندگی کی
مختلف حالتون کی غیر یکسانیت کو نظر انداز کرنے سے قاصر رہے تو انھون
نے اپنے خیالات مین بہت بڑی رنگ آمیزی کرکے اس مسئلہ کو ہاتھ
مین لیا۔ ان لوگون کے نقطۂ نظر سے اس مسئلہ کو اختراع کرنے والون
کی مایوسی کیلیے کی اس مایوسی کے مانند تھی جس سے مجبور ہوکر اسنے
لکھا تھا۔

اگر یہ سچ ہو کہ اضافۂ تعلیم قدرت پر ایک وسیع قبضہ جو اسکا لازم نتیجہ ہے
اور حصول دولت جو اسکے قدم بقدم چلتی ہو عوام کی حاجتمندی اور اسکے
ضروری لوازم طبعی اور اخلاقی تنزل مین کسی قسم کا اختلاف پیدا نہین

کر سکتے تو مین اسباب کو بڑی خوشی کی نظر سے دیکھون گا کہ کوئی مہربان مدار تارہ زمین سے ٹکرا کر اسکی ہر چیز کی صفائی کر جائے۔

مایا کی ابتدا کے متعلق یہ اور اسی قسم کے اور خیالات جن کا اظہار وقتاً فوقتاً لوگون کی طرف سے ہوتا ہے اس کو ثابت کرتے ہین کہ جس چیز کو دل محسوس کرنے کے قابل نہین ہوتا دماغ اسکی بری بھلی تشریح کر کے اس سے پیچھا چھڑانے کا کسقدر آرزومند ہوتا ہے۔

لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ مایا کا خیال نہ تو ہندوؤن کی ہر چیز کو اندیشہ کی نظر سے دیکھنے کے باعث پیدا ہوا اور نہ ان کے اس چیز سے اپنے آپ کو چھپانے کی فکر سے جس کی تشریح ان کے لیے ناممکن تھی۔ ویدانت مین مایا کا جو ذکر آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض جہالت کا نام ہے۔ نہ تو اسکا کوئی خاص وجود ہے اور نہ یہ بالکل ہی عدم ہے۔ یہ ایک طاقت ہے جو اپنے وجود کے لیے دنیا کی نمائش پر منحصر ہے۔ یعنی وہ طاقت جو ان صورتون کے نمودار ہونے کی ذمہ دار ہے جنھین نامعلوم مقام سے تعلق رکھنے والے فن اور مادہ کہتے ہین۔ مایا ہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے ہم آتما کے بجائے برہمانڈ کو دیکھتے ہین ہم اسکے طریق وقوع کو سمجھنے مین اس لیے قاصر ہین کہ ہم خود اسکی پیداوار ہین اور نتیجہ کبھی اپنے باعث سے فوق الاثر نہین ہو سکتا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ مایا کو دور کرنے کے لیے علم، برہم گیان، اور وجود حقیقی کی واقفیت کی ضرورت ہے۔ اسکے دور ہونیکے معنی یہ ہین کہ انسان روشنی کے اس اعلیٰ ترین درجے کو حاصل کرے جو اس کے دائرہ مین موجود ہے یعنی یہ کہ وہ اپنی پوری طاقت تک پہنچ جائے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ انسان اس معراج کو حاصل کرے جس مین تلون اپنی جگہ توحد کو دیتا ہے۔ یعنی یہ کہ اس پر حقیقی علم کے دروازے کھل جائین اسکی غلطی کا پردہ آنکھون کے آگے سے اٹھ جائے، اور اسکا غم ہمیشہ کیلئے تلف ہو جائے۔

ہم نے اوپر کہا تھا کہ انسان مایا کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس خیال سے کہ ناظرین اتنا پڑھکر گھبرا نہ جائین اور گھبراہٹ مین ادھر سے اپنی توجہ ہٹا لین ہم اسکے ساتھ ہی یہ بھی بیان کر دینا چاہتے ہین کہ انسان اسے سمجھنے مین صرف اسی درجے تک قاصر ہے جیسے کہ وہ تمام "بنیادی خیالات" کو سمجھنے کے معاملے مین ہوتا ہے۔ اسکی مزید توضیح کے لیے ذیل کی عبارت انگریزی کی کتاب "عجیب و غریب صدی" مین سے "مادہ کے گردابی مسئلہ" کے متعلق ترجمہ کر کے درج کی جاتی ہے:-

اس مسئلہ کی رو سے ایتھر کو ایک اس قسم کی رقیق چیز تصور کیا جاتا ہے جو نہ تو دباؤ مین آسکتا ہے اور نہ اسمین رگڑ پیدا ہوتی ہے۔ سارے برہمانڈ مین ایک اور صرف وہی ایک چیز ہے۔ وہ چیز جسے مادہ کہتے ہین درحقیقت ایتھر کی حرکت کی ایک صورت ہے۔ سالمات درحقیقت نہایت چھوٹے چھوٹے گرداب یا ایتھر کی تیزی سے گردش کرنے والے اجزا ہین اور یہ اجزا اس قسم کے ہین کہ جب ایک بار اس رگڑ سے خالی رقیق چیز مین ان کے اندر حرکت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ دوامی اور ناقابل اتلاف ثابت ہوتے ہین۔ خیال ہے کہ ان گرداون کی ایک کافی (قریب قریب بے انتہا) تعداد جن مین سے ہر ایک کی جسامت مختلف ہوتی ہے جو مختلف تیزی سے حرکت کرتے ہین اور گیس کے ذرات کے مانند ہر ممکن سمت مین پھیلتے ہین، جسامت اور حرکت کی مشابہت کے اعتبار سے مختلف مجموعون کی صورت اختیار کرتے ہین۔ اس اجتماع کے عمل سے عناصر پیدا ہوتے ہین اور جب یہ عناصر کیمیائی ترکیب سے ایک دوسرے سے ملتے ہین تو اس سے مادہ کی مختلف صورتین پیدا ہوتی ہین۔ لیکن ان سالمات اور ان کے مجموعات کی مسلسل حرکات غیر مرئی ایتھر کے اندر حرارت اور بجلی کی خاص جنبشین پیدا کرتی ہین جس کا اثر دوبارہ مادہ پر پڑتا ہے تو ان باہم پیوست شدہ تبدیلیون کا ظہور ہوتا ہے جنھین قوانین و ظہورات فطرت خیال کرتے ہین۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا کشش اس ابتدائی حرکت سے پیدا ہوتی ہے جو ایتھر مین لائی جاتی ہے یا نہین۔

بہر نوع لارڈ کیلون جو انگلستان مین اس گردابی حصے کے سب سے بڑے شارح ہین انکی اِس تھیوری کو زیر نظر رکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہو کہ برہانڈ کی ابتدا کی دریافت کے متعلق جسقدر کوششین کیگئی ہین ان سب مین یہ نہایت اہم ہو۔ لیکن تمام "بنیادی خیالات" کی طرح یہ مسئلہ بھی اِس قسم کا ہو کہ ذہن انسانی بمشکل اسے قبول کرسکتا ہو۔ دباؤ مین نہ آنے اور نہ رگڑ کھانیوالی رقیق شے جو سارے برہانڈ پر حاوی اور محیط ہو سالماتی گردابی حرکات کے سلسلۂ نامتناہی کی ابتدا، قبول حرکات، اجتماعات کا نہ ختم ہونیوالا سلسلہ، کیمیائی حرکات کی پیچیدگی، ایتھر کی مختلف قسم کی جنبشون، اور کشش کی طاقت کا پیدا ہونا، یہ سب باتین فہم انسانی مین نہین آسکتین۔ اگر آبھی جائین تو سب سے بڑی ناقابل فہم بات یہ رہ جاتی ہو کہ ایتھر کے ان گردابی حلقون کے اِس طرح آپسمین ٹکراتے رہنے کے نہ ختم ہونے والے سلسلہ مین سے زندگی بیداری، محبت، اور رذالت کیونکر پیدا ہوگئی۔

ممکن ہو کہ ناظرین مین سے بعض یہ اعتراض کرین کہ ایک سائینٹفک طور پر مستند ناقابل فہم مثال پیش کر دینے سے یہ لازم نہین آتا کہ کوئی اور ناقابل فہم بات تسلیم کرلی جائے۔ ہم ان کے اس اعتراض کو تسلیم کرتے ہین سچ پوچھو تو مایا کا مسئلہ بجائے خود ایک مستحکم بنیاد پر قائم ہو۔ ہم نے ڈاکٹر والیس کی کتاب کا مندرجۂ بالا اقتباس محض اس لیے پیش کیا کہ دکھایا جائے گو بعض باتین ہمارے فہم وقیاس سے بعید ہین تاہم اُس وجہ سے ہم انھین ناممکن نہین قرار دے سکتے۔

مایا کے مسئلہ کو مختلف نقاط نظر سے مختلف دلائل کے ذریعہ سے ثابت کیا جاسکتا ہو۔ ذیل مین ایک پہلو کو لیکر اسکے متعلق وہ دلائل جو فروری سنہ ۱۹۰۲ء کے رسالہ "پربدہ بھارت" مین پیش کیے گئے تھے درج کیے جاتے ہین :-

اگر خدا اپنی دُنیا مین نہین ہو تو ہمین اسے کسی دوسری جگہ تلاش کرنیکی ضرورت نہین۔ فی الحقیقت اور کوئی جگہ ہی نہین جہان اسے تلاش کیا جائے۔

اس مسئلہ سے اِس خیال کی تشریح ہوتی ہو کہ خدا کا وجود برہانڈ سے باہر ہو۔ اگر وہ برہانڈ سے باہر ہو تو وہ لامحدود نہین اس لیے خدا نہین۔

اگر خدا سارے کے اندر موجود ہو تو ضروری ہو کہ وہ ذرہ مین بھی ہو اگر نہین تو اسکی اِس صفت مین فرق آتا ہو کہ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ یہان پر ایک نہایت دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہو۔ کیا ذرہ خدا سے کسیقدر کم یا اس سے زیادہ درجہ رکھتا ہو؟ دوسرے لفظون مین یون کہو کہ کیا ذرہ ایک غیر ترقی یافتہ خدا ہو یا مرکب یعنی خدا یا کچھ اور چیز؟ -

اگر ذرہ غیر ترقی یافتہ خدا ہو تو وہ خدا کا جزو ہو کیونکہ وہ سالم خدا نہین ہوسکتا۔ اِس سے ثابت ہوتا ہو کہ خدا ترقی کے مختلف مدارج کے اجزا سے مرکب ہو۔ اگر اِس اُصول کو مان لیا جائے تو ثابت ہوتا ہو کہ خدا کے وجود مین ترمیم اور اسکی موت بھی واقع ہوسکتی ہے۔

اگر ذرہ خدا سے مختلف کچھ چیز ہو جس پر خدا کا وجود محیط اور اسکے اندر جان ڈالتا ہو تو اسکے لاانتہا اور ہر جگہ موجود ہونیکی صفت مین فرق آتا ہے ذرہ کا خدا سے مختلف ہونا اسے محدود کرتا ہو۔ خدا چونکہ ذرہ مین موجود نہین اسلیے وہ ان اجزا مین بھی موجود نہین جن سے ذرہ مرکب ہو۔ اگر وہ ہوتا تو ذرے سے بھی جُدا نہوتا۔

غرض یہ کہ عالم کی دونون صورتین ناقابل تسلیم ہین۔ اگر ہم خدا کو ترقی کن یا محدود سمجھین تو اسکی خدائی صفات مین فرق آتا ہو۔

ایک فرقہ اِن سائنس دانون اور مسئلہ ارتقا کے مویدون کا پیدا ہوگیا ہو جن کا عقیدہ یہ ہو کہ خدا وہ نامعلوم کامل وحدانیت ہو جسکے دو پہلو مادی اور روحانی عالم ہین۔

اگر ہم ان دونون عالمون کا اِس نامعلوم کامل وحدانیت کے ساتھ اس قسم کا تعلق تسلیم کرین جیسا اس مین بتایا گیا ہو تو یہ ماننا پڑتا ہو کہ اس مین بھی یقیناً تبدیلی واقع ہوتی ہو اور اس سے خواہ کچھ اور ثابت ہوتا ہو مگر خدا کی صفت "خدائی" ثابت نہین ہوتی۔

اسکی وجہ یہ ہو کہ سبب کی صورت اختیار کرتے ہوئے اس ذات نامعلوم کو وہ بننا پڑا جو وہ پہلے نہ تھی یعنی اس مین تبدیلی واقع ہوئی۔ تبدیلی ایک نتیجہ ہو جو واقعات کے شروع ہو کر ختم نہ ہونے والے سلسلہ مین ظہور پذیر ہوتا ہو جس نتیجہ نے اس ذات نامعلوم کو سبب بنایا اُسکا خود کوئی سبب موجود تھا اور بجائے خود نتیجہ رہ چکا ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس اس سلسلہ کو لا انتہائی تک پہنچایا جا سکتا ہو۔ اس طرح پر اگر اس ذات نامعلوم مین کسی تبدیلی کا وقوعہ تسلیم کر لیا جائے تو وہ ایک اثر یا نتیجہ ثابت ہوتی ہو۔ گویا اسکی حالت متبدل ماننی پڑتی ہو جو واقعات کے شروع ہو کر ختم نہ ہونے والے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

اس صورت مین پھر اس ذریعہ کو جس نے اس ذات نامعلوم مین تبدیلی پیدا کی جس کے باعث آخر الذکر نے نتیجہ کا درجہ حاصل کیا ایک ایسی صفت ماننا پڑتا ہو جو یا تو اس ذات نامعلوم کے اندر موجود تھی یا باہر۔ اگر اندر موجود تھی تو تبدیلی کا باعث اس ذات نامعلوم کی کوئی اندرونی ضرورت ہوگی۔ اگر خارجی تھی تو وہ ذات نامعلوم یقیناً کسی پر انحصار رکھتی ہوگی اور اسپر کسی قسم کا اثر یا دباؤ پڑ سکتا ہوگا۔ لیکن جس مین ضرورت کی وجہ سے یا دباؤ کے باعث کوئی تبدیلی ہو سکتی ہو وہ خدا نہین ہو سکتا۔

پس ہمین دو مین سے ایک بات ماننا پڑتی ہو یعنی یا تو مادئیت یا مایا کا مسئلہ جس کا منشا یہ ہو کہ جو کچھ نظر آتا ہو یہ محض نظری دھوکا ہو۔ اس مسئلہ کو تسلیم کرنے والے اعتراف کرتے ہین کہ ہم برہمانڈ کی ابتدا کے متعلق کچھ نہین جانتے، کیونکہ ہماری عقل ہمین یہ بتانے سے قاصر ہو کہ کیونکر اس کامل طور پر نامعلوم ذات نے روحانی اور مادی عالم پیدا کر دیے اور خود اس عمل مین تلف نہ ہوئی۔ ہمین دو مین سے ایک کے حق مین فیصلہ دینا ہوگا۔ اگر ہم اول الذکر کے حق مین فیصلہ دین تو بھی ماننا پڑے گا کہ یہ برہمانڈ کا ظہور محض دھوکا ہے۔

ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہین کہ جہلا کے ہاتھون پڑنے کی وجہ سے اس مسئلہ نے بہت سی خرابیان پیدا کی ہین جہلا کے ہاتھ سے جو کچھ نہ ہو تھوڑا ہے۔

مایا کا مسئلہ ہمین سکھاتا ہو کہ جو کچھ ظہور مین آ رہا ہو اسمین سے کچھ بھی کامل طور سے حقیقی نہین لیکن ساتھ ہی کوئی بھی چیز نسبتاً غیر حقیقی نہین ہو۔ ہر ایک حالت یا ہر ایک چیز محض ظاہری ہو صرف اسکا وجود حقیقی ہو۔ لیکن ظاہرات کا عالم ہی قانون کا عالم ہو جب تک کوئی شخص کامل پاکیزگی، نیکی، ضبط، وخودداری کے ذریعے سے اندرونی روشنی کو جاگرو جوُد نہ پہچان لے تب تک وہ طبقۂ ظاہرات سے باہر قدم نہین رکھ سکتا اور نہ کرم کے زبردست اور غلطی نہ کرنے والے قانون سے بچ سکتا ہو۔ پس ظاہر ہو کہ ان حالتون مین صرف جاہل لوگ ہی اپنی کمزوریون کے لیے مایا کی پناہ ڈھونڈ سکتے ہین۔

ہم دکھا چکے ہین کہ تیاگ جو ہندو تہذیب کا اُصول ہو براہ راست مایا کے مسئلہ سے تعلق رکھتا ہو۔ اس مضمون کو ختم کرنے سے پیشتر ہم بعض اور اہم نتائج کا جو اس سے پیدا ہوتے ہین ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہین۔

زندگی مین کوئی بات کامل طور پر بُری یا صرف جزوی طور پر اچھی نہین ہو کیونکہ تمام چیزون کے عنصر حقیقی کے علاوہ جو لامحدود اور ناقابل بیان ہو اور کچھ کامل طور پر حقیقی نہین ہو۔ ہر ایک ظہور کو اگر اسکی حقیقی قدر کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اسکے ہمیشہ مبدل رہنے والے نظر فریب لباس سے قطع نظر وہ حقیقت مین وجود لامحدود ہو۔ اس اعتبار سے اس نہ ختم ہونے والے برہمانڈ مین کوئی چیز ایسی نہین جس کا اپنے باعث وجود سے برکت حاصل کرنا یقینی نہ ہو۔ لامحدود اُمید نہ ختم ہونے والی طاقت، خارج از حدود تکمیل، سب کا قدرتی استحقاق ہو، اور اس استحقاق کو سب تک پہنچانا ہی مسئلہ ارتقا کی جان ہو۔

مایا کا سوال اخلاق کے بنیادی اُصول کو قائم کرتا ہو۔ کیونکہ وہ

تفریق اور ظہور پر سے حقیقت کا احساس ہٹا کر اسے اس ناقابل تقسیم ذات پر ڈالتا ہی جو سب کے اندر رایا ہے۔ اخلاق سے عاری ہونے کا امکان اس تفریق کو تسلیم کرنے پر حصر رکھتا ہے اکسی دوسرے شخص ب کو ضرر پہنچاتا ہو کیونکہ وہ جانتا ہو کہ وہ اس طرح اپنے آپ کو تکلیف نہیں پہنچاتا۔ مایا کے مسئلہ کی روسے یہ تفریق محض ظاہری ہو حقیقی نہیں۔ ظاہری پہلو پر زور دیکر وہ حقیقی سے جُدا ہوجاتا اور اس طرح اپنے آپ کو ضرر پہنچاتا ہے۔

کیا وجہ ہی کہ ایک شخص اپنے ہمسایہ سے اپنے برابر محبت کرے؟ اسلیے کہ اسکی اور اُسکی حقیقت دراصل ایک ہی ہے۔

یہ مسئلہ دوسرون کو نجات دلانے کسی قوم کے شاہی اختیارات تسلیم کرنے، یا ایک کو دوسرے سے برتر و بہتر سمجھنے کے اُصول کو سختی سے رد کرتا ہی۔ اسکی روشنی مین جو کام کیا جائے وہ صرف ایک ہی معنی رکھتا ہی یعنی یہ کہ انسان خدمت کر رہا ہے، اس ذات واحد کی خدمت جو لا انتہا صورتون مین موجود ہے۔ مایا کو ماننے والا کسی کی شخصی فضیلت، خدائی اوصاف، دوسرون کو حقیر و گنہگار تسلیم کرنا ان باتون کا مطلق قائل نہین۔ وہ تو فطرت انسانی کی نیکی پر بے انتہا اعتقاد رکھتا ہے اور کل بنی نوع کے لیے لامحدود خیرات کا معترف ہے۔

تیرتھ رام

پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی

اُردو علم ادب نے ابتدا سے آجتک کئی چولے بدلے اور تغیرات کی مختلف منزلین طے کین لیکن ماہران علم اللسان واقف ہین کہ اس قسم کی تبدیلیان ہر زبان کیلئے لابدی ہین البتہ فی زمانتا اُردو کی ادبی دُنیا مین خیالات کے اعتبار سے جو خوشگوار انقلاب نمودار ہو رہا وہ بہ لحاظ اپنے مستقل فوائد کے قابل قدر چیز ہی حقیقت یہ ہی کہ برٹش گورنمنٹ کے زیر سایہ جہان ہمین اور بہت سی برکات سے متمتع ہونے کا موقع ملا ہے وہان ایک یہ بھی ہی کہ ہمارے خیالات و جذبات مغربی خیالات و جذبات سے متاثر ہو رہے ہین اور یہ مُلکی لٹریچر کے حق مین ایک مبارک فال ہے۔

بیشک اسکا فیصلہ وقت کرے گا کہ مغربی تاثیرات نے ہمارے علم ادب کو واقعی کوئی نفع پہنچایا ہی یا نہین لیکن ارباب نظر موجودہ واقعات سے آئندہ نتائج کے اخذ کرنے سے قاصر نہین، اور اُن کا خیال ہی اور اُسکی صحت کے کئی قابل قبول ثبوت بھی موجود ہین کہ مغربی لٹریچر کا اثر اردو ادب کیلئے ہر نوع منفعت بخش ثابت ہوگا۔

یہ ادبی انقلاب جسکی طرف ہم اُوپر اشارہ کر چکے ہین حقیقت مین اُس وقت سے شروع ہوا ہی جب سے ہمین انگریزی تعلیم کی بدولت مغربی خیالات پر عبور کرنیکی قدرت حاصل ہوئی ہی لیکن اُسکی اصلی بنا اُسی وقت پڑ چکی تھی جب کلکتہ مین فورٹ ولیم کالج کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ اور اُن کی پُرجوش جماعت نے اول، اول اُردو کے خزانہ کو جن جن گرانمایہ جواہر سے لبریز کیا ہی اُسکی شکر یہ آمیز یاد بھی خدا ان ملک کے دلون سے کبھی محو نہین ہوسکتی۔ آج بھی ہمارے ملک مین جو اور جسقدر علمی تحریکین قوت سے فعل مین آ رہی ہین وہ سب کی سب ڈاکٹر صاحب موصوف کے مقرر کردہ معیار پر چلائی جاتی ہین۔ فروعات مین اگر کوئی اختلاف ہو تو وہ چندان قابل وقعت نہین۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کی مساعی جمیلہ اور اُن کے کارآمد

نتائج کا اعتراف کرنیکے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اُن کے اہتمام سے جسقدر بھی کتابین نکلین وہ بجائے خود خوبیون کا مجموعہ ہونیکے سرتاپا مشرقی رنگ مین تھین اور مغربی خصوصیات سے وہ بالکل بے تعلق اور علیحدہ تھین اور شاید یہی سبب ہے کہ اس زمانے مین جبکہ خیالات کی رَو ایک دوسرے جانب کو جارہی ہے، طوطا کہانی، باغ و بہار، بیتال پچیسی کے صفحات ہمارے لیے مستقل دلچسپی اور دلبستگی سے قطعاً خالی نظر آتے ہین۔

علم ادب اُردو کی شاندار شہ نشین مین جس نئے ستون کی کمی تھی وہ دراصل پنجاب کے نامور ڈائرکٹر تعلیمات کرنل ہالرائڈ کے ہاتھون اضافہ ہوا۔ ہمارا مطلب اس سے یہ ہے کہ مغربی لٹریچر سے مشرقی طبائع کو مانوس کرنیکی اہم لیکن دشوار خدمت سب سے پہلے کرنل موصوف نے اپنے ذمہ لی ہے اور انصافاً کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے خزانۂ ادب مین جسقدر نئی نئی چیزین یورپ وغیرہ سے لاکر رکھی گئی ہین وہ سب اُنھین کے حُسن تدبیر کا نتیجہ ہے۔

یہ بات بھی اکثر دیکھی گئی ہے کہ ابتدا مین خواہ کوئی کام کتنا ہی مشکل کیون نہو لیکن اگر اُسکی تحریک جاری رہے تو باوجود خارجی اسباب کے مخالف و متضاد ہونیکے کچھ نہ کچھ آدمی ہاتھ بٹانے والے پیدا ہوجاتے ہین خصوصاً ایسی حالت مین کہ وہ کام سر بسر اُنھین لوگون کے فائدہ کا ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہین کہ کرنل ہالرائڈ کی تحریص و تشویق نے اُنکے گرد ایسے بہت سے آدمی جمع کردیئے تھے جو پہلے پہل اُن کے مددگار تھے لیکن آخرکار وہ اُردو لٹریچر کے اول محسنون مین شمار ہونے لگے۔ انہین پروفیسر آزاد اور مولانا حالی خصوصیت سے قابل تذکرہ ہین۔

قاعدہ کی بات ہے کہ جبتک کسی تحریک کا آغاز نہین ہوتا اُسکی مخالفت اور موافقت ہونا یا اُسکی ترقی کے اسباب کا فراہم کرنا ایک غیر یقینی امر ہوتا ہے لیکن جب تحریک چل نکلتی ہے تو یہ باتین خودبخود پیدا ہوجاتی ہین۔ یہ بھی کچھ خدا ہی کیطرف سے ہوتا ہے کہ مفید اور نفع رساں کامون کے ہمدرد بسا اوقات اُس طبقے سے نکل کھڑے ہوتے ہین جن سے اسکی خواب مین بھی توقع نہین ہوسکتی۔ اسی جگہ دیکھ لیجیے اُردو علم ادب مین جتنی نئی نئی چیزین آپ کو ملین گی وہ تقریباً سب کی سب ایسے لوگونکی محنت شاقہ کا ثمرہ ہونگی جنھین اپنی عمر کا معتدبہ حصہ قدیم تعلیم و تربیت کے نذر کرنے کے علاوہ یورپ مین علم ادب وغیرہ سے آگاہی حاصل کرنیکا موقع تک نہین ملا۔ مولانا آزاد، مولوی حالی، پروفیسر ذکاءاللہ، مولوی نذیراحمد، نواب محسن الملک، انمین سے کون بزرگ کس کالج کے تعلیم یافتہ تھے اور کسے یورپ جاکر یا ہندوستان مین بیٹھکر مغربی خیالات پر عبور کرنیکی نوبت آئی تھی لیکن یہی لوگ ہین جنکے زورِ قلم نے اُردو ادب کی کایا پلٹ دی اور یہی وہ مبارک نفوس ہین جنکی زبردست دماغی کاوشون نے اُردو لٹریچر کی تاریخ مین ایک شاندار اور روشن باب کا اضافہ کیا ہے۔

بہرکیف اسے اتفاقی بات سمجھ لو یا کسی خاص سبب کا لازمی نتیجہ کرنل ہالرائڈ نے جو پودھا نصب کیا تھا اُسکے سینچنے والے بہت جلد کئی ایک پیدا ہوگئے اور گو ابھی تک اس پودھے مین پورے طور پر پھل نہین آئے لیکن کوئی یہ بھی نہین کہہ سکتا کہ یہ خشک ہوجائیگا۔ سرسید، آزاد، حالی، مہدی علیخان، چراغ علی، شبلی، ذکاءاللہ، نذیراحمد سبھون نے اپنا پسینہ اس ہونہار نہال کی آبیاری مین صرف کیا اور اُسکی نشو و نما کا سامان بہم پہنچایا۔ مذہبی، ملکی، ادبی، معاشرتی، تاریخی، سوانحی مضامین و کتب جو ان حضرات کے قلم سے نکلے اس درخت کی مختلف شاخین سمجھی جاسکتی ہین۔ ان مضامین پر ان بزرگان قوم نے جو کچھ لکھا خوب اور بہت خوب لکھا کہ اخلاف کے لیے اُنکی یہ کتابین نمونہ کا کام دیتی ہین لیکن ابھی ایک چیز کی کمی تھی یعنی جدید اُصول پر قصّے اور فسانے لکھے جانے کی ضرورت تھی۔ گو یہ ضرورت ایک

حد تک مولانا نذیر احمد کی بعض کتابون از قسم مراۃ العروس وغیرہ سے پوری ہوگئی تھی لیکن انصاف یہ ہی کہ یہ کتب عورتون کیلئے لکھی گئی تھین اور اسلئے عمداً انمین بعض اُن اُصول سے احتراز کیا گیا تھا جو مغربی ناولون کے بنیادی پتھر تسلیم کیئے جاتے ہین۔

اس مسئلہ پر رائے زنی کرنا تحصیل حاصل ہوگا کہ اُردو مین قصہ نگاری کا قدیم رنگ کیا تھا کیونکہ جو لوگ اُردو جانتے اور پڑھنے والے ہین ممکن نہین کہ اُنھون نے خود طلسم ہوشربا، بوستان خیال، یا فسانہ عجائب کی بعید از خیال اور خلاف عقل وقیاس سرگذشتون کا مطالعہ کیا ہو یا کم از کم اُنکی حالت سے آگاہ نہون۔ اِن کتابون کے مصنفین کی جدت اور مضمون آفرینی مین کسکو شک ہوسکتا ہی لیکن اسکے باوجود کہنا پڑتا ہی کہ یہ فسانے اصلیت سے خالی تھے اور اسوجہ سے اُن سے وہ کام نہ نکلا جو یورپ مین آج ناولون کے ذریعہ سے ہو رہا ہی۔ وہان ان ناولون اور قصّون سے اخلاقی، تمدنی، اور معاشرتی فوائد حاصل ہوئے اور ہو رہے ہین اور ہمارے یہان اِن پُرانے افسانون سے صرف تفریح طبع مقصود سمجھی جاتی رہی ہی۔ اسی شوق نے جو زیادہ تر اُمراء اور حکمرانون کے دلون مین جاگزین تھا ہمارے یہان داستان گویون کی ایک خاص جماعت پیدا کردی تھی جسکے "باقیات الصالحات" آج بھی ہندوستان کی اسلامی دیسی ریاستون مین اپنے اسلاف کے کمال کا علمی ثبوت دینے کے لیے موجود ہین۔ لیکن اب ان باتون مین کوئی لطف نہ رہگیا تھا اور خیالات اور مذاق کے تغیرات کے ساتھ ضروری تھا کہ اِس صنف خاص مین بھی کچھ مسالہ اُن لوگون کی ضیافت طبع کی غرض سے مہیا کیا جاتا جن کا وجدان صحیح دیو، جن، بھوت، پریت کے دور از خیال اور غیر سبق آموز قصص مین کوئی دلچسپی نہین لے سکتا تھا۔ اِس اہم ضرورت کی تکمیل کا احساس سب سے پہلے پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی کو ہوا اور وہی اُردو کی جدید طرز کی فسانہ نگاری کے موجد ہین۔ ہم اوپر کسیقدر حیرت واستعجاب سے اس امر کا اظہار کرچکے ہین کہ اُردو زبان کے اولین مصلحو نمین ہمین جتنے نام نظر آتے ہین وہ سب کے سب قدیم تعلیم وتربیت کے نمونے تھے۔ پنڈت رتن ناتھ بھی پُرانے زمانے کی یادگار تھے۔ انمین اتنی بات ضرور تھی کہ وہ انگریزی بھی جانتے تھے اور غالباً مطالعہ کے زور سے اُسمین مہارت کامل پیدا کرلی تھی۔

یہ امر ابھی تک ما بہ النزاع ہی کہ جدید فسانہ نگاری مین اولیت کا سہرا شرر کے سر ہی یا سرشار کے[5]۔ قدردانان اُردو کے دو گروہ ہوگئے ہین ایک شرر کی فضیلت کا مدعی ہی دوسرا سرشار کی۔ ہمارے یہان اُصولی اور علمی بحثون مین بھی ذاتیات تک نوبت آجاتی ہی ورنہ اِس قسم کے مسائل پر رائے زنی کرنا نہ صرف دلچسپی کا موجب ہوتا ہی بلکہ مفید بھی کیونکہ کسی زبان کی تاریخ ان واقعات کے فیصلہ کُن تکملہ کے بغیر کسی طرح مکمل نہین کہی جاسکتی۔ بہرحال یہ بحث ایک عرصے تک جاری رہی اور دونون گروہ اپنے اپنے عقائد کی تائید عقلی ونقلی دلائل سے کرتے رہے ہم کو اسجگہ "سرشار و شرر" کے قضیے کو از سرنو تازہ کرنا منظور نہین لیکن ہماری ذاتی رائے اس باب مین یہ ہی کہ اگر مولینا حلیم پر ہم کی منطق کی رعایت سے یہ بھی فرض کرلیا جائے کہ "فسانہ آزاد" جو سرشار کی شہرت علمی کی بنیاد ہی بعض اسباب سے جدید طرز کے ناولون کی فہرست مین جگھ پانے کا مستحق نہین تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ سرشار اُصولاً اُردو ناول نویسی کے موجد ضرور ہین۔ اس سے ہمارا منشاء یہ ہی کہ سرشار سب سے پہلے ہندوستانی فسانہ نگار ہین جنھون نے اُردو قصون

---

۵ مولوی عبدالحلیم صاحب شرر خود سرشار کو مخاطب کرکے فرماتے ہین مصرع

تم نے نئی نکالی فسانہ کی راہ واہ

اور یہ اس بات کا بین ثبوت ہی کہ جدید فسانہ نگاری مین اولیت کا سہرا سرشار کے سر ہے۔ (ایڈیٹر)

کو مافوق العادت واقعات سے برہیز کرنیکی جگہ اُنمین اصلیت کا رنگ پیدا کیا ہے۔

سرشار کی اوّلین تصنیف جس نے دُنیائے ادب مین اُنکی ناموری وعظمت کے جھنڈے گاڑ دیئے ہین "فسانۂ آزاد" ہے۔ اُسکو اُردو قصص اور ناولونمین باعتبار مضمون کے وہی درجہ حاصل ہی جو انگریزی مین "ڈان کوئکزاٹ" کو ہی۔ فسانہ کی شان نزول بھی یہی ہی کہ سرشار کے کسی دوست نے اس طرز کی کتاب تصنیف کرنیکی فرمائش کی تھی۔ سرشار نے مستقل کتاب مرتب کرنے کی جگہ پہلے جداگانہ مضمون کی حیثیت سے اسے اودھ اخبار مین چھپوانا شروع کیا اور جب اُنھین معلوم ہوگیا کہ پبلک کو اُس سے بے انتہا دلچسپی پیدا ہوگئی ہی تو اُسے کتابی شکل مین شائع کردیا۔

"فسانۂ آزاد" مین جدید وقدیم رنگ کی آمیزش اس تناسب کے ساتھ کیگئی ہی کہ دونون مذاق کے لوگ اُسے پسند کرتے ہین۔ ہم اسجگہ فسانۂ آزاد کی خصوصیات کو نمبروار قلمبند کرنا چاہتے ہین:۔

۱۔ سب سے پہلی اور مفید ترین خصوصیت 'فسانہ' کی یہ ہی کہ اُس مین جسقدر واقعات ہین وہ سب کے سب بلا استثنار انسانی طاقتون سے تعلق رکھتے ہین۔ ہمارے پُرانے قصّون مین روحانی تصرفات کا منظر بہت دلکش الفاظ مین پیش کیا جاتا تھا لیکن یہی ایک بات ایسی تھی جو قصّے کو صرف قصّہ کی وقعت دلاتی تھی، نہ اُس سے اخلاق وآداب پر کوئی اثر پڑتا تھا، نہ کوئی تاریخی یا تمدنی منافع مرتب ہوتے تھے، اور نہ کسی معاشرتی یا منزلی نتائج کا استنباط ہوتا تھا کیونکہ جب پڑھنے والا یہ سمجھے کہ اس کتاب کا ہیرو محض روحانی طاقتون کی بدولت اپنی مشکلات سے عہدہ برآیا اپنے مقاصد مین کامیاب ہوا تو اس سے اُسکی ہمت وجرأت واستقلال مین کوئی اضافہ نہین ہوسکتا کیونکہ وہ جانتا ہی کہ مُہر سلیمانی یا الہ دین کے چراغ کا حاصل کرنا انسانی طاقت سے قطعًا خارج ہی۔ لیکن اگر اُسکی کامیابی اور مقصدوری خود انسانی کوششون کا نتیجہ ثابت کی جائے تو یقینًا اُس کے عزم اور ارادے بلند ہون گے اور وہ یہ خیال کرے گا کہ اس شخص کی طرح مین بھی اپنے دماغ اور ذہن سے کام لیکر مقصدور ہو سکتا ہون۔

۲۔ دوسری خصوصیت فسانہ کی یہ ہی کہ اسمین جسقدر باتین لکھی ہین وہ ایسی ہین کہ اُنکی اصلیت سے کسی کو انکار کی جرأت نہین ہوسکتی۔ کوئی منظر، کوئی سین، کوئی واقعہ ایسا نہین دکھایا گیا جسکی ہوبہو تصویر نہ کھینچدی ہو۔ مثال کے لیے "فسانۂ آزاد" کے ابتدائی صفحات دیکھیے جہان آزاد کتب وغیرہ کی سیر کرتے اور وہان کی کیفیت بامعان نظر دیکھتے پھرتے ہین۔ یہ حالات مطالعہ کیجیے تو ممکن نہین کہ وہی سمان آنکھون کے سامنے پھر نہ جائے۔

۳۔ ناول کی کئی قسمین ہین، کسی مین کوئی تاریخی واقعہ درج ہوتا ہی، کسی مین رسم ورواج کی کیفیت دکھائی جاتی ہی، کوئی کسی خاص زمانے کی عام معاشرتی وتمدنی حالت کا آئینہ ہوتا ہی۔ فسانۂ آزاد اُس وقت کی لکھنؤ کی سوسائٹی کا دلچسپ ترین مرقع ہی۔ سرشار کی دو ایک اور تصانیف (سیر کہسار وغیرہ) اس خصوصیت کی مشترکہ طور پر حصّہ دار ہین۔ سرشار لکھنؤ مین پیدا ہوئے۔ محمد شاہ کا زمانہ تھا اور یہ زمانہ عروج کا تھا۔ لیکن اسلامی سوسائٹی مین جہان تک اُسکا تعلق اودھ سے ہی دلفریب خوبیون کے ساتھ بعض قابل اصلاح عیوب بھی موجود تھے، اور تعجب معلوم ہوتا ہی کہ ان باریک باریک باتون کو جن پر اکثر خیال بھی نہین جاتا سرشار نے نہایت غور وخوض سے دیکھا اور جانچا۔ اُنھون نے کسی پر کوئی اعتراض نہین کیا، کسی قسم کا الزام نہین لگایا، لیکن محاسن کے ساتھ معایب کا ذکر اس انداز سے کر گئے ہین کہ نکتہ سنج طبائع اُن کا منشا فورًا دریافت کرلیتی ہین۔

۴۔ اُردو نثر مین بیگمات کی زبان خاص وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہی اور اس امر خاص مین دہلی اور لکھنؤ والے دونون ہمنوا ہین کہ جس

محاورے کا ثبوت محلات کی گفتگو سے نہ ملے وہ قابل سند نہیں۔ یہ ایک جُداگانہ بحث ہے ورنہ ہم اسکے متعلق کچھ عرض کرتے۔ لیکن اسمین کلام نہین کہ بیگمات کی زبان کی نقل ہر شخص آسانی سے نہین اُتار سکتا۔ آجتک صرف دو چار آدمی ایسے گذرے ہین جنھون نے اِس مین کمال کر دکھایا ہے اور انہین سرشار یقینی طور پر ممتاز ہین۔ اسکا ثبوت "فسانۂ آزاد" اور "سیر کہسار" کے صفحے صفحے سے ملتا ہے۔ وہی الفاظ، وہی محاورے، وہی لب ولہجہ، وہی انداز تقریر، وہی لوچدار باتین، وہی فصاحت، وہی لطافت گویا آپ اپنے کانون سے کسی خاتون کو گفتگو کرتے ہوئے سن رہے ہین۔

پردہ نشین مستورات کی زندگی مغرب کی نگاہون اور اُن لوگون کی نظرون مین جو اسلامی طرز معاشرت سے واقفیت نہین رکھتے ایک سربستہ راز بنی ہوئی ہے لیکن سرشار کے فسانہ آزاد مین اسکے چہرے سے پردہ اُٹھا دیا گیا ہے۔ اور کم از کم لکھنؤ کی بیگمات کی سوسائٹی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ صحیح اور بالکل صحیح ہے۔ تعجب معلوم ہوتا ہے کہ جو کام ایک مسلمان اہل قلم عمدگی کے ساتھ نکرتا وہ سرشار نے کرکے اپنی واقفیت کا ثبوت دیا۔ اگر یہ وصف اُسی شخص مین ہوسکتا ہے جسے اپنی آنکھوں سے محلات کی زندگی کا طور طریق دیکھنے کا موقع ملا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ سرشار کو ایسے مواقع خوش نصیبی سے ملے تھے۔ پڑوس مین مُسلمانون کے مکانات تھے۔ اُس زمانہ مین ہندو مسلمانون کے تعلقات بالکل برادرانہ تھے۔ سرشار کو اپنی عمر کے ابتدائی حصے مین ان گھرون مین جانے کا اکثر اتفاق ہوتا تھا اور یہی تجربہ اور مشاہدہ ہے جو اُن کی تصویرین اصلیت کا رنگ پیدا کرنیوالا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اِس مرقع مین بعض نقش و نگار خیالی اور فرضی ہین۔ مثلاً حسن آرا اور سپہر آرا کی آزادانہ معاشرت اور ان کے ساتھ آزاد کے تعلقات کا اسدرجہ بے تکلف ہونا۔ یہ باتین بہت قبل از وقت ہین اسیطرح آزاد کو اُن کی محبوبہ کی جانب سے جنگ مین شریک ہوکر داد مردانگی دینے کی صلاح ایک ایسا فعل ہے کہ تاوقتیکہ عورتوں کی تعلیم و تربیت باقاعدہ طریقے سے اُصولاً نہو وہ اِس قسم کے جذبات کو کبھی اپنے دل مین جگہ نہین دیسکتین۔ تاہم تصویر کا یہ رُخ گویا اِس بات کا شاہد ہے کہ آزادی نسوان کی جو ساعی آجکل بعض اسلامی حلقون مین ہورہی ہین اگر یہ کامیاب ہوئین تو تقریباً ایک صدی کے بعد مخدرات اسلام کی معاشرتی منزلی یا جذبات اخلاقی مین جو تغیر ہوگا وہ غالباً اِسی قبیل کا ہوگا۔

۵۔ زبان کی خوبیون کا ایک پہلو اوپر دکھانیکے بعد صرف اسقدر کہنا رہجاتا ہے کہ بیگمات کی گفتگو سے قطع نظر دوسری صورتون مین بھی فسانہ آزاد کے مصنف نے اپنے اشخاص افسانہ کے طرز کلام کی نقل اُتارنے مین کمال کر دکھایا ہے۔ مُلّا اور واعظ سے افیونی اور سرائے کی بھٹیاری تک کی بول چال اِس صفائی سے دکھائی گئی ہے کہ باید و شاید۔

۶۔ یہی مکالمون کا حال ہے۔ ناول نویس کے لیے یہ منزل بہت دُشوار گذار ہوتی ہے کیونکہ اُسے اپنا مافی الضمیر دوسرون کی زبان سے اسطرح ادا کرنا پڑتا ہے کہ سُننے والونکو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ متکلم اور مخاطب کے درمیان کوئی توسل اور بھی ہے۔ سرشار اس دقت پر بھی بحسن اسلوبی غالب آئے ہین اور اُنھون نے اس راستے کو اسطرح طے کیا ہے کہ کسی جگہ تکان کے آثار نہین پائے جاتے۔

۷۔ سرشار کے فسانہ کے کیرکٹر بولتے ہوئے ہین اور یہ صفت بھی بہترین ناولون کا حصہ سمجھی جاتی ہے۔ آزاد اور خوجی پر اُن کا طبعی رنگ اتنا گہرا ہے کہ وہ جہان کہین اور جس جگہ بھی نظر آتے ہین دور سے شناخت ہوجاتے ہین

آزاد اور خوجی کی جو شہرت اب علمی و ادبی دُنیا مین پائی جاتی ہے اُسکی مثال الف لیلہ کے خاص خاص کیرکٹرون کے سوا اور کسی کو نصیب نہین ہوئی۔ یہ بھی سرشار کے باکمال ہونے اور اُنکی تصنیف کے قبولیت عامہ کا فخر حاصل کرنیکی ایک واضح دلیل ہے۔

۸۔ اسمین شک نہین کہ تاریخی ناول فن فسانہ نگاری کا بہترین عنصر سمجھا جاتا ہے لیکن بسا اوقات اُسمین صحیح اور مستند واقعات کے ساتھ

عشق و محبت کی سرگزشت کا فرضی پیوند لگایا جاتا ہی جس سے اصل کتاب پایۂ اعتبار سے ساقط ہوجاتی ہی۔ البتہ یہ نقص اُن ناولون مین نہین ہوتا جنمین کسی خاص ملک، توم ملت، یا کسی خاص وقت کے مراسم اور رواج یا سوسائٹی کی عام حالت دکھائی جاتی ہی۔ اس قسم کی تصانیف ہر زمانہ مین دلچسپی کی چیز سمجھی جاتی ہین کیونکہ اُن کے ذریعے سے سچے حالات بلا فرق معلوم ہونے کی وجہ سے آنیوالی نسلین بھی اُن سے دلچسپی لے سکتی ہین اور اسطرح کتاب کی عمر غیر محدود ہوتی ہی۔ سرشار کا فسانہ اور سیر کہسار اسی قسم کے ناول ہین جنمین اگر واقعات سب فرضی ہین لیکن اُنھین گرد وپیش کے جن حالات و واردات کے ساتھ منسلک کیا ہی اُن کے صحیح اور دلپسند ہونے مین کلام نہین جسطرح ہم ان کتابون کے مطالعہ سے لکھنؤ کی قدیم سوسائٹی (جسکی کچھ جھلک اس زمانے مین بھی وہان پائی جاتی ہی) کے متعلق آگاہی حاصل کرسکتے ہین۔ اسیطرح آئندہ زمانے مین بھی اگر کسی کو یہ شوق ہوا تو اُس کیلئے معلومات کا بہترین ذریعہ فسانہ آزاد یا اسی قسم کا اور لٹریچر ہوگا۔ اس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد غالبًا سب کو اعتراف ہوگا کہ "فسانہ" کا شمار جائز استحقاق کے ساتھ کم از کم اُردو کی اُن زندہ جاوید کتابون مین ہونے کے لائق ہی جو اپنی مستقل دلبستگی اور دائمی مفاد کے سبب خاص و عام سے قبولیت کا سرٹیفکٹ لیکر مدت مدید تک رواج پذیر رہتی ہین۔ اس قسم کی تصانیف مصنف کیلئے عمومًا سرمایۂ ناز ہوتی ہین اور اس لحاظ سے اگر سرشار کو فسانۂ آزاد پر فخر ہو تو کچھ نازیبا نہین۔

اکثر معترضین کا خیال ہی کہ بہت سے محاسن کے ساتھ فسانہ آزاد مین چند عیوب بھی ایسے موجود ہین جو نظر انداز نہین ہوسکتے مثلًا کتاب کی ضخامت اسقدر رہی کہ طوالت بعض مرتبہ مطالعہ کی دلچسپی کو کم کردیتی ہی اسیطرح مضامین اور واقعات کا غیر مسلسل ہونا بھی اُصول تنقید کے لحاظ سے قابل اعتراض ہی۔ بعض اہل نظر فسانہ آزاد کو جدید ناول نویسی کا نمونہ ہی نہین سمجھتے۔ یہ باتین ایک زمانہ تک معرض بحث مین رہچکی ہین اور یہان اُن کا اعادہ تحصیل حاصل ہوگا۔

فسانۂ آزاد کے علاوہ سرشار کی اور تصانیف بھی ہین لیکن درحقیقت اُن کا علمی امتیاز فسانۂ آزاد سے قائم ہوا ہی۔ تصنیفات مابعد مین سے سیر کہسار، جام سرشار، اور کامنی خصوصیت سے قابل تذکرہ ہین لیکن انمین سے کوئی فسانہ کے رتبہ کی نہین۔ سیر کہسار تک تو خیر لیکن اسکے بعد شاید ضرورتًا اُنھین ایسی کتابین لکھنا پڑین جو عمومًا "بھرتی" کے لقب سے یاد کیجاتی ہین۔ پی کہان، ہشو، بچھڑی ہوئی دُلھن وغیرہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ قلم برداشتہ لکھی گئی ہین۔ ان سے تفریح کے سوا اور کوئی فائدہ نہین متصور ہوسکتا۔

ایک رلے سرشار کی کتابون کے متعلق یہ بھی ہی کہ اُن کے تمام ناولون مین فسانہ آزاد سے لیکر "ہشو" اور "پی کہان" تک ایک ہی قسم کی سوسائٹی کا رنگ دکھایا ہی اور ایک ہی طرح کے کیرکٹر پیش کیئے گئے ہین۔ یہ خیال بالکل صحیح ہی۔ لیکن اسکی وجہ یہ تھی کہ جس معاشرت کی تصویر اُنھون نے دکھائی ہی اُسکے اور صرف اُسی کے خط و خال سے وہ بخوبی واقف تھے۔ اگر دوسری راہ وہ اپنے لیے نکالتے تو شاید اُنھین بھی اس قسم کے الزامات کا ہدف بننا پڑتا کہ

عرب مین دہشون کا کیا ذکر یا
مغربی ہیروئین کی سیاہ اور چمکدار زلفین کہان۔

ہمارے خیال مین اگر سرشار تاریخی ناولون کی طرف توجہ کرتے تو غالبًا اپنی قابلیت سے اُسمین بھی مرد میدان ثابت ہوتے لیکن یہ رنگ اُن کے طبعی مذاق کے بالکل مخالف تھا اور ابتدا اُنھین اس دُشوار گذار گھاٹی کے طی کرنے مین ناقابل بیان مشکلات کا سامنا ہوتا اور انپر غالب آنے کے بعد بھی یقینًا اُنھین پبلک مین یہ رسوخ نہ حاصل ہوتا جو فسانہ آزاد کیوجہ سے ہوا۔

کسی کتاب یا کسی مصنف کی تصانیف کی قدر و منزلت یہ دیکھنے سے بھی معلوم ہو سکتی ہو کہ اُس کتاب یا اُن کتابونکی وجہ سے اُس زبان کے عام علم ادب پر کیا اثر پڑا۔ سرشار نے ناول نویسی کی جدید شاہراہ دکھا کر اُردو اہل قلم کا ایک معقول گروہ اُسپر چلنے کیلئے تیار کر دیا ہو اور اب جسقدر نئے ناول لکھے جاتے ہین وہ اُصولی طور پر سرشار کے نمونے پر ہوتے ہین۔ اُصول سے ہمارا یہ مطلب ہو کہ اگرچہ سین، پلاٹ، اور واقعات کی ترتیب کے لحاظ سے بعض جدید ناول فسانۂ آزاد سے افضل ثابت ہوئے ہین، لیکن فی الحقیقت یہ فسانۂ آزاد کے اتباع و تقلید سے اس لیئے باہر نہین کہے جا سکتے کہ سب سے پہلے فسانۂ آزاد ہی نے جدید قصہ نویسی کا نمونہ پیش کر کے دکھایا تھا کہ قدیم و جدید افسانو نمین ما بہ الامتیاز فرق کیا ہو اور فطرت انسانی کے کارنامے کس طرح آشکارا کرنا چاہیئے۔ بہرحال اِس سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ سرشار کی تصنیفات نے اُردو کے فن افسانہ نویسی کو خاص تقویت پہنچائی ہو اور اسکا اعتراف تو اُن لوگون کو بھی ہو جو سرشار کو اُس عزت کا مستحق نہین سمجھتے جو اُنھین ملک نے دے رکھی ہے۔

جدید طرز کے افسانون کے ماسوا سرشار کی علمی خدمات کی تفصیل کچھ اور بھی ہو جسے ہم اختصار کے ساتھ اس جگہ قلم بند کرین گے۔ سب سے پہلے اُن کے مضامین مراسلۂ کشمیر اور اودھ پنچ وغیرہ مین نکلتے اور مقبولیت حاصل کرتے رہے۔ ۱۸۷۵ء مین اُنھون نے علم طبیعیات کی ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ کر کے شمس الضحیٰ نام رکھا۔ انگریزی اُنھون نے کیننگ کالج لکھنؤ مین پڑھی تھی اور گو وہ کسی امتیازی ڈگری کے مالک نہ تھے لیکن ذاتی لیاقت اس پایہ کی تھی کہ شاید ہر قسم کا کام وہ انگریزی مین کر سکتے تھے۔ ایڈوکیٹ اور پاینیر مین اُن کے مضامین وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے تھے۔ مراسلات ڈفرنیہ کے نام سے اُنھون نے لارڈ ڈفرن کے خطوط کا ترجمہ بھی کیا ہو۔ یہ خطوط مطالب کے اعتبار سے بہت دقیق ہین اور اسکا صاف و صحیح ترجمہ خود اس بات کی دلیل ہو کہ سرشار کی قابلیت انگریزی دانی مین "فاضلانہ" ضرور تھی۔

عربی فارسی کی تعلیم اُسوقت شرفاے ہنود مین عام طور پر رائج تھی اور سرشار بھی ان دونون زبانون مین ید طولیٰ رکھتے تھے۔ چار برس کی عمر مین انکے باپ پنڈت بیج ناتھ کا انتقال ہو گیا لیکن معلوم ہوتا ہو کہ شفیق باپ کا سایہ سر سے اُٹھ جانیکے باوصف تعلیم اُنکی باقاعدہ ہوئی۔ اسکا ثبوت اُن کے علمی مضامین سے بھی ملتا ہو۔

۱۸۷۸ء مین منشی نولکشور نے اودھ اخبار کا انھین ایڈیٹر مقرر کیا۔ اِنکے زمانے مین جو شہرت اور ہر دلعزیزی اِس اخبار کو حاصل ہوئی، اُسکی نظیر اُسکی پچھلی اور مابعد کی زندگی مین نہین ملتی۔ خصوصاً جس زمانے مین فسانۂ آزاد باقساط اُسمین شائع ہوتا تھا اُسوقت اودھ اخبار کی مانگ بہت بڑھ گئی تھی اور شاید یہ پہلی کامیابی تھی جو کسی اُردو اخبار کے حصہ مین آئی۔

اودھ اخبار سے قطع تعلق ہو جانیکے بعد وہ اپنا خاص رسالہ خمکدۂ سرشار نکالنے لگے جسمین یہ التزام رکھا گیا تھا کہ اُسکے ہر نمبر مین ایک مکمل ناول نکلتا تھا۔ پی کہان، بچھڑی ہوئی دُلھن، اور کُڑم دھم اِسی مین نکلے تھے۔

۱۸۹۵ء مین جب مین حیدر آباد گیا تو حضرت سرشار وہان پہلے سے موجود تھے۔ مولانا عرشی جو دربار آصفی کے نامور فارسی گو شاعر گذرے ہین اُن سے سرشار کے روابط بہت بڑھے ہوئے تھے اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ مجھے بھی عرشی صاحب کے توسط سے اُن کی خدمت مین نیاز حاصل کرنیکا موقع بار ہا ملا۔ عجیب طباع اور بذلہ سنج آدمی تھے جبتک بیٹھے رہتے حاضرین کو اپنی دلچسپ باتون سے محظوظ کیا کرتے۔ ہز ایکسلنسی مہاراجہ کشن پرشاد اُس زمانے مین وزیر افواج نظام تھے۔ اُن کے دولتکدہ پر حضرت سرشار رہتے تھے۔ مہاراجہ بہادر اُن پر بہت عنایت کرتے تھے۔ آخر دم تک سرشار پھر اُن سے جُدا نہوے۔ حیدر آباد مین بھی حضرت سرشار نے اپنے علمی مشاغل کا سلسلہ از سر نو جاری کر لیا تھا۔

حضور نظام مرحوم کی سالگرہ کی یادگار ہین دبدبۂ آصفی اور محبوب الکلام نثر اور نظم کے پرچے مہاراجہ بہادر کی سرپرستی مین حضرت سرشار کے اہتمام سے شائع ہوتے تھے۔ بالخصوص دبدبۂ آصفی ان کے مضامین سے لبریز رہتا تھا لیکن اکثر مضامین دوسرون کے نام سے چھپتے تھے تاہم طرز تحریر سے یہ ثابت ہوجاتا تھا کہ اسکے مصنف حضرت سرشار ہی ہین۔

سرشار اسم بامسمیٰ سرشار تھے۔ آب آتشین سے اُنھین اس درجہ اُنس تھا کہ کسی وقت اُسکی کیفیت سے خالی نہوتے تھے۔ جہان کہین جاتے تو ملازم کے ساتھ ایک بوتل ضرور رہتی۔ مینوشی کا شغل اُن کی خلوت وجلوت کا رفیق تھا۔ اِس بے اعتدالی نے جہان ایک طرف اُنکے قوائے جسمانی کو صدمہ پہنچایا وہان دوسری طرف اُنکے آفتاب کمال کو بھی گھن لگا دیا تھا۔ قاعدے کی بات ہو کہ انسان جسقدر معمر اور مسن ہوتا ہو اُسیقدر اُسکا ہنر پختگی پاتا جاتا ہو لیکن سرشار کی جُداگانہ کیفیت تھی جیسے جیسے وہ بڑھتے گئے ویسے ویسے اُن کے جوہر فن کی جلا ماند پڑتی گئی اور اگر سبب غائر نظر سے دیکھا جاے تو سب سے قوی یہی ہوگا کہ اُنھون نے "بنت العنب" کو منھ لگا کر خود کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔

سرشار کا اصلی نام پنڈت رتن ناتھ در تھا لیکن وہ زیادہ تر اپنے تخلص سے مشہور ہین۔ اسکے باوجود بہت کم لوگون کو معلوم ہوگا کہ فن شعرگوئی مین بھی اُنھین مہارت تھی۔ بیشک وہ شاعر تھے اور کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے لیکن اُنکی علمی عظمت کی کفالت اُنکی دوسری تصانیف سے ہوتی ہو نہ کہ اُن کے چند متفرق اشعار یا دو ایک مختصر مثنوی اور نظمون سے جن کے کہین کہین کے اشعار اکثر لوگون کو یاد ہین تحفۂ سرشار ایک مثنوی ہو لیکن اُس سے پختگی کلام اور رنگینی خیالات کا ثبوت کچھ زیادہ نہین ملتا۔ تاہم قیاس سے کہا جا سکتا ہو کہ اگر سرشار نے شعرگوئی کیطرف کچھ اور توجہ کی ہوتی تو وہ اپنے زمانے کے ایک اچھے شاعر ہوتے ایک شعر اُن کا یہ ہو۔ ناظرین مضمون کی نزاکت کا اندازہ کرین ؎

حال سب میری بخت جانی کا   باڑھ کہتی ہے مُڑ کے خنجر سے

دو شعر اور دستیاب ہوئے ہین جو تبرک سمجھے جانے کے قابل ہین ؎

پینے پہ جب آتے ہین تو پھر بس نہین کرتے   میخانے مین سنتے نہین سرشار کسی کی
سیاہ بخت و تبہ روزگار ہم بھی ہین   جواب زُلف پریشان یار ہم بھی ہین

شاعری مین حضرت اسیر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ لیکن اُنکے اشعار گواہ ہین کہ اُنھون نے صنائع وبدائع کی پابندی مین اپنے اُستاد کی پیروی نہین کی بلکہ صاف اور شُستہ زبان کو ترجیح دی ہو۔ تحفۂ سرشار کی اُمید اسکے ثبوت مین پیش کیجا سکتی ہو جسمین کہتے ہین ؎

لندن کی پلا دو آتشہ مے   آپیرِ مغان کدھر چھپا ہے
داتا پلوا شراب اچھوتی   خوشبو خوش رنگ تیز جو بھی
سرخوش شرابِ ناب لادے   بوتل مُنھ سے مرے لگادے
بدمست ہون پی کے ایک چلّو   زاہد کو بنائین خوب اُلّو
برسادے شرابِ ناب ساقی   دکھلادے آفتاب ساقی
فتوے کا شتی کا کون مانے   لاکھون مین یون کھلے خزانے
رم جھم یہ برس رہا ہے پانی   بے مے ہے حرام زندگانی

ساقی نامہ سرشار سے اچھا کون لکھ سکتا تھا جسکے گھر کی شراب لونڈی تھی۔ ظرافت کا مادہ اُن کی طبیعت مین کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اسکا رنگ اُن کی تمام تصانیف مین موجود ہو اور اوپر کا چوتھا شعر بھی اُنکی شوخ کلامی اور آزاد منشی کا ثبوت ہو۔ مندرجۂ ذیل شعرونمین صبح صادق کی کیفیت کس دلکش پیرائے مین دکھائی ہے ؎

جھلکا جھلکا سپیدۂ صبح   ہلکا ہلکا سپیدۂ صبح
تارے چھپتے مین جھلملا کر   ہے نور سا جلوہ گر فلک پر
بھینی بھینی مہک گلونکی   اور نغمہ زنی وہ بلبلون کی
اے ساقی مہ لقا بدہ مے   اے مرد خدا انجواب تا کے
وقتِ سحر اور خنک ہوا ہو   بے مے سب کر کرا مزا ہے

اِک چلّو کے دینے مین یہ تکرار — اُٹھو جاگو سحر ہوئی یار
مرغانِ چمن بہ نکتہ رانی — چون برہمنان بہ دید خوانی
نوبت رنگت جما رہی ہے — شہنائی مزا دکھا رہی ہو

بعض مختص المقام تشبیہین اور استعارے نہایت پُر لطف ہین شلاً طیور کی خوش الحانی کی مشابہت برہمنون کی دیدخوانی سے کس قدر کیفیت خیز ہو اسیطرح "کاشی کا فتوی" جو کہین پر گذر چکا ہی نئی چیز ہو اور لطف سے خالی نہین۔ اگر ہندو شعرا اپنے مذہبی اور قومی خصوصیات کو اسیطرح اُردو تلمیحات و استعارات مین داخل کر سکین تو یقیناً عجیب دلپسند اضافہ ہوگا۔

اِسی مثنوی مین ہندوستان کی گزشتہ عظمت کا فوٹو اِن الفاظ مین پیش کیا ہو ؎

اَب ہند مین کیا رہا ہو بھائی — فریاد ہے ہندو دُوھائی
مصری اسی باغ کے تھے اِک گل — شاگرد تھے ہند کے جزو کُل
اِک پھول اسی چراغ کے تھے — اِک بوند اسی ایاغ کے تھے
سقراط سے لیکے تا بہ لقمان — طفل مکتب تھے اہل یونان
آگے اسکے زمین سے تا مہ — سب کرتے تھے زانوئے ادب تہ
رامائن مین دکھائے وہ ڈھنگ — ہومر کا بھی جم سکا نہ کچھ رنگ
رنگت ملٹن کی بھی ہو پھیکی — سُبحان اللہ و الیکی
کالیداس آن خدائے بینش — سرمایہ ناز آفرینش
جھنڈے بید کی مین بھی گڑے تھے — یونانی جیب مین پڑے تھے
دعوی جس کو ہو جان مل کا — دیکھے وہ فلسفہ کپل کا

وہ علم وہ فضل اَب ڈبویا
جو کچھ سیکھا تھا اب وہ کھویا

غزلیات کہنے کے سرشار معمولاً عادی نہ تھے لیکن اکثر ان کے زمانہ حیات مین انھین کے اہتمام سے بمقام حیدرآباد مہاراجہ شاد بہا کی ڈیوڑھی مین مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ سرشار خود تو کچھ نہ کہتے تھے لیکن مقامی شعرا کو اصرار کے ساتھ شرکت کے لیے مدعو کرتے تھے اور ان کی خاطر سے اکثر مشاہیر کو وہان جانا پڑتا تھا اور اسطرح مشاعرے نہایت رونق سے ہوا کرتے تھے۔

تاہم کچھ تو شاید اس وجہ سے کہ حیدرآباد مین اُنھین باوجود علمی مذاق کی کثرت کے اپنے ہم خیال نہ مل سکے اور کچھ اس وجہ سے کہ شراب خانہ خراب نے اُن کو زیادہ تر گوشہ نشینی کی زندگی پر مجبور کر دیا تھا اُن کے دم سے وہان وہ علمی چرچا نہ ہونے پایا جس کی اُمید سرشار ایسے مشہور نثار کی موجودگی سے بہر صورت ہو سکتی تھی۔ خود محبوب الکلام اور دبدبۂ آصفی جو ایک معنی مین اُن کے ذاتی رسالے تھے اُن کی عدم توجہی سے کچھ زیادہ ہر دلعزیز نہو سکے مضامین وغیرہ کے اعتبار سے بھی وہ بہت کم رُتبہ تھے البتہ کبھی کبھی کوئی مضمون ایسا نکل جاتا تھا جس کی طرز بیان کہ اُٹھتی تھی کہ یہ حضرت سرشار کی جودت طبع کا نمونہ ہے۔

حیدرآباد اُنھین موت کھینچکر لیگئی تھی اور وہ پھر وہین کے خاک کے پیوند ہوے۔ ۲۷ جنوری ۱۹۰۲ء کو حیدرآباد مین اِس خبر نے حیرت و استعجاب کی ناقابل بیان کیفیت پیدا کر دی تھی کہ پنڈت رتن ناتھ سرشار مرگِ ناگہانی کے شکار ہوئے۔ چونکہ اِس سے پہلے اُن کی علالت کا حال بھی کسی کو نہ معلوم ہوا تھا اس وجہ سے غیر متوقع انتقال سے سب کو سکتہ سا تھا۔ بہرکیف جس مٹی مین امیر و داغ کی ہڈیون کا پیوند ہونا مقدر ہو چکا تھا وہی سرشار ایسے اہل کمال کا بھی مدفن بنی۔ ع

خدا بخشے بہت سی خوبیان تھین مرنیوالے مین

سیّد محمّد فاروق

مصنوعی انسان

۱۹۵۱ء مین بمبئی کے بعض اخبارات مین ایک سنسنی خیز خبر شائع ہوئی تھی کہ کلکتہ کے مشہور و معروف پروفیسر کیلاش چند داس نے مصنوعی طریق پر بعض جاندار کوٹھڑیان جن سے اجسام حیوانی مرکب ہوتے ہین اور نیز اسی قسم کی جاندار چیزون کی ابتدائی صورت تیار کرنے مین کامیابی حاصل کرلی ہی۔ اس سے پہلے ہرچند کہ پروفیسر موصوف اپنی سائنٹفک تحقیقات اور تبحر علمی کے لیے ہندوستان کے ہر حصہ مین پوری شہرت حاصل کر چکے تھے تاہم بمبئی کی تعلیم یافتہ آبادی نے اِس خبر کو حد درجہ کی بے اعتباری کے ساتھ سنا۔ لیکن اخبارات کے ایڈیٹر عجیب خیالات کے انسان ہوتے ہین۔ جس اخبار سے میرا مضمون نگاری کا تعلق تھا اس نے پروفیسر داس کی علمی تحقیقات کے متعلق مزید حالات دریافت کرنے کی غرض سے مجھے بلاکر کلکتہ جانے پر رضامند کیا۔ اسکے چار روز بعد جب مین لنڈسے اسٹریٹ مین پروفیسر موصوف کے مکان پر پہنچا تو وہ اپنی لیبورٹری مین تھے۔ نوکر کی معرفت اطلاع کرائی۔ میری ان سے برسون پہلے کی جان پہچان تھی اس لیے معمولی علیک سلیک کے بعد مین نے بلاتامل ان سے اپنے حاضر ہونے کی وجہ بیان کردی۔

پروفیسر داس نے جن کی عمر کم و بیش چالیس سال کے قریب ہوگی میرے ساتھ دوستانہ برتاؤ کیا اور مجھے شیشہ کی الماریون کی ایک لمبی قطار دکھائی جن مین مین نے بہت سے چھوٹے چھوٹے جانور مکھی کے برابر یا اس سے چھوٹے زندگی کے لیے جد و جہد کرتے دیکھے اس خیال نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا کہ وہ ہمارے ایسے ہی ایک انسان کی ذہانت کا نتیجہ تھے۔ مین نے اس نئی دُنیا کے خالق پروفیسر داس کی طرف دیکھا اور بے اختیار میرے مُنھ سے ان کے لیے کلمات تحسین نکلے۔ مین نے اِن سے پوچھا "آپ نے سب سے بڑا جاندار کونسا پیدا کیا ہی؟" اسکا اُنھون نے کچھ جواب نہ دیا چپ چاپ مُسکراتے ہوے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

چند قدم چلنے کے بعد اُنھون نے دبی زبان سے میرے کان مین کہا "مین تمھین ایک بالکل نئی چیز دکھاتا ہون مگر اس بات کا صدق دل سے اقرار کرو کہ تم اسکا ذکر کسی سے نہ کروگے۔"

مین نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ جواب دیا "مین آپ سے اس بات کا وعدہ کرتا ہون۔"

وہ جادوگر میری طرف دیکھکر کہنے لگا "یہ میری لیبورٹری کا حصہ خاص ہی اور مین اسوقت تک اسکے اندر کسی کو جانے نہین دیتا جبتک مین خود اسکے ساتھ نہ ہون جن خوش نصیب لوگون کو اس کے اندر داخل ہونے کا موقع حاصل ہوا ہی وہ اُنگلیون پر گنے جا سکتے ہین۔"

مین نے اس رعایت کے لیے جو خاص طور پر میرے ساتھ برتی جانے لگی تھی شکریہ ادا کیا اور ہم ایک تنگ گرم کمرہ مین داخل ہوئے جہان لمبی لمبی میزون پر بند بکسون کی قطارین دکھائی دین۔ کمرے کے وسط مین ایک بڑی سی مربع میز پر چند اس قسم کی نالیان، سلنڈر اور آلات موجود تھے جن کے لیے اُردو زبان مین ابھی تک نام بھی ایجاد نہین ہوے۔ دیوارون مین جابجا خانے بنے ہوئے تھے اور ان خانون مین قطار در قطار چھوٹی بڑی بوتلین اور سائنس کے متعلق مختلف آلات سجے ہوئے تھے۔ کمرے مین روشنی ایک سُرخ لمپ کی تھی جو چھت سے آویزان تھا اور کرۂ ہوائی مین اس قسم کی بو تھی جیسے کسی تیز عرق کو جوش دینے سے پیدا ہوتی ہی۔

یہان پہنچکر پروفیسر نے ایک شیشہ کے بکس کا ڈھکنا اُٹھایا۔ مین نے

اندر نظر ڈالی تو اس مین تربوز کے برابر ایک بڑا اور سیاہ بیضوی تھیلا پڑا تھا۔ اس تھیلے کو ایک چکدار نالی کے ذریعے سے ایک لمبے سُرخ سلنڈر کے ساتھ ملایا ہوا تھا جس مین برقی تار لگے تھے۔ اس کے اندر دل کی مانند باقاعدہ حرکت ہوتی تھی بس اس کے سوا اور کوئی غیر معمولی بات اس مین نظر نہ آتی تھی۔ چونکہ مجھے اسمین کوئی عجیب بات دکھائی نہ دی اس لیے مین نے پروفیسر داس سے کہا کہ آپ مہربانی سے اس کی تشریح کر دیجیے۔

وہ تھوڑی دیر خاموش رہے گویا جو کچھ کہنا تھا اسکے اثر کو دوبالا کرنا چاہتے تھے۔ پھر بولے جو کچھ مین کہنے کو ہون تم اُسے شاید باور نہ کرسکو۔ اس کے بعد وہ پھر اسطرح رک گئے گویا میرے خیالات معلوم کرنا چاہتے تھے۔

مین نے اطمینان دہ لہجہ مین جواب دیا "پروفیسر صاحب! میرے دلمین آپ کا بڑا ادب و احترام ہے آپ جو کچھ کہین گے مین اُسے صحیح تسلیم کرون گا"۔

اُنھون نے جواب دینے سے پہلے ایک کرانومیٹر سے اسکی حرکات گنین پھر اس پر ایک اس قسم کا آلہ لگایا جیسے سٹتھسکوپ (دل کی حرکات معلوم کرنیکا آلہ) ہوتا ہے پھر میری طرف بڑی سنجیدگی سے دیکھا اور اس چیز کی طرف اشارہ کرکے کہا "یہ ایک مصنوعی بچہ ہے"۔

(۲)

مین یہ بات سُنکر حیران و ششدر رہگیا اور بے اختیار میرے مُنھ سے نکلا "کیا؟ انسان کا بچہ"؟

پروفیسر داس نے اپنی سنجیدگی مین کسی قسم کا فرق نہ آنے دیا اور کہا "ہان مجھے زندگی بھر اسی کی آرزو رہی ہے کہ مصنوعی انسان پیدا کرسکون۔ میری دولت اور صحت اِسی ایک خیال کے نذر ہوچکی ہے اور جب مین اسمین کامیاب ہوگیا تو یقیناً مجھ سے بڑھکر دُنیا مین کوئی خوش و خورم نہ ہوگا۔ اگر مین اس طریق پر انسان کو پیدا کرنے مین کامیاب ثابت ہوا تو مین اس کے اندر اعلیٰ قسم کا احساس پیدا کرون گا۔ اسے بہترین ذہانت دونگا اور اسکے اعضا بھی ایسے بناؤنگا جیسے اتفاقی بدولت ہمین اب تک حاصل نہین ہوئے۔ پندرہ مہینے سے یہ تخم اسطرح ترقی کر رہا ہے"

مین خاموش سُنا کیا۔ پروفیسر نے اپنے سلسلہ کلام کو جاری رکھکر کہا "آپ اس بات کو ذرا یاد رکھیئے گا کہ یہ مصنوعی بچہ ہے مین جو انسان پیدا کرنا چاہتا ہون اسکے متعلق میری آرزو یہ ہے کہ اس کے لیئے کسی قسم کا حیوانی مادہ نہ برتا جاے۔ ہر چیز یہان تک کہ وہ جوہر لطیف جو بجائے خون کے اسکی پرورش کرتا ہے، بناتا ہون۔ ہمارے رشی منی گھاس کے تنکو مین جان ڈالدیا کرتے تھے۔ کیا ہم اس گئے گذرے زمانے مین اتنا بھی نہ کرسکین گے؟"

مین نے اس تھیلے کی طرف جو باقاعدگی سے حرکت کر رہا تھا، اشارہ کرکے پوچھا "یہ کون سی کل ہے جس مین آپنے اس تخم کو محفوظ رکھا ہے؟"

پروفیسر صاحب نے کہا "مرغی کے انڈے سینے کی مشینین ولایت سے آتی مین۔ تم نے ان کے نمونے کسی نہ کسی نمایش مین ضرور دیکھے ہونگے۔ بس انھی کے اُصول پر یہ انسانی انکیوبیٹر (سینے کی مشین) تیار کیگئی ہے۔ اِس نالی مین سے ہوکر خون اُس ذخیرہ مین سے جو چھت پر ہے اسکے اندر پہنچتا ہے۔ اب تک سارا کام بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام پاتا رہا ہے اور مین امید کرتا ہون کہ اندر چھ ماہ کے عرصے مین بچہ پیدا ہوجائیگا۔ موجودہ حالت مین تخم چھ پونڈ کے بچے کے برابر ہوگیا ہے"۔

مین نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "یہ ایجاد واقع مین حیرت خیز ہے۔ مغربی دُنیا اسکا ذکر سنکر کیا کہے گی؟ لیکن آپ یہ تو بتائیے کہ اسکے

اندر دماغ بھی ہوگا؟ اور ہان اِس مصنوعی انسان کی شکل و صورت کیسی ہوگی؟"

پروفیسر صاحب نے جواب دیا "مین چاہتا ہون میرے بچہ مین (کیونکہ حقیقت مین مین اسے اپنا ہی بچہ سمجھتا ہون) وہ تمام باتین موجود ہون جو موجودہ نسل انسانی مین معدوم ہین مثلاً وہ ایکس شعاعین، مقناطیسی لہرین، ہپناٹزم اور روحانیت کی موجین، نظرون سے پوشیدہ عالم، اور ان کے موجودات اِن سب کو دیکھ سکے گا۔ وہ عالم اور زمانہ کے اندر اسیطرح پرواز کرسکے گا جیسے پرندے ہوا مین کرتے ہین یا ہم سمندر پر۔ غرض وہ تمام اسرار قدرت سے واقف ہوسکے گا۔ آپ ایک موٹی سی مثال نیند اور خواب کی لیجئے۔ سائنس باوجود اپنی صدہا کوششون کے اب تک اِن ظاہرات کا پتہ چلانے سے قاصر رہا ہے"

پروفیسر داس نے یہ الفاظ بڑی سنجیدگی کے لہجہ مین کہے تھے اور اس وقت ان کے چہرے پر اس قسم کا فلسفیانہ اطمینان ہویدا تھا کہ مین بے اختیار ان کی ذہانت کی دل ہی دل مین تعریف کرنے لگا۔ اتنے مین اُنھون نے اپنا ایک اور چھپا ہوا انکوبیٹر نکالا۔ مین اس کے اندر کا نظارہ دیکھکر حیران و ششدر رہگیا۔ اس چھوٹے سے شیشے کے بنے ہوئے آلہ مین مجھے ایک نہایت چھوٹا سا بندر ادھر اُدھر چلتا پھرتا نظر آیا۔ آپ شاید اسکو باور نہ کرین گے لیکن مین سچ کہتا ہون کہ وہ قد مین میری اُنگلی سے بڑا نہ تھا۔ اس کی چار آنکھین، چار ہی کان تھے اور ان کے علاوہ اسمین بعض ایسے اعضا بھی دیکھے گئے جو اور کسی حیوان مین اس سے پہلے مین نے نہ دیکھے تھے۔ پروفیسر صاحب نے میرے چہرے سے میری حیرت کا اندازہ کرکے مسرت آمیز لہجے مین کہا "چین مین جو بونے درخت ہوتے ہین انھی کے اصول پر مین بونے بندر پیدا کرنا چاہتا ہون۔ گو یہ جانور جسکو تم اپنے روبرو دیکھ رہے ہو قطعاً مصنوعی نہین ہے"۔

مین نے حیرت و استعجاب کے لہجہ مین پوچھا "پروفیسر صاحب! کیا دُنیا مین اس قسم کی مخلوقات بھی موجود ہے جس سے سائنس بالکل بے خبر ہو؟"

اُنھون نے جواب دیا "لاانتہا تعداد مین! اگر ہم اِن سے واقف نہین تو قصور صرف ہمارا ہے کیونکہ قدرت نے ہمین ان اعضا سے محروم رکھا ہے جن کی مدد سے ہم انھین دیکھ سکتے ہین۔ مین بذات خود پریون، فرشتون، جنون، بھوتون، اور ارواح خبیثہ کے وجود کا قائل ہون۔ یہ بندر جسے تم دیکھ رہے ہو ایکس شعاعین اور مادی وجودات کو دیکھ سکتا ہے۔ یہی اور اس سے بھی زیادہ صفات اُس لڑکے مین ہون گی جو مین مصنوعی طور پر پیدا کیا چاہتا ہون۔ تمھین یاد ہوگا بالمیکی نے ایک موقع پر کُشا کے تنکون سے ایک لڑکا بنا کر اس مین جان ڈالی تھی اور پھر اسکا نام کُش رکھ دیا تھا۔ مین چونکہ اس بچہ کو نباتاتی مادہ سے پیدا کرنے کی فکر مین ہون اس لیے مین نے اسکا نام بھی "نبیتی" تجویز کیا ہے۔ مین اُمید کرتا ہون کہ بڑا ہوکر وہ ہمین نامعلوم عالمون اور ان کی مخلوقات کے متعلق بہت سی عجیب و غریب باتین بتا سکے گا"۔

اس کے بعد پروفیسر صاحب اس بارے مین ذکر کرتے رہے کہ مین کیون اپنی اس ایجاد کا ذکر مخفی رکھنا چاہتا ہون۔ اُنھون نے کہا کہ مین ساری مہذب دُنیا کو حیران کردون گا۔ مغرب والے باوجود اپنی صدہا دریافتون کے ابھی ہمارے سامنے طفل مکتب ہین۔ مین اپنی اِس دریافت کا ذکر اس وقت تک پوشیدہ رکھنا چاہتا ہون جب تک کہ یہ بچہ پورے طور سے بالغ نہ ہو جائے۔

اِس قسم کی باتین سن سن کر میرا دماغ چکر مین آنے لگا لیکن مین سب کچھ اپنی آنکھون سے دیکھ چکا تھا۔ اس لیے جب مین اُن سے رخصت ہوا تو دلی مسرت کے ساتھ مجھے پورے طور پر اطمینان بھی حاصل تھا۔

جو کچھ مین پروفیسر داس کی لیبورٹری مین دیکھ آیا تھا اگر رات کے وقت دیکھنے کا اتفاق ہوتا تو مین یقیناً اسے ایک پریشان خواب سمجھتا لیکن مین مصنوعی بچے کو اسکی ابتدائی حالت مین دن کے وقت خود اپنی آنکھون سے دیکھ آیا تھا۔ اسکے علاوہ پروفیسر داس کی شہرت ہندوستان مین بہ اعتبار ایک محقق سائنس کے کچھ کم نہ تھی۔ ان حالات مین میرے لیے سوائے اسکے چارہ ہی کیا تھا کہ جو کچھ دیکھ آیا تھا اسے بالکل صحیح اور درست سمجھتا۔

بمبئی واپس جاکر مین نے پروفیسر صاحب سے اپنی ملاقات کا کچھ مختصر بیان اپنے اخبار کے لیے لکھ دیا مگر اس معرکہ کی بات کو عمداً اسمین سے حذف کردیا کیونکہ مین معاملے کو پوشیدہ رکھنے کا وعدہ کر آیا تھا۔ اس کے چند ہفتہ بعد پروفیسر موصوف کا ایک خط میرے نام اس مطلب کا آیا کہ "مین نے اپنی رہایش کا انتظام پونا مین کرلیا ہی۔ اس معاملے کے متعلق جب کوئی خاص بات ظہور مین آئے گی مین اس کی اطلاع تمھین دون گا"۔

اسکے بعد کئی سال گذر گئے۔ اِس اثنا مین چند مرتبہ پروفیسر صاحب سے میری ملاقاتین ہوئی مگر سرسری اور کچھ عرصہ تک خط وکتابت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ایک بار جب مین دوڑ کے موقع پر پونا مین گیا تو اس ارادہ سے پروفیسر صاحب کے مکان کی طرف روانہ ہوا کہ ان سے اِس معاملے کے متعلق ضرور کوئی پختہ بات دریافت کرونگا مگر آپ میری مایوسی کا اندازہ کرسکتے ہین جب وہان پہنچنے پر معلوم ہوا کہ وہ چند ماہ پیشتر چین وجاپان کی سیاحت کے لیے روانہ ہوچکے ہین۔ میرے لیئے اَب سوائے اِس کے کیا چارہ تھا کہ اِن کے نام ایک خط لکھتا اور اسکے جواب کا انتظار کرتا۔

(۳)

لنڈسے اسٹریٹ کلکتہ مین پروفیسر صاحب سے ملاقات کیئے اَب ۲۰ سال کا عرصہ گذر چکا تھا اور مین نے انکی کامیابی کی توقع دل سے بھلا دی تھی کہ ایک روز ایک بالکل غیر متوقع امر ظہور مین آیا۔ مین دفتر مین بیٹھا تھا کہ ایک خوبرو نوجوان اندر داخل ہوا اور میرے ہاتھ مین ایک بند لفافہ دیکر خود ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ خط کا مضمون چکر مین لانے والا تھا:-

میرے عزیز دوست۔

حامل رقعہ میرا بیٹا انسیتی ہی جو بغرض تعلیم دُنیا بھر کا سفر کر رہا ہی۔ مین اُمید کرتا ہون وہ تمھین بہت سی عجیب وغریب باتین سنائے گا اور تم کو اِس کی شخصیت سے یقیناً دلچسپی ہوگی۔ اگر تم کسی طرح اسکی مدد کرسکے تو مین ممنون احسان ہون گا۔

تمھارا صادق

کیلاش چ - داس

مین نے دوبارہ اس کے خوشنما سڈول بدن اور خوبصورت چہرے کی طرف دیکھا۔ اسکی آنکھون مین اس شخص کی سی جھلک پائی جاتی تھی جو دُنیا کا بہت بڑا حصہ دیکھ چکا ہو۔ اس کے بعد عالم تحیر مین کرسی پر پیچھے کی طرف جھک گیا۔

دل مین خیال آیا "پروفیسر داس بھی ہندوستان کا اڈیسن ثابت ہونے والا ہی۔ دیکھو تو آخر مصنوعی انسان پیدا کرہی لیا"۔

مین نے اِس سے کہا کہ "جب تک آپ بمبئی مین رہین میری مہمانی قبول فرمائیے۔ مین جسطرح آپ کی خدمت کرسکتا ہون حاضر ہون"۔

اس نے کہا مین نے ایک قصہ لکھا ہی۔ اسے کسی انگریزی یا گجراتی پرچہ مین درج کرانا چاہتا ہون۔ اس کا عنوان ہی "دوسرے عالم کی روحون سے میری ملاقات"۔

اس بات نے میرے یقین کو اور بھی پختہ کردیا کیونکہ پروفیسر داس نے مجھ سے ذکر کیا تھا کہ میرا پیدا کیا ہوا مصنوعی بچہ اِن تمام باتون سے واقف ہوگا جو ہمارے لیے بمنزلہ اسرار ہین۔ مین نے پوچھا

آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ حقیقی تجربہ کی بنا پر لکھا ہوگا؟"

اس نے جواب دیا "بس ایسا ہی سمجھئے کیونکہ جو بات ہم فرض کر لیتے وہ ایک حقیقی تجربہ کے برابر درجہ رکھتی ہے۔ تمام باتیں اصل میں ذہن انسانی ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔

میں نے کہا "آپ بجا فرماتے ہیں مگر اخبارات یا رسالوں کے اڈیٹر معاملہ کو اس نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتے"

وہ بولا "اس کا مضائقہ نہیں۔ میں اپنے قصہ کو ان کے مذاق کے مطابق بنا کر لایا ہوں۔ میں نے جو قصہ لکھا ہے وہ نہایت پرمعنی اور با اثر ہے اسمیں اگر کوئی اور خوبی نہیں تو آرجنلٹی ضرور ہے۔ علاوہ بریں میرے والد کی شہرت ہی اسے کامیاب بنانے کیلئے کیا کم ثابت ہوگی"

میں اسکی طرف غور سے دیکھتا رہا مگر اسکا لہجہ بالکل سنجیدہ تھا۔ دل میں سوچا "کیا عجیب و غریب انسان ہے" مگر بظاہر صرف اسقدر کہا "مسٹر داس آپ کا فرمانا بالکل بجا ہے۔ اس صورت میں تو اڈیٹر جو کچھ بھی آپ لکھیں اسے چھاپنے کیلئے تیار ہوں گے۔ آپ کے پاس اس قصہ کا مسودہ تیار ہے؟"

میرا دل قصہ کا مطلب معلوم کرنے کو سخت بے چین ہو رہا تھا۔ اسنے مسودہ نکالکر میرے حوالہ کیا اور کہنے لگا "اسمیں عالم اعلیٰ و اسفل دونوں میں میری سیاحت کا ذکر درج کیا ہے"

میں نے مسودہ کے ورق کھولے اور پڑھنا شروع کیا مضمون نہایت شستہ انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔

"۔ ۔ ۔ ۔ اور بہشت اور دوزخ کی کوئی شکل یا صورت نہ تھی اور روشنی اور تاریکی دونوں زمانہ کی سطح پر ملی ہوئی تھیں۔ انسان کی روح تصور کی سطح پر پھر رہی تھی۔

"تخیل کے پلیٹ فارم پر کوئی وجود موجود نہ تھا اور ظہورات فطرت کی گونج میں حصہ لینے والا کوئی نہ تھا۔ اور انسان نے کہا نیکی اور بدی کا وجود پیدا ہو اور ایسا ہی ہوا۔

"انسان نے خواہش ظاہر کی کہ خیال، تصور، امنگ، عقل، باعث اور اثر نمودار ہو اور اس نے محسوس کیا کہ ایسا ہونا بہتر ہے۔ جب میں زمین پر پیدا ہوا اور اس بات کو محسوس کرنے لگا کہ مجھے اپنی ٹوٹی عمر بھر غم کے ساتھ کھانی ہوگی اور کہ میرے راستے میں خار اور کانٹے بچھے ہوئے ہیں تو میں نے بہشت اور دوزخ کی سیاحت کا عزم کیا"

میں مسودہ کو پڑھتے پڑھتے یکایک رُک گیا اور اپنے نوجوان ملاقاتی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اسوقت ایڈوکیٹ آف انڈیا کا پرچہ دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا جو کچھ آپ نے لکھا ہے بالکل راست ہے؟ کیونکہ اس زمانے کے لوگ ایسی باتوں کے باور کرنے کے لیے یکایک تیار نہیں ہوتے۔ اس نے شانے ہلا کر جواب دیا "اگر آپ قدرتی انسان کی صورت اختیار کر سکیں اور فطرت آپکو اس بات کی اجازت دے کہ آپ انقلاب اور زمانہ سے بالاتر ہو ان عالموں میں جو ہماری نظروں سے غائب ہیں پرواز کر سکیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ حقیقت جس پر زمانۂ موجودہ کے لوگوں کو فخر ہے محض ایک اصطلاحی گورکھ دھندا اور تمسخر ہے"

میں نے سر ہلایا اور اس سے کہا آپ اچھی طرح کھل کر بیٹھیں اور مسودہ کو پھر پڑھنا شروع کیا:-

"جب میں بہشت میں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہ ایک عجیب و غریب عالم ہے۔ اس میں نہ کوئی شہر تھے نہ کسی قسم کے فرائض نہ گناہ نہ ثواب۔ اس دنیا میں مندر، اسکول، محتاج خانے، جیل خانے، عدالتیں، شفاخانے کہیں موجود نہ تھے۔ میں جدھر رُخ کرتا پُرلطف وہی نظارے اور سبزہ زار نظر آتے تھے۔ ہر طرف امن و ہم آہنگی، صحت، اور خوشی کا راج تھا۔ وہاں کا منظر دیکھکر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بہت بڑا

شاندار باغ ہو۔ کہین کہین فرشتے اُڑتے نظر آتے تھے۔ باامن جھونپڑیونکے اندر سے تسکین بخش موسیقی کے سُر اسطرح سُنائی دیتے تھے جیسے موسمِ بہار کی آمد پر خوش گلو پرندون کے چہچہے۔ درختون مین بڑے لذیذ پھل لگے ہوے تھے۔ جو چاہتا اُنھین توڑتا، کھاتا یا پھینک دیتا تھا۔۔۔ راستے مین مجھ چند آسمانی وجود ملے تو مین نے ان سے پوچھا کیا مین یہان سے کسی قسم کی سوغات اپنے ہمراہ دُنیا مین لے جا سکتا ہون؟ اُنھون نے میری طرف بڑی حیرت کی نظر سے دیکھا اور جب مین نے اُنھین سمجھایا کہ مین یہان کی بعض چیزین قیمتاً خریدنا چاہتا ہون تو اُنھون نے بڑی حیرانگی کے ساتھ اپنے ہاتھ اوپر کو اُٹھالیے اور کہنے لگے اِس ملک مین تو روپیہ کا رواج ہی نہین۔ ہم لوگ اِس کے بغیر ہی بہت ہی خوش ہین۔

ان کی زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان لوگون کا نہ تو کوئی بادشاہ ہو نہ ملکہ۔ مین نے حیران ہو کر پوچھا تم لوگون کا بادشاہ یا اِس قسم کے کسی اور اعلیٰ افسر کے بغیر کام کیونکر چلتا ہو؟ کیا یہان پر زمانۂ موجودہ کے ترقی یافتہ ممالک کیطرح پارلیمنٹ، رائے دینے کا حق، اور اور اسی قسم کی باتین موجود نہین؟

"فرشتے نے مسکرا کر سر ہلایا اور جواب دیا بالکل نہین۔ اِس قسم کی دُنیاوی فضولیات کی نہ یہان ضرورت ہو اور نہ وجود۔ اِس عالم مین نہ کوئی قانون ہو نہ کوئی قانون ساز۔ ہم اپنے دلون کی آواز سنکر اس پر عمل کرتے ہین۔ ہمارے ضمیر مردہ نہین۔ اِس لیے یہان کسی قانون یا قانون ساز کی کیا ضرورت ہو سکتی ہو؟ اِس امن و ہم آہنگی کو دیکھیے جو آپ کو یہان ہر طرف نظر آتی ہو۔ یہ سب اِس بناوٹی قانون کی عدم موجودگی ہی کا نتیجہ ہے۔

"مین نے اس سے پوچھا کیا مین اس جگہ کی سکونت اختیار کر سکتا ہون؟ اسنے جواب دیا کہ آپ کو پہلے مایا کا تیاگ کرنا ہوگا۔ جب تک آپ دولت یا خواہشات نفسانی کے پھندے مین پھنسے ہوئے ہین یہان نہین رہ سکتے۔ مین چونکہ دوزخ بھی دیکھنا چاہتا تھا اس لیے اُنھین الوداع کہکر رخصت ہوا۔

"شیطان کی نگری مین پہنچنے کے لیے مجھے کسی قسم کی دقت پیش نہین آئی۔ جب مین اسکی حدود مین داخل ہونے لگا تو قریباً ایک درجن آدمی جن کے منھ کتون کی تھوتھنی سے مشابہ تھے میرے گرد جمع ہو کر پوچھنے لگے تمھارے پاس کوئی قابلِ محصول شے تو نہین ہو؟ مین چونکہ دوزخ کے قوانین سے واقف نہ تھا اس لیے مین نے جواب دیا کہ میرے پاس جو اسباب ہو وہ صرف روحانی ہو۔ معلوم نہین وہ کہان تک قابلِ محصول سمجھا جا سکتا ہو؟

"اُنھون نے بڑے غور سے میرے کپڑون کی تلاشی لینا شروع کی اور جب کچھ برآمد نہ ہوا تو ایک مشتبہ سی صورت کا آدمی مجھے ایک تنگ مکان مین لے گیا جہان سے نیچے اُترنے کے لیے سیڑھیان بنی ہوئی تھین۔ نیچے اُترا تو ایک ریل کا اسٹیشن نظر آیا جو آدمیون سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ گرمی اور بدبو اسقدر تھی کہ میرا دماغ چکر کھانے لگا۔ کچھ عرصہ انتظار کرنیکے بعد ایک بہت بڑی ٹرین وہان آکھڑی ہوئی۔ مین حیران ہو گیا کہ اس زمانے کی تہذیب کا اثر دوزخ پر کسقدر پڑ چکا ہو۔ مین طوعاً وکرہاً اس ٹرین کے ایک خانے مین بیٹھ گیا لیکن مسافرون کی وہ کثرت تھی کہ دم گھٹا جاتا تھا۔ راستے مین کئی اسٹیشن آئے کئی مسافر چڑھے مگر اُترے بہت کم نتیجہ یہ ہوا کہ ہم بالکل پچک کر بیٹھے رہے۔ آخر کار اُس وقت جب کہ مین بیہوش ہونے کے قریب تھا گاڑی ٹھہر گئی اور مین ٹرین سے نکل آیا۔

"سیڑھیون پر سے چڑھ کر اوپر آیا تو ایک شہر غدار میری نظر پڑا۔ اس کے بازار میلے کچیلے اور مکانات بدنما تھے۔ ہر طرف مارے شور و غل کے کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔

"مین نے ایک لڑکے سے جو اخبار بیچ رہا تھا پوچھا اس شہر کا نام

کیا ہے؟ اس نے جواب دیا یہ نرک دیش کا صدر مقام ہے۔ کیا تم کوئی اجنبی ہو؟۔

"اس نرک دیش مین جہان تک مین نے دیکھا ان تکلیفون یا صعوبتون کا نام و نشان بھی نہ تھا جو ہمین بتائی جاتی ہین۔ وہان پہنچنے کے لیے ہمین کوئی خون کی ندی عبور نہ کرنی پڑی تھی نہ وہان کسی کو آگ مین جلایا یا تیل مین بھونا جاتا تھا۔ یہ جگہ تو جدید ترقیات کے اعتبار سے یورپ اور امریکہ کے شہرون کا مقابلہ کرتی تھی۔ لوگون کے لباس بڑے شاندار اور فیشن کے مطابق تھے۔ جا بجا دھوئین کی بدبو اور گوشت کی سڑاند آ رہی تھی۔ بازارون اور گلیون کے نکڑ پر پولیسین متعین تھے۔ بہشت کے بخلاف اس شہر مین عدالتین، جیل خانے، تھیٹر، ہوٹل، مندر اور بڑی بڑی دکانین موجود تھین۔ مین نے دیکھا کہ جا بجا لوگ گہری نظرون سے میری طرف دیکھ رہے ہین۔ مین حیران تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے مگر بھلا ہو اس پولیس والے کا جس نے مجھے جلدی ہی پکڑ کر ایک تاریک کوٹھری مین اس جرم پر بند کر دیا کہ مین آداب تہذیب سے ناواقف ہون۔ در اصل بات یہ تھی کہ مین چونکہ سیدھا بہشت سے وہان پہنچا تھا اس لیے بوٹ پہننا یاد نہ رہا ننگے پاؤن ہی چل نکلا تھا۔

"مین نے اس کوٹھری کے محافظ سے پوچھا تمھارے یہان روپیہ کا چلن ہے؟۔

"اس نے جواب دیا یقیناً ہے۔ روپیہ پر ہی تو یہان کے سارے کاروبار کا دارو مدار ہے۔ یہان ہر شخص کی عزت کا اندازہ اسکی دولت سے ہوتا ہے جس کے پاس روپیہ نہین وہ نکما ہے۔ روپیہ والے کو سبھی عیش اور آسائش مہیا ہین۔

"میری جیب مین چند روپے تھے۔ مین نے محافظ کے ہاتھ مین تھوڑی نقدی دیکر کہا از راہ عنایت یہ تو معلوم کرائیے کہ ڈینٹے، ملٹن وغیرہ وہ لوگ جنھون نے دوزخ کے متعلق بڑی بڑی لمبی چوڑی نظمین لکھی ہین اس ملک مین رہتے ہین یا کہین اور؟ اس نے ٹیلیفون کے ذریعے سے اپنے افسر سے پوچھکر جواب دیا کہ یہان چونکہ نوآبادگارون کے لیے بڑی سختی سے نگرانی ہوتی ہے اس لیے ان انارکسٹون کو اس ملک مین رہنے کی اجازت نہین۔

"مین نے پھر پوچھا یقیناً اس جگہ کیلئے ڈارون، اسپینوزا، سانا رولا اور اور اس قسم کے لوگ جو دنیا مین خدائی ذات سے منکر تھے اور جنھین لوگ دہریہ ہونے کی وجہ سے بہشت مین جانے کے ناقابل ٹھہراتے تھے رہتے ہون گے۔

"وہ بولا ہرگز نہین۔ یہان تو صرف بڑے بڑے سود خوار ساہوکار، رشوت خوار جج، نمائشی فلاح خواہ، دھوکہ باز مقنن، جیتون کو مارنے والے، خطرہ جان ڈاکٹر، اور عیاش اکیڑ بستے ہین۔

"اس سے اگلے روز میرا مقدمہ عدالت مین پیش ہوا۔ تحقیقات کے بعد حکم سنایا گیا کہ سو روپیہ جرمانہ ادا کرے یا ۹ دن قید رہے۔ میرے پاس چونکہ روپیہ کافی نہ تھا اس لیے مجبوراً جیل خانے کی سیر کرنی پڑی۔

"ایک شخص پر خون کا مقدمہ تھا۔ اس کے دوستون نے مجھے اس شرط پر جھوٹی گواہی دینے کے لیے رضامند کر لیا کہ وہ میرا جرمانہ ادا کر دین گے۔ مین بھی جیل مین رہتا رہتا عاجز آ گیا تھا۔ اس تجویز کو منظور کر لیا اور رہائی حاصل کی۔

"اس کے چند روز بعد مجھے ایک تھیٹر مین جانے کا اتفاق ہوا۔ ناٹک بالکل فحش اور فضول تھا۔ مین نے تنگ آ کر کہین یہ کہ دیا کہ دوزخ بھی کیسا خوفناک ملک ہے۔ اس پر ایک شخص نے جھٹ مجھے ایک پولیس والے کے حوالے کر دیا۔

"میرا مقدمہ دوبارہ عدالت مین پیش ہوا۔ ذرا سی بات کا بتنگڑ

بنایا گیا۔ دونون جرح قدح ہوتی رہی۔ آخر فیصلہ یہ سُنایا گیا کہ مجھے دوزخ
مین سے جلا وطن کر دیا جائے کیونکہ مین اسمین رہنے کے قابل نہ تھا
مین نے لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اِس آسانی سے دوزخ سے نجات حاصل
ہوئی۔

"اس کے بعد جب مین نے دوبارہ اِس دُنیا کا رُخ کیا تو معلوم ہوا
کہ میرا خاکی جسم مدت ہوئی جلا دیا گیا تھا۔ ناچار ایک نئی ہستی کی
مختلف منازل طے کرنے کی تیاریان کرنے لگا۔ جب مین دُنیا مین نمودار
ہوا تو مجھے اپنے لیے نئے فرائض، نئے نواحات، اور نیا ہی جسم نظر آیا۔
لیکن یہ مین اچھی طرح جانتا تھا کہ میری روح وہی ہی۔"

جب مین اس قصہ کو پڑھ چکا تو نظر اُٹھا کر دیکھا کہ میرا ملاقاتی کھڑکی
مین کھڑا سورج کو غروب ہوتے دیکھ رہا تھا۔

مین نے کہا "یہ ایک غیر معمولی طور پر دلچسپ قصہ ہی لیکن واقعات
اسقدر عجیب ہین کہ اگر اس کے لکھنے والے آپ نہ ہوتے تو اس کو شائع
کرنیوالا تلاش کرنا مشکل ہو جاتا۔ مین اُمید کرتا ہون، مین آپ کو
اسکی اُجرت اسقدر دلا سکون گا کہ جتنی آجتک ہندوستان کے کسی
اڈیٹر نے کسی کو نہین دی۔"

اس نے سر ہلایا مگر جواب کچھ نہ دیا۔

میرے دلمین رہ رہ کر خیال آرہا تھا کہ میرے لیے اِس شخص
کی بدولت دولت اور شہرت حاصل کرنیکا کیسا عمدہ موقع ہی۔ اسی
دھن مین مین نے زمانہ مستقبل کے متعلق دل ہی دلمین طرح طرح
کی تجاویز سوچنی شروع کر دین۔ مین نے اِس بات کا ارادہ کیا کہ
تمام اخبارات مین اِس مطلب کا نوٹ چھپوا دون کہ میرے پاس
زمانۂ موجودہ کا "کش" ٹھہرا ہوا ہی، جو ماں کے بطن سے پیدا نہین
ہوا۔ لوگ جبس وقت ٹائمز آف انڈیا، سانجھ ورتمان، اندو پرکاش،
وغیرہ چوٹی کے اخبارون مین اس کا ذکر پڑھین گے تو ہر ایک میری
ملاقات کا خواہشمند ہوگا کیونکہ میری ہی وساطت سے لوگ "نبیتی"
سے ملاقات کرسکتے ہین۔ بعض اسے بے وقت کا اپریل فول سمجھین گے
بلا سے مین تو خود اپنی آنکھون سے پروفیسر واس کی لیبوریٹری مین
اِس شخص کو جنین کی حالت مین دیکھ آیا ہون۔

اِس قسم کے خیالات کو دلمین لیے ہوئے اُٹھا۔ اپنے ملاقاتی کا
ہاتھ اپنے ہاتھ مین لیا اور کہا کل خدا نے چاہا تو مین آپ کی ملاقات
کے لیے تمام بڑے بڑے اڈیٹرون اور ان کے دوستون کو بلواؤنگا
کیونکہ نامور آدمیون کو انٹروڈیوس کرانیکا یہی طریقہ ہی۔

ہم دونون اکٹھے تاج محل ہوٹل مین گئے۔ مل کر کھانا کھایا اور
پھر مین نے اسے اسکے کمرہ تک پہنچا دیا۔

جب مین شب بخیر کہکر گھر کی طرف لوٹا تو میرے دماغ مین صدہا
سنسنی خیز تجاویز کا ہجوم تھا۔

(۴)

اگلے روز سہ پہر کو بمبئی کے تمام اخبارات کے قائم مقام میری ملاقات
کو آئے اور اس وقت اول مرتبہ مین نے انھین ان واقعات سے
باخبر کیا جو ۲۰ سال قبل مین نے پروفیسر واس کی لیبوریٹری
مین دیکھے تھے۔ اپنے بیان کی تصدیق مین مین نے اس کے مصنوعی
جانورون اور جنین کے فوٹوگراف بھی دکھائے لیکن میری پاس
چونکہ فوٹو کی تصاویر کے علاوہ اِس مشہور و معروف موجد کے وہ
خطوط بھی تھے جن مین اس نے اپنی اِس ایجاد کا اشارۃً ذکر کیا
تھا اس لیے اِن سب کو میری باتین صحیح تسلیم کرتے ہی بن پڑین۔
نوجوان "نبیتی" سے انکی ملاقات کے لیے مین نے اگلا دن مقرر
کیا لیکن ساتھ ہی اِن سے طے کر لیا کہ اِس کے لیے مین ایک
معقول فیس چارج کرونگا۔ بہرصورت اِن کے اطمینان کے لیے مین نے
انھین اِس کا فوٹو لینے کی اجازت دیدی اور اُسکی زبان سے یہ

معلوم کرنے کی بھی کہ آیا "بنسپتی" اسی کا نام ہے۔

آپ میری خوشی کا اندازہ اس بات سے کر سکتے ہین کہ اگلے روز تمام صبح کے اخبارات مین اس نوجوان کا ذکر بڑی تفصیل سے چھاپا گیا اور بعض اخبارات نے اس کے فوٹو بھی درج کیے۔

"بنسپتی" شاید ابھی بیدار بھی نہ ہوا ہو گا کہ میرے پاس ایک سو کے قریب تار مختلف لوگون کی طرف سے آے۔ ایک بھاٹیہ سیٹھ نے مجھ سے اس روز کی آمدنی کا ٹھیکہ دس لاکھ کی معقول رقم کے عوض کرنا چاہا۔ بعض لوگ اسکے بارے مین مزید کیفیت معلوم کرنا چاہتے تھے۔ بعض خاص طور پر خلوت مین ملاقات کرنے کے آرزومند تھے۔ مین نے اس نوجوان کا لکھا ہوا قصہ گجراتی کے ایک ماہوار رسالہ کے ایڈیٹر کے ہاتھ ایک پونڈ فی سطر کے حساب سے فروخت کر دیا اور ساتھ ہی یہ شرط قرار پائی کہ آئندہ وہ جو کچھ لکھے وہ اسی نرخ پر خریدا جایا کرے۔ ½۶ بجے سے پہلے پہلے ہوٹل مین لوگون کا اسقدر ہجوم ہو گیا کہ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ اخبارات کے ایڈیٹرون اور خاص رپورٹرون کے علاوہ بڑے بڑے مالدار مارواڑی سوداگر، پارسی سیٹھ، بھاٹیہ لکھ پتی، خطاب یافتہ ہندو مسلمان، اعلیٰ طبقے کے انگریز لیڈیان، پارسی اور مرہٹہ خواتین، غرضکہ ہر عمر، ہر جنس اور ہر رنگ کے آدمی جمع تھے مجھے اتنا راستہ نہ ملتا تھا کہ گذر کر اس معاملہ کی خبر اس واقع کے ہیرو کو دے سکتا۔

آخر کار جب مین اس بھیڑ کو چیرتا ہوا اس کے کمرے مین پہنچا تو وہ بیدار ہو چکا اور کپڑے پہن رہا تھا۔ مین نے صبح کا ایک اخبار اس کے ہاتھ مین دیکر کہا "مسٹر بنسپتی ذرا اسے دیکھنا۔" اس نے بحالت اضطراب عنوان کی سرخیان پڑھین اور اس کے بعد جون جون باقی مضمون پڑھتا گیا اس کے جوش مین اضافہ ہوتا گیا۔ اس کا رنگ زرد ہو گیا ہاتھ کانپنے لگے اور سر کرسی کی پشت سے جا لگا۔

مین نے حیران ہو کر پوچھا "کیا ہوا۔ آپ بیمار تو نہین ہین؟"

اس نے لکنت کے ساتھ جواب دیا "غضب ہو گیا! اب کیا ہو گا؟"

مین نے کہا "آپ کیا کہتے ہین؟ اسمین قابل اعتراض کونسی بات ہے؟"

اس نے سر کے بال نوچتے ہوئے جواب دیا "یہ جو کچھ لکھا ہے سراپا جھوٹ ہے۔ یہ اخبار جب میرے والد کی نظرون سے گذرے گا تو وہ کیا کہین گے؟ اُف! خداوندا تیری پناہ!"

مین نے کہا "آپ خواہ مخواہ مضطرب ہوتے ہین۔ اس ملاقات کی کیفیت مین کونسی بات جھوٹی درج ہوئی ہے؟"

وہ بولا "آپ سے ایک خوفناک غلطی سرزد ہوئی ہے۔ بڑا مغالطہ یہ ہوا کہ مین مصنوعی آدمی نہین ہون۔"

اتنا کہکر وہ گھبراہٹ کی حالت مین کھڑا ہو گیا اور پھر بولا "آپکو یہ گمان کیونکر پیدا ہوا کہ مین مصنوعی انسان ہون؟"

میری آنکھین پتھرا گئین۔ خون ٹھنڈا پڑنے لگا۔ پیشانی پر سرد عرق کے قطرے نمودار ہو گئے اور پوچھا "توبہ! توبہ! کیا تمھارا نام "بنسپتی" نہین ہے؟ بیس بائیس سال گذرے جب کلکتہ مین تمھارے باپ نے مجھے انکوبیٹر کے اندر ایک جنین دکھایا تھا کیا تم اس سے پیدا نہین ہوئے؟"

ایک دیوانہ کیطرح اپنے بالون کو کھینچتے ہوئے اس نے جواب دیا "بُرا بھلا ہو! سچ! سچ! مین تو اپنے باپ کا قدرتی بیٹا ہون اور اس وقت پیدا ہوا تھا جب پونا مین رہتے ہوئے ایک سال بعد اس نے ایک دکنی لیڈی سے شادی کر لی تھی۔ اس نے بارہا مجھے بتایا تھا کہ وہ جنین جسے تم بھی دیکھ آئے تھے آخر بڑھتے بڑھتے ایک کوکرموتھا بن گیا۔"

مین چکر کھا کر دیوار سے جا لگا اور چلا کر پوچھا "کوکرموتھا؟ سچ کہتے ہو؟"

وہ بولا "مین اسے ثابت کر سکتا ہون۔ اُف! اے میرے خدا! اب کیا ہو گا؟ غضب ہو گیا! ستم ہو گیا!"

ہم دونون اِس کمرے مین اِدھر اُدھر دیوانون کی طرح چھپتے پھر رہے تھے۔ باہر سے بار بار ٹیلیفون کی گھنٹی کی آوازین آتی تھین اور نوکر ہر لمحہ ہیرو ن ملاقاتی کارڈ لا لا کر اندر ڈال جاتا تھا مگر ہمین اِن کی کچھ خبر نہ تھی۔

روشن لال

آنریبل مولوی سید حسین بلگرامی

مملکت آصفیہ، اس خیال سے کہ اُس کے حکمران اسلامی روایات کے علم بردار ہین، اور اِس لحاظ سے کہ وہان اِس گئی گذری حالت مین بھی معارف شناسی اور علم پروری کی وہی خصوصیات نمایان ہین جو کسی زمانے مین دولت عباسیہ اور فرمانروایان قرطبہ کے ساتھ مختص سمجھی جاتی تھین اقطاع ہند مین بانمود سمجھی جاتی ہو۔ شروع سے لیکر ابتک دولت نظام مین ترقی و اصلاح کے کئی دور ہو چکے ہین لیکن مورخین کا اجماع ہو کہ سر سالار جنگ اعظم کا زمانہ حیدر آباد کا "عہد زرین" تھا حقیقت حال بھی یہی ہو کہ اِس دانشمند مدبر کے وقت مین حیدر آباد کے سیاسی اقتدار اور ملکی عظمت کا دائرہ اسقدر وسیع تھا کہ آج ہماری نگاہین اُن کا حصر کرنے سے عاجز ہین۔ اُن تمام تاثیرات کے اعتبار سے جو وزارت عظمیٰ کی بدولت دکن کو نصیب تھی اُس شہرت اور وقعت کو دیکھتے ہوے جو اُس عہد مین حیدر آباد کی شاہی خاندان کو حاصل ہوئی اور علم دوستی اور معدلت پژوہی کے اُس جوش کا اندازہ کرتے ہوئے جس سے اپنے اپنے وقت پر ہر شخص نے فائدہ اُٹھایا، بیجا نہوگا اگر یہ کہا جاے کہ حیدر آباد مین سالارجنگی کارنامے اُسی عزت و شان سے دیکھے جاتے ہین جو کبھی بغداد مین برامکہ اور دار السلطنت سلاجقہ مین نظام الملک طوسی کے حصے مین آئی تھی۔

سر سالار جنگ کے عملیات کی نمایان کامیابی کا ایک گہرا اور سچا راز یہ بھی تھا کہ اُنھون نے اپنے گرد ہندوستان کے تمام لائق اور یکتا افراد جمع کر رکھے تھے۔ حیدر آباد کی تعلیمی حالت اُسوقت ایسی نہ تھی کہ وہان کی آب و ہوا سے قابل جوہر پیدا ہو سکتے اور اسکی ضرورت تھی کہ بیرونی حصص سے ایسے اشخاص چیدہ، بلائے جاتے جنکی دماغی قوتین حیدر آباد کے عروج کا مرکز قرار پاتین۔ سر سالار جنگ کا ساد ور بین آدمی اِس ضرورت سے قطع نظر نہین کر سکتا تھا چنانچہ اُنھون نے شمالی ہند کے بہت سے نامور لوگون کو از راہ قدردانی حیدر آباد طلب کیا اور اُن کے سپرد وہ گرانبار فرائض کئے گئے جن کے انجام دینے کی اُنمین فطرتی قابلیت موجود تھی۔ اِن لوگون مین جو بزرگ سب سے پیشتر حیدر آباد کے سیاسی پلیٹ فارم پر نمودار ہوے وہ آنریبل مولوی سید حسین صاحب بلگرامی تھے جن کے چہل سالہ کارنامے اسبات کے شاہد ہین کہ جسطرح وہ ارکان دولت نظام کے زمرہ مین اپنے اور ہمعصرون سے پہلے شریک ہو کر الفضل للمتقدم کے مصداق ہوے اُسیطرح بے لوث کارگذاری اور مستقل شہرت کے میدان مین بھی وہ کسی سے پیچھے نہین رہے۔

مولوی سید حسین صاحب بلگرامی ہندوستان کے اُس طبقے سے تعلق رکھتے ہین جنکی قابلیت اور علمیت اور رُسی کے ساتھ اجتہاد رائے مسلم ہو۔ بلگرام اودھ کا مشہور قصبہ ہو اور اُسکی خاک کچھ ایسی مردم خیز واقع ہوئی ہو کہ آجتک وہان سے متعدد نامور اور ذی شہرت اصحاب نکل چکے ہین۔ توطن کے لحاظ سے مولوی سید حسین صاحب کو اُنھین اسلاف کی جانشینی کا فخر ہو جنکی عظمت کا نقارہ

آج بھی اُسی زور شور سے بج رہا ہو۔ لیکن باریک بین نگاہیں مولوی صاحب کی بزرگی و ناموری کا حصہ دار تمام ہندوستان کو سمجھتی ہین اور واقعیت بھی یہی ہو۔

آنریبل مولوی سید حسین بلگرامی! خدا جانے اس نام مین کیا جادو ہو اور دو چار الفاظ کے اس مجموعے مین کیا تاثیر ہو؟ قلم اس جادو اور اس تاثیر کا فوٹو کھینچنے سے عاجز ہو لیکن ذوق سلیم ان کی کیفیات کا اندازہ کر سکتا ہو کہا جاتا ہو کہ لفظون کے ظاہری معانی کے علاوہ باطنی مطالب بھی ہوتے ہین۔ اگر یہ سچ ہو تو ہم کہین گے کہ آنریبل موصوف کے نام کا صحیح معنوی مطلب ذہن نشین ہوتا ہو وہ عبارت ہو سوز و گداز قوم سے، عام ہمدردی سے، بے لوث محبت سے، حقیقی خدمت ملک سے، ایثار نفس سے، علم دوستی سے، صاف گوئی سے، راستبازی سے، اور اُن تمام اوصاف سے جو اس یگانۂ روزگار کے حصے مین آئی ہین۔ ایک بات اور بھی عجیب ہو کہ اس نام کی تاثیر مسمریزم کی طرح محدود یا پابند نہین ہو بلکہ لامحدود اور غیر پابند، ساری فضائے ہند مین یہ تاثیر پھیلی ہوئی ہو، اور مسلم، ہندو، عیسائی، پارسی ہر ایک کے قلب اُس سے متاثر ہوتے ہین۔

مولوی صاحب کے حالات ملک مین اس کثرت سے زبان زد ہین کہ اُن کا تفصیلی اعادہ تحصیل حاصل سے زیادہ نہو گا مختصراً یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ آپ بلگرام کے ایک معزز و موقر خاندان کے رکن رکین اور رفرد فرید ہین۔ آپ کا خاندان عراق عرب سے بلگرام آیا تھا۔ عہد مغلیہ مین آپ کے بزرگون کا رسوخ بہت بڑھا ہوا تھا۔ اور جب ہند کی عنان حکومت برٹش گورنمنٹ کے قبضے مین آئی اُس وقت بھی آپ کے خاندانی عروج و ترقی کی رفتار یکسان طور پر تیز رہی۔ آپ کے خاندان مین علم و فضل کا چرچا جو کچھ آجکل ہو وہی حالت بزرگون کی بھی تھی اسیوجہ سے آپ کی تعلیم کا انتظام بھی نہایت معقول رہا۔ گویا آپ کو عربی، فارسی یا انگریزی کی جو تعلیم دلائی گئی وہ بالکل با اُصول تھی۔ انگریزی زباندانی مین آپ کو جو ید طولی اسوقت حاصل ہو اُسکی بنیاد گویا زمانہ طالب علمی پڑ چکی تھی۔ مطالعہ علمی کا شوق آپ کی طبیعت ثانیہ بنا ہوا تھا۔ کتابون کے ساتھ آپ کو عشق تھا حیدرآباد مین بھی باوجود فرائض منصبی کی گرانباری کے آپکا بہت کچھ وقت لائبریری مین کٹتا تھا جسکو بیش بہا اور نادر کتب کا مجموعہ کہنا بالکل صحیح ہوگا۔

مضمون نویسی اور انشاپردازی کا شغف بھی آپ کو ابتدا سے ہو چنانچہ جب آپ لکھنو مین تھے تو ایک انگریزی اخبار نکال رکھا تھا جسکی ترتیب و تالیف آپ ہی کے ذمہ تھی۔ ان تمام باتون نے آپ کی شہرت کا دائرہ بہت وسیع کر رکھا تھا۔ چنانچہ جب ۱۸۷۳ء مین نواب سرسالار جنگ بہ تقریب دورہ شمالی ہند آئے تو آپ کو اُن سے تعارف حاصل کرنے کا بہت اچھا ذریعہ پیدا ہو گیا۔ نواب سرسالار جنگ کی مردم شناس نظر نے جوہر طبعی کو پہچان گئی چنانچہ آپکو لکھنو سے حیدرآباد جانا پڑا اور وہان آپکو صدارت عظمٰی کے معتمد خصوصی (پرائیویٹ سکرٹری) کا منصب تفویض ہوا۔ وزیر اعظم دکن کی پرائیویٹ سکرٹری کی ذمہ داریان کوئی معمولی نہین ہوتین لیکن مولوی سید حسین صاحب بلگرامی نے جس خوبی اور دانشمندی سے اپنے فرائض انجام دیئے ہین اُن کی یاد اسوقت تک حیدرآباد والون کے دلون مین موجود ہو۔ رازداری کی صفت آپ مین نہایت قیمتی صفت ہو اور نواب سرسالار جنگ کا اعتماد کلی حاصل کرنے مین اس سے بیش بہا امداد پہنچی۔ نواب موصوف آپ پر اپنا دلی عندیہ تک ظاہر کرنے مین حیص بیص نہ کرتے تھے۔ حیدرآباد مین اب بھی کچھ لوگ ایسے موجود ہون گے جو نواب صاحب اور سید صاحب کے بے تکلفانہ اور راستبازانہ برتاؤ کی چشم دید شہادت دے سکین گے۔

۱۸۸۴ء مین حضرت غفران مکان میر محبوب علیخان مرحوم تخت نشین ہوئے اور انتظام مملکت کے لیے اسٹیٹ کونسل مقرر ہوئی ہم سکے

سکرٹری بھی مولوی سید حسین مقرر ہوئے۔ سٹیٹ کونسل کے ختم ہونے پر مولوی صاحب موصوف کو حضور نظام مرحوم کے پرائیویٹ سکرٹری شپ کا قلمدان سپرد ہوا۔ اس خدمت کو آپنے بہت زمانہ تک انجام دیا اور غائت درجہ کی نیکنامی اور راستبازی سے۔ جو لوگ ریاستی کاروبار سے واقف ہین اور اُسکی پیچیدگیون کا کچھ تجربہ رکھتے ہین وہ مولوی سید حسین صاحب کی مشکلات کا ایک حد تک اندازہ لگا سکتے ہین لیکن مولوی صاحب نے اس خداداد قابلیت و عقلمندی سے اپنا کام انجام دیا ہی کہ شاید و باید۔

آخر آخر مین آپ کے تفویض نظامت تعلیمات عامہ ممالک محروسہ سرکار عالی" کا عہدہ تفویض ہوا تھا اور وظیفہ یاب ہونے سے پیشتر تک آپ اسی منصب پر مامور رہے۔ ہم اسجگہ آپ کی تعلیمی خدمات کا تبصرہ کرنے پر آمادہ نہین۔ نہ قلت گنجایش اسکی اجازت دیگی، لیکن یہ ضرور کہین گے کہ آپ نے اگرچہ حیدرآباد یونیورسٹی علیحدہ قائم نہین کی، صنعتی تعلیم کو بڑے پیمانہ پر جاری نہین کیا، تعلیم نسوان کو بھی بہت محدود حالت مین رکھا؛ تاہم حیدرآباد کے حالات و واقعات کا اندازہ کرنے کے بعد اس سیغے مین آپ سے جو کچھ ہو سکا وہ کم نہین ہے۔ ہم وثوق کے ساتھ کہ سکتے ہین کہ مولوی سید حسین صاحب بلگرامی کو ہر ایک قسم کی تعلیم رائج کرنے کی فکر دامن گیر رہتی تھی لیکن حکام بالادست کی طرف سے اُنھین کسی قسم کی امداد نہین پہنچی۔ آج جو کچھ تعلیم وغیرہ کا چرچا حیدرآباد مین ہو رہا ہی وہ سب مولوی صاحب کی ذاتی کوششون کا نتیجہ ہی۔ اکثر یہ اعتراض ہوتا ہی کہ آپ کے زمانہ مین صنعتی تعلیم کی طرف مطلق توجہ نہین کی گئی لیکن یہ صحیح نہین ہی۔ توجہ ضرور ہوئی ہی، ہان اُسکے نتائج کچھ زیادہ مستقل اور دیرپا نہین نکلے۔ اور اُسکی اصلی وجہ وُہی تھی جو ہم اوپر لکھ آئے ہین۔ ہمین اتفاق سے اُس زبردست یادداشت کی ایک نقل ملگئی ہی جو آپ نے ممالک محروسہ سرکار عالی مین تعلیم صنعت و حرفت کو رواج دینے کے متعلق قلمبند فرمائی تھی۔ یہان اُسکا اقتباس درج کیا جاتا ہی کہ ناظرین بھی اسکو پڑھکر آپ کی اصابت رائے کا اندازہ کر سکین:۔

سررشتہ تعلیمات سرکار عالی کی بنیاد اُن ہی اُصول پر جاری ہی جنکی پابندی قدیم سے چلی آتی ہی۔ غور کیا جاے تو نوعیت سب کی یکسان ہی۔ غریب، امیر، عہدہ دار، ساہوکار، مزارع، اہل حرفہ سبھی کے بچّون کو لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا ہی یا وہ علوم جن سے لکھنے پڑھنے مین مدد ملے اور وہ دفتر یا حجرہ مین بیٹھکر دماغ سے کام لینے کی عادت پڑجائے۔ ظاہر ہی کہ یہ طریقہ تعلیم کا فرض کرلیتا ہی کہ امیر و غریب سب کو دُنیا مین بہ آزادی یا بآسائش معیشت پیدا کرنے کیلئے فقط دماغ ہی سے کام لینا بس ہی۔ املا و انشا کا فن، ساری مشکلون کو حل کرسکتا ہی ..... کچھ شک نہین کہ یہ صفات جنکا ذکر اوپر ہوا بجائے خود کسب کے قابل ہین اور نہایت درجہ مفید ہین .... مگر شاید تمام آبادی ملک کا اگر حساب کیا جاے تو سنو مین پانچ بھی ایسے نہ نکلین گے جن کو انشا و املا سے کام لینے کی بالعادت ضرورت رہتی ہو پس عامۂ خلائق کا تمام تعلیمی وقت ایسے فنون کی تحصیل مین صرف کرانا اُصول تعلیم کے خلاف ہی۔ عموماً رعایا کو اس قسم کی تعلیم دینا چاہیئے جو کسب معیشت مین اُنکو مدد پہنچاے اور اُن کے اذہان کو اسقدر صیقل دیدیے جس سے وہ اپنے روزمرہ کے معاملات کو جلد سمجھ سکین ..... جو بچّے فقط چشم و دماغ سے پڑھنا اور ہاتھ سے لکھنا سیکھتے ہین اور اُن اعضا سے اور کوئی کام نہین لیتے اُن سے کیونکر اُمید کیجا سکتی ہی کہ وہ سن رشد کو پہنچکر ہل درست چلالین گے یا کوئی دستکاری کا کام بھی بہتر کرسکینگے ..... حاصل تقریر یہ ہی کہ مزارعین و اہل حرفہ وغیرہ کی اولاد کو محض کتابی تعلیم نہ دینا چاہیئے بلکہ ایک معتدبہ حصّہ اُن کے تعلیمی وقت کا صنعت و حرفت کے سکھانے مین صرف کرنا چاہیئے۔ کتابی تعلیم اُن کو فقط اسقدر دینا چاہیئے کہ وہ لکھنے پڑھنے مین دوسرے کے محتاج نہ رہین اور اپنی صنعت و حرفت مین عقل و فہم سے کام لے سکین اور اُسمین اختراع و ایجاد کرنے پر

قادر ہون۔

ان خیالات کے اظہار فرمانے کے بعد آپ نے تجویز بنائی ہی کہ اضلاع دکن مین کہان کہان صنعتی مدارس کھولے جانے چاہیئے۔ اِس یادداشت سے کم ازکم اسقدر پتہ ضرور چلتا ہی کہ آپ بھی اُسی صنعتی تعلیم کے موید تھے جسکی ضرورت عام طور پر ہندوستان مین محسوس ہو رہی ہی۔

اسی طرح یہ اعتراض بھی بسا اوقات وارد کیا جاتا ہی کہ باوجود تعلیم نسوان کے بہترین اور پُرجوش حامی ہونیکے آپ کے زمانۂ نظامت مین مدارس نسوان نے خاطرخواہ ترقی نہین کی۔ لیکن یہ اعتراض بالکل بودا اور نادرست ہی۔ حیدرآباد مین دو ایک زنانہ اسکول بہت خوبی سے کام کر رہے ہین۔ اِس سے زیادہ زنانہ اسکولون کی ضرورت کیا تھی؟ اسکول تو بہت سے قائم ہو سکتے تھے مگر پڑھنے والیان کہان سے آتین۔ ہان اگر والدین مین لڑکیون کو تعلیم دلانے کا شوق ہو جائے تو مدارس کی کثرت مفید ہو سکتی ہی۔

مولوی سید حسین صاحب بلگرامی کا زمانۂ زندگی زیادہ تر حیدرآباد مین گذرا ہی۔ وہان کے کئی انقلابات اُنکی نظرون کے سامنے ہوئے۔ اُنھین ریاستی زندگی کا خاص تجربہ ہی۔ چنانچہ اسوقت تک وہان کتنی سازشین ہوئین، پارٹی فیلنگ کا زور بڑھا، وزارتین بدلین، حسد وعناد کی گرم بازاریان رہین، لیکن آپ کی کوہ وقاری دیکھنے کے قابل ہی کہ آپنے اپنے اُصول سے ذرہ بھر جنبش نہین کی۔ ایک سیدھا راستہ جو شروع مین اختیار کیا اُس پر سے نہین ہٹے۔ انقلابون اور سازشون اور دھڑہ بندیون کے طوفان نے آپ کی طبیعت پر کوئی اثر نہین کیا۔ آپ ہر دَور مین یکسان معزز وممتاز ومعتمد رہے، اور یہی اعتماد وامتیاز تھا جسکی وجہ سے حضور نظام مرحوم کی آپ پر خاص نظرعنایت تھی۔ آپ نے کئی مرتبہ فرائض منصبی سے سبکدوش ہونے کے لیے استعفا دیا لیکن مرحوم نے نامنظور فرمایا حضور حال کی تعلیم وتربیت کا ایک حصّہ آپ کے سپرد تھا اور یہ بڑی خوشی کی بات ہی کہ زمانۂ حال مین گورنمنٹ نظام نے آپ کی سالہاسال کی تجربکاری سے فائدہ اُٹھانے کے لیے آپ کو مشیر وزارت مقرر فرماکر حد درجہ کی بالغ نظری کا ثبوت دیا ہی۔ گورنمنٹ نظام سے آپ کو جو خطابات حاصل ہین اُن کی تفصیل یہ ہی۔ نواب علی یار خان، مؤتمن جنگ، عماد الدولہ عماد الملک بہادر، اور گورنمنٹ ہند کی طرف سے جہان ایک مرتبہ آپ والیسرائیگل کونسل کے اور بالآخر مجلس وزیر ہند کے رُکن مقرر ہوئے، آپ سی۔ ایس۔ آئی کے خطاب سے ممتاز ہین۔ انگریزی سوسائٹی مین آپ کو جو نمایان وقعت وامتیاز حاصل ہی اُسکا حال بھی کسی باخبر سے پوشیدہ نہین۔ آپ ہندستانیون اور انگریزون کے میل جول کے زبردست حامی ہین۔ علی گڈھ کالج مین ایک دفعہ آپ نے اِسی مبحث پر نہایت قابل قدر خیالات ظاہر فرمائے تھے۔

ملکی خدمات سے الگ ہو کر دیکھیئے تو آنریبل نواب عماد الملک مولوی سید حسین بالقابہ کے قومی کارنامے بھی قابل رشک نظر آتے ہین۔ علی گڈھ کالج کے آپ مربیون مین ہین اور حیدرآباد مین "علیگڈہ کاز" کو جو تقویت پہنچی وہ سب آنریبل بلگرامی کی مساعی کا نتیجہ تھی۔ ٹرسٹیان کالج کے آپ کچھ عرصے تک پریسیڈنٹ رہ چکے ہین۔ دو مرتبہ آپ نے کانفرنس کی صدارت فرمائی اور اپنی بیش بہا آرا سے قوم کو مستفید ہونے کا موقع دیا۔ مملکت آصفیہ کی بے نظیر علم دوستی کی مثالین جو دورِ آخر سے تعلق رکھتی ہین زیادہ تر نواب صاحب قبلہ کی بدولت قائم ہوئین۔ کئی اہل قلم اور مصنف دولت نظام کے وظیفہ خوار ہین اور ان سبھون کو آپ ہی کی کوشش سے فراغ بالی نصیب ہوئی ہی۔

نواب عماد الملک بہادر کی علمی کارگذاریون کا تبصرہ جداگانہ مضمون کا محتاج ہی۔ ہم یہان چند سطور مین ان کا مختصر ذکر کرین گے۔

آپ کی انگریزیت، عربیت اور فارسیت مسلم ہی۔ آپ کی انگریزی زبان دانی کا اقرار یورپین اہل قلم تک کو ہی۔ آپ کے کئی مضامین انگریزی زبان مین چھپکر شائع ہو چکے ہین۔ اسلامی ڈیپوٹیشن نے جو ایڈریس شملہ پر حضور وسیرائے بہادر کی خدمت مین پیش کیا تھا اُسے آپ ہی نے قلمبند فرمایا تھا۔ اُسکے متعلق اہل الرائے صحاب کا خیال ہی کہ لٹریری حیثیت سے بھی وہ ایک یادگاری چیز ہی۔ آپ کی "تاریخ دکن" جو انگریزی زبان مین مدوّن ہوئی ہی قابل دید چیز ہی جسمین زبان دانی کے علاوہ تاریخی تحقیقات کی حدین کھنچی ہوئی پائی جاتی ہین۔ بہت زمانہ ہوا آپ نے قرآن مجید کا ترجمہ شروع کیا تھا لیکن بعض موانعات کے باعث اُسکی تکمیل اُس زمانے مین نہو سکی۔ اَب معلوم ہوا ہی کہ آپ کی توجہ اس طرف پھر مبذول ہوئی ہی۔ خدا کرے آپ اس کار خیر کو جلد تر اتمام کو پہنچائین۔ اسلامی دُنیا کی یہ سخت ترین ضرورت ہی جس کی آپ کے ہاتھون پورے ہونیکی اُمید کی جاتی ہے۔

سطور بالا مین آپ کے حالات جو کچھ درج کیے گئے ہین وہ محض ایک خاکہ ہی ورنہ آپ کے واقعات زندگی اور آپ کی مختلف النوع خدمات کے تذکرہ کیلئے رسالون کی ضخامت سے کام نہین نکل سکتا۔ آپ کی ذات ہندوستان کے لیے مغتنمات سے ہی اگر ہمارے گوش شنوا اور چشم بینا ہون تو آپ سے ہم بہت سے مفید سبق حاصل کر سکتے ہین۔ خدائے پاک و برتر آپ کا سایہ ہما پایہ ملک اور قوم کے سر پر عرصۂ مدید تک قائم رکھے اور آپ کے فیضان سے خاص و عام کو مستفیض ہونے کا موقع عطا فرمائے۔ آمین!۔

تنقید کتب

(۱) نظام الملک طوسی

مولوی محمد عبد الرزاق صاحب کانپوری کی علمی شہرت البرآمکہ ایسی محققانہ و مستند تالیف سے وابستہ ہی اور آپ کو پبلک سے روشناس کرتے ہوئے کسی غیر معمولی ذریعۂ تعارف کی ضرورت مطلق نہین۔ یہ امر ہی خواہان لٹریچر کیلئے خصوصیت سے مسرت خیز ہی کہ آپ نے "سلسلۂ وزراء اسلام" کی دوسری کتاب بھی جسکا نام مندرجۂ عنوان ہی، اسی خوبی اور زیبائش کے ساتھ اتمام کو پہنچائی ہی جنھون نے البرآمکہ کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت مین پورا پورا حصہ لیا ہی۔ "نظام الملک طوسی" کاغذ، لکھائی، چھپائی، تقطیع، جلد غرض کہ ظاہری شکل و صورت مین بالکل البرآمکہ کا نمونہ ہی اور خوشی کا مقام ہی کہ محاسن باطنی مین بھی اُس سے کم نہین۔

"نظام الملک طوسی" جیسا کہ اُس کے نام سے ظاہر ہی دولت سلجوقیہ کے نامی گرامی، وزیر کبیر، ابو علی حسن بن علی بن اسحاق المخاطب بہ خواجہ بزرگ، تاج الحضرتین، قوام الدین، آتابک، رضی امیر المومنین کی مفصل اور جامع سوانح عمری ہی جو مولوی محمد عبد الرزاق صاحب کی سالہا سال کی کوشش و سعی سے ہم تک پہنچی ہی اور اُسکے غائر مطالعہ کے بعد ہمین یہ کہنے مین مطلق تامل نہین کہ تحقیق و تدقیق اور جانفشانی کے لحاظ سے مولوی صاحب کی یہ دوسری کتاب بہ حیثیت مجموعی اُردو کے ذخیرۂ ادب مین ایک انمول اضافہ ہی۔ یا یون کہنا چاہیئے کہ جسطرح طبقۂ وزرائے اسلام و مشاہیر عالم مین نظام الملک کا نام چوٹی پر نظر آتا ہی اُسی طرح "نظام الملک طوسی" لٹریری عظمت کے اعتبار سے ایک بہترین کتاب ہے۔

مولوی محمد عبد الرزاق صاحب نے جس تلاش اور جستجو سے پریشان

اوراق کا یہ شیرازہ باندھا ہے اُسکا اندازہ اس سے ہوگا کہ اِس کتاب کی ترتیب وتکمیل مین آپ کو کم نہ زیادہ سواسو کتابون کی ورق گردانی کرنی پڑی ہے۔ اِن مین سے بہت سی کتب ایسی ہین جو ہندوستان مین عنقا کا حکم رکھتی ہین۔ کوئی شبہہ نہین کہ اگر اتنی محنت ومشقت اور تلاش سے کام نہ لیا جاتا تو "نظام الملک طوسی" اس درجہ مکمل نہ ہوسکتی تھی جس صورت مین کہ وہ آج ہم تک پہنچی ہے۔

جسطرح نظام الملک کا نام کوئی معمولی نام نہین، اسیطرح اُسکے کارنامے بھی معمولی نہین۔ جس شخص نے دولت سلجوقیہ کی عنان وزارت تیس سال تک اپنے ہاتھ مین رکھی ہو، اور جسکی لائف علمی وتمدنی وسیاسی کارنامون کا مجموعہ رہ چکی ہو اُسکا تذکرہ لکھنا ہر شخص کا کام نہین۔ اِسی قسم کی چند در چند مشکلات کا اندازہ کرنے کے بعد ہم مولوی محمد عبدالرزاق صاحب کو اُن کی نمایان کامیابی پر مبارکباد دیتے ہین اور دُعا کرتے ہین کہ ؎

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

نظام الملک طوسی کے مطالعہ سے جہان اور بیسیون دلچسپیان پیدا ہوسکتی ہے وہان ایک یہ بھی ہے کہ دولت سلجوقیہ کی مجمل مگر مسلسل تاریخ پر بھی عبور ہوجاتا ہے، اور ناظر اندازہ کرسکتا ہے کہ جس سلطنت کا نظام الملک وزیر تھا، وہ خود کیا تھی یا اُسکا سیاسی عمل واقتدار کسقدر وسیع تھا۔ ہمین افسوس ہے کہ قلت گنجائش کے سبب ہم اس جگہ مفصل نہین لکھ سکتے مختصر طور پر سمجھ لینا چاہیئے کہ سلاطین اسلام کی فہرست مین سلاجقہ کا نام زرین حروف مین اسطرح لکھا ہوا ہے کہ آج بھی باوجود امتداد زمانہ اُن کی آب وتاب مین سر مو فرق نہین آنے پایا۔ لیکن جسطرح اسلامی سلطنتون مین سلجوقی حکومت نے خاص نام ونمود حاصل کیا تھا اسیطرح خاندان سلاجقہ مین الپ ارسلان اور ملک شاہ کا زمانہ سلطنت خصوصیت سے قابل ذکر ہے جبکہ سرحد چین سے بحر روم تک اور بحر خضر سے بحر ہند تک سلجوقی پرچم لہراتا تھا اور ترکستان، ماوراالنہر، ایران، شام، عراق، یمن، حجاز ایسے وسیع اور زرخیز ممالک زیر نگین تھے۔ خوش قسمت تھا نظام الملک کہ اُسے اِن دونون نامور حکمرانون کی وزارت کا فخر حاصل ہوا اور مبارک تھے الپ ارسلان اور ملک شاہ جنھین خواجہ بزرگ ایسا وزیر نصیب ہوا۔

"نظام الملک طوسی" مین ملک شاہ کا تذکرہ کسی قدر تفصیل سے درج ہے اور اسکی ضرورت بھی تھی ورنہ واقعات وروایات کا تسلسل مشکل سے ذہن نشین ہوتا۔ اِسی طریقے سے عمر خیام اور حسن بن صباح بانی مذہب اسمعیلہ کے حالات کتاب کا ضروری جزو ہین۔ لیکن مناسب ہوتا کہ یہ حالات بطور ضمیمہ شامل کیئے جاتے کیونکہ ایسا نہونے سے حسن ترتیب مین کسیقدر خامی ضرور پیدا ہوگئی ہے۔ حسن بن صباح، عمر خیام، ملک شاہ اور خود نظام الملک کی تصاویر مولوی محمد عبدالرزاق صاحب نے نہایت جانکاہی سے فراہم کی ہونگی۔ ان سے اصل کتاب کی زینت یقیناً دوبالا ہوگئی ہے۔ اچھا ہوتا اگر یہ مرقعے ہاف ٹون کرالئے جاتے۔

سیاسی کارنامون کے پہلو بہ پہلو نظام الملک کے علمی کارنامے بھی نہایت وضاحت سے دکھائے گئے ہین۔ شہرۂ آفاق "یونیورسٹی آف بغداد" یعنی مدرسۂ نظامیہ کے حالات غایت درجہ دلچسپ ہین۔ نظامیۂ بغداد کے علاوہ، نیشاپور، اصفہان، مرو، خوزستان، موصل، جزیرہ ابن عمر، آمل، بصرہ، ہرات، بلخ، اور طوس کے مدارس کا بھی مختصر ذکر کیا گیا ہے۔ یہ تمام مدارس نظام الملک کے دریائے جود سے سیراب تھے اور نظامیہ بغداد کی شاخ کے طور پر قائم کیے گئے تھے۔ تعجب ہے کہ نظامیہ بغداد کے تاریخی حالات مین کچھ اختلاف پیدا ہوگیا ہے کہ اس بیت العلوم کا وجود، جہانتک

مالی امداد و تقویت سے تعلق ہو نظام الملک کے بذل و احسان کا شرمندہ ہو۔ لیکن انصافاً دیکھیے تو اُس کے بانی مبانی حضرت شیخ الشیوخ ابوسعد صوفی نیشاپوری ہین۔ مولوی محمد عبدالرزاق صاحب فرماتے ہین کہ

ایسا روشن خیال اور مدبر وزیر ملک کی فلاح و بہبود سے کبھی غافل نہین رہ سکتا ہو کیونکہ ملک اور قوم مین ترقی، فارغ البالی اور عزت کا ذریعہ صرف اعلیٰ تعلیم و تربیت ہو اور عام تعلیم بغیر ایک قومی بیت العلوم کے محال ہو۔ اس خیال سے خواجہ نظام الملک نے بڑے پیمانہ پر ایک درسگاہ بنانے کا قصد کیا تھا۔

لیکن اس کے آگے جو کچھ لکھا گیا ہو اُس سے ہمارے خیال کی تصدیق ہوتی ہے:۔

اور اس ارادہ کی تحریک یون ہوئی کہ ایک دن شیخ الشیوخ ابوسعد صوفی نیشاپوری خواجہ سے ملنے آئے اور کہا کہ آپ کے نام سے مدینۃ السلام مین ایک مدرسہ تعمیر کرنا چاہتا ہون جس کے ذریعے سے آپ کا نام قیامت تک زندہ رہیگا۔ خواجہ نے کہا بہت خوب آپ ضرور بنائیے چنانچہ خواجہ نے فراہمی سامان کے لیے اپنے وکلا کو اُسی وقت حکم دیدیا اور شیخ نے دجلہ کے کنارے ایک خوبصورت قطعہ اراضی خرید کیا اور بروز منگل مہینہ ذیقعدہ ۴۵۷ھ مطابق ۴۔ اکتوبر ۱۰۶۵ء مدرسہ کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور پورے دو سال کی مدت مین ماہ ذیقعدہ ۴۵۹ھ (ستمبر ۱۰۶۷ء) عمارت مدرسہ بنکر مکمل ہوگئی۔ شیخ ابوسعد نے عمارت پر خواجہ نظام الملک کا نام نقش کیا۔۔۔۔۔۔"

اس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہو کہ اس کے بانی مبانی فی الحقیقت شیخ ابوسعد صوفی تھے۔ ضرورت تھی کہ اس مسئلہ کو مولوی محمد عبدالرزاق صاحب کسی قدر وضاحت سے قلمبند فرماتے۔

ایک نقص "نظام الملک طوسی" مین اور بھی ہو جسکی طرف ہم حضرت مولف کو متوجہ کرنا چاہتے ہین اور وہ یہ ہو کہ بعض غیر ضروری یا نسبتاً کم ضروری باتون کو خواہ مخواہ طوالت دیکر کتاب کو ضخیم بنانیکی کوشش کیگئی ہو۔ فٹ نوٹ تو جسقدر اور جس حد تک لکھے گئے ہین وہ کارآمد ہین اور اُن کا شمول از بس ضروری تھا لیکن فارسی نثر کے بعض انتخابات کا معہ ترجمہ درج کرنا تحصیل حاصل سے زیادہ نہین ہوا۔ اسیطرح نظام الملک کے حادثۂ وفات پر جن شعرائے فارسی نوحے اور مرثیئے لکھے تھے اُن کا بجنسہ نقل کردینا چندان ضروری نہ تھا۔ یہ عجیب بات ہو کہ ناظر کتاب کی قابلیت پر بھروسہ نہ کرکے بغرض تفہیم مطالب فارسی نثر کا ترجمہ تو کرنا لابد سمجھا گیا۔ لیکن یہ خیال نہ کیا گیا جو لوگ سلیس نثر فارسی نہ سمجھ سکتے ہون اُنکے لیے فارسی نظم کیا دلچسپ ہوسکے گی۔

بہرکیف اِن دو ایک معمولی فروگذاشتون کے علاوہ اور کوئی اہم نقص اس کتاب مین نہین پایا جاتا اور یہ فروگذاشتین ایسی ہین جنکا انسداد آئندہ ایڈیشن مین ہوسکتا ہو۔ بحالت موجودہ بھی ہر ایک اہل علم کو قدردانی کا اظہار کرنا چاہیئے[۱]۔

(۲) تذکرہ ہزار داستان

المعروف بہ

خمخانۂ جاوید

لالہ سری رام صاحب ایم۔ اے منصف دہلوی نے چند سال ہوئے اپنے تذکرۂ شعرا معروف بہ خمخانۂ جاوید کی پہلی جلد شائع کی تھی۔ افسوس ہو کہ علالت مزاج کے باعث اِس سلسلے کی دوسری جلدین جلد نہ چھپ سکین ورنہ اس چار پانچ برس مین لالہ صاحب نے تذکرے کی تکمیل یقیناً کردی ہوتی۔ جیسا کہ عرض کیا گیا پہلی جلد کچھ عرصہ پیشتر نکل چکی تھی اور اب ہمین جلد دوم بغرض ریویو موصول ہوئی ہو

[۱] "نظام الملک طوسی" کے ملنے کا پتہ:۔ مولوی محمد عبدالرزاق صاحب مصنف البرامکہ۔ محلہ پیچ باغ۔ شہر کانپور۔ قیمت ۔ عہ

جو وسط ۱۹۱۲ء مین شائع ہوئی ہی- چونکہ دونون جلدین ایک ہی سلک مین منسلک ہین اس لیے ہم اظہار رائے کا دائرہ محض دوسری جلد تک محدود نہ رکھین گے کیونکہ بہت سی دلچسپ معلومات، جنکا اعادہ اس جگہ کیا جانا ضروری ہوگا، جلد اول سے تعلق رکھتی ہین-

جلد اول کی اشاعت کے موقع پر ملک کے تمام نامور اخبارات و رسائل نے ریویو اور تنقید کے ذریعے یہ امر پبلک کے ذہن نشین کر دیا تھا کہ لالہ صاحب نے جس تذکرہ کا آغاز کیا ہی اسکی تکمیل مین اُنھین سخت جانکاہی و جانفشانی سے کام لینے کے علاوہ مالی اخراجات کا بھی کسی درجہ متحمل ہونا پڑا ہی حقیقت حال بھی یہی ہی کہ حضرت مولف نے اسکی تکمیل و ترتیب مین اپنے جانب سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہین کیا، اور سالہا سال کی محنت و مشقت کے بعد اسے موجودہ صورت مین لائے ہین- اِس قسم کی کتابین معمولی غور و خوض سے اتمام کو نہین پہنچتین بلکہ اِن کے لیے خونِ جگر کھانا پڑتا ہی- نیند حرام ہو جاتی ہی راحت و آرام کا خیال تک نہین رہتا، تلاش اور جستجو مین سرگرم رہنا پڑتا ہی، کتابون کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہی، اور کوئی شک نہین کہ لالہ سریرام صاحب نے یہ تمام مصیبتین برداشت کی ہین تب دریائے مقصود سے یہ درِ شاہوار ہاتھ آیا ہی- چونکہ علمی دُنیا کا ہمین کسی حد تک تجربہ ضرور ہی اسلیے جب ہم نے لالہ صاحب موصوف کے ایک پرائیویٹ خط مین یہ فقرے لکھے دیکھے کہ

بجائے کسی قسم کے مالی فائدے کے مین نے اپنی صحت اس پر سے نثار کر دی اور کم از کم بیس ہزار روپیہ اس شوق کی نذر کیا

تو ہمین کچھ بھی استعجاب نہین ہوا- اس کے ساتھ ہی لالہ صاحب کی علم دوستی اور مستقل مزاجی کا ضرور معترف ہونا پڑا اور اُن کی یہ صفات ایسی ہین جنکا اقرار تمام علمی حلقون مین اِس سے بہت پیشتر کیا جا چکا ہے-

لالہ سریرام صاحب کو جیسا کہ دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہی، اساتذہٗ اُردو کے کلام اور حالات کی فراہمی کا شوق اُس وقت سے تھا جبکہ آپ کالج مین تعلیم پاتے تھے- اُسی کے پہلو بہ پہلو یہ تحریک بھی دل مین پیدا ہوئی کہ یہ تمام حالات یکجا کر کے ایک جامع تذکرہ کی شکل مین ترتیب دئے جائین چنانچہ سترہ سال کی محنت و سعی کے بعد آپ نے جلد اول شائع کی اور اُس کے تین سال بعد جلد دوم- جلد اول مین صرف الف اور ب کی ردیف اور جلد دوم مین پ سے ح تک کی ردیف ختم ہوئی ہی- اس طریقے سے آپ کا ارادہ ہی کہ مکمّل تذکرہ پانچ جلدون مین منقسم ہوگا- خدا کرے بقیہ تین جلدین جلد تر اشاعت پذیر ہون- ہم اِس جگہ نہایت قلق کے ساتھ ظاہر کرنا چاہتے ہین کہ لالہ صاحب کا مزاج نصیب اعدا کچھ زمانہ سے علیل ہی اور اسی وجہ سے آپ کے علمی مشاغل کا وہ عالم نہین رہنے پایا- بہی خواہان ادب اُردو کی دُعائین اُن کے ساتھ ہونی چاہئین کہ وہ صحت پا کر اِس علمی و قومی خدمت کی تکمیل کر سکین-

اسوقت تک اُردو شعرا کے کئی تذکرے لکھے جا چکے ہین اور بعض اُنمین سے تاریخی عظمت رکھتے ہین- لیکن اُنمین سے بعض تو ناپید ہین اور اکثر کی حالت یہ ہی کہ قلت معلومات کی وجہ سے متلاشی کی تشفی نہین کر سکتے- بعض تذکرونمین ہجو و مذمت کا بازار اسقدر گرم کیا گیا ہی کہ جو کچھ خوبیان بھی اُنمین ہین وہ نظر انداز کر دینے کے قابل ہین- مولوی محمد حسین آزاد کی معرکۃ الآرا کتاب آبِ حیات اُصولاً نہ صرف ہر پہلو سے خالی از سقم ہی بلکہ وہ مذاق موجودہ کے موافق بھی ہی لیکن اُسمین سوائے خاص الخاص اُستادون کے اور کسی کیلئے جگہ نہین نکل سکی- ان تمام حالات پر نظر کرنے کے بعد بے تامل کہنا پڑتا ہی کہ لالہ سریرام صاحب کا تذکرہ جامعیت کے لحاظ سے واقعی "ہزار داستان" ہے-

خمخانۂ جاوید مین بڑی خوبی کی بات ایک یہ ہی کہ حتی الوسع اسے ہر شخص کے مذاق کے مطابق بنانے مین کوئی بات اُٹھا نہین رکھی گئی شاعر کے حالات حتی الوسع مفصل لکھے گئے ہین بعض مقامات پر حسب ضرورت روایت و درایت سے اُنکی جرح و تعدیل بھی کیگئی ہے۔

نامور شعراء کے کلامون کی تنقید منصفانہ اور مہذبانہ انداز مین دکھائی گئی ہی جن اساتذہ کے متعلق لوگونمین اختلاف آرا ہی، وہان لالہ صاحب نے دونون قسم کی رائین درج کرنے کے بعد اپنا ذاتی خیال بھی نہایت صفائی سے بتادیا ہی۔ شہرت و ناموری، شخصیت خصوصیت لحاظ، مروت، کوئی بات بھی آپ کو سچ کہنے سے روک نہین سکی مثلاً مولانا حالی کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہین :-

آپ نے مقدمۂ دیوان مین جو شعر و شاعری پر بحث لکھی ہی اور اساتذہ عرب و یورپ کا موقع موقع سے مقابلہ حال وخیالات اور شعر کے اثر کی کیفیت لکھی ہی وہ دیکھنے سے متعلق ہی۔ کمی ہی تو صرف یہ کہ اُم الالسنہ سنسکرت کے مشاہیر شعراء اور اُن کے یادگار کارنامون کا ذکر نہین کیا جسکا غالباً یہ سبب ہی کہ حضرت کو سنسکرت کی معلومات سے استفادہ حاصل کرنے کا موقع نہین ملا۔

اقبال کی نسبت لکھتے ہین :-

آپ کے کلام مین ایک کمی ضرور ہی وہ یہ کہ کہین کہین خلاف محاورہ و روزمرہ اہل زبان الفاظ نظم کر جاتے ہین۔

جلیل کے بارے مین آپ کی رائے ہی :-

اگرچہ ان کے اکثر اشعار رعایت لفظی اور محاورہ بندی سے باہر نہین ہوتے مگر بندش کی چستی اور بیان کی سلاست اُس ناطبوع رنگ کو نہایت دلچسپ بنادیتی ہی اور بے اختیار منھ سے تعریف نکلتی ہی۔

یہ آراء ممکن ہی کہ بعض حلقون مین اطمینان کی نظر سے نہ دیکھی جائین لیکن بلاشبہہ یہ رائین نیک نیتی اور انصاف کے ساتھ ظاہر کیگئی ہین۔

شاعرون کے حالات کی فراہمی کوئی آسان کام نہین لیکن لالہ سری رام صاحب نے کمال جانفشانی سے اِس مشکل کو حل کیا ہے۔ واجد علی شاہ اختر، ارشد گورگانی، ادیب دہلوی، الکزنڈر ہیڈرلی آزاد، انور دہلوی، ان کے مفصل حالات بالعموم ہر ایک کے لیے دستیاب ہونا ممکن نہین لیکن لالہ صاحب نے جس طریقے سے انکے تفصیلی سوانح بہم پہنچا کر تذکرہ کی زینت بڑھائی ہی وہ لائق داد ہی لسان العصر اکبر، مولینا شہری، اقبال، چکبست لکھنوی بجا طور پر دور جدید کے شاعر کہے جاسکتے ہین۔ ان کے حالات بھی نہایت دلچسپی کے ساتھ قلمبند کیے گئے ہین۔ اچھا ہوتا اگر حضرت اقبال کی مستقل نظمون کا اقتباس بھی درج کیا جاتا۔ مولانا حالی کی غزلون کے انتخاب سے بھی گویا اُن کی شاعری کا ایک رُخ دکھلانے کی سعی کیگئی ہے، اور یہ گویا ایک اہم نقص ہے۔

شعراء کے کلام کا نمونہ جو درج کیا گیا ہی اُسکو دیکھکر لالہ صاحب کے نظر انتخاب کا قائل ہونا پڑتا ہی۔ یہ ضرور ہی کہ مقررہ معیار سے وہ بعض اوقات ہٹ گئے ہین تاہم مجموعی حیثیت سے نکتہ چینی کی گنجائش اُسمین بہت کم ہے۔

ایک بات البتہ تعجب خیز ہے کہ جہان بہت سے معمولی شعراء کے لیے "ہزار داستان" کے صفحات مین جگہ نکالی گئی ہی وہان دو چار ایسے سخنگو رہ بھی گئے ہین جنکا شمول تذکرہ کی تکمیل کے لیے ازبس ضروری تھا مثلاً سید فضل الحسن حسرت موہانی، جو زمانہ جدید کے شاعرون مین با نمود آدمی ہین اور جنکی لٹریری خدمات بھی قدر افزائی کی بہر طور مستحق تھین۔ اسیطرح خواجہ احسن اللہ خان ثاقب قندہاری کا نام بھی اِس کتاب سے خارج ہی۔ حسرت موہانی نے اپنے رسالہ اُردوئے معلی مین "خمخانۂ جاوید جلد اول" پر ریویو لکھتے ہوئے یہ شبہہ ظاہر کیا تھا کہ جلد دوم مین بعض ذاتی اختلافات کی بنا پر ثاقب کا نام

عمداً نہین رکھا گیا۔ اُسوقت تک دوسری جلد شائع نہوئی تھی لیکن اب اُن کے بیان کی تصدیق ہوتی ہی۔ کہین اسی "افشاے راز" کے جرم مین جناب حسرت شعرا کی پنچایت سے خود بھی خارج کردیئے گئے ہون۔ اگر واقعی یہ فروگذاشتین عمداً روا رکھی گئی ہین تو ہمین بیحد افسوس ہوگا کیونکہ یہ فعل تذکرہ نگاری کے اُصول کے بالکل مخالف ہی[۵]

(۳) تاریخ پالن پور

کسی نکتہ رس مورخ نے فخرآمیز لہجہ مین لکھا ہی کہ یونان کا خطہ تاریخی واقعات کا معدن ہی۔ لاکلام اسکی صداقت مسلم ہی لیکن یہی مقولہ ہندوستان کے متعلق بھی باحسن الوجوہ دُہرایا جاسکتا ہی اور انصافاً دیکھیئے کہ اُن عظیم الشان اور دیر اثر واقعات کے اعتبار سے جو اس سر زمین مین وقتاً فوقتاً رونما ہوے اور اُس تاریخی عظمت کے لحاظ سے جو ہند کے ایک ایک حصہ کو حاصل ہی یہ ملک یونان پر ترجیح فایقہ پانے کا مستحق اور جائز مستحق کہانتک نہین ہی۔ ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کوئی مقام ایسا نہین جو کسی خاص شکل وصورت مین قابل ذکر نہو۔ آب وہوا، پیداوار، رسم واعتقادات سے جنکی گوناگونی بجائے خود مستقل دلچسپی کی چیز ہوسکتی ہی اگر قطع نظر بھی کی جائے تاہم تاریخی حیثیت سے بھی یہان کا ایک ایک چپہ، جداگانہ اور غیرمشترک شہرت کا دعویدار ہی۔ مختلف بیرونی اقوام نے یہان آکر صدہا سال تک حکومت کی، اُن کے اخلاف جو امتداد زمانہ سے یہین کے باشندے سمجھے جانے لگے، ایک مدت تک تخت سلطنت پر براجمان رہے، ایک ایک صوبہ مین کئی کئی خود مختار سلطنتین قائم ہوئین، جن کے سیاسی وتمدنی کارنامے ایک دوسرے سے مختلف الحیثیت مگر یکسان طور پر باعظمت تھے مختصر یہ کہ اگر ہندوستان کی کوئی مبسوط تاریخ لکھی جائے اور اسمین قطاع ہند کے مفصل حالات درج کرنیکی کوشش کیجائے تاہم یہ ناممکن الوقوع امر ہوگا کہ اُسمین تکمیل کا رنگ ہر پہلو سے ظاہر ہوسکے۔ مولٰنا ذکاءاللہ مرحوم کی ضخیم وجسیم تاریخ ہند کا سلسلہ ہرصورت سے بیش قیمت چیز ہی اور ادبی خوبی کے لحاظ سے بھی اپنی نظیر آپ ہی لیکن اگر ناظر کتاب اُس سے ہر خطہ کے تاریخی، جغرافیائی، تمدنی، معاشرتی، اور اسی قبیل کی دوسری تفصیل دریافت کرنا چاہے تو یقیناً ناکامیابی ہوگی اصل یہ ہی کہ جبتک ہر حصہ ملک کی جُداگانہ تاریخ نہ لکھی جائے اِن وسیع معلومات کا کسی ایک کتاب سے بہم پہنچانا دشوار ہوگا۔ اِسی اعتبار سے ہمکو مولوی سید گلاب میان صاحب کا خصوصیت سے ممنون ہونا چاہیئے کہ اُنھون نے ریاست پالن پور جہان اُن کو میر منشی ریاست کا عہدہ تفویض ہی، اُسکی جُداگانہ اور علیحدہ تاریخ لکھکر پبلک کو ریاست کے ہرقسم کے حالات وکوائف سے مطلع ہونے کا موقع دیا۔

ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی ریاستون مین اکثر ایسی بھی ہین جو از یاد رفتہ سلاطین کی معنوی جانشین کہے جانیکا استحقاق رکھتی ہین۔ ممالک متوسط مین بہت سی ریاستین رقبہ، آبادی اور اختیارا کے رو سے چندان قابل وقعت نہین سمجھی جاتین مگر اُن کے حدود کے اندر قدیم یادگارون کا قابل قدر وجود پایا جاتا ہی یا اُن کی تاریخی روایات اُن کی عظمت کی کفالت کر رہی ہین۔ ریاست پالن پور کا شمار بھی اسی سلسلہ مین آسکتا ہی جہان کے حکمران ایک زمانہ سے ملکی اور قومی خدمتین انجام دیتے چلے آرہے ہین ریاست موصوفہ کی قدامت کا حال صرف اِس سے ظاہر

---

۵ ملنے کا پتہ :۔ منیجر دفتر خمخانۂ جاوید۔ نئی سڑک دہلی یا دفتر العصر لکھنؤ

قیمت جلد اول مجلد قسم اول صہ
؍ ؍ ؍ دوم للعہ
؍ ؍ بلا جلد سہ ۱۲ر

قیمت جلد دوم مجلد قسم اول۔ للعہ
؍ ؍ ؍ ؍ دوم سہ ۸ر
؍ ؍ غیر مجلد عا ۱۲ر

ہوسکتا ہی کہ یہ ریاست سلطنت مغلیہ سے کئی صدی پہلے کی ہی اِس طرح سیکڑون سال کے اہم واقعات اور مہتم بالشان انقلابات کا اِس سرزمین سے تعلق قدرتی طور پر ہونا چاہیئے اور مولوی سید گلاب میان کی اِس تالیف کے مطالعہ سے عجیب وغریب تاریخی حالات کا انکشاف ہوتا ہے۔

"تاریخ پالن پور" جو نفاست ظاہری کے اعتبار سے ایک بے مثل کتاب ہی، مضامین اور ترتیب مضامین دونون اعتبار سے قطعاً بے عیب ہے۔ تاریخ کا "میٹریل" مولوی سید گلاب میان کے اُستاد اور خالو مولانا مولوی سید رحمت میان صاحب مرحوم کا جمع کیا ہوا تھا۔ سید مغفور کے حالات جو تاریخ کے شروع مین قلمبند کیئے گئے ہین دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ ذاتی قابلیت اور پُراثر شخصیت کے لحاظ سے وہ بے مثل تھے۔ مرحوم کی خواہش تھی کہ پالن پور کی تاریخ مدون کر کے اپنی ایک اور علمی یادگار قائم کرین لیکن قضا نے اُنھین مہلت نہ دی اور ابھی وہ بکھرے ہوے موتی، جنکو اکٹھا کر چکے تھے، لڑی مین پروے بھی نہ جانے پائے تھے کہ اُن کا انتقال ہوگیا۔ مولوی سید گلاب میان کو خدائے عظیم اجر دے کہ انھون نے منتشر مسودات کی مدد اور اپنی ذاتی جانفشانی سے اُس کام کو پورا کیا ورنہ حسرتِ تکمیل مرحوم کو قبر مین بھی چین سے نہ رہنے دیتی۔

تقسیم مضامین کی تشریح ہم مولوی سید گلاب میان کے الفاظ مین بیان کرین گے:۔

> تاریخ پالن پور کی تقسیم ایک مقدمہ اور تین جلدون مین کیگئی ہی مقدمہ مین مطالب تاریخ کی توضیح ہی۔ اور تینون جلدون کی تخصیص یہ ہی کہ پہلی جلد مین صرف اُن فرمانروایان خاندان لوحانی کا تذکرہ ہی جنھون سے اکثر نے جالور پر اور بعض نے جالور اور پالن پور دونون پر حکومت کی ہی۔ دوسری جلد مین فقط اُن رئیسون کا ذکر ہی جو جالور پر سے قبضہ اُٹھ جانے کے بعد پالن پور ہی پر فرمانروا رہے ہین اور تیسری جلد ہز ہائنس فرمانروائے حال خلد اللہ ملکہم کے حالات مین ہی۔ اِس تیسری جلد کے دو حصے کیئے گئے ہین۔ ایک مین ہز ہائنس کی لائف اور نظم ونسق ریاست کی صورت دکھائی ہی اور دوسرے حصہ مین جغرافیہ اور حالات متفرقہ وغیرہ کا بیان ہی۔

عام طور پر یہ گمان ہوسکتا ہی کہ ایک اسلامی ریاست کی تاریخ صرف اہل اسلام کی دلچسپی کا ذریعہ بن سکتی ہی لیکن ہم بلاخوف تردید کہنا چاہتے ہین کہ تاریخ پالن پور کے قیمتی صفحے جن وافر معلومات سے لبریز ہین اُن کی دلچسپی کسی خاص فرقہ تک محدود نہین۔ قدیم تاریخ کا جسقدر حصہ ہی اُس کا مطالعہ کسی کیلئے بیکار نہین ہوگا۔ اِسی طرح، معاشرت، تمدن، علوم وفنون، وغیرہ کے مباحث ہر ایک کیلئے بلاتفریق یکسان سودمند ہین۔ علاوہ اُن حالات کے جنکا تعلق براہ راست ریاست سے ہوسکتا ہی اور بہت سے مضامین بھی اِس قسم کے ضمناً شریک کتاب کیئے گئے ہین جنپر عبور کرنا خالی از فائدہ نہین ہوسکتا۔ مثلاً افغانون اور پٹھانون کی نسبی تحقیقات، یا سید محمد جونپوری کے مشرح حالات۔ غالباً مہدی جونپوری کے اتنے تفصیلی واقعات اور کسی اُردو کتاب مین یکجا نہین مل سکتے۔ اِس کتاب کے مطالعہ سے اسبات کا کافی ثبوت ملتا ہی کہ مولف اُن اُصول سے اچھی طرح واقف ہین جو آجکل تاریخ نویسی کی بنیاد سمجھے جاتے ہین۔ جہان ملکی واقعات و انقلابات کی تصویر کھینچی گئی ہی وہان عقاید، رسوم، طرز زندگی وغیرہ پر بھی کافی سے زیادہ روشنی ڈالی ہی۔ جغرافیائی حالات بھی اپنی جگہ کتاب کا ضروری جزو بنے ہوئے ہین۔ اور یہ تمام خوبیان بغیر نہایت سخت محنت و جانکاہی کے نہین پیدا ہوسکین۔

واقعات کی صحت کا التزام بھی، یقیناً غیر معمولی کیا گیا ہے۔ مولف صاحب خود تحریر فرماتے ہین:۔

...... لیکن پھر بھی مین نے اس تاریخ مین جو کچھ لکھا ہو حتی الامکان وثوق کے ساتھ لکھا ہو جبتک کسی چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کی نسبت بھی مجکو کم از کم دو مختلف روایتون یا دو مختلف طریقون سے صحت کا یقین نہین ہوگیا مین نے اُسکے لکھنے کی جرأت نہین کی اور جہان کہین ذرا سا بھی اختلاف نظر آیا دونون مختلف صورتین بجنسہ نقل کرکے بعض بعض موقعون پر اپنی رائے کا بھی اظہار کردیا ہے۔

جن مشہور و معروف تاریخون کی امداد سے "تاریخ پالن پور" مدوّن ہوئی ہین اُنمین سے چند یہ ہین طبقاتِ اکبری، آئین اکبری، اکبر نامہ، منتخب التواریخ بدایونی، تزکِ جہانگیری، تاریخ ٹاڈ راجستان، کتاب عہدنامجات، لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ قابل مولف نے صرف انھین چند تاریخون کی ورق گردانی سے کام نکالا ہو بلکہ حقیقت یہ ہو کہ اُنھون نے متاع نیک ہر دکان کہ باشد کے اُصول پر عمل کیا ہو اور جہان سے اور جس طریقے سے جو کچھ ملا ہو اُس سے حسب ضرورت استفادہ کیا ہو۔ یہانتک کہ مقامی گیتون، مشہور قصّون اور روایتون اور ہندی اشعار کی مدد سے بھی اکثر واقعات و حالات کا استنباط کیا گیا ہو۔ یہ اعتراض ہوسکتا ہو کہ کبیشون کی روایات قابل اعتبار نہین، لیکن اگر مورخ وسیع النظر ہو تو ان کی ہذیان سرائیون سے بہت کچھ سچی باتین بھی پیدا ہوسکتی ہین کیونکہ بھاٹ اور کبیشر کے دوہرے اور اشعار کسی خاص اور صحیح واقعہ پر مبنی ضرور ہوتے ہین اور اسی اعتبار سے انھین ہندوستان کے قدیم مورخ کہا جاتا ہو۔

تاریخ پالن پور کی دو خصوصیات ایسی ہین جنکی تعریف خواہ مخواہ کرنی پڑتی ہو۔ ایک حسن ترتیب دوسرے حسن بیان۔ یہ دونون خوبیان ملکر سونے مین سوہاگے کا کام کرگئی ہین۔ مضامین کی ترتیب اِس اسلوب سے رکھی گئی ہو کہ آپ صفحے کے صفحے پڑھتے جایئے کہین ذہن مین اُلجھن نہ پیدا ہوگی۔ پھر کتاب کی زبان ایسی پاکیزہ و شُستہ ہو کہ باید و شاید۔ بعض مقامات پر انشاپردازی کا رنگ پیدا ہوگیا ہو مثلاً تیسری جلد کے دیباچہ مین "عرض حال" کے عنوان سے رقمطراز ہین:۔

جب مین نے عالم وجود مین قدم رکھا ہو اور ماں کی گود مین پڑے پڑے اپنی ناسمجھ آنکھون سے دُنیا کے تھیٹر کی سیر کی ہو تو کوئی یہ کہ سکتا ہو کہ مین نے کیا ادراک کیا ہوگا؟ کچھ نہین۔ ہان جب ماں کی آغوش محبت سے نکلکر ڈانواں ڈول دُنیا کے ہنڈولے مین خود بخود گردش کرنے لگا تو میری آنکھون نے گونگے کے خواب کیطرح بہت سے دلچسپ واقعات دیکھے مگر میری ذہنی قوت نے، قوتِ مدرکہ صحیحہ کے پیدا ہونے تک اسکو بھی حافظہ کی صندوق مین رکھکر محفوظ کردیا اور جب سن تمیز کے میدان مین آکر علم کی عینک لگائی تو سب تماشے ایک طرف، اپنے آپ کو مختلف حقوق مین گھرا پایا۔ پہلا حق تو والدین کا دکھائی دیا جنکی ماتا بھری گود مدتون میری عمر کا پیمانہ رہی ہو اور جنھون نے برسون اپنے کلیجے کے خون کی بتیس دھارین پلا پلا کر مجکو پالا ہو، اور دوسرا حق اُس ولی نعمت کا محسوس ہوا جس کا سرپرست ہاتھ میرے اور میرے خاندان کے رزق کا چمچہ ہے۔ ۔ ۔ ۔

اِسیطرح متعدد مقامات پر سید گلاب میان صاحب نے اپنی سحر بیانی کا ثبوت دیا ہو۔ کتاب کی معمولی حالت باعتبار زبان کے یہ ہو کہ طبیعت کبھی اُس کے پڑھنے سے سیر نہین ہوسکتی تاریخی واقعات کے بیان کرنے کیلئے ایک خاص طرزِ تحریر کی ضرورت ہوتی ہو جسکی متانت، صفائی، اور پختگی پڑھنے والے کے قلوب پر نمایان اثر ڈال سکے۔ ہم حضرت مولف کو نہایت گرمجوشی سے مبارکباد دیتے ہین کہ اِس باب مین بھی اُن کی کوششین مشکور ہوئی ہین۔

واقعہ نگاری مین بھی جس حد تک، متانت اور ثقاہت کو دخل دیا گیا ہو وہ قابل تعریف ہو۔ تاریخ کا آخری حصہ فرمانروے حال کے سوانح سے متعلق ہو لیکن مولف نے اس دور کے واقعات بھی کچھ ایسے سلجھے ہوئے الفاظ مین بیان کیئے ہین کہ مبالغہ اور غلو کا شائبہ تک نظر نہین آتا اور یہ کچھ کم خوبی کی بات نہین ہو۔

مولوی سید گلاب میان، ملک کے جانب سے مبارکباد دینے کے مستحق ہین کہ اُنھون نے اپنی نادر تالیف کو ہر پہلو سے سنوارنے اور درست کرنے مین کوئی دقیقہ اُٹھا نہین رکھا باطنی خوبیون کے ماسوا ظاہری محاسن کی کمی نہین۔ چھپائی لکھائی اور کاغذ وغیرہ کا جو اہتمام کیا گیا ہو وہ بہر نوع آفرین کے لائق ہو۔ فرمانروایان پالن پور کے مرقع، تجار و پیشہ ور کاروباری لوگون کے گروپ، اماکن و محلات کی تصاویر، ان سب سے کتاب کی رونق کئی گنا بڑھ گئی ہو، اور انہین سے بعض اس خیال سے اور بھی قابل قدر ہین کہ وہ قدیم صناعی کے نمونہ کی حیثیت سے بے کم و کاست ہاف ٹون سے چھپوا کر شامل کتاب کر دیگئی ہین۔

آخر کتاب مین بعض مشاہیر اہل قلم کی تقاریظ کا حصہ ہو مثلاً مولنا شرر، مولوی عزیز مرزا مرحوم، صاحبزادہ آفتاب احمد خان، نواب حاجی اسمٰعیل خان، مسٹر شاکر میرٹھی، وغیرہم، اور ان سب مین تبصرہ نگاری کا حق ادا کرتے ہوے مولف کی محنت جانفشانی کی داد دیگئی ہو۔ ہمین اُمید ہو کہ عام طور پر اِس تاریخ کی قدردانی ہوگی جو کتب خانہ اس سے خالی رہے گا اُسکی بدقسمتی کا مزید ثبوت ہم پہنچانیکی کوئی ضرورت نہین۔

سید القلم

العصر کا خیر مقدم

(۱)

گلزار مین اب فصلِ بہار آئی ہو ... پیغام نسیم جان فزا لائی ہو
پھر مردہ دلون مین روح تازہ آئی ... شاکر کا یہ اعجاز مسیحائی ہو

العصر کے کیون نہون اڈیٹر شاکر ... ہین اہل سخن مین سب سے بہتر شاکر
کیون نہ ہو قدردان زمانہ اُن کا ... ہین عاقل و نکتہ دان سخنور شاکر

العصر ہے گنج شائیگان اُردو ... اب ہوگی ترقی زبانِ اُردو
ہے چشمۂ فیض طبع شاکر جاری ... ہوگا شاداب گلستانِ اُردو

ہے بزم سخن کے لیئے زیبا العصر ... بیمثل ہے اُردو کا رسالہ العصر
ہین جوش طرب سے دلکی کلیان خندان ... پیغام سرور عیش لایا العصر

اوج گیاوی

(۲)

اب علم ادب کی رُستگاری دیکھو ... باغ اُردو کی آبیاری دیکھو
اخلاقی و تاریخی مضامین کے لیے ... العصر رسالہ ہوا جاری دیکھو

تسکین ہی علاج۔ طبع برہم کے لیے ... اور صبح وصال ہے شب غم کے لیے
العصر کو ہمدردی جو ہمسے ہو تو پھر ... ہم ہین تیار خیر مقدم کے لیے

اُردو کی ترقی مین جو کچھ ڈھیل ہوئی ... اخلاق و ادب کی جو نہ تعمیل ہوئی
جو کچھ گذری۔ گذر گئی لیکن اب ... العصر سے ہر کمی کی تکمیل ہوئی

صبر دہلوی

نمازِ عشق

اےدل تو کیون فداے رہِ سوزوساز ہی؟   کیون تو رہینِ لذّتِ دردوگداز ہی؟
پہلو مین چپکے چپکے تو ہی بیقرار کیون؟   درد نہان کی ٹھیس سے ہی اشکبار کیون؟
غم تجھکو کیون پسند ہی کسپر فدا ہی تو؟   ہر وقت آہ و درد مین کیون مبتلا ہی تو؟
دیکھون تو مین بھی صورتِ حیران کہان مجھے   کچھ تو فسانۂ غمِ پنہان سُنا مجھے
جسپر تو مر رہا ہی وہ نازآفرین ہی کون؟   دیتا ہی جسپہ جان وہ ایسا حسین ہی کون؟
کیا دیرِ برہمن کے بتون سے سوا ہی وہ؟   اعلیٰ تر از شہودِ رُخِ ماسوا ہی وہ؟
کِسکی ستائشون مین تو محوِ خیال ہی؟   کیا آرزوے ذوقِ حصول کمال ہی؟
ہر ذی حیات جس کے لیے دردمند ہی؟   کیا تو اُسی کے سوز مین مثل سپند ہی؟
ہان ہی اُسی حسین کی اگر جستجو تجھے   خونِ جگر سے چاہیے کرنا وضو تجھے؟

دیر و حرم سے بڑھکے ہی شانِ نیازِ عشق
حاصل کائنات ہی ذوق نمازِ عشق

آئی نظر مین حسن کی جب سے ادا مجھے   ایک ایک برگِ خشک بھی ہی خوشنما مجھے
ایسا جما ہی رنگ جمالِ نگار کا   ہر چیز آرہی ہے نظر دلربا مجھے
اے عشق جب سے تونے دکھایا ہی حسن یار   ہونا پڑا ہی سارے جہان پر فدا مجھے
تیری فضا مین تیر رہی ہی یہ کائنات   کون و مکان سے آئی ہی تیری صدا مجھے
سجدے کرائے تونے حرم مین ہزار ہا   ق   تو لے گیا ہی دیر مین بھی بار ہا مجھے
مِٹ مِٹ کے مین بنا ہون یہان تک ہزار بار   ہر بار عاشقی نے کیا ہے جلا مجھے
کھو دی ہی مین نے عمر غمِ عشق مین حمید   اب آکے کیا ستائیگی فکرِ فنا مجھے
بلبل کو گل نے دی ہین اگر سینہ سوزیان   حسنِ ازل نے سوزِ ابد دیدیا مجھے
موسیٰ نہ کوہِ طور کا قصہ سنائین اب   ہر ذرہ وقت دید ہی برقِ بلا مجھے
حیرت مین ہون مین جلوۂ دلدار دیکھکر   اے ذوقِ دیدِ یار یہ کیا ہوگیا مجھے

بخشا ہی ہوش جلوۂ حسنِ قدیم نے
دے ڈالی ہی زبان مجھے اپنی کلیم نے

کیا مین کہون کہ کون ہی کیون بیقرار ہون   جانداده اداے جمالِ نگار ہون
سارا جہان ہی کوئے حرم میرے واسطے   مین زائرِ تجلّی رخسارِ یار ہون
ہر نقشِ پا نے مجھکو دکھائی ہی راہِ دوست   دیر و حرم کے راز کا مین رازدار ہون
دل ہی مقامِ یار تو کیسی تلاشِ دوست   مین لامکان کے رمز سے بھی ہوشیار ہون
پیشِ نگاہِ یار رقعود و قیام کیا   ہر وقت مین سجود مین ہی کیون بیقرار ہون
روتا ہون دیکھ دیکھ کے اک شے کو ہر جگہ   مین خندۂ نہان کے لیے اشکبار ہون
اس بیخودی دل پہ بھی رہتا ہون ہوشیار   امیدوارِ رحمتِ پروردگار ہون
ہی انکسارِ روح تو رکنِ نمازِ عشق   کیا کہ رہا ہی شیخ کہ شب زندہ دار ہون
پنہان ہی عاشقی مین حیاتِ ابد کا راز   کیون مین اسیرِ گردشِ لیل و نہار ہون

جو شے حمید جلوہ نما ہر مکان مین ہی
وہ بند ہاے اسیرِ دلِ ناتوان مین ہی

حمید کوٹلوی

لڑکپن اور بےفکری

آج رنگِ خامۂ نیرنگ افزا دیکھیے   سحر پردازیِ فکرِ نکتہ پیرا دیکھیے
صورتِ الفاظ مین معنی کا تماشا دیکھیے   خوشنما تصویرِ فطرت کا یہ خاکا دیکھیے

سادہ دل سادہ طبیعت لاابالی صورتین
دو ہین البیلی نویلی بھولی بھالی صورتین

اِک بہت کم عمر اور اک اُس سے کچھ سن مین سوا   ایک پر رعنائی صدقے اک پہ زیبائی فدا
دونون پیاری پیاری شکلین ایک سے اک دلربا   اک حسین اک مہ جبین اک خوش ادا اک خوش لقا

چشم بد دور ان کی بچپن کی ادائین دیکھیے
پیار بھی خوش ہوکے لیتا ہی بلائین دیکھیے

سادگی اُس پر لڑکپن اور بےفکری کا رنگ   پھر کہان وہ دن کہان یہ سن کہان پھر یہ اُمنگ
جسم سانچے مین ڈھلے جنپر قبائین تنگ تنگ   قد وہ بوٹا سے کہ ہون سرو و صنوبر جن سے دنگ

چشم نرگس زلف سنبل لالہ رُخ غنچہ دہن

باغبانِ صنع کی گلکاریون کے دو چمن

اِک طرف گلدان مین سرسبز پودھے کی بہار   ہلکی ہلکی ٹہنیان اُس پر شگوفون کا نکھار
بھینی بھینی تازہ پھولونکی وہ بوئے خوشگوار   جس پر اِک نازک کلی کا اسقدر آیا ہے پیار

بے تکلف شاخِ گل کے لیکے بوسے ناز سے
بوئے گل پر ہو رہی ہے محو کس انداز سے

گل یہ کہتا ہے کہ صدقے تیرے اے رنگین عذار   کیا خبر تجھکو کہ ہے رنگِ چمن ناپائدار
تجھکو اندوہِ خزان ہے کچھ نہ پروائے بہار   کیا کہون تجھ سے جفائے انقلابِ روزگار

نذرِ صرصر سیکڑون گلہائے رنگین ہوگئے
دستۂ گل لاکھون وقفِ دستِ گلچین ہوگئے

اِک طرف شیشے مین ہے پریان سیمابی کا گھر   تک رہی ہے ٹکٹکی باندھے جسے اِک سیمبر
پتلیان پھرتی ہین شکلِ رشتۂ تارِ نظر   آتی ہین مڑ کر جدھر وہ یہ بھی مڑتی ہین اُدھر

کہتی ہین گویا زبانِ حال سے وہ بے زبان
قید مین ورنہ دکھاتے اپنی ہم اٹھکھیلیان

اب کہان ہے وہ موجِ دریا کی روانی ہے نصیب   اب کہان ہے بہتا ہوا شفاف پانی ہے نصیب
اب کہان ہے آزادیونکی زندگانی ہے نصیب   وہ فراغت کب؟ کہان وہ شادمانی ہے نصیب

بازوؤن مین زور شانون مین وہ ہمت ہی نہین
وہ فضا آبِ روان کی وہ وسعت ہی نہین

کیا کہین اِکدن شفق آزادِ زندان ہم بھی تھے   یعنی بیفکرِ غم و اندوہ و حرمان ہم بھی تھے
آشنائے بحرِ بے پایانِ عرفان ہم بھی تھے   قلزمِ توحید کے اِک دُرِّ غلطان ہم بھی تھے

سادگی کے سال آزادی کے سن کیا ہوگئے
بیغمی کی راتین بیفکری کے دن کیا ہوگئے

شفق عمادپوری

افسانۂ گل

دبالِ جان جو ہجومِ غمِ زمانہ ہوا   مین سیر کے لیے سوئے چمن روانہ ہوا
بہار پر تھا حسینانِ باغ کا جوبن   ہر ایک شاخِ گلِ تر بنی ہوئی تھی دلہن
بنا تھا رونقِ گلشن نکھار پھولونکا   لپٹ کے چومتی تھی منھ بہار پھولونکا
سمجھ گیا تھا یہ ہر پھول مین یگانہ ہون   قبولِ چشمِ جہان شاہدِ زمانہ ہون
مجھی سے رونقِ بزمِ نشاط و عشرت ہے   مجھی مین راحت و آرامِ جان ودیعت ہے
غرض تھے چرخ پہ اُس دم دماغ پھولونکے   بھڑک رہے تھے چمن مین چراغ پھولونکے
غرورِ حسن سے آوازے سب پہ کستے تھے   وہ جسکو دیکھتے تھے کھل کھلا کے ہنستے تھے

یہ حال دیکھ کے ساکت وہان رہا نہ گیا
خطاب کرکے یہ گل کی طرف پکار اُٹھا

بہارِ حسنِ دو روزہ پہ پھول جاتا ہے   تو اپنی ہستیِ فانی کو بھول جاتا ہے
شرابِ عشق چھلکتی ہے جام سے تیرے   سرورِ بادہ بھی حاصل ہے نام سے تیرے
فروغِ حسنِ حسینان ہے حُسن و رنگ ترا   انوکھی وضع ہے تیری نرالا ڈھنگ ترا
اُبھر اُبھر کے دکھاتا ہے اپنے جوبن کو   تڑپ تڑپ کے لٹاتا ہے سارے گلشن کو
ہے گدگداتی صبا بنکے بیکلی تیری   پھنساتی ہے اُسے خود تجھکو دل لگی تیری
پسند کیون نہین آتا ہے تجھکو حجلۂ غیب   کہ ہے اسی مین نہفتہ تمام رازِ شکیب
ہزار جان سے قربان ہے خود فروشی پر   سدا اُتلا ہوا رہتا ہے گرم جوشی پر
مآلِ کار تجھے ایکدن کوئی گلچین   کریگا شوق سے اپنے گلے کا ہار یہین
ملیگا چند گھڑی تجھکو لطفِ ہمخوابی   رہیگا حسن یہ قایم نہ تیری شادابی
مگر وہ حال زبون تیرا صبحدم ہوگا   کہ ہائے دیکھنے والونکو بھی الم ہوگا
اُڑیگا رنگ یہ رنگِ رخِ سحر کیطرح   رہیگا دہر مین تو آہِ بے اثر کیطرح
ملیگی خاک مین ساری یہ تیری شادابی   رہیگا حُسن نہ وہ بلبلون کی بیتابی
تپان رہیگا شرارِ طپیدہ کے مانند   ملیگا خاک مین اشکِ چکیدہ کے مانند
اُٹھینگی اُنگلیان تجھ پر کہ شمع مردہ ہے   کہینگی شاخین دکھا کر گُل فسردہ ہے
اگر تو مانتا بلبل کو اپنا شیدائی   ہزار جان سے جو تھا ترا تمنائی
نہوتا حال یہ اُسکا جو ہوکے تو رہتا   نہ تذکرہ سرِ بازار کو بکو ہوتا
ڈبوئی آبرو اپنی بھی آشنائی بھی   وفا بھی عفت و عصمت بھی پارسائی بھی
کہا یہ گل نے سُنی ہم نے داستان اپنی   دہن مین تیرے یہ واللہ ہے زبان اپنی

بجا ہے ٹھیک ہے انکار ہو نہین سکتا مگر خطا کا بھی اقرار ہو نہین سکتا
خبر نہین تجھے صورت پرست ہو دنیا مدام بادۂ غفلت سے مست ہو دنیا
ہماری ہستیِ موہوم ہے نباتاتی تو دیکھ اُنکو جو رکھتے ہین جوہر ذاتی
وفا پرستی کی خو جنکے آب و گل مین ہے ادائے فرض کا احساس جنکے دل مین ہے
مآل کار سمجھتے ہین عقل رکھتے ہین جو کارخانۂ قدرت مین دخل رکھتے ہین
ہے جنکو حسن لیاقت بھی حسن صورت بھی جو رہ چکے ہین رہین وفا و الفت بھی
اُنھین تو دیکھ کہ مرتے ہین بیوفاؤن پر مٹے ہوئے ہین تصنع پہ کج اداؤن پر
نہین ہے نام کو جن مین ذرا وفاداری کہ جو ہر آنی ہوئی خاص شیوۂ دلداری
مگس کیطرح نیا گل تلاش کرتے ہین یہ آئے دن نئے گل پیرہن پہ مرتے ہین
عبث ہے مجھ پہ پھر الزام بیوفائی کا کم التفاتیون کا اور کج ادائی کا
کہا ہے حضرتِ اقبال نے خوب شباب کہ جنکے دعوے کا ممکن نہین ہے کوئی جواب

ریاض دہر مین ہین یون تو رنگ رنگ کے پھول
وفا کی جن مین ہو بو وہ کلی نہین ملتی !

شباب

ویرانِ قصرِ شاہی

فطرتاً ہے مجھکو شوق دید آثار کہن قدرتاً ہے مجھ کو ذوق علم اسرار کہن
یادگار شوکت ماضی جہان پاتا ہون مین جسطرح بنتا ہے اُسکو دیکھنے جاتا ہون مین
خواہ مسجد خواہ مندر خواہ ہو شاہی مکان نقش کہنہ مین ہین اُن کے خاص جذبات نہان
مجھکو اُجڑی بستیون سے خاص دلچسپی سی ہے اور باشندون سے اُنکے خاص ہمدردی سی ہے
غور کرنا ٹوٹی دیوارون پہ بھاتا ہے مجھے ایسی اُجڑی بستیون مین لطف آتا ہے مجھے
مین سمجھتا ہون کہ ایک افسانہ کہتا ہے کوئی بھول کر بھی گر انھین ویرانہ کہتا ہے کوئی
جب کسی ایسی جگہ پر سیر ہوتا ہے گذر ہوتی ہے طاری عجب ایک بیخودی سی قلب پر
جب کوئی شاہی عمارت دیکھنے جاتا ہون مین ایک عجب عالم مین اپنے آپکو پاتا ہون مین
اجڑے محلون سے جو آتی ہے صدائے بازگشت طرفہ افسانہ سناتی ہے صدائے بازگشت

پہلے کچھ احکام سلطانی سناتی ہے مجھے قصۂ شان جہانبانی سناتی ہے مجھے
پھر سناتی ہے محافل کی طرب انگیزیان شوخی حسن ملاحت زا کی شکر ریزیان
کالی کالی وہ گھٹائین اور بھری برسات مین نازسے گانا وہ رقاصون کا بھیگی رات مین
عہد پیشین کے لطیفے کچھ سناتی ہے مجھے کچھ ہنساتی ہے مجھے اور کچھ رلاتی ہے مجھے
عاشقون نے گفتگو سرمستی جذبات مین کی تھی جو آہستہ تنہائی مین بھیگی رات مین
ہم کو بتلاتی ہے آ آ کر صدائے بازگشت دور ماضی کا ہے اک دفتر صدائے بازگشت

ہم سے پوچھے کوئی ایسے اُجڑے دیارون کا حال انکے ساکن کون تھے اور کیا ہوا انکا مآل
ذرہ ذرہ مین یہان کے نطق کی تفسیر ہے ریزے ریزے مین یہان کے جوہر تقریر ہے
سنگریزے کام کرتے ہین زبانونکے یہان ہو رہا ہے ہر طرف ایام پیشین کا بیان
ہر قدم پر پانو کے نیچے جو آتی ہے زمین داستان حالت ماضی سناتی ہے زمین

اس جگہ کچھ عیش کچھ عشرت کے سامان دفن ہین اس جگہ پر کچھ مرادین اور کچھ ارمان دفن ہین
اس جگہ پر ہے مزار شوکت و شان غرور اس جگہ مدفون ہین اسباب مکان غرور
آرزوے حد شہرت کی یہان پر قبر ہے جستجوے لطف جنت کی یہان پر قبر ہے
دلربائی اور دلآزاری کی حد ہے اس جگہ عاشقی اور نازبرداری کی حد ہے اس جگہ
نالۂ شبگیر زاہد اس جگہ پر ختم ہے حسن عالمگیر شاہد اس جگہ پر ختم ہے
تیغ جوہر دار کی حد اس جگہ پر ہو گئی حسن بدکردار کی حد اس جگہ پر ہو گئی
اس جگہ ہے بیکسی اور نامرادی سو رہی قبر ہے یان شوخی چشم فسون پرداز کی
دب گئے ہین کچھ جواہر غیر سفتہ اس جگہ دفن ہین کچھ غنچہائے ناشگفتہ اس جگہ
مرقدین ہین کچھ جنون فتنہ سامان کی یہان چاک دامان کی یہان چاک گریبان کی یہان
ساقی توبہ شکن ہے اس جگہ آرام مین شاہد نازک بدن ہے اس جگہ آرام مین

ذرہ ذرہ کہ رہا ہے اپنی اپنی داستان
لو سنو افسانہ ہائے ریزہ ہائے استخوان

اس طرح کہتا ہے ایک ہڈی کا ٹکڑا برملا عالم فانی کا مجھ مین ہے تماشا برملا

مین وہ پنجہ ہون کہ جسمین آ کے تیغ آبدار   شیر افگن مردِ میدان انکو کردیتی تھی خوار

چار سو عالم مین شہرہ تھا شجاعت کا مری   شان و شوکت کا مری او جاہ و حشمت کا مری

کتنے گھر ابتر کیئے تھے مین نے اپنے ہاتھ سے   کتنے تن بے سر کیئے تھے مین نے اپنے ہاتھ سے

میرے تیشہ کی دمک سے مہر کو تابندگی   میرے خنجر کی چمک سے برق کو شرمندگی

زندگی مین مل سکی کافی نہ جب راحت مجھے   قبر کی تعمیر، بعد مرگ سونے کے لیے

بعد مردن بس یہی آرام کی تدبیر تھی   بس یہی گویا بقائے نام کی تدبیر تھی

آدمی کو کام ہے اولاد سے دو چار پشت   ہان بقائے نام ہے اولاد سے دو چار نسبت

آ گئے ہین فاصلے پر جسطرح ماضی سے ہم   جانتے یہ بھی نہین تھے کون جدِ محترم

ہونگے ہم گمنام اکدن اپنی ہی اولاد مین   رفتہ رفتہ ہونگے شامل بے نشان افراد مین

دور اندیشی سے کی یون قبر بنوانی پسند   استدادِ وقت سے پہنچے نہ تا کوئی گزند

حیف اب کچھ بھی نہین اس قبر کا باقی نشان   ورنہ ہوتا تم کو اسکی پائداری کا گمان

قبر بنوائی تھی جو اپنی حفاظت کے لیے   اب محافظ کا کوئی ذرہ نہین محفوظ ہے

سرگذشتِ عالم فانی سنانے کے لیے
ہم ابھی باقی ہین ٹھوکرین کھانے کے لیے

دوسرا ریزہ یہ کہتا ہے نہ پوچھو میرا حال   ظلم سے میرے تھی اک خلقت کی خلقت پائمال

کیا ہون نہین ہے اک حلقۂ چشم فسون پرداز ہون   مین سراپا عشق ہون اور مین سراپا ناز ہون

مین نے صدہا سرکشون کا حال ابتر کر دیا   بس جدھر دیکھا ادھر عالم کو مضطر کر دیا

وہ جہان آشوب سرکش اور وہ شیر کارزار   تھام لیتے تھے کلیجہ جب مرا اٹھتا تھا وار

کتنی خلقت مبتلائے بد حواسی مر گئی   کتنی خلقت میری اک چتون کی پیاسی مر گئی

مین نے کتنے دل جلونکا سارا سامان لے لیا   دین کتنون کا لیا کتنونکا ایمان لے لیا

پی کے میری اک نظر سے شربتِ آبِ حیات   نیمجان کتنے ہوئے شاداب و سیراب حیات

داستان وقتِ رفتہ، آہ لیکن کب تلک
یہ بیان وقتِ رفتہ، آہ لیکن کب تلک

مین غرض یہ بستیان تاریخ صفحاتِ قدیم   انکو ویرانہ نہ سمجھو ہین بیانِ دین مقیم

کوئی کیفِ عبرت آموزی کا متوالا تو ہو

صاف آتی ہین نظر ہان دیکھئے

روان

قطعہ

ہے لگا رکھا عبث محروم ہم نے جی کو روگ   دلمین آتا ہے کہ ترکِ عشق خوبان کیجیے

تا بہ کے یہ بت پرستی تا کجا یہ کافری   معتکف ہو بیٹھیے اور ذکرِ یزدان کیجیے

دخل ہو اصنام غارت گر کا اسمین کس لیے   گھر خدا کا ہے یہ دل کیون اسکو ویران کیجیے

مصحفِ رخسار مین تشبیہ ہے کمزور سی   اس سے یہ مطلب کہ پیدا ضعفِ ایمان کیجیے

مغتنم صبح جوانی ہے پئے فکرِ معاد   کیون سعادت کی سحر کو شام ہجران کیجیے

اس سے کیا حاصل کہ پیمان حقیقی چھوڑ کر   سست پیمانون سے کیون عہد و پیمان کیجیے

دردِ الفت ہے نہ پیدا کیجیے دلمین تو کیون   منتِ عیسیٰ پئے تدبیر و درمان کیجیے

لوٹئے کانٹون پہ کیون ہر شب کسی کے ہجر مین   سوتے سوتے کیون خیالِ نوکِ مژگان کیجیے

بیٹھیے کیون ہو کے پا در حلقۂ زنجیرِ زلف   اپنے گھر کو کس لیے مانند زندان کیجیے

کس لیے الجھا کے گیسو مین دلِ بیتاب کو   خود پریشان ہو جیئے اُن کو پریشان کیجیے

کیسی وحشت ہے چھوڑ کر گھر بار اپنا کس لیے   سوئے صحرا جائیے قطعِ بیابان کیجیے

ایکدن گھر ہی جلا ڈالین نہ یہ گھر کے چراغ   داغہائے دل سے کیون ہر شب چراغان کیجیے

شمع رویون سے لگایا کیجیے ہر گز نہ لو   کس لیے پھر شکوہ ہائے سوزِ پنہان کیجیے

بیٹھیے کیون جا کے کنجِ باغ مین زار و قطار   گل کو خندان کیجیے بلبل کو گریان کیجیے

فصلِ گل مین ہو کے کیون منت کشِ جنون   ٹکڑے ٹکڑے دامان کیجیے پرزے گریبان کیجیے

شاعری کے نام پر اک داغ ہے عشقِ مجاز   فائدہ کیا ہے کہ وصفِ [illegible] کیجیے

کس لیے کہلائیے محروم یعنی نامراد   خود ہی اپنے آپ کو کیون مرحمان کیجیے

جن سے اُمیدِ جوابِ خط نہ ہو ان کے لیے   کس لیے ہر روز فکرِ تازہ عنوان کیجیے

کیجیے موزون نہ اشعارِ طرب انگیز کیون   کیون غزل مین بھی یہی سوگواران کیجیے

یہ تو سب کچھ کیجیے پر آ گیا وہ شوخ پھر
نذرِ دل گزرانیے یا پیشکش جان کیجیے

محروم



شمس العلماء مولانا الطاف حسین صاحب "حالی"

العصر

کرۂ ہوائی کے متعلق دلچسپ معلومات

تمہید

عالمِ ارضیات[1] اور ہیئت والون کا متفق علیہ قیاس ہی کہ یہ زمین جس پر ہم بستے ہین خلا مین معلق ایک کرہ ہی، جو وقتِ[2] معینہ پر ایکدفعہ اپنے محور پر گھومتی، اور آفتاب کے تجاذب سے سال مین ایک دفعہ آفتاب کے گرد چکر لگاتی ہی۔ اسکا اندرونی حصہ مرکز کے قریب اغلبًا مائع اور سیال ہی، لیکن سطح پر اور سطح سے بہت دور اندر کی طرف پتھرون اور چٹانون کی ایک موٹی ٹھوس تہ (کرسٹ Crust) مائع اور سیال مادہ کے انجماد سے پیدا ہو گئی ہی۔ اسکی سطح کے بعض حصص تو خشک ہین لیکن اکثر حصون کے اوپر پانی کے بخارات نے ٹھنڈے ہو جانے کی وجہ سے سمندر[3] کی شکل اختیار کر لی ہی۔ سطح زمین کے اوپر کئی میلون کی اونچائی تک ہوا[4] کا ایک وسیع اور عمیق سمندر ہی، اور اس سے اُدھر فضائے بسیط مین "ایتھر" کا بحر بیکران ہی۔

[1] فٹ نوٹ۔ جی آلوجسٹ (Geologist) یعنی عالمانِ علم طبقات الارض۔ ہم نے جی آلوجی (Geology) کا ترجمہ ارادۃً "ارضیات" کیا ہی انگریزی زبان مین تمام علوم کے نام ایک ہی طرز پر وضع کئے گئے ہین، مثلاً زوآلوجی، فزی آلوجی، سوشی آلوجی، وغیرہ تمام جدید علوم اسی طرز پر پکارے جاتے ہین۔ قدیم علوم مثلاً فزکس یا باٹونی وغیرہ مستثنیات ہین۔ کیا ہی اچھا ہو اگر اُردو مین بھی ماسوا اُن علوم کے جن کے نام پہلے سے وضع ہو چکے ہین یا اب مشکل سے (صفحہ دیکھو)

[2] اس مبحث کے متعلق ہم ایک جداگانہ مضمون مین تفصیل کے ساتھ بحث کرینگے دُنیا مین بہترین گھڑی مرورِ وقت کے اندازہ کے لیے زمین کی گردش لیل ونہار سمجھی جاتی ہی لیکن فی زماننا سائنس کی حیرت انگیز ترقی نے یہ ثابت کر دیا ہی کہ زمین کی روزانہ گردش کا وقت بڑھ رہا ہی۔ گویا ایک شبانہ روز کا عرصہ موجودہ زمانے مین آج سے چند ہزار صدیان پہلے سے چند ایک دقیقہ کی مقدار سے لمبا ہی۔ بالفاظ دیگر ہمارے دن رات لمبے ہو رہے ہین لیکن سال اسی تناسب سے چھوٹا ہو رہا ہی۔ [3] کرۂ آبی ہائڈروسفیر Hydrosphere [4] کرۂ ہوائی = Atmosphere

۱۔ کرۂ ہوائی کرۂ زمین کا ایک جزو لاینفک ہی

زمین اپنی سالانہ گردش مین ۱۸ میل فی ثانیہ یا تقریباً ۶۶ ہزار میل فی گھنٹہ کی حیرت انگیز رفتار سے حرکت کرتی ہی۔ لیکن کرۂ ہوائی بعینہ اسیطرح زمین کے ساتھ متصل رہتا ہی جسطرح ہم سطح زمین پر رہتے ہین۔ اسی طرح کرۂ ہوائی کرۂ زمین کے ساتھ زمین کی یومیہ گردش مین بھی متصل رہتا ہی۔ زمین کا محیط تقریباً ۲۵ ہزار میل ہی۔ لہذا خط استوا کے قریب کرۂ ہوائی کے وہ حصے جو سطح زمین سے قریب ہین ساڑھے دس سو میل فی گھنٹہ یا ۱۸ میل فی منٹ کی رفتار سے گھومتے ہین، اور وہ حصے جو عرض بلد ۳۰ کے قریب ہین ۹۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھومتے ہین، اور وہ حصے جو عرض بلد ۶۰ کے قریب ہین سوا پانچ سو میل فی گھنٹہ یا ۹ میل فی منٹ کی رفتار سے گھومتے ہین۔ بعض حضرات غلطی سے یہ خیال کرتے ہین کہ کرۂ ہوائی زمین کی روزانہ گردش مین شامل نہین ہوتا بلکہ زمین اُس کے نیچے اسطرح پھسلتی رہتی ہی جسطرح ایک متحرک جسم دوسری ساکن جسم کے نیچے حرکت کرتا ہی۔ وہ یہ خیال نہین کرتے کہ کشش زمین جسکی بدولت باقی تمام مادی اجسام زمین کے ساتھ حرکت کرتے ہین ہوا پر بھی بحیثیت ایک مادی جسم ہونے کے اسی طرح عمل کرتی ہی اور زمین کے ساتھ کرۂ ہوائی اسیطرح گردش کرتا ہی جسطرح ایک متحرک صندوق کے ساتھ اسکے اندر کی چیزین حرکت کرتی ہین۔ ایسی مثالون مین ایک بڑی مشکل یہ ہوتی ہی کہ الفاظ کے مفہوم کو غلط طور پر محدود کر دیا جاتا ہی۔ اس بحث مین سطح زمین کے اوپر کرۂ ہوائی اور دیگر مادی اجسام کی وہی حالت ہی جو ہماری مثال مین صندوق کے اندر کی چیزونکی ہی۔

(بقیہ صفحۂ گذشتہ) تبدیل کیئے جا سکتے ہین تمام نئے نام "ارضیات" کے وزن پر یعنی "ایات" کی آواز پر ختم ہون مثلاً علم ادب کو ادبیات، علوم طبعی کو طبعیات، کانون کے علم کو معدنیات، علم کیمیا کو کیمیات، علم نباتات کو نباتیات وغیرہ نام دیئے جا سکتے ہین۔ ہماری زبان مین علمی ترقی کے لوازمات مین سے ایک یہ بھی ہی کہ اصطلاحات علمی مناسب طریقہ پر وضع کی جائین۔ میرا مدعا ہرگز یہ نہین ہی کہ موٹے موٹے عربی کے الفاظ اُردو لغت مین شامل کیئے جائین؛ مین صرف بہترین یکانگت کا حامی ہون انگریزی زبان مین علمی اصطلاحات مین کیسی عمدہ اور قابل تعریف یکجہتی ہی۔ کیمیات یعنی Chemistry کے متعلق علمی کتب کا اُردو مین ترجمہ کرنا تقریباً محال ہی، تاوقتیکہ جیسی یکسان اصطلاحات (Nomenclature) انگریزی زبان مین کیمیائی مرکبات کے لیے وضع ہین اُردو مین بھی وضع نہ کیجائین۔ ایک اور گزارش جو مین العصر کی علمی تحریک سے فائدہ اُٹھا کر علم دوست اصحاب کی خدمت مین پیش کرنا چاہتا ہون، وہ یہ ہی کہ تمام علمی آلات Scientific Instruments کا نام اُصول متشرحہ صدر کے مطابق اُردو لغت مین یکسان وضع کرنا چاہیے۔ مثلاً آلات بالعموم دو قسم کے ہوتے ہین۔ ایک وہ جن کے نام کا آخری حصہ اسکوپ (scope—) ہوتا ہی، دوسرے وہ جن کے نام کا آخری حصہ میٹر (meter—) ہوتا ہی۔ میٹر والے آلات وہ ہوتے ہین جن کی مدد سے مختلف چیزونکا صحیح طور پر اندازہ کیا جاتا ہے۔ برعکس اس کے اسکوپ والے آلات صرف چیزون کے باہمی تعلقات عام طور پر دکھانے کے لیے استعمال ہوتے ہین۔ میرے نزدیک اگر ان آلات کا ترجمہ "پیما" کی مدد سے کیا جائے تو نہایت موزون ہوگا مثلاً ایلکٹرومیٹر Electro-meter "برق پیما" ایلکٹرا سکوپ Electro-scope "برق نما" وغیرہ ایک تیسری قسم کے آلات جو حال ہی مین مروج ہوئے ہین خود بخود بغیر کسی بیرونی مدد کے اپنے مشاہدات لکھتے جاتے ہین۔ ایسے آلات حوالہ دینے کے لیے نہایت مفید اور کارآمد ہین۔ انکی صفت سیلف ریکارڈنگ ہی جسکا صحیح ترجمہ "خود نویس" ہو سکتا ہی۔ ایسے آلات بالعموم گراف graph— پر ختم ہوتے ہین۔ مین تجویز پیش کرتا ہون کہ انھین "نویس" کہا جائے۔ مثلاً تھرموگراف Thermograph جو محکمۂ آب و ہوا مین استعمال ہوتے ہین "حرارت نویس" کہے جائین۔ فقط۔

جس طرح متحرک ہونے کے لیئے صندوق اور اس کے اندر کی چیزین ایک جسم کا حکم رکھتی ہین اسطرح تجاذب مادی[1] کی بدولت زمین کرۂ ہوائی اور تمام مادی اجسام جو زمین کی کشش کے احاطۂ اثر مین داخل ہین زمین کی روزانہ اور سالانہ گردش مین ایک جسم ایک حکم رکھتے ہین یہانتک کہ ہمارا چاند جو زمین سے تقریبًا ۲½ لاکھ میل کے فاصلے پر ہے اسی طرح زمین کی مختلف حرکتون مین حصہ لیتا ہے جسطرح ہم اور تم جو کہ سطح پر رہتے ہین یا قصہ کہانیون کا سمندر جو زمین کی اندرونی چٹانون کے پتھرون کے اندر رجا گزین ہے۔ اگر بفرض محال ایک لمحہ کے لیے یہ مان لیا جائے کہ کرۂ ہوائی زمین سے کم از کم اسکی روزانہ حرکت کے لحاظ سے علیحدہ ہے تو ایک غبارہ باز یا ہوا مین اڑنے والے جانور اگر صبح کو ہندوستان کی زمین سے ہوا مین اڑنا شروع کرے تو تقریبًا بارہ گھنٹہ کے بعد شام کے وقت وسطی امریکہ یعنی میکسیکو وغیرہ کی زمین پر اتر سکتا ہے!!!

متقدمین زمین کی روزانہ گردش کے قائل نہین تھے۔ منجملہ دیگر غلط اعتراضات کے جو وہ روزانہ گردش کے خلاف پیش کرتے تھے ایک اعتراض اسی نوع کا تھا جس کے متعلق ہم ابھی بحث کر چکے ہین۔ وہ کہتے تھے کہ اگر زمین دن رات مین ایک دفعہ گھومتی ہے تو جیسا اوپر ذکر کیا گیا ہے خط استوا اور اسکے قرب وجوار کے ممالک مین ہمیشہ اتنے زور کی آندھی چلنی چاہیئے کہ درخت جڑ سے اکھڑ جائین اور مکانات مسمار ہو جائین اس لیے کہ وہان ہوا کی رفتار زمین کے مقابلے مین ۱۰۴۰ میل فی گھنٹہ ہوگی۔ بالفاظ دیگر ان کا اعتراض یہ تھا کہ زمین تو ۱۰۴۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آگے بڑھیگی لیکن ہوا جو زمین کی حرکت مین کوئی حصہ نہین لے رہی زمین کی اشیا کے اوپر اسی رفتار کے ساتھ رگڑ کھاتی رہیگی۔ زمانۂ حال مین تجاذب مادی کے مسئلہ کو سمجھ لینے کے بعد اس قسم کے جملہ اعتراضات خود بخود رفع ہو جاتے ہین۔

۲- ہوا مین مدوجزر۔ ہوائی جہازرانی کا مسئلہ

زیادہ تر چاند کی کشش سے اور ایک تھوڑی حد تک سورج کی کشش سے سمندر مین دو دفعہ مدوجزر ہوتا ہے۔ پانی کا جو حصہ چاند کے مقابل آتا ہے وہ چاند کی طرف کھنچ جاتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بندرگاہ مین ہر ۲۴ گھنٹہ مین سمندر کا پانی دو دفعہ اونچا چڑھتا ہے اور دو دفعہ معمول سے کم نیچے ہو جاتا ہے جب سورج اور چاند کی کشش ایک ہی سمت مین اثر کرتی ہے تو بڑے جوار بھاٹے پیدا ہوتے ہین اور جب ان کی کشش مخالف سمتون مین اثر کرتی ہے تو معمول سے چھوٹے مدوجزر ہوتے ہین۔ سطح زمین کے نزدیک ایک بہت موٹی ٹھوس تہ ہونے کا ایک بدیہی ثبوت یہ ہے کہ سمندر مین مدوجزر ہوتا ہے۔ اگر یہ تہ کم گہری ہو تو چونکہ پانی کے ساتھ نیچے سے سمندر کی تہ بھی اوپر کی طرف کھنچی آئے مدوجزر ایسے نمایان نہ ہون۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ چاند اور سورج کی کشش سے کرۂ ہوائی مین بھی سمندر کیطرح مدوجزر ہوتا ہوگا۔ بہت سے سائنس دان عملی طریقے پر ہوائی مدوجزر کی تحقیقات مین مصروف ہین کیونکہ ہوائی مدوجزر نہ صرف علمی حیثیت سے دریافت طلب ہے بلکہ اب جبکہ ہوائی جہاز دن بدن زیادہ استعمال کیے جا رہے ہین اسکی ضرورت اور زیادہ ہو گئی ہے کرۂ ہوائی مین مدوجزر کے یہ معنی ہین کہ ہوائی جہازرانون کو ملاحون کی طرح ہوائی مدوجزر کے اوقات کا خیال رکھنا لازم ہوگا۔ ان چونکہ ہوائی سمندر رما سوائے

[1] تجاذب مادی سے مراد نیوٹن کا وہ عالمگیر قانون یعنی Law of Univereal Gravitation ہے جس کے مطابق عالم مین مادہ کا ہر ایک ذرہ باقی تمام مادی ذرات کو اپنے مرکز کی طرف کھینچتا ہے۔

صرف چند ایک رکاوٹوں کے جو بلند پہاڑ وغیرہ کی وجہ سے اس کی عالمگیر یکسانیت مین واقع ہوئی ہین مد جزر کے لیے وسط سمندر کا جہان پانی کی سطح کا نشیب و فراز بندرگاہون سے کہین کم ہوتا ہے علم کہتا ہے اور دوسرے ہوا پانی سے کئی سو گنا ہلکی ہے کرۂ ہوائی مین مد جزر کی وہ شدت نہین ہوتی جو تنگ بندرگاہون مین ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ آج تک اس صیغۂ علم کی طرف کچھ زیادہ توجہ نہین کیگئی اور مقیاس الہوا مین پارے کے اوپر نیچے ہونیسے ہوائی مدوجزر کا پتہ نہین لگ سکتا جب تک زیادہ نازک طریقے اختیار نہ کیے جائین گے یہ مسائل ایک بڑی حد تک علمی حیثیت سے راز سربستہ رہین گے۔

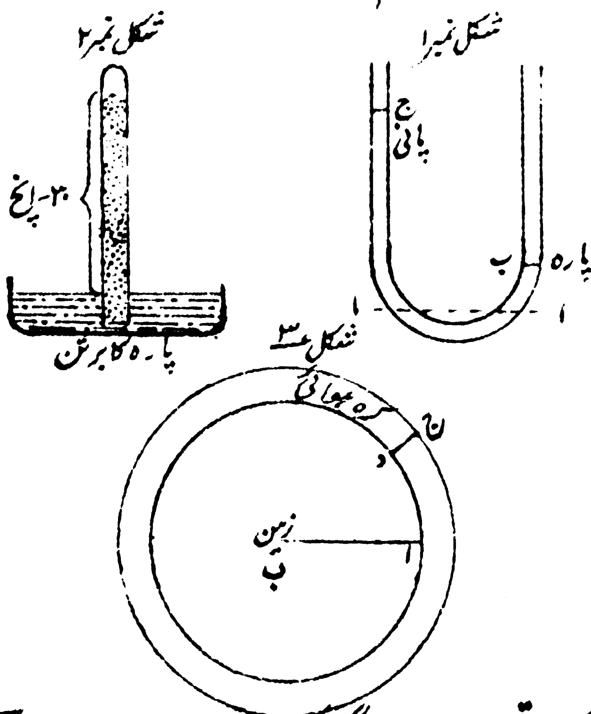
۳۔ ہوا کے اعلی طبقات کے دلچسپ حالات

کرۂ ہوائی کے متعلق جدید ترین معلومات اس کے طبقات اعلی کے حالات کی مفصل دریافت ہے۔ غبارہ کے ذریعے سے آدمی زیادہ سے زیادہ پانچ میل کی بلندی تک جا سکتا ہے۔ دنیا مین سب سے اونچا پہاڑ بھی تقریباً پانچ میل بلند ہے لیکن ان پانچ میلون کی بلندی کا حال بھی ان طریقون سے وسیع طور پر فی الحال معلوم نہین ہے ہان حال ہی مین ایک نیا طریقہ ایجاد ہوا ہے جس سے ۱۰ میل کی بلندی تک کے حالات معلوم کیے گئے ہین۔ اس سے پیشتر کہ ہم ان دلچسپ معلومات کا مفصل ذکر کرین ہم موازنہ کی خاطر کرۂ آبی اور کرۂ ہوائی کا مختصراً مقابلہ کرتے ہین۔

جس طرح مچھلیان اور دوسرے آبی جانور پانی کے سمندر مین رہتے ہین اسی طرح انسان اور خشکی پر رہنے والے حیوانات ہوا کے ایک سمندر مین رہتے ہین جو پانی کے سمندر سے کیا بلحاظ وسعت اور کیا بلحاظ گہرائی کے ہر طرح سے بڑا ہے۔ سطح زمین کا صرف ایک چوتھائی حصہ خشک ہے جو عرف عام مین ربع مسکون کے غلط نام سے مشہور ہے۔ باقی تین چوتھائی حصہ پانی کے سمندرون سے گھرا ہوا ہے گویا سمندر کی وسعت سطح زمین کے مجموعی رقبہ کی تقریباً تین چوتھائی کے برابر ہے۔ لیکن کرۂ ہوائی کے متعلق یہ امر دلچسپی اور افادہ سے خالی نہین کہ سطح زمین کا ایک چپہ بھر حصہ تو ایک طرف ایک ذرہ بھی ایسا نہین جسے کرۂ ہوائی احاطہ کیے ہوئے ہو اور جس کے ارد گرد ہوا کے سمندر کی لہرین ہر وقت جاری و ساری نہ ہون۔ بالفاظ دیگر رقبہ کے لحاظ سے کرۂ ہوائی سطح زمین کی وسعت کے بالکل برابر ہے اور ایسا ہونا عین ضروری ہے اسلئے کہ پانی کے بغیر انسان کچھ دن تک زندہ رہ سکتا ہے لیکن اگر ہوا ایک لمحہ نہ ملے تو جان بلب ہو جاتا ہے۔ زیست کے لیے ہوا سب سے پہلی ضرورت ہے ہان اگر ہماری خلقت موجودہ سے بالکل مختلف ہوتی تو غالباً صانع قدرت ہمین اسقدر ہوا کا محتاج نہ بناتا

۴۔ کرۂ ہوائی کا مجموعی وزن زمین کے وزن سے دس لاکھ گنا کم ہے

یہ اندازہ آسانی کے ساتھ یون لگایا جا سکتا ہے۔ اگر انگریزی حرف یو U کی شکل کی ایک شیشے کی نلی لیجائے اور اس مین پانی یا پارہ یا اور کوئی ایک مائع جسم ڈالدیا جائے تو دونون بازؤن مین مائع کی



سطح ایک جتنی بلندی پر ہوگی لیکن ایک بازو مین پارہ اور دوسرے

مین پانی ڈالا جائے تو پانی کی سطح ج کی بلندی خط مستقیم ا ۔۔ ا سے اوپر پارہ کی سطح ب کی بلندی خط ا ۔۔ ا سے اوپر کی نسبت تقریباً ½ ۱۳ گنا زیادہ ہوگی اسلئے کہ پارہ پانی سے ½ ۱۳ گنا زیادہ بھاری ہی۔ دوسری شکل مین ایک شیشہ کی نلی پارہ سے بھر کر پارہ کے برتن مین الٹی کھڑی کی گئی ہی نلی مین پارہ برتن کے پارہ کی سطح سے ۳۰ انچ اونچا کھڑا ہوتا ہی۔ یو شکل کی نلی والے تجربون سے فائدہ حاصل کرکے آپ کہہ سکتے ہین کہ یہان بھی ایک یو شکل کی نلی ہی جسکا ایک بازو دکھائی نہین دے رہا اس لیے کہ اسمین ہوا بھری ہی اور دوسرے بازو مین پارہ بھرا ہی۔ گویا ۳۰ انچ لمبی پارہ کی نلی ہوا کی ایک غیر مرئی لمبی نلی کے وزن کی وجہ سے پارہ کی بیرونی سطح سے (جس پر ہوا کے وزن کا دباؤ اثر کر رہا ہی) اوپر کھڑی ہی بعینہ اسیطرح جسطرح شکل اول مین پانی کی ایک ½ ۱۳ گنا لمبی نلی پارہ کی ایک چھوٹی نلی کو سہارا دیئے ہوئے ہی۔ ان تجارب کی بنا پر ہم فوراً کرۂ ہوائی کی بلندی کا اندازہ لگا سکتے ہین بشرطیکہ کرۂ ہوائی نیچے سے اوپر تک ایک جتنا کثیف ہو۔ اس شرط کو صحیح مانکر یکسان کثافت کی ہوا کے کرہ کی بلندی چونکہ پارہ ہوا سے دس ہزار گنا بھاری ہی ۳۰ + ۱۰۰۰۰ انچ یعنی تقریباً پانچ میل نکلتی ہی لیکن چونکہ ہوا جون جون ہم اوپر چڑھتے ہین لطیف ہوتی جاتی ہی کرۂ ہوائی کی اصلی بلندی کا اندازہ تمام ان باتونکا لحاظ کرکے تقریباً پینتالیس میل لگایا گیا ہی۔ اس علم کے ساتھ ہم کرۂ ہوائی کے وزن کا تناسب زمین کے وزن کے ساتھ تیسری شکل کی مدد سے معلوم کر سکتے ہین۔ زمین کی کثافت اضافی پانی کے مقابلے مین ½ ۵ ہی بالفاظ دیگر اگر زمین کا حجم رکھنے والے پانی کے پانچ کو اکٹھے کئے جائین تو ان کا مجموعی وزن زمین کے وزن سے کچھ کم ہوگا اب اگر آپ ایک مکعب فٹ پانی کا وزن جانتے ہین تو زمین کا وزن ان اعداد سے بآسانی نکل سکتا ہی۔ زمین کا حجم $\frac{4}{3} + \frac{22}{7} \times (4000)^3$ مکعب میل ہی۔ کرۂ ہوائی کا وزن دریافت کرنے کے لیے ہم مقیاس الہوا کی نلی (شکل دوئم) کو پھر استعمال کرینگے ہمکو کرۂ ہوائی کی بلندی بالکل صحیح طور پر معلوم نہین ہی لیکن یہ معلوم ہی کہ تمام کرۂ ہوائی کا بوجھ پارہ کی ۳۰ انچ گہری تہ کے بوجھ کے برابر ہی۔ اب شکل ۳ مین آپ یون سمجھئے کہ بجائے زمین کے گرد ۴۵ میل گہری ہوا کی ایک تہ ہونے کے پارہ کی ایک ۳۰ انچ گہری تہ ہی جس کا حجم تقریباً $4 + \frac{22}{7} \times (4000)^2 \times \frac{30}{36 + 1760}$ مکعب میل ہی۔ پارہ پانی سے ½ ۱۳ گنا زیادہ بھاری ہی اور زمین پانی سے ½ ۵ گنا بھاری ہی اس لیے کرہ ہوائی کے وزن کو زمین کے وزن سے وہی نسبت ہی جو $4 + \frac{22}{7} \times (4000)^2 + \frac{30}{36 + 1760} + \frac{27}{2}$ کو $\frac{4}{3} + \frac{22}{7} + (4000)^3 + \frac{11}{2}$ سے ہی یا ایک کو دس لاکھ سے۔ المختصر کرۂ ہوائی کا مجموعی وزن زمین کے وزن سے دس لاکھ گنا کم ہی۔

۵۔ ہوا کا دباؤ

بہت سے حضرات متعجب ہون گے کہ اگر فی الواقع ہوا کا اتنا بوجھ ہی اور ہم ہوا کے بوجھ کے نیچے ہین تو پھر کیون ہم اس دباؤ کو محسوس نہین کرتے۔ بات اصل مین یہ ہی کہ ہوا کا دباؤ ہمارے اندر باہر ہمارے بدن مین مسامات وغیرہ کی وجہ سے دونون طرف برابر ہی اور اس لیے اس کا مجموعی اثر ہمارے بدن کے اوپر صفر محض یعنی کالعدم ہی۔ اگر ایسا نہوتا تو چونکہ فی مربع انچ ہوا کا دباؤ تقریباً ½ ۶ سیر ہی اور تخمیناً ہمارے جسم کی بیرونی سطح کا رقبہ ۶۵ ہزار مربع انچ ہوتا ہی ہمارے جسم پر کچھ کم سوا چالیس ہزار سیر یا دس ہزار پانچ سو من کے دباؤ سے ریزہ ریزہ ہوجاتے۔ لیکن تعجب ہوتا ہی کہ کس عمدگی کے ساتھ ہم ہوا کے حیرت انگیز دباؤ سے بالکل بےخبر ہین اور اسے کبھی محسوس تک نہین کرتے۔ (پانی چونکہ ہوا سے تقریباً ساڑھے آٹھ سو گنا بھاری ہی اگر ہم پانی کی سطح سے ۳۲ فٹ نیچے جائین تو ہمارے جسم پر اتنا ہی دباؤ

پڑتا ہی جتنا کہ کرۂ ہوائی کے بوجھ سے پڑ سکتا ہی۔ اب آپ خیال فرمائیے کہ اُن آبی جانورون کی ہڈیان اور تمام جوارح کس قدر مضبوط ہوتے ہونگے جو سطح سمندر سے ہزارون فٹ نیچے نشو و نما پاتے ہین !!!) اگر ایک شیشے کے برتن مین مخراج الھوا کی مدد سے ہوا کا اکثر حصہ خارج کر دیا جائے اور شیشہ کافی مضبوط نہو تو ہوا کے دباؤ کا اثر برتن کے ٹوٹ جانیسے آسانی کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہی۔ اگر ہمارے جسم بھی شیشہ کیطرح غیر مسامدار ہوتے اور ان کے آر پار ہوا نہ گذر سکتی تو نہایت سختی کے ساتھ ہمکو ہوا کے دباؤ کا یقینی احساس ہوتا۔ لیکن چونکہ ہوا ہمارے جسم کے اندر باہر آسانی سے گذرتی ہی اس لیے نتیجہ ہمارے حق مین حد درجہ مفید ہی۔

۶-۱ اسٹرٹیو سفیر یا کرۂ زمہریر

کرۂ ہوائی کے متعلق ایک دلچسپ امر جو متعدد اور مختلف تجارب اور مشاہدات کی بناء پر معلوم ہوا ہی یہ ہی کہ تقریباً چھ میل کی بلندی تک ہوا کا درجۂ حرارت تین سو فٹ کی بلندی کے لیے ایک درجہ فارن ہیٹ کم ہوتا چلا جاتا ہی۔ لیکن چھ میل کی بلندی سے اوپر درجۂ حرارت مین کوئی کمی واقع نہین ہوتی یہانتک کہ ۱۰ میل کی بلندی تک ایک ہی درجۂ حرارت ہوتا ہی۔ اس لحاظ سے کرۂ ہوائی دو حصون مین منقسم ہو جاتا ہی ایک تو وہ حصہ جو سطح سے لگا ہوا تقریباً چھ میل کی بلندی تک اوپر جاتا ہی اور جس مین ہوا کا درجۂ حرارت بلندی کے ساتھ کم ہو جاتا ہی اور فی میل ۱۸ درجہ فارن ہیٹ کم ہوتے ہوتے انتہائی حد پر صفر سے تقریباً پچاس درجہ فارن ہیٹ نیچے یعنی منفی ۵۰ فارن ہیٹ ہو جاتا ہے۔ اِس حصّہ کو کرۂ حرارت (ٹراپو سفیر Troposphere) کے نام سے تعبیر کرتے ہین۔ دوسرے حصہ کو اسٹرٹیو سفیر (Stratosphere) کہتے ہین ہم اسکو کسی خاص صحیح نام سے اُردو مین تعبیر نہین کر سکتے سہولت کے لیے مین نے جلدی سے اسکے لیے کرۂ زمہریر استعمال کر لیا ہی۔ ہوا کے اس اعلیٰ طبقہ کا عجیب خاصہ یہ ہی کہ اس مین درجۂ حرارت میلون تک یکسان رہتا ہی۔ شروع مین خیال کیا گیا تھا کہ اس طبقے کا درجۂ حرارت بدلتا نہین ہی اور اسے طبقۂ مساوی حرارت کہتے تھے لیکن بعد کے تجارب نے ثابت کر دیا ہی کہ سطح زمین پر مختلف مقامات کے اوپر یہ طبقہ مختلف بلندیون پر شروع ہوتا ہی بلکہ اسکا اصلی درجۂ حرارت بھی مختلف ہوتا ہی۔ علاوہ ازین ایک ہی مقام کے اصلی درجۂ حرارت مین تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہی لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود ایک امر جسکی وجہ سے یہ اعلیٰ طبقہ طبقۂ اسفل سے ممتاز ہی یہ ہی کہ جہان سے شروع ہوتا ہی اس کے پرے اوپر کیطرف پھر کوئی تبدیلی درجۂ حرارت مین واقع نہین ہوتی۔

یہ امر دلچسپی سے خالی نہوگا کہ ہوا کے اِس اعلیٰ طبقہ اسٹرٹیو سفیر کا مطالعہ کن ذرائع سے کیا گیا ہی۔ ہم اوپر ذکر کر چکے ہین کہ پہاڑون کی مدد سے یا انسانی غبارونکی مدد سے ہم زیادہ سے زیادہ بصد مشکل ۵ میل سے کم تک کی بلندی پر پہنچ سکتے ہین۔ ہوا کے اعلیٰ طبقات

لے درجۂ حرارت کی پیمائش کے لیے یوروپ مین اور دوسرے ممالک مین جہان یوروپ کے علوم مروج ہین برف اور بھاپ کی درجۂ حرارت کے درمیانی وقفہ کو مختلف پیمانون کے مطابق تقسیم کیا جاتا ہی۔ فارن ہیٹ کا پیمانہ ان مین سے ایک ہی۔ اسکے مطابق جمتے ہوے پانی یا برف کا درجہ حرارت ۳۲ کہلاتا ہی اور کھولتے ہوئے پانی کی بھاپ کا درجۂ حرارت ۲۱۲۔ برف سے کم درجۂ حرارت کی پیمائش اسی حساب کے مطابق ہوتی ہی مثلاً ایک جسم کا درجۂ حرارت جو برف سے اتنا ہی زیادہ ٹھنڈا ہو جتنی کہ بھاپ بمقابلہ برف گرم ہی فارن ہیٹ کے پیمانے کے مطابق ۳۲ – ۱۸۰ یعنی منفی ۱۴۸ (منفی سے مراد صفر کے نیچے ہی) ہوگا۔ سنٹی گریڈ پیمانے پر برف اور بھاپ کی درجۂ حرارت کا وقفہ سو برابر حصون مین منقسم ہوتا اور ریومر مین اسی حصون پر۔ برف کا درجۂ حرارت ایک مین صفر سنٹی گریڈ اور دوسرے مین صفر ریومر کہلاتا ہی بھاپ کا درجہ ایک مین سو سنٹی گریڈ اور دوسرے مین ۸۰ ریومر کہلاتا ہی۔

کا مطالعہ زمانہ حال سے شروع ہوتا ہے ۱۸۶۲ عیسوی مین ایک منچلا علم دوست یوروپ کا بیٹا گلیشر (Gleisher) اس امر کے درپے ہوا اور ایک بہادرانہ کوشش کے بعد ۲۹ ہزار فٹ کی انتہائی بلندی تک ہوا کی سیر کر آیا۔ بیسوی صدی کے شروع تک اس کے بعد پھر کوئی کوشش ہوا کے مطالعہ کی نہین کی گئی لیکن گذشتہ دس بارہ سالو نمین اپنے آپ کام کرنے والے آلات کی تکمیل کی وجہ سے یہ کام از سر نو نہایت زورون کے ساتھ شروع ہے۔

سب سے زیادہ مفید چیز اس ضمن مین آزمائشی غبارہ (سونڈنگ بیلون یعنی Sounding Baloon) ہے جو کہ نہایت عمدہ پتلے ربڑ کا بنا ہوا ہوتا ہے اور ہائیڈروجن گیس سے بھرا جاتا ہے صعود سے پہلے اس کا قطر تقریباً ایک گز ہوتا ہے۔ جون جون غبارہ اوپر چڑھتا ہے ہوا کے بیرونی دباؤ کے کم ہونے سے غبارہ کے اندر کی ہائیڈروجن گیس پھیلتی جاتی ہے حتّٰی کہ ایک خاص حد تک پھیلنے کے بعد غبارہ پھٹ جاتا ہے اور نیچے گر پڑتا ہے۔ غبارہ کے اندر عام طور پر کم از کم دو آلات ہوتے مین یعنی ایک آلہ حرارت نویس جو خود بخود درجۂ حرارت کی پیمائش کرتا ہے اور ایک کاغذ کے لمبے ٹکڑے پر ہر لمحہ ایک یادداشت لکھتا جاتا ہے اسے انگریزی اصطلاح مین تھرموگراف (Thermograph) کہتے ہین، دوسرا ہوا کے دباؤ کی پیمائش کے لیے ہوتا ہے اور پہلے کیطرح یہ بھی اپنا کام خود بخود کرتا ہے اور ایک کاغذ کے لمبے ٹکڑے پر یادداشت لکھتا ہے اسے نقل نویس (بیروگراف Barograph) کہتے ہین ان دونون آلات کے مختصر مجموعہ کا نام میٹیروگراف Metereo graph ہے۔ کمال یہ ہے کہ میٹیروگراف کا مجموعی وزن ایک چھٹانک سے کم ہوتا ہے اور اسی ہلکے پن کیوجہ سے غبارہ مع آلات دس بارہ پندرہ بلکہ بعض اوقات ۱۸ میل کی بلندی تک اوپر چڑھ جاتا ہے۔ غبارہ کے اندر آلات کے ساتھ ایک انعامی اشتہار ہوتا جس مین پانے والے کے لیے غبارہ اور آلات کو حفاظت سے بند کر کے مالک کے پاس واپس بھیجنے کے لیے مفصل ہدایات درج ہوتی ہین۔ اس ترکیب سے بہت سے غبارے اپنے فرض کی تکمیل کے بعد اپنے مالک کے پاس پہنچ جاتے ہین۔ نہ صرف خشکی پر بلکہ سمندر مین بھی غبارہ کے ضائع ہونیکا کم امکان ہے کیونکہ یوروپ جہان یہ سب علمی چرچے ہین وہان کی ہوا مین بھی علم کی لہرین سرایت کر گئی ہین اور ہر پیر و جوان علمی مشاغل کی اعانت مین سرگرم ہے۔

اسٹرٹیوسفیر یعنی ہمارے کرۂ زمہریر کے متعلق ایک دلچسپ امر دریافت طلب امر یہ ہے کہ سطح زمین کے اوپر مختلف مقامات پر کرۂ حرارت (ٹراپوسفیر Troposphere) اور کرۂ زمہریر مین حد فاصل کی بلندی کیا ہے اور وہان درجۂ حرارت کیا ہے بالعموم دونون کرون کی حدود فاصل ایک دوسرے سے بدیہی طور پر ممتاز ہوتی ہین گو بعض حالات مین یہ بھی پایا گیا ہے کہ درجۂ حرارت میلون تک بہت آہستہ آہستہ کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ انگلستان کے اوپر کرۂ زمہریر کی نچلی تہ ۵ سے ۶ میل کی بلندی پر شروع ہوتی ہے اور اسکا درجہ حرارت تخمیناً منفی ۲۵ فارن ہیٹ ہے۔ دنیا کے مختلف حصو نپر مشاہدات کا موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کرۂ زمہریر کی بلندی خط استوا کے اوپر سب جگہون سے زیادہ اور قطبین کے اوپر سب جگہون سے کم ہے جتنی زیادہ بلندی ہوتی ہے درجۂ حرارت اتنا ہی کم ہوتا ہے لہذا اگر کرۂ حرارت کسی مقام کے اوپر زیادہ بلندی پر ختم ہوتا ہے تو وہان کرۂ زمہریر کا درجۂ حرارت بہت کم ہوتا ہے۔ ان امور کے انطباق سے یہ حیرت افزا نتیجہ نکلتا ہے کہ سب سے زیادہ سردی ہوا کے اعلیٰ طبقات مین خط استوا کے اوپر ہے نہ کہ قطبین کے اوپر۔ وسط افریقہ مین ایک صعود سے معلوم ہوا کہ کرۂ زمہریر کا درجۂ حرارت جھیل وکٹوریا نینزا کے اوپر منفی ۱۱۹ درجہ فارن ہیٹ یعنی پانی کے درجۂ حرارت انجمادی سے ڈیڑھ سو درجے نیچے۔ مصنوعی طریقون سے اس سے کم درجہ کی سردی حاصل کرنا ممکن ہے لیکن غالباً قدرت مین یہ سب سے کم درجہ کی سردی ہوگی۔

فیروز الدین مراد

لارڈ کیلون

سر ولیم ٹامسن، جو اپنی عمر کے اخیر حصہ مین لارڈ کیلون کے نام سے مشہور ہوئے، انیسوین اور بیسوین صدی کے نہایت مشہور و معروف عالم طبعیات و ریاضیات تھے۔ اپنی کوششون سے اُنھون نے جو قابل قدر اضافہ علمی اکتشافات مین کیا ہو، وہ کسی اور عالم کو نصیب نہین ہوا۔ برقیات کے متعلق اُنھون نے کئی بیش قیمت اُمور معلوم کیے اور اس کے متعلق بہت سی مفید اختراعات بھی کین، جن کی وجہ سے انکا نام سائنس کی دُنیا مین ہمیشہ چمکتا رہیگا۔ علما و محققین کے دربار مین آپ کا قول ناطق سمجھا جاتا ہو۔ کئی عمدہ کتابین بھی اُنھون نے تصنیف فرمائی ہین جو یونیورسٹیون کے سائنسی نصاب مین داخل ہین۔

یہ امر مسلمہ ہو کہ لڑکپن مین جو اثر بچے پر پڑتا ہو وہ عمر بھر قائم رہتا ہو۔ لارڈ کیلون ہر فن مولا اور گرامی قدر عالم تھے۔ اسلئے طبعًا دل مین یہ سوال پیدا ہوتا ہو کہ وہ کون سے اثرات اور صحبتین تھین جن سے لارڈ موصوف کے دل و دماغ پر اسقدر مستقل اور انقلاب خیز اثر پیدا ہوا۔

لارڈ کیلون کے والد، پروفیسر ٹامسن آئرلینڈ کے رہنے والے تھے اُنھون نے گلاسگو یونیورسٹی مین تعلیم پائی۔ السنۂ قدیم (لاطینی و یونانی) ریاضیات اور نیچرل فلاسفی (علم طبعی) مین انعامات حاصل کیے۔ ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد الٰہیات اور طبعیات کے لیکچرون مین بھی شریک ہوتے رہے ۱۸۱۵ء مین وہ بلفاسٹ اور آئرلینڈ کے شاہی دار العلوم مین اور چند سال بعد گلاسگو یونیورسٹی مین ریاضیات کے پروفیسر مقرر ہوے۔ ۱۸۱۹ء مین اُنھون نے "علم الحساب" پر ایک کتاب تصنیف کی تھی، جو نہایت مستند اور ایک اعلیٰ پایہ کی کتاب سمجھی جاتی ہو۔ یہ کتاب اسقدر مقبول ہوئی کہ ساٹھ سال کے عرصے مین بہتر مرتبہ طبع ہوئی۔ یہ کتاب پروفیسر جیمس ٹامسن کی وسیع ریاضی دانی اور عالمانہ طریقۂ تعلیم کا زندہ ثبوت ہو۔ جب وہ بلفاسٹ مین پروفیسر تھے تو علم ہندسہ، جغرافیہ، فلکیات اور کیل کلس (Calculus) یعنی اعلیٰ ریاضی پر بھی کتابین تصنیف کی تھین۔ آپکا بڑا بیٹا بھی علمی مسائل پر بحث کرنے لگا، اور اُس نے بھی ریاضیات مین خاص دستگاہ بہم پہنچائی۔

اِس سے صرف یہ دکھانا مقصود ہو کہ سر ولیم ٹامسن کی زندگی کا ابتدائی حصہ کس قسم کے خیالات اور اسباب مین صرف ہوا کہ اُنکی طبعیت پر ایسی تاثیر ہوئی کہ شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار مین وسیع جگہ کا استحقاق حاصل کیا۔

سر ولیم ٹامسن ۲۶۔ جون سنہ ۱۸۲۴ء کو شہر بلفاسٹ مین پیدا ہوئے آپ اپنے والد کے دوسرے بیٹے تھے جب ان کے والد گلاسگو یونیورسٹی مین پروفیسر مقرر ہوئے، اُسوقت اِن کی عمر آٹھ سال کی تھی۔ دو سال بعد سارا خاندان ایک جزیرہ کو گیا۔ وہان کے فطری مناظر بہت دلفریب اور دلکش تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بچون کے دل پر کوہستانی مناظر کا بہت گہرا اثر ہوا۔ انھین قدرتی مناظر کے باعث ان کا اشتیاق تجسس بہت چست ہو گیا۔ ہزارہا قسم کے نئے پودے اور جانور ایسے تھے جنھین بچے بڑے شوق سے دیکھتے اور اُنکے متعلق مختلف سوال کرتے تھے۔ پروفیسر جیمس ٹامسن گوناگون علمی مذاق اور قاموسی علم و دانش کے آدمی تھے، اسلیئے وہ ارضی تحقیقات مین مصروف ہو گئے۔ اِس سے اندازہ ہو سکتا ہو کہ ولیم ٹامسن نے طبعیات اور ارضیات کو کیون اپنے خاص علوم قرار دیا، اور انھین کی تحقیقات اور ترقی مین عمر بسر کر دی۔

دس برس کی عمر مین ولیم ٹامسن نے گلاسگو یونیورسٹی سے

امتحان پاس کیا۔ دونون بھائی ایک ہی جماعت مین تھے، مگر ولیم ہمیشہ اول رہتا تھا۔ اِس زمانے مین چھوٹے بھائی نے اپنی تیزفہمی اور غیر معمولی ذہانت اور وسعتِ علم کے باعث اپنے ہم سبقون کے درمیان خاص نام پیدا کر لیا تھا۔ اُس زمانے مین امتحان کے اچھے نتائج پر بہت کم انعام ملتا تھا۔ مگر جماعت کے دوسرے لڑکون نے ولیم کو کثرت رائے سے انعام کا حقدار قرار دے رکھا تھا۔ جو لڑکے ریاضیات اور علم طبیعی مین ڈگری حاصل کرنے کے خواہشمند تھے، اُن کے نصاب مین ہندسہ مین ایولوئس اور لاگرانج کی معرکۃ الآرا تصانیف، علم طبیعی مین نیوٹن کے "اُصولِ اولیہ" اور لاپلیس کی "ترکیب اجرام فلکی" کتب شامل تھین۔

۱۸۳۹ء مین ولیم نے ایک خاص مضمون "کرۂ ارض کیحالت زمانۂ آئندہ مین کیا ہوگی؟" کے عنوان پر لکھکر یونیورسٹی سے انعام حاصل کیا۔ ایک پندرہ سال کے لڑکے کے لیے یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ ولیم نے السنۂ قدیم اور منطق مین بھی انعامات حاصل کیے اور بڑے بڑے ذہین لڑکون کو مات دی۔

۱۸۴۰ء مین ولیم اپنے والد اور بھائی بہنون کے ساتھ جرمنی گیا۔ وہان پہلی مرتبہ اُس نے جرمن عالم فوریر کی شہرۂ آفاق کتاب "انتشارِ حرارت" پڑھی۔ اس کے مطالعہ سے اُس کے دل پر بہت گہرا اثر ہوا، اور وہ استخراج نتائج اور ریاضی طریقۂ استدلال کی خوبی کا قائل ہوگیا، اور تمام عمر اسی عالم کے اُصول و طریقہ سے ہدایت پذیر ہوتا رہا۔ وہان سے آکر گلاسگو گیا، اور ایک مضمون فوریر کے خیالات کی تائید مین لکھا اور جن لوگون نے اُس کے نظریہ پر حملہ کیا تھا اُنکی بھی ساتھ ساتھ تردید کی۔ دوسرا مضمون ولیم نے خلا مین گرم جسم کے سرد ہونے کے مسئلہ پر لکھا اُس کے تھوڑے عرصے کے بعد اُسنے ایک نادر مضمون "حرارت اور برق کے بعض مسائل کی مساوات"

پر لکھا، جسکے باعث علمی حلقون مین ولیم کا نام نہایت عزت سے لیا جانے لگا۔

پروفیسر جیمیس ٹامسن نے خیال کیا کہ کچھ عرصے بعد گلاسگو یونیورسٹی مین نیچرل فلاسفی کی پروفیسری خالی ہوگی، اور نیز وہان ایک اور شخص کا لڑکا کیمبرج سے ریاضیات کا اعلیٰ امتحان پاس کرکے آیا تھا لہذا اُنھون نے ولیم کو اس پُرانی تعلیم گاہ مین ریاضی کی اعلیٰ سند کے لیے بھیجا۔ ۱۸۴۱ء مین ولیم کیمبرج کو گیا۔ اسوقت اِس کے معلومات ریاضی اور طبیعی اسقدر اعلیٰ اور وسیع تھے کہ وہ دیگر اُستادون کی تصانیف پر نہایت بے تکلفی کے ساتھ تنقید کر سکتا تھا۔ وہان جاکر اُسنے بہت نیکنامی اور ہردلعزیزی حاصل کرلی جب ریاضی کے امتحان کا وقت قریب آیا تو اُسے بیحد تشویش ہوئی کہ اگر درجۂ اول مین پاس نہوا تو باپ کو بہت رنج ہوگا۔ خیر امتحان ہوا، اور جب نتیجہ شائع ہوا تو ولیم دوسرے نمبر پر آیا۔ اس سے اُسے اور اسکے باپکو بہت صدمہ ہوا۔ اسکے بعد ہی اسمتھ کا انعامی امتحان ہوا۔ اسمین ایک سوال حرکت رقیق کشش اجسام اور ٹمپریچر کی طبعی تمثیل پر بھی تھا۔ ولیم ٹامسن اس امتحان مین اول نکلا اور انعام کا مستحق ہوا۔ چونکہ یہ انعام ہر طالب علم حاصل نہین کرسکتا تھا، اسلیئے اسکو باعثِ امتیاز و فخر سمجھا جاتا تھا۔

۱۸۴۵ء کے شروع مین ولیم ٹامسن نے مشہور زمانہ محقق برقیات مائکل فیراڈے سے ملاقات کی اُسنے اِنھین کانچ کا ایک ٹکڑا تحفۃً دیا تھا جسے زندگی بھر ولیم ایک قیمتی چیز سمجھتا رہا۔ موسم گرما مین وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ پیرس گیا اور وہان مشہور فرنچ محقق طبعیات رگنال کی زیر نگرانی اُس کے کیمیاخانہ مین طبعیات کا مطالعہ کیا اور اِس نامی اُستاد کے طریقۂ تحقیقات کو خوب دیکھا بھالا۔ یورپ مین یہ قاعدہ ہی کہ آسودہ حال لوگ اپنے لڑکون کی تکمیل تعلیم کے لیے ڈگری کا امتحان ختم کرتے ہی انھین ممالک غیر کی سیاحت کے لیے بھیجدیتے ہین، جن سے اُنکا مشاہدہ

اور تجربہ وسیع ہوجاتا ہے۔ اسی مقصد سے ولیم ٹامسن کو فرانس وغیرہ بھیجا گیا تھا کہ اسکی تعلیم درجۂ کمال تک پہنچ جائے۔ چنانچہ رگنال کا کیمیا خانہ اور اسکے طریقۂ تحقیق کے مشاہدے سے اُسے بہت فائدہ حاصل ہوا۔

۱۸۴۶ء مین گلاسگو یونیورسٹی کے پروفیسر علم طبیعی کا انتقال ہوگیا اور اتفاق رائے سے ولیم ٹامسن اسکا جانشین منتخب ہوا۔ یہ انتخاب نہ صرف اُسکے لیے بلکہ اُسکے رشتہ دارون اور دوستون کے لیے بھی بیحد خوشی کا موجب ہوا۔ ۱۸۴۹ء مین گلاسگو مین ہیضہ نمودار ہوا جسمین اس کا باپ جیمس ٹامسن مرگیا اور اسکی جگہ پر کرنیکے لیے بلیک برن نامی اسکا ایک دوست ریاضی کا پروفیسر منتخب ہوا۔ اسکاٹلنڈ مین یہ عام دستور ہے کہ یونیورسٹی کے پروفیسر اور ڈاکٹر وغیرہ انتخاب سے مقرر ہوتے ہین۔ انگلستان کی یونیورسٹیون مین یہ دستور نہین ہے۔ ولیم ٹامسن نصف صدی تک یونیورسٹی مذکور مین علم طبیعی کے پروفیسر رہے اور دنیائے علمی کی کائنات مین اپنی اختراعات سے بیش قرار اضافہ کیا۔

۴۔ نومبر ۱۸۴۶ء کو پروفیسر ٹامسن نے نیچرل فلاسفی پر پہلا لکچر دیا۔ اسے آپنے بہت ہوشیاری سے مرتب کیا تھا۔ اگرچہ سالم لکچر لکھا ہوا تھا مگر جماعت کے سامنے جاتے ہی وہ گھبرا سے گئے اور جلدی جلدی لیکچر پڑھ ڈالا۔ رفتہ رفتہ بولنے کی مہارت ہوگئی اور جھجک بھی جاتی رہی اور تب اپنے مطلب کو لڑکون کے ذہن نشین کرنے مین کامیاب ہوتے رہے جب صبح کو جماعت مین جاتے تو سب سے پہلے دعا مانگتے، اور پھر اپنا لیکچر شروع کرتے۔ پہلے اُصول بیان کرتے، پھر آلاتِ طبعی کے ذریعے سے تجربے دکھاتے۔ بعض دفعہ دوران لیکچر مین کوئی نیا مسئلہ دریافت کرلیتے جس کے انکشاف مین وہ کئی دن سے مصروف تھے کبھی لیکچر دیتے وقت بھٹک کر کہین سے کہین چلے جاتے اور اُس مسئلہ کا تذکرہ چھیڑ دیتے جس پر وہ کچھ دیر پہلے غور و فکر کر رہے تھے۔

۱۸۹۹ء مین آپنے بوجہ کہن سالی اس آسامی سے قطع تعلق کرلیا۔ آپنے ریاضیات اور علمی طبعیات کے تمام شعبون مین تحقیقات کی، اور کئی باتین ایسی معلوم کین جن سے علما ناواقف تھے۔ علم حرارت مین ایک نیا نظریہ قائم کیا اور اُسے توسیع دی۔ یہ نظریہ اُصول تھرمو ڈائنامیکل (Thermodynamical) کا حامی ہے۔ اس سے یہ مراد ہے کہ حرارت قوت مین منتقل ہوسکتی ہے۔ اس کے متعلق آپ نے ایک ایسا طریقہ وضع کیا ہے جس سے درجۂ حرارت و برودت ایسی صحت سے معلوم ہوسکتا ہے کہ اسمین کسی غلطی کا امکان نہین ہوسکتا طبعیات مین آپنے ایک نیا اُصول "انتشار قوت" یعنی (Dissipation of Energy) قائم کیا تھا۔ یہ اُصول سائنس مین بہت وسیع اہمیت رکھتا ہے، اور اسکا اطلاق بھی نہایت شاندار اور فلسفیانہ بنگیا ہے۔ اس کا ذکر ہم لارڈ کیلون ہی کے الفاظ مین کرتے ہین:۔

> عالم موجودات مین یہ ایک عالمگیر میلان ہے کہ قوت میکانکی خارج ہوکر پھیلتی رہتی ہے۔ یہ قوت جتنی خارج ہوتی ہے بے جان اشیا کے فطری عمل سے بحال نہین ہوتی، اور نہ ذرّون کے اجتماع سے اسکی کمی پوری ہوتی ہے۔ خواہ وہ نباتی زندگی کے عمل سے ہون یا جاندار کی قوت ارادہ کے تابع ہون۔ ایک زمانہ تھا جب کرۂ ارض جاندارون کی ہستی کے ناقابل تھا۔ اور کچھ عرصہ بعد وہ پھر اِن کے رہنے سہنے کے قابل نہ رہیگا۔ ان البتہ اگر موجودہ فطری قوانین کے عمل مین کچھ تغیر واقع ہوجائے تو دوسری بات ہے۔

یہ خیال آپنے اپنے ایک مضمون مین ظاہر کیا تھا جسکا عنوان "فطرتاً قوت کا عالمگیر میلان" تھا۔ اس خیال کو اسطرح سے واضح کیا جاتا ہے کہ آفتاب سے دس لاکھ کا بیان حرارت خارج ہوتی ہے اور اسمین سے

صرف ۱۲۲۰ اکائیان سیارون مین آتی ہے، باقی خلا مین پھیلکر ضائع ہوجاتی ہی اور حرارت قوت قرار دی جاتی ہو کسی زمانے مین آفتاب اس قوت سے محروم ہوجائے گا۔

لارڈ کیلون نے طبعیات کی تحقیقات مین ریاضی طریقہ استدلال اور اُصول سے کام لیکر جدت طبع کا ثبوت دیا۔ ایتھر کی ماہیت اور ساکن اجسام سے متعلقہ مسائل بھی اسی سے حل کئے، اور ذرّون کی خاصیت کی توجیہ کرتے ہوے اِن سے گردابی حرکت بھی اسی قاعدے سے منسوب کی ہی۔ مگر آپنے برق اور مقناطیس کے متعلق سبسے زیادہ کام کیا ہی۔ بحری تار برقی اور برقی کو قوتِ میکنکہ قرار دیکر صنعت و تجارت پر بڑا احسان کیا ہی۔ انگلستان اور امریکہ کے درمیان بحری تار برقی کا سلسلہ قائم کرنے مین جو کامیابی حاصل ہوئی تھی وہ آپ ہی کی مساعی حسنہ اور برقی دریافتون کی وجہ سے ہوئی ہی۔ ۱۸۵۸ء اور ۱۸۶۹ء کے درمیان بحر اطلانطک اور دیگر سمندرون کے وار پار جو بحری سلسلہ تار برقی قائم ہوا ہی، وہ آپ ہی کے برقی اُصولون کی عملی صورت ہی۔ برق کے متعلق آپ نے کئی نازک اور باریک آلات وضع کیئے جن سے انجنیرونکو بہت فائدہ پہنچا۔

لارڈ کیلون کو فن جہازرانی کا بھی شوق تھا۔ اسکے متعلق آپ نے ایک قطب نما جہاز رانونکی ہدایت کے لیے بنایا، اور سمندر کی گہرائی معلوم کرنے کی بھی ایک کل تیار کی۔ قطب نما کی تصیح اور مد و جزر کی تحقیقات کے لیے کئی خاص طریق وضع کیئے۔ علاوہ ازین کئی سو مضامین مختلف طبعی و ریاضی و برقی علوم کے متعلق شائع کیئے۔ اِن مضامین کا شمار ساڑھے چھ سو سے زائد ہی، جو کئی مسلسل جلدون مین طبع ہوئے ہین۔

لارڈ کیلون نے دو شادیان کی تھین۔ پہلی شادی ۱۸۵۲ء مین ایک نامی عالم کرّدم کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ اسکا انتقال ۱۸۷۰ء مین ہوگیا۔ دوسری شادی مس بلانڈی (متوطن مڈیرا واقع بحر اوقیانوس) کے ساتھ ۱۸۷۴ء مین ہوئی۔ ۱۸۶۱ء مین آپ برف پر لڑھکتے ہوے گر پڑے تھے جس سے ران کی ہڈی کا بالائی سرا ٹوٹ گیا۔ اُسکی وجہ سے آپ عمر بھر لنگڑے رہے۔ کئی ماہ تک ٹانگ باندھکر پڑے رہے، مگر اس زمانے مین کاغذ اور پنسل آپ کے غمگسار اور ہمدم تھے۔

۱۸۶۶ء مین بحری تار برقی کا سلسلہ قائم کرنے مین جو نمایان خدمات انجام دی تھین اُن کے اور نیز دیگر قابل قدر اکتشافات کے صلے مین آپ کو نائٹ کا خطاب مرحمت ہوا۔ پھر ۱۸۹۲ء مین ملکہ وکٹوریہ نے آپ کو لارڈ کے خطاب سے ممتاز فرمایا۔ اُسوقت آپ رائل سوسائٹی کے پریسیڈنٹ تھے۔ پھر ملک معظم شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم نے آپ کو "آرڈر آف میرٹ" مین شامل فرمایا۔

اپنے وسیع طبعی علوم اور سائنسی اکتشافات کی بدولت آپ تمام مہذب دُنیا مین مشہور ہوگئے۔ تمام یونیورسٹیون اور سائنس کی انجمنون نے آپ کو اعزازی ڈگریان عطا کین۔ فرانس اور جرمنی نے خاص طور پر اپنی قدردانی کا اظہار کیا۔ آپ بہت قوی ہیکل تھے اور کام سے کبھی نہین تھکتے تھی۔ آخر عمر مین درد شقیقہ کا دورہ لاحق ہوگیا تھا جس سے آپ کو سخت تکلیف ہوتی تھی مگر دورہ ختم ہوجانے پر آپ پھر اپنے کام مصروف ہوجاتے تھے۔

۱۹۰۷ء شروع موسم سرما مین لیڈی کیلون بیمار ہوگئین۔ ۲۲ نومبر کو لارڈ ممدوح کو بھی سردی لگ گئی۔ ادھر بیوی کی علالت کی تشویش تھی، اُدھر اپنی طبیعت ناساز، اِس سے جسم پر بہت مضر اثر ہوا، اور آپ صاحب فراش ہوگئے۔ تاہم اپنے کام مین لگے رہے۔ ایک دو ہفتہ اسی طرح مرکھپ کے گذارے مگر روز بروز طبیعت نڈھال ہوتی چلی گئی جسمانی قوت رفتہ رفتہ سلب ہونے لگی۔ آخر کار ۱۸ دسمبر ۱۹۰۷ء کو اس جہان فانی سے رحلت فرمائی۔

اسوقت آپ کی عمر تراسی سال کی تھی۔ ۲۳۔ دسمبر کو آپکی لاش نہایت تزک و احتشام کے ساتھ ویسٹ منسٹر ابی مین دفن کیگئی۔ نماز جنازہ سادگی آمیز شان کے ساتھ ہوئی جسمین سب بڑے بڑے آدمی شریک تھے۔

لارڈ ممدوح کے شاگردون مین بہت سے نام آور لوگ ہین جو اسوقت شاندار مراتب پر ممتاز ہین۔ پروفیسر صاحبان جینک، ارٹن، پیری، انڈیگرے، گبسن، اور کارس لا آپ ہی کے شاگرد ہین۔ سر ولیم رامزے مشہور عالم کیمسٹری اور کنٹربری کے موجودہ آرچ بشپ صاحب بھی آپکے نامی گرامی شاگرد ہین۔ جاپان مین بھی کئی نامی مدبر اور عالم آپ کے شاگردون مین سے ہین۔ اپنے شاگردونکے آپ بہت خیرخواہ تھے اور ہر طرح اُنکی مدد کیا کرتے تھے۔

۱۸۹۶ء مین لارڈ کیلون کی "جوبلی" ہوئی تھی جسمین تمام مہذب ممالک کی یونیورسٹیون اور انجمنون کے وکیل شریک ہوے اور لارڈ ممدوح سے اظہار عقیدت کیا۔ اس موقع پر آپنے جوابی تقریر کرتے ہوئے سر آئزک نیوٹن کے ہمزبان ہوکر فرمایا:۔

"پچپن (۵۵) سال کی تحقیقات کے بعد میرا خیال ہو کہ برقیات کے بارے مین میرا علم طالب علمی کے زمانے سے کچھ ہی بہتر ہو۔"

جس سے غالبًا آپ کی یہ مُراد ہوگی کہ برقیات کا میدان نہایت وسیع ہو۔ لارڈ کیلون بیسوین صدی کے آئزک نیوٹن تھے۔ ان دونون عالمون مین بہت کچھ مشابہت پائی جاتی ہو۔ سر آئزک نیوٹن کے اُصول اولیہ ابتک مستند سمجھے جاتے ہین، اسیطرح آپنے جو تحقیقات طبعیات اور برقیات مین کی اور اسکی بنا پر جو اُصول قائم کیے وہ عرصہ دراز تک مسلمہ و مقبول رہین گے۔

جے۔ آر۔ رائے

انسانی دماغ کی ماہیت

"دُنیا مین سب سے عجیب بلکہ سب سے قیمتی، مادہ وہ ہو جس سے دماغ تیار ہوتا ہو۔ اگر ہم اس مادہ کو بخوبی سمجھ سکتے اور اس کے اجزا کی پہچان ہمین حاصل ہو سکتی، تو انسان کی ہستی کے متعلق ہمین بہت سے راز معلوم ہو جاتے۔" (سر جیمس کرکٹن براؤن)

وہ سفید مادہ جسکو عرفِ عام مین دماغ کے نام سے پکارا جاتا ہو، ساخت کے لحاظ سے مختلف حیوانات ہی مین مختلف نہین ہوتا بلکہ ایک ہی انسانی دماغ کے مختلف حصونمین ایک دوسرے سے اختلاف کھتا ہو۔ جن عناصر سے وہ مرکب ہو اُنکی تعداد، صورت، انتظام اور تعلق کے اعتبار سے دو انسانی دماغون کا مادہ کبھی یکسان نہین ہوتا۔ نہ آج تک کبھی یکسان دیکھا گیا، اور نہ آئندہ دیکھا جا سکتا ہو۔ کیونکہ اسکا تعلق ہی انفرادی شخصیت سے ہو۔ لیکن کیمیائی ترکیب کی رو سے دیکھو تو دماغی مادہ قریب قریب ہر حالت مین یکسان ہی پایا جاتا ہو۔ ایک امتحانی نلی مین کسی بیوقوف اور دوسری مین کسی فیلسوف کے دماغی ٹکڑے کو رکھکر ان کا تجربہ اور ان تجربات کا مقابلہ کرو تو دونون مین ذرہ برابر فرق نہ معلوم کرسکو گے۔ باوجود اس کے یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہو کہ دونون صورتون مین کیمیائی اختلافات ضرور موجود ہوتے ہین۔ قصور اگر ہو تو صرف ہماری نظر یا سمجھ کا ہو۔

دماغ کی خاص خاص مریضانہ حالتون مین عصبی ریشون اور اِس رقیق مادہ کے اندر جو دماغ اور ریڑھ سے تعلق رکھنے والی ہڈی اور گنبد کو چکنا کیئے رکھتا ہے کیمیائی تبدیلیان دیکھی گئی ہین اور یہ قرین قیاس ہے کہ دماغی مرکبات اور اجزا مین فرق واقع ہونے سے انسان کے مزاج اور اس کے عادات مین بھی فرق آجاتا ہے۔

وہ تمام عجیب وغریب باتین اور حیرت خیز عقلی ونقلی دلائل جو انسان کو سوجھتے ہین درحقیقت اِس دماغی مادہ کی مضبوطی اور عمدگی سے تعلق رکھتے ہین۔ یہی وجہ ہے کہ ہر حالت مین دماغ کی مناسب غذائیت کو نہایت اہم معاملہ سمجھا جاتا ہے۔ اگر تم دماغ سے کام لینا چاہتے ہو تو ضروری ہے کہ اسے مناسب غذا بہم پہنچاؤ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کونسی غذا ہے جو دماغی تقویت کے لیے بہترین سمجھی جاسکتی ہے۔ یہ ایک نہایت دلچسپ سوال ہے اور ہم چاہتے ہین کہ ان سطور مین اس پر کسیقدر تفصیل کے ساتھ بحث کیجائے۔

حکما متفق ہین کہ جسم کے باقی حصون کیطرح دماغ کو بھی باقاعدہ غذا ملتی رہنی چاہیے جس حالت مین انسان کے خون کا دوران باقاعدگی سے ہوتا ہے تو جسم دماغ کے روبرو متعدد اغذیہ پیش کرتا ہے۔ انہین سے جو چیزین اس کے مطلب کی ہوتی ہین دماغ انھین منتخب کرلیتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے خون اور اسکا دوران ہمیشہ باقاعدہ نہین ہوتا۔ بعض اوقات خون کمزور ہوتا ہے۔ اس صورت مین دماغ کو اسکی پوری غذا حاصل نہین ہوتی اور اسکی طاقت کم ہونے لگتی ہے بعض اوقات خون غلیظ ہوجاتا ہے اس وقت دماغ کو ضرورت سے زیادہ چیزین ملتی ہین اور وہ بھی اسکے لیے خرابی کا باعث ثابت ہوتی ہین۔ ان دونون حالتون کے علاوہ بعض صورتون مین خون کے ساتھ خراب اجزا دماغ تک پہنچ جاتے ہین جن سے اسکے اندر زہریلا مادہ پیدا ہوجاتا ہے۔

سچ پوچھو تو کوئی چیز خصوصیت کے ساتھ ایسی نہین جسے دماغی غذا قرار دیا جاسکے۔ لیکن خوراک کے بعض اجزا اس قسم کے ہین جو دماغ کی غذائیت کے لیے ضروری تصور کیئے جاتے ہین۔ اور ان مین سے جس کو سب سے بڑا رتبہ دیا گیا ہے وہ فاسفورس ہے۔ بکنر کا قول ہے کہ "فاسفورس کے بغیر انسان مین سوچنے کی طاقت نہین آسکتی"۔ لیکن یہ بیان ایک قسم کے مبالغہ پر مبنی ہے جسکی بنا اس اصول کو قرار دیا جاسکتا ہے کہ ایک خاص فاسفورس دار چربی دماغی اجزا کی ساخت مین موجود پائی جاتی ہے۔ مبالغہ اس لیے ہے کہ اگر ہم کہین "گندھک یا لوہے کے بغیر انسان مین سوچنے کی طاقت نہین ہوتی" تو وہ بھی کچھ کم درست نہین ہے۔

جب سے (۱۶۶۹ء) فاسفورس دریافت ہوا ہے اسے دماغی تکمیل کے لیے جزو لازم سمجھا جاتا رہا ہے۔ گو یہ خیال سائنٹفک تحقیقات پر اسقدر مبنی نہین جتنا بعض لوگونکا خیال ہے۔ باوجود اس کے جدید تجربات اور دریافتون نے اِس امر کی تصدیق کی ہے کہ اس سے دماغی ترقی عمل مین آتی ہے جن حالتونمین دماغی ترقی زیادہ تیز دیکھی گئی اسکی وجہ فاسفورس کا مقدار کثیر مین موجود ہونا ہی پایا گیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جس وقت دماغ اور ہڈیان بالیدگی کے عمل مین ہون تو انھین فاسفورس کی کافی مقدار درکار ہوتی ہے۔

ان باتونکو مدنظر رکھتے ہوئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بچون اور کمزور دماغ والونکو فاسفورس کا معقول جزو بذریعہ خوراک بہم پہنچایا جائے اور ہرچند کہ غذا مین فاسفورس کی مقدار کم ہوجانیسے کوئی بدیہی مریضانہ علامات نمودار نہین ہوتین تاہم ہمارا اس نتیجے پر پہنچنا کچھ بے جا نہوگا کہ جس طرح غذا مین چونے کا جزو کم ہونیسے جسم کی ہڈیان نرم ہوجاتی ہین اسیطرح فاسفورس کی مقدار کا کم ہونا دماغ کو سست کرتا اور اسکی بالیدگی مین مانع آتا۔

لیکن باوجود اسکے کہ فاسفورس دماغی ترقی اور برقراری صحت کیلئے اسقدر ضروری سمجھا جاتا ہے اس کا استعمال فاسفیٹ کی قسم کے مرکبات کی صورت مین چندان ضروری نہین کیونکہ ضرورت کے اعتبار سے اسکی کافی مقدار معمولی ملے جلے کھانے مین پائی جاتی ہے۔ فی الحقیقت یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ آخر الذکر صورت مین استعمال کیا ہوا فاسفورس اول الذکر صورت کی نسبت زیادہ مفید ثابت ہوا ہے اس لیے مناسب ہے کہ جسم کو جس قسم کا فاسفورس مہیا کیا جائے وہ انکٹی یا مٹی ملے ہوے فاسفیٹ کی صورت مین نہ ہو بلکہ معمولی کھانون ہی کی صورت مین دیا جائے۔

مختلف کھانون مین فاسفورس کی مقدار کا تناسب مختلف ہوتا ہے، اور اسلیئے ضروری ہے کہ نوجوانون کے لیے جو کھانے منتخب کیئے جائین وہ ایسے ہون کہ انہین فاسفورس کی مقدار نسبتاً زیادہ ہو۔

اگر سبزی خورونکے عقیدے کے مطابق چند بچون کی پرورش صرف بقولات پر کیجائے تو کچھ عرصہ گذرنے پر ان کا دماغ یقیناً کمزور پایا جائیگا۔ اگر کسی بچے کو محض گاجرین اور شلغم کھلا کر بالغ کیا جائے جن مین علی الترتیب ۰.۲۶ اور ۰.۵۸ فیصدی فاسفورک ایسڈ ہوتا ہے تو اول تو انکا بالغ ہونا ہی مشکل ہے اور اگر ہون بھی تو دماغی اعتبار سے اس بچے کے مقابلے مین بہت کمزور رہون گے جس کی پرورش انڈون اور بھیڑ کے گوشت پر کیگئی ہو جن مین علی الترتیب ۰.۳۷ اور ۰.۴۲۵ فیصدی فاسفورک ایسڈ پایا جاتا ہے۔

تمام معمولی کھانون مین پنیر کے اندر فاسفورس کی مقدار بہت زیادہ پائی گئی ہے۔ اسکے اندر فاسفورس پنٹ اکسائڈ (فاسفورس ایک حصہ اور آکسیجن ۵ حصہ) کی مقدار ۱.۸ فیصدی پائی جاتی ہے۔ بحالیکہ معمولی سبزیون مین صرف ۰.۱۸ ہوتی ہے چونکہ پنیر مین فاسفورس کے علاوہ وہ تمام اجزا جو اعصاب و عضلات کو تیار کرنے مین مدد دیتے ہین، بہت بڑی مقدار مین موجود ہوتے ہین یہان تک کہ ایک پونڈ بہترین پنیر مین اسقدر دہنیت اور مادہ کیسین پایا جاتا ہے جتنا کہ ایک گیلن دودھ مین ہوتا ہے اسلیئے نوجوانون کے لیے یہ بہترین غذا خیال کی جاتی ہے۔ اس مین اگر کوئی نقص ہے تو صرف یہ ہے کہ کمزور معدے اسے ہضم نہین کر سکتے اور ظاہر ہے کہ نوجوان معدے بالغ معدون کے مقابلے مین کمزور ہوتے ہین۔

بعض لوگ پنیر سے طبعاً متنفر ہوتے ہین لیکن اکثر اسے اسلیئے استعمال نہین کرتے کہ وہ دیر مین ہضم ہوتا ہے اور اس دیر مین ہضم ہونیکی بڑی وجہ یہ ہے کہ لوگ اسے بخوبی چبا کر نہین کھاتے، یا پیٹ بھر کر کھانا کھانے کے بعد اسے زیادہ مقدار مین کھالیتے ہین، یا اسوقت کھاتے ہین جبکہ وہ خشک اور سخت ہو گیا ہو۔ اگر پنیر عمدہ قسم کا ہو اور عمدہ طور پر کھایا جائے تو یہ ایسی چیز ہے کہ بھوک لگاتی غذائیت بہم پہنچاتی ہے اور طبیعت کو فرحت دیتی ہے۔ گوشت کے مقابلے مین یہ نہ صرف ارزان غذا ہے بلکہ فائدہ مین بھی بہتر ہے اور جو لوگ گوشت نہین کھاتے اُن کے لیے نعمت غیر مترقبہ سمجھی جا سکتی ہے۔

اِن صفات کو مدنظر رکھتے ہوئے اور نیز اس خیال سے بھی کہ اس مین گوشت اور دماغی مادہ پیدا کرنے والے اجزا موجود ہوتے ہین اور یہ مادہ ٹاکسن سے جو نقرس پیدا کرتا ہے بری ہوتا ہے امید کیجا سکتی ہے کہ زمانہ آئندہ مین بچون اور کمزور دماغ والون کی غذا مین پنیر کا جزو کافی رکھا جایا کرے گا۔

فاسفورس کے دماغی غذا تسلیم کیئے جانے کے سلسلہ مین بہت سے لوگ جنھین دماغی محنت کا کام پڑتا ہے اس خیال سے مچھلی کا استعمال بکثرت کر رہے ہین کہ اس مین اسکا جزو غالب ہوتا ہے۔

لیکن تحقیقات سے معلوم ہوا ہی کہ یہ خیال ایک بڑی حد تک غلط ہی اور اسکا رواج ڈوما نامی ایک مشہور کیمیا دان کے ایک سرسری بیان پر مبنی ہی۔ جو لوگ مچھلی کے گوشت سے فاسفورس حاصل کرنا چاہتے ہین انھین اس تلاش مین یقیناً مایوسی حاصل ہوگی۔ باوجود اس کے اِن لوگون کے لیے جنھین بیٹھک کا اور دماغی کام کرنا پڑتا ہی مچھلی ایک عمدہ غذا ہی۔ کم از کم اس قسم کی مچھلیان جو زیادہ موٹی نہین ہوتین اور جنکے اندر اجزائے پروٹیڈ کا تناسب کم ہوتا ہی۔ ان نوجوانون کے لیے جن کا نظام عصبی اشتعال پذیر ہو اور بہت جلد اسمین فتور واقع ہو سکتا ہو گوشت کے بجائے مچھلی بہتر غذا تسلیم کی جاتی ہی۔

ایک زمانہ مین لوگون نے اسی فاسفورس کی تلاش مین اس خیال سے کہ یکسان چیزین ایک دوسرے کو غذائیت بہم پہنچا سکتی ہین حیوانات کا مغز بطور خوراک استعمال کرنا شروع کر دیا تھا لیکن جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہی کہ گو اِس قسم کی خوراک کا خواہ کوئی اور فائدہ ہو لیکن اِس سے انسانی دماغ پر کچھ مفید اثر نہین ہو سکتا۔

بعض حیوانات کے غدود یا ان غدود کے اندر سے حاصل کیے ہوے لعاب کے استعمال سے چند صورتون مین جو تعجب خیز اثرات دیکھنے مین آئے ہین انکی وجہ سے لوگون کے دل مین اُمید پیدا ہوگئی ہی کہ اگر جانورونکا مغز یا اُن کے مغز کا جوہر حاصل کرکے اسے بطور خوراک استعمال کیا جاے تو اس سے خون کو اِس قسم کی قابل تحلیل غذا حاصل ہو سکتی ہی جو دماغ کو تقویت دیتی ہی۔ جو لوگ سائنس کے مختلف شعبون مین دلچسپی لیتے ہین ان سے یہ بات پوشیدہ نہوگی کہ تجربات سے معلوم ہو چکا ہی کہ دماغی کمزوری کے ایسے مریضون کے اندر جن کی حالت حد درجہ افسوسناک تھی (یعنی جو قد کے بونے دل کے کمزور صورت مین مینڈک کے ایسے نظر آتے تھے) بھیڑون کے غدود سے ایک قسم کا مرکب تیار کرکے پہنچایا گیا تو نہ صرف ان کا قد بقدر ایک ہاتھ کے زیادہ ہو گیا بلکہ شکل و صورت بھی عمدہ نکل آئی جسکی وجہ محض یہ تھی کہ جو مادہ خود اِن کے اندر موجود نہ تھا وہ دوسری جگہ سے حاصل کرکے اِن کے اندر پہنچا دیا گیا۔ ایسے لوگون کی مثالین موجود ہین جو پہلے بالکل فاتر العقل تھے لیکن اس عمل سے ذہین اور سمجھدار ہو گئے۔

ان تجربات مین کامیابی حاصل ہونے کی وجہ سے حیوانی غدود و اجسام پر بھی عمل کیا گیا تاکہ غذائیت کی کمی اور دماغی کمزوری کے مختلف مدارج معلوم کیے جا سکین لیکن باوجود عرصہ دراز کی محنتون کے اِس بارے مین کوئی نمایان کامیابی حاصل نہین ہو سکی۔ اس قسم کے جوہر کا اثر بدن پر کچھ پڑتا ضرور ہی مگر دماغی امراض مین اِس سے اطمینان بخش فائدہ حاصل نہین ہو سکا۔ اِس صورت مین ممکن ہی کہ لوگ حیوانات کے مغز کو ایک لذیذ اور زود ہضم غذا سمجھکر استعمال کرتے ہین لیکن یہ ناممکن ہی کہ اِس سے انسانی دماغ کو وزندار یا مضبوط بنانے مین کوئی خاص مدد مل سکے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہی دماغ کے لیے کوئی خاص غذا تجویز نہین کی جا سکتی۔ زندگی کی تمام منازل مین کفایت شعاری اور فضول خرچی دونون کے انتہائی پہلوؤن کو چھوڑکر اگر مناسب اور عمدہ کھانا کھایا جاے تو دماغ خود بخود ان مین سے اپنے مطلب کی غذا چن لیتا ہی۔

بچپن مین جبکہ بچہ شیر خوار ہوتا ہی مان کا دودھ ہی اسکے لیے بہترین دماغی غذا ہی۔ مان کے دودھ مین جو تاثیر ہی وہ نہ تو انّا کے دودھ مین ہو سکتی ہی نہ گائے یا بکری کے، اور نہ اسکے

مقابلہ مین کوئی پیٹنٹ فوڈ یا بوتل مین دودھ پلانے کا طریقہ مفید قرار دیا جا سکتا ہی۔ بہت سی ننھی جانین محض اِسی لیے ضائع ہو جاتی ہین کہ انھین وہ غذا نہین دیجاتی جسکی وہ قدرتی طور پر حقدار ہین اور اِس طرح پر شیرخواری کے ایام مین نامناسب غذائین دے دے کر انکے دماغ کی بالیدگی مین رُکاوٹ پیدا کی جاتی ہی۔

ایام شیرخواری کے بعد زندگی کے تمام مدارج مین غذا کو عام اُصول کے مطابق باقاعدہ بنایا جا سکتا ہی۔ اس بات کی ضرورت بالکل نہین کہ دماغ کی تقویت کے لیے کوئی خاص غذا استعمال کیجائے۔ اسمین شک نہین کہ ہر عمر مین خوراک کی بہت سی غلطیون سے بچنا اور اسمین خاص ترا اہتمام کرنا ضروری ہی لیکن ان سب کی تفصیل اس جگہہ ناممکن ہی۔

ضروری ہی کہ زندگی کے ہر حصہ مین انسان کو مادہ پروٹیڈ کافی مقدار مین ملتا رہے کیونکہ یہی وہ چیز ہی جو جسمانی ریشون کو تیار کرتی ہی اور اسی کا دماغ سازی پر مفید اثر پڑتا ہی۔ جون جون انسان کی عمر زیادہ ہوتی جاے اسے لازم ہی کہ حیوانی غذا کا استعمال بھی بڑہادے کیونکہ مادہ پروٹیڈ قابل انہضام صورت اور کثیر مقدار مین اسی چیز کے اندر موجود پایا گیا ہی۔

انسان کی زندگی مین ایک خاص وقت ایسا ہوتا ہی جب دماغ کی مناسب غذائیت کا خاص طور پر خیال رکھنا ضروری ہی یعنی اسوقت جبکہ وہ بچپن سے نکلکر جوانی مین قدم رکھنے لگا ہو۔ اس تبدیلی کے ساتھ ہی خوراک کی خواہش مین بھی ایک نمایان تبدیلی واقع ہوا کرتی ہی۔

جس وقت عقل ڈاڑھ نکلتی ہی تو اسوقت کھانون کی رغبت مین بھی فرق واقع ہوتا ہی۔ لڑکے اس زمانے مین پھلون اور مٹھائی کو زیادہ پسند نہین کرتے بلکہ حیوانی غذا اور اسی قسم کی دوسری لذیذ چیزون کے خواہشمند پائے جاتے ہین۔ بخلاف اس کے لڑکیان مٹھائی کی زیادہ خواہشمند ہو جاتی ہین۔ بعض صورتون مین اِس تبدیلی کے ایام مین وہ مٹی کھریا مٹی، یا کچے چاول کھانے لگ جاتی ہین۔ اِن چیزون کا استعمال سخت مضر ہی اور اِس قسم کی عادات کو فی الفور ترک کر دینا لازم ہی۔ غرضکہ اس تبدیلی کے ایام مین اور اس کے بعد ایک عرصہ تک اس بات کا احتمال ہوتا ہی کہ انسان خراب یا کم غذا کھانے لگے اور اسے قلتِ خون کا مرض لاحق ہو جائے، اس لیے ضروری ہی کہ سن بلوغ کی نسبت اِن دنون مین غذا نہ صرف زیادہ بلکہ مقوی دیجائے اگر ایسا نہ کیا گیا تو عصبی کمزوری اور بےچینی پیدا ہو جائے گی۔ جس کے بعد ممکن ہی کہ مسکرات کے استعمال کی خواہش پیدا ہو جائے۔ درحقیقت یہی وہ زمانہ ہی جبکہ شراب پینے کی تباہ کن عادت اختیار کر لی جاتی ہی۔ پس لازم ہی کہ غذا کی طرف پوری توجہ دیکر الکحل کو اسکی تمام صورتون مین دور رکھا جائے۔ سرجیمز کرکٹن براؤن کا خیال ہی کہ "بعض لوگ جو مذہبی خیال سے یا کسی اور وجہ سے خاص خاص کھانون بالخصوص گوشت کا استعمال ترک کر دیتے ہین یہ بہت بُرا ہی جہان تک ہو سکے لوگون کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔"

ایک چیز البتہ ایسی ہی جو دماغ کے لیے خاص طور پر مفید سمجھی جا سکتی ہی اور جس کا بچپن اور اس کے بعد شباب سے بیشتر کے زمانے مین استعمال واجب ہی وہ چیز جو یا جئی کا آٹا (Oat-Meal) ہے۔ درحقیقت یہ تمام کھانون مین سب سے زیادہ غذائیت بخش چیز ہی اور اسمین چربی فاسفورس اور دیگر مقویات کے اجزا بافراط پائے جاتے ہین۔

اسمین کچھ شک نہین کہ سفید گیہون ہم ہندوستانیون

کی عام غذا ہی اور اسمین قابل تحلیل پروٹینڈ کی بہت سی مقدار پائی جاتی ہی کہ مین غذائیت اور چربی پیدا کرنیوالے مادّے بہت پائے جاتے ہین، چاول بسبب زیادہ نشاستہ رکھنے کے بعض اقوام مثلاً کشمیریون یا بنگالیون مین زیادہ استعمال ہوتے ہین، اور جو مین معدنی مادے زیادہ پائے جاتے ہین، تاہم ان سب باتون کو زیر نظر رکھتے ہوئے یہی تسلیم کرنا پڑتا ہی کہ جئی مین جو صفات موجود ہین وہ انمین سے کسی چیز مین بھی نہین پائی جاتین۔

اگر تم کسی شخص سے اسکا ذکر کرو تو وہ یہی کہے گا کہ جئی تو گھوڑون کی خوراک ہی۔ یورپ مین بھی سولے باشندگان اسکاٹ لینڈ کے بہت کم اقوام اسے استعمال کرتی ہین۔ حال مین ایک فرانسیسی نے لکھا تھا کہ "جئی کی روٹی موٹی اور کھُردری ہوتی ہی اور اسے صرف غریب ملکو نمین کھایا جاتا ہی"۔ لیکن کچھ عرصے سے اسکا رواج انگلستان مین زیادہ ہونے لگا ہی۔ بدقسمتی سے وہان بھی مزدور پیشہ جماعتین اسے اب کم استعمال کرتی ہین۔ نتیجہ یہ ہی کہ اس طبقہ کے لوگ اب ویسی مضبوط کاٹھی اور جسمانی تحریک نہین رکھتے جیسی ان کے پیشرؤون مین پائی جاتی تھی۔

جب سے جدید تہذیب نے ترقی حاصل کرنی شروع کی ہی لوگ ان سادہ کھانون کو چھوڑ کر چاء، بسکٹ، وغیرہ استعمال کرنے لگ گئے ہین۔ ایک مشہور اہل الرائے کا قول ہی کہ "جئی کا آٹا دودھ مین ملا کر استعمال کیا جائے تو لاکھ چائین اور قہوے اس پر سے قربان کر دیے جا سکتے ہین کیونکہ یہ مرد، عورت، بچہ، سب کے لیے بہترین غذا ہی"۔

حال کی بعض علمی تحقیقات سے اس بارے مین مزید روشنی حاصل ہوئی ہی کہ جئی کے آٹے کا اثر جسم پر کیا پڑتا ہی۔ تجربہ سے ثابت ہوا ہی کہ ۸ ہفتہ تک جن چوہون کی پرورش جئی کے آٹے اور پانی پر کیگئی انمین وہ غدود جسے اصطلاح مین (Thyroid Gland) کہتے ہین ان چوہون کے غدود کی نسبت جن کو دودھ اور روٹی کھلائی گئی تھی دوگنے تھے۔ جیسا کہ قبل ازین بیان کیا جا چکا ہی اس غدود کا لعاب جسم کے ہر حصہ مین غذائیت کا اثر پیدا کرتا ہی شاید یہی وجہ ہی کہ شمالی انگلستان کے باشندے بچپن مین جئی کے استعمال کے باعث مضبوط اور تنومند ہوتے ہین۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہی کہ جئی کا اثر اس غدود پر پڑتا اور دماغ سازی کے عمل مین بہت مدد دیتا ہی۔ یہ تھرام

شمس العلماء خواجہ حالی

اُردو شاعری کا جنم بھوم ہندوستان ہی لیکن اُسکی نشو و نُما فارسی شاعری کے زیر اثر ہوئی ہی۔ قاعدہ ہی کہ ابتدائی تاثرات کا رنگ انسانی طبائع پر آخر عمر تک گہرا رہتا ہی۔ اسی اُصول سے جب اُردو شاعری کے مختلف پہلوؤن پر نگاہ کرتے ہین تو ہمین اسبات سے کہ سنسکرت اور بھاشا کا اسپر رتی تک نہین پڑا تعجب نہین ہوتا میر و سودا سے لیکر غالب و مومن تک ایک لکیر کے فقیر بنے رہے ہین۔

ان صاحب کمالون کے علو مرتبت مین کسکو شک ہو سکتا ہی۔ خصوصاً غالب کے جنھون نے اس اندھی تقلید کے نقصانات کا اندازہ کر کے آخر اپنے لیے ایک دوسرا راستہ تلاش کر لیا۔ لیکن اسے ان بزرگون کا طبعی رجحان کہیے یا بعض خارجی و اضطراری اسباب کا نتیجہ کہ اپنے گلدستے کو اپنے باغ کے پھولون سے زیب دینے کی جگہ اُنھین اصفہان و شیراز کے باغبانون کا منت پذیر ہونا پڑا،

اور اس ایک فروگذاشت سے اُردو شاعری مین بعض ایسے عیوب پیدا ہو گئے جو ابتک اُسکے صاف وشفاف دامن کو داغدار بنائے ہوئے ہین۔

عرب سے قطع نظر خود عجم کی شاعری نے ابتک کئی پلٹے کھائے لیکن اُردو شعرا نے جو راگ روز اول سُنا تھا اُسی پر آخر تک سر دھنتے رہے۔ ہم اساتذۂ اُردو کی دماغ سوزیون کے دلی اعتراف کا ثبوت کئی دفعہ زبان قلم سے بھی دیچکے ہین اور اسمین کلام نہین، اُنھین کے کارنامے آج بھی اُردو لٹریچر کی لاج قائم رکھے ہین لیکن اس حقیقت سے چشم پوشی نہین ہوسکتی کہ اگر اُنھون نے "اصلیت" سے ذرا بھی کام لیا ہوتا تو اُردو شاعری مین تاثیر کلام کے اعتبار سے تو بھی کوئی کمی نہ رہتی۔ ہمارے بعض شعرا نے جنمین میر، درد، غالب، داغ، مجروح وغیرہ خصوصیت سے ذکر کے قابل ہین اپنے کلام مین تاثیر پیدا کرنیکی کوشش بہ کامیابی کی ہی اور اکثر نے جذبات انسانی اور واردات عشق کی صحیح اور سچّی تصویر اُتارنے مین کمال کر دکھایا ہی جسکا اقرار آجکل بھی کیا جاتا ہی جبکہ ایک گروہ بدقسمتی سے ملک مین ایسا پیدا ہو گیا ہی جسنے ایشیائی شاعری کی ہجوگوئی کا بار اپنے ذمہ لے رکھا ہی۔ اُن اُستادون کا کلام جو مبالغہ وتصنع سے بری ہی نیچرل محسوسات قلب کے لحاظ سے ہر طرح قابل قدر ہی اور چونکہ یہ باتین فطری وسیع النظری اور نازک خیالی کا نتیجہ ہوتی ہین اسلیئے اسمین وہ بے مزگی اور پھیکا پن نہین ہی جو عموماً چبائے ہوئے لقمے مین ہوتا ہی۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہی کہ یہ دلپذیر علمی نظیرین شاذ و نادر پائی جاتی ہین۔ الغرض سنسکرت اور بھاشا بلکہ عربی کے ساتھ بھی اعتنا نہ کرنیسے جو نقصانات ابتک عائد ہوئے اور ہو رہے ہین اُن کی تلافی اور بھی مشکل ہوتی اگر یہی سلوک مغربی خیالات کے ساتھ بھی کیا جاتا جن سے مستفید ہونے کے لیے ہمین حکومت برطانیہ عظمیٰ کا منت پذیر ہونا چاہیئے۔ طرز معاشرت اور عادات و خصائل کیطرح حکمران جماعت کے علم ادب کا اثر مفتوح قوم پر پڑنا ضابطہ قدرت کی سب سے پہلی دفعہ کے عین مطابق ہی۔ اسلامی ادبیات کا اثر ہندوون پر جیسا کچھ پڑا اُسکا ثبوت کایستھون اور کشمیری پنڈتون مین مل سکتا ہی نسیم اور سرشار اور سرور ایسے جادو نگار اگر اس دُنیا مین نہین ہین تو چکبست اور آبر وغیرہ بجائے خود زندہ مثالین ہین۔ برٹش گورنمنٹ کے ظل عاطفت مین ہندوستانیون کو مغربی طور پر تعلیم پانے کا موقع ملا اور اس سے جہان اور بہت سے مادّی و اقتصادی فوائد حاصل ہوئے وہان علمی منافع بھی نظرانداز نہین کیئے جا سکتے۔ لٹریچر کیطرف ہمین ان دنون جو تھوڑا بہت اعتنا پیدا ہو گیا ہی وہ سب اُس یورپی تشویق کا نتیجہ ہی جو نت نئی صورتون مین آئے دن جلوہ گر ہوتی رہتی ہی۔

ممکن نہ تھا کہ مغرب اور مشرق باہم ملین اور ایک دوسرے کے معائب ومحاسن سے متاثر نہون۔ مشرق کے متعلق مغرب نے جو رائے قائم کی ہی ہمین اُس سے یہان کوئی بحث نہین لیکن ہمارے لیے بہت سی باتون مین مغرب نے آئینہ کا کام دیا ہی اور اسی آئینہ مین جس پر جدید اُصول تنقید کی جلا کیگئی تھی ہمین اپنے علم ادب کے خط و خال نظر آئے ہین اور ہمین ایک حد تک معلوم ہو گیا ہی کہ اسکی حالت کیا تھی؟ اب کیا ہی؟ اور آئندہ کیا ہونی چاہیئے؟

فارسی، عربی، اور دیگر زبانون کی شاعری مختلف طبقون مین منقسم کی جاسکتی ہی۔ مثلاً

عشقیہ شاعری

رزمیہ شاعری

اخلاقی و مذہبی شاعری

نیچرل شاعری

قومی شاعری۔

عشق و محبت کے عنوان سے جسقدر مسالہ ہمارے اسلاف نے مہیا کیا ہی اُس سے ایک نہین بلکہ بیسیون او ر سیکڑون مندر پیکر حسن کی پرستش کیلئے تیار ہو سکتے ہین۔ رزمیہ شاعری کی کمی انیس و دبیر کے مراثی نے پوری کر دی ہی۔ اخلاقی اور مذہبی صنف سخن کی ترتیب جُداگانہ طور پر ہمارے یہان نہین ہی لیکن اساتذۂ اُردو کی غزلیات اکثر و بیشتر اخلاق و آداب کے مضامین سے ملو پائی جاتی ہین۔ نیچرل شاعری اُردو مین مفقود تھی لیکن مولٰنا آزاد نے ایک ایسی شاہراہ کی داغ بیل ڈالدی ہی جس پر چلنے کے بعد "برگ درختان سبز" کا ذوق آفرین منظر خود بخود آنکھون کے سامنے آجاتا ہی۔

نیچرل شاعری کیطرح قومی شاعری کا نام لیوا ابھی شعراء اُردو مین کوئی نہ تھا لیکن انگریزی مثل ہی کہ "ضرورت ایجاد کی ماں ہی" اور حقیقت شناس نظرون سے پوشیدہ نہین کہ جسطرح یہ مثل قدیم زمانے مین اُن نتائج کے اعتبار سے جو علمی اور تمدنی دُنیا مین ظہور مین آچکے ہین صحیح ثابت ہوئی ہی اُسیطرح آج بھی وہ صحیح ہی۔ مغربی تعلیم کے اثر سے ہندوستان مین بھی خیالات و جذبات کا جو انقلاب لازمی طور پر پیدا ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔ ایک طرف اگر ہربٹ سپنسر اور ہکسلے کے فلسفہ نے ارسطو و بوعلی سینا کی شہرت پر اپنا حق جمایا تو دوسری طرف گولڈسمتھ، ٹنیسن، اور بیرن کا رنگ تخیل میر و سودا کی مصوری پر غالب آنے لگا۔ صحیفہ فطرت کے حقیقی مبصرین کی اُردو مین کمی تھی لیکن شمس العلماء مولٰنا آزاد مرحوم کا "مجموعہ نظم" اسبات کا ثبوت ہی کہ اُردو مین بھی "معرفت کردگار" کے ایک ایک ورق مین دفتر کی وسعت پیدا کی جا سکتی ہی۔ ہمارے ادبیات کی خوش قسمتی ہی کہ آجکل علمی رسائل مین بعض اوقات نیچرل نظمین اس پایہ کی شائع ہوتی رہتی ہین جو اپنے صحیح معنون مین اُردو شاعری کا بہترین حصہ سمجھی جانے کی مستحق ہوتی ہین۔

رنگئی قومی شاعری؟ اسکا وجود متقدمین کے کلام مین نہین ہی اور متاخرین مین بھی حالی سے پہلے کسی نے اسپر توجہ نہ کی تھی۔ قاعدہ ہی کہ ضرورت سے اسباب خود بخود منتج ہوتے ہین۔ مُسلمانون کی حالت جیسی کچھ زبون تھی اُسکی صحیح اور سچی تصویر یہان دکھانا تحصیل حاصل ہی۔ مختصراً سمجھ لینا چاہیئے کہ حکومت کے ساتھ دولت و عزت اور اخلاق و آداب بھی اُنسے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ جہالت، لاعلمی، خود غرضی اور وہ تمام عیوب جو کسی تنزل پذیر قوم کے جزو لاینفک خیال کیے جاتے ہین مسلمانو نمین موجود تھے۔ ضرورت تھی ایک ایسے شخص کی جو انھین ذلت و ادبار کے اس قعر سے نکالے اِس اہم منشاء کی تکمیل کے لیے سرسید مغفور کی ذات مقدر ہو چکی تھی۔ مرحوم نے اپنی بیش قیمت عمر فلاکت زدہ مسلمانونکی فلاح و بہبودی کی کوششو نمین صرف کر دی اور آج اس مردہ قوم مین جو کچھ زندگی کے آثار پائے جاتے ہین وہ انھین کی مسیحائی کا صدقہ ہی۔

سرسید نے اپنے مبارک مقصد کی تکمیل کیلئے اپنے گرد و پیش بہت سے قابل آدمی جمع کر لیے تھے۔ مولٰنا حالی بھی اُسی قومی نورتن کے روشن اور درخشندہ جواہر ہین۔ شک نہین کہ سرسید کو ایک ایسے شخص کی ضرورت بھی تھی جو اپنی سحر آفرینیون سے اعجاز کا کام لیکر جمود کو حرکت مین لاوے اور جو اپنی ولولہ انگیز صدا سے دلونمین جوش پیدا کرے۔ تاثیر کلام نے دُنیا مین اکثر بڑے بڑے کام کیئے ہین اور اسکے متعلق متعدد تاریخی روایات مشہور ہین۔ حالی کی معجز بیانی نے اگرچہ سولن کیطرح یونان والونکو سیلمس کا قبضہ نہین دلادیا اور نہ لارڈ بائرن کیطرح دول یورپ کو یونان کی امداد پر آمادہ کر کے اُسکی بغاوت کی شاخ مین حکومت خود اختیاری کا پھل لگایا لیکن اتنا سب کو معلوم

ہی کہ جس زمانے مین سر سید کشتی اسلام کو جہالت و فلاکت کے بھنور مین چکر کھاتے دیکھکر اُسکے محفوظ رکھنے کی مساعی مین مصروف تھے اور بہت کم لوگ اُنکی پروا کرتے تھے اُسی وقت حالی کی ایک جگر دوز چیخ نے مسلمانون مین وہ ہلچل ڈالدی کہ سوتے بیدار ہو گئے، بیٹھے اُٹھ کھڑے ہوئے اور جو لوگ کھڑے تھے وہ دوڑنے لگے۔

مسدس جزر و مد اسلام یا مسدس حالی دُنیا کے اُن علمی ادبی کارنامون مین شمار کیا جاتا ہی جن کا پائدار اثر کسی قوم کے اخلاق معاشرت، اور تمدن پر پڑ سکتا ہی۔ حالی نے جسوقت اسلام کی گذشتہ شان و شوکت کی تصویر دکھا کر موجودہ ادبار و ذلت کا مرقع مؤثر الفاظ مین پیش کر کے مسلمانون سے صاف صاف کہدیا کہ جس کی یہ حالت ہو۔ مصرع

وہ قوم آج ڈوبیگی گر کل نہ ڈوبی

یہ ایک بجلی تھی جو آنکھون کے سامنے دوڑ گئی؛ رعد کی کڑک تھی جسنے دلونکو ہلا دیا۔ وہ دماغ جو اپنے متعلق کبھی سوچنے کے عادی نہ تھے روشن ہو گئے۔ پہلو مین درد پیدا ہوا اور درد بھی قوم کا۔ نگاہین منزل مقصود کی تلاش مین اِدھر اُدھر دوڑنے لگین اور ان تمام تحریکون سے کم از کم اسقدر فائدہ ضرور مرتب ہو گیا کہ مسلمانون کو اپنی پست حالت کا اندازہ ہو گیا اور اُنھین اپنا ایک نصب العین مقرر کر کے اُسکی جد و جہد مین مصروف ہونا پڑا۔

ملٹن کی ایک خاص نظم کی بابت کہا جاتا ہی کہ اگر وہ اسکے سوا اور ایک سطر بھی نہ لکھتا تاہم یہ نظم اُسکے کمال فن کی کفالت کرتی۔ مسدس حالی کا بھی یہی حال ہی۔ حالی کی علمی شہرت اسی کے بدولت ہوئی اور اُنھین قومی رہنمائی کی سند اسی نے دلوادی ہی بہت سے لوگ جو حالی کو غلطی سے شاعر نہین سمجھتے وہ بھی مسدس کی خوبیون کے معترف ہین اور اُسکے مطالعہ سے اثر اندوز ہوتے ہین۔

خیال کرنے کی بات ہی کہ تیرہ سو سال کے اسلامی واقعات کا نظم مین قلمبند کرنا کہ زبان کی لطافت، واقعات کی صحت، طرز بیان کی خوبی اور سب سے زیادہ یہ کہ کلام کی تاثیر کا کوئی پہلو نظر انداز ہونے پائے کوئی آسان بات نہ تھی لیکن مولینا حالی نے اِن تمام مرحلون کو جس خوش اسلوبی سے طے کیا ہے وہ اُنھین کا حق تھا اور اسکا انصاف کچھ وہی کر سکتے ہین جنھین مبدء فیاض سے مذاق سلیم و وجدان صحیح کا وافی حصہ ملا ہے۔ یہان اُن لوگون سے سوال نہین جو فطرتاً نکتہ چین اور عیب جو واقع ہوئے ہین یا جنھین یہ بات خواہ مخواہ پھر معلوم ہوتی ہی کہ دہلی و لکھنؤ کے آگے پانی پت کا نام بھی لیا جائے۔

مسدس حالی سہل ممتنع کا بہترین نمونہ ہی اور تسلسل مضمون کا اسقدر لحاظ کیا گیا ہی کہ اگر کہین درمیان سے دو ایک بند چھوڑ کر پڑھا جاے تو مطالب کی وہ وضاحت نہین باقی رہتی۔

تاثیر سخن اور سوز و گداز کے ماسوا مسدس حالی کی ایک بالا امتیاز خصوصیت یہ بھی ہی کہ اُسکا مطالعہ لڑکون، جوانون، اور بوڑھون کیلئے یکسان معنی خیز و موثر اور فرحت بخش ہی۔ یہ صفت اُردو کی شاید کسی اور کتاب مین نہوگی۔ فارسی مین "گلستان" البتہ یہی وصف رکھتی ہی۔

مسدس حالی کو نئی طرز کی شاعری کا سنگ بنیاد خیال کیا جاتا ہی اور یہ خیال اصلیت سے پُر ہی۔ حالی کی تقلید شعراء اُردو کو اس وجہ سے ناگزیر تھی کہ خیالات کا جو انقلاب علمی نقطہ خیال سے پیدا ہوا تھا وہ بہر حال پُرانی اور بے کیف شاعری کے حق مین ضرور سم قاتل تھا جن لوگون نے دوربین نظر سے کام لیکر اس رمز کو پیشتر سے سمجھ لیا اُنھون نے حالی کے اتباع پر اپنے طرز سخن مین تبدیلی کردی۔ اگر وہ ایسا نکرتے تو بھی زمانہ ایک نہ ایک دن

انھین ایسا کرنے پر مجبور کرتا۔

مولنا حالی کی اُس شہرت کا کفیل جو اُنھین آج ملک کا سرمایۂ ناز اور قوم کا چشم و چراغ بنائے ہوئے ہی اُن کا جدید رنگ کا کلام ہی لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ رنگ اختیار کرنیسے پہلے وہ شاعری کے کوچہ سے نابلد تھے۔ اُن کے ابتدائی حالات سے ناظرین واقف ہونگے لیکن ہم سیاق عبارت کیلئے یہان اختصار مدنظر رکھکر اُن کے سوانح قلمبند کرتے ہین اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ اُنھون نے کن کن تجربون کے بعد موجودہ طرز سخن کی پابندی اختیار کی ہی۔

مولنا حالی پانی پت کے ایک معزز خاندان کے سپوت ہین۔ پانی پت مین ایک محلہ انصاریونکا ہی۔ یہ خواجہ ملک علی صاحب کی اولاد مین جو ہرات سے ہندوستان آئے۔ بزرگ آدمی تھے۔ بادشاہ نے سر آنکھون پر لیا۔ پانی پت اور اُسکا ملحقہ علاقہ اُنھین بطور مدد معاش دیا گیا۔ آپکو اُس پرگنہ کا منصب قضارت بھی حاصل تھا۔ نرخ بازار کا تعین، نماز عیدین کی امامت، بزرگونکے مزارات کی تولیت، بھی ان کے تفویض تھی۔ مولنا حالی نسلاً انصاری اور بطناً سید ہین۔ آپ کے والد بچپن ہی مین اختلال دماغ کے عارضہ مین مبتلا ہو گئے تھے۔ ۹ سال کی عمر مین سایۂ مادری بھی سر سے اُٹھ گیا۔ ایسی حالت مین باقاعدہ تعلیم و تربیت کا ہونا بظاہر غیر ممکن تھا لیکن حالی کو تحصیل علم کا فطرتی شوق تھا اور اپنی ذاتی کوشش سے اُنھون نے وہ کچھ کر دکھایا جو دوسرون کیلئے باوجود ہر قسم کی سہولت و آسانی کے محال سمجھا جاتا ہی۔

میر ممنون دہلوی کے بھتیجے اور داماد سید جعفر علی فارسی کے ماہر کامل تھے۔ مولنا حالی نے فارسی انھین سے پڑھی۔ عربی کی تعلیم مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری سے پائی۔ ۱۷ سال کی عمر مین آپ کی شادی ہوگئی تھی۔ اسوقت تک آپ کی تعلیم درجۂ تکمیل کو نہ پہنچی تھی اور اس معاشرتی پابندی کے بعد ناممکن تھا کہ وہ اسکا سلسلہ بدستور جاری رکھتے لیکن جن لوگونکی قسمت مین ناموری لکھی ہوتی ہی اُن کیواسطے حصول مقصد کا راستہ خود بخود صاف ہو جاتا ہے۔

ان کے دلمین تحصیل علمی کا شوق باقی تھا۔ اور حُسن اتفاق سے سُسرال بھی خوشحال ملا کہ گھر بار کی فکرون کا ناقابل برداشت بار ان پر نہ پڑ سکا۔ طلب صادق تھی۔ اگر کوئی رُکاوٹ بھی ہوتی تو اُسکا خیال نہوتا۔ بسم اللہ کہکے آپ دہلی چل کھڑے ہوئے۔ اِس زمانے مین دہلی کی حالت گئی گذری نہ تھی۔ اہل کمال کا مجمع تھا۔ طالبا کمال کیلئے دلّی چھوڑ اور کوئی جگہ بمشکل ملسکتی تھی حالی دلّی پہنچے اور ۱۸۵۴ء تک وہین رہے اور علوم منطق و فلسفہ اور صرف و نحو وغیرہ کی تحصیل انتہائی درجہ تک بہ اطمینان تمام کی۔ دلّی سے پانی پت واپس آنیکے بعد بھی آپ کا علمی مطالعہ برابر جاری رہا۔ ۱۸۵۶ء مین ضلع حصار کی محکمۂ کلکٹری مین ایک مختصر سی جگہ پر مامور ہوئے لیکن ۱۸۵۷ء کے پرآشوب زمانۂ غدر کی پریشانیون مین یہ جگہ بھی چھوڑنا پڑی۔ لیکن امن وسکون ہوجانے کے بعد اُنھین گورنمنٹ پنجاب کے دار الکتب (بک ڈپو) مین ایک جگہ مل گئی۔ یہان آپ کے ذمہ یہ خدمت سپرد تھی کہ کتابون کی عبارت زمانۂ حال کے مذاق کے مطابق درست کیا کرتے تھے اور حشو و زائد سے پاک کرکے اُسے جدید نمونے پر لاتے تھے۔ اس خدمت پر آپ جب تک مامور رہے آپ کا قیام لاہور مین رہا۔ اُسوقت لاہور آجکل کا لاہور نہ تھا جس شخص نے دہلی کے ارباب کمال کی دلچسپ صحبتون کے لطف اُٹھائے ہون اُسکی دلبستگی کا سامان لاہور مین کیا ہوتا۔ پھر وطن اور اہل وطن کی مفارقت اُسپر مستزاد تھی اور سب پر طرہ یہ ہوا کہ اُسی زمانے مین وہان چیچک اور ہیضہ کی دست بردنے شہر کو وحشت ناک بنا دیا تھا

بے دیار و بے وطن آدمی کیلئے اس مصیبت مین اسکے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ اپنی بیتی اپنے آپ سے کہکر دل کو ڈھارس دے۔ اُنکی بعض قدیم غزلون مین جہان لاہور کی پریشان کن زندگی کی حسرتناک تصویر کھینچی ہے وہان بزرگان دہلی کی یاد بھی آگئی ہے اور سمجھ یہ مین بہت دردناک ہو گیا ہے۔ مثلاً ایک غزل مین فرماتے ہین ؎

دلاتی ہے صبا کس کو چمن یاد — نہ مین بلبل نہ گھر میرا چمن ہے
کرون تجھ سے بیان کچھ دردِ غربت — مگر جوشِ سخن مُہرِ دہن ہے
ہے لاہور مین آکر سو جانے — یہی دُنیا یہی دار المحن ہے
یہان بیگانگی ہے اسقدر عام — کہ بُلبل ناشناسائے چمن ہے
مجھے تنہا نہ سمجھین اہل لاہور — تصور مین مرے اِک انجمن ہے
مری خلوت مین ہے ہنگامۂ بزم — خموشی مین مری ذوقِ سخن ہے
بتاؤن تم کو ہون کس باغ کا پھول — جہان ہر گل بجائے خود چمن ہے
بتاؤن تمکو ہون کس مصر کی بو؟ — جہان غربت وطن پر خندہ زن ہے
نہ لینے دیگا جنت مین بھی آرام — یہی گر جذبۂ مہرِ وطن ہے

یہ اشعار بھی اُسی زمانے کے تصنیف ہین ؎

شہر و دریا سے باغ و صحرا سے — بو نہین آتی آشنائی کی
بختِ ہمد استانی شیدا — تونے آخر کو نارسائی کی
صحبتِ گاہ گاہی رشکی — تونے بھی ہمسے بیوفائی کی

لیکن اُنھین لاہور مین بہت زیادہ عرصہ تک قیام نہین کرنا پڑا۔ چار برس کے بعد "اینگلو عربک سکول" دہلی کی مدرسی پر مقرر ہو کر وہان سے واپس آئے۔ دلی واپس آکر حالی کو وہی لطف ملا جو شاعرون کے الفاظ مین بُلبل کو رہائی کے بعد چمن کی سیر سے حاصل ہوتا ہے یا غریب الوطن مسافر کو غربت کی کلفت و مصیبت جھیلنے کے بعد وطن پہنچکر عزیز و اقارب یا احباب کی ملاقات سے۔

ابھی مولنا حالی عربک سکول مین مدرس ہی تھے کہ اتفاق سے نواب آسمان جاہ مرحوم جو کسی زمانے مین دولت آصفیہ کے مدار المہام اور اسلامی معارف پروری کے روایات کے حامل تھے، کالج دیکھنے کیلئے علیگڈھ آئے۔ مولنا حالی بھی موجود تھے اُن کو بھی باریابی کا موقع دیا گیا اور آپ کے لیے ۷۵ روپیہ ماہوار کا علمی وظیفہ مقرر ہو گیا۔ فی سنہ ۱۳۰۱ھ مین جب مولنا حالی علیگڈھ ڈیپوٹیشن کے ساتھ جس کو خود سرسید کی سرگردگی کا فخر حاصل تھا حیدر آباد گئے تو آپ کا وظیفہ بھی ۷۵ سے پورے سو روپے کر دیے گئے۔

اِن واقعات سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آپ کی زندگی کا بہترین حصہ دہلی مین بسر ہوا ہے اور اگر میر و غالب اپنے مطول قیام دہلی کے لحاظ سے دہلوی اور ناسخ و آتش اسی اعتبار سے لکھنوی کہلائے جانیکے مستحق ہین تو مولینا حالی نے کیا قصور کیا ہے کہ اُنھین دہلوی کہنا تو ایک طرف رہا اُنکی زبان آجتک ہدف و ملامت کا نشانہ بنائی جاتی ہے۔ یہ ایک اُصولی بحث ہے۔ اسکا تصفیہ ماہران علم اللسان کر سکتے ہین لیکن اسکے باوصف ہمارے خیال مین دہلوی یا لکھنوی کا اضافی لقب مولینا حالی کی دستار فضیلت کا طرہ نہین بن سکتا بلکہ اُن کا کمال اُن کی عظمت کی دلیل ہے۔

زمانۂ قیام دہلی مین مولنا حالی کو اُن ذی کمال ارباب فن کی صحبت مین شریک ہونے کا موقع ملا ہے جو اپنے وقت کے فرد فرید تھے۔ ایشیائی شاعری کی زندگی اُس زمانے مین اُن کے دم سے وابستہ تھی۔ وہ شاعر تھے اور شاعر گر بھی، یہ بات ناممکن تھی کہ اُن کے ذوق شعر گوئی کو دیکھکر مولنا حالی کو شوق نہ پیدا ہوا ہو۔ فطرت سے اُنھین وہ صفات عطا ہوئی تھین جو شاعر کو شاعر بناتی ہین۔ اُنسے کام لینے کے لیے ایک معمولی سی تحریک کی ضرورت تھی۔ غالب سا فہم شناس شاعر مولنا حالی کی نسبت کہتا تھا کہ اگر تم شعر نہ کہوگے تو

ظلم کروگے۔ بالآخر اُنھین بھی ان بزرگون کا ہمنوا ہونا پڑا اور آج اُن کا پُرانا کلام دیکھکر ہم اندازہ کرسکتے ہین کہ ابتدا مین اُن کا رنگ طبیعت کیا تھا۔

غالب کا نام اُردو شعراء کی فہرست مین "فلسفی شاعر" کے لقب سے لکھا جاتا ہی۔ حالی کو بھی زانوے تلمذ اُنھین کے آگے تہ کرنا پڑا کسی مجبوری سے نہین بلکہ اس سبب سے کہ جس راستے پر چلنے کو یہ کمر بستہ تھے اُسکی رہنمائی غالب سے بہتر کوئی نہ کرسکتا تھا۔ کہا جاتا ہی کہ ابتداً نواب شیفتہ سے اصلاح لی۔ نواب موصوف کے ساتھ اُنھین ایک عرصہ تک یکجائی حاصل تھی ممکن ہی کہ شاگرد بھی ہوگئے ہون البتہ اسمین کلام نہین کہ نواب شیفتہ جو خود بھی مشاق شاعر تھے، اُنکی صحبت بھی مولننا حالی کی تشویق و تحریص کا باعث ہوئی۔ نواب مصطفٰے خان شیفتہ پہلے مومن کے شاگرد تھے پھر غالب سے اصلاح لینے لگے۔ جہانگیر آباد سے جو اُنکی ریاست تھی غزلین بغرض اصلاح غالب کے پاس آتی تھین۔ حالی بھی جب تک جہانگیر آباد مین رہے اُن کا کلام بھی غالب کے پاس نظر ثانی کی غرض سے آیا کرتا تھا۔ یہ کہنا تحصیل حاصل ہی کہ مولننا حالی کا ابتدائی کلام زلف و رُخ، ساق و ساعد کے تذکرہ سے مالامال رہا ہوگا۔[لہ] ابتدا مین یہ امر ناممکن العمل تھا کہ وہ اس طرز سخن کے عیوب سے جنھین اُنکے اور تمام ساتھی محاسن سمجھتے ہون واقف ہو جاتے۔ اُنھون نے اسوقت تک جو کچھ پڑھا تھا وہی پڑھا تھا اور جو کچھ دیکھا تھا وہی دیکھا تھا۔ دُنیا مین کوئی اصلاحی کام بغیر کسی ذاتی مشاہدہ و تجربہ کے آجتک نہین ہوا اور حقیقت حال بھی یہی ہی کہ جب تک انسان کو بطور خود کسی چیز کے حسن و قبح نہ معلوم ہون وہ اُس کے متعلق اچھی یا بُری رائے کسطرح قائم کرسکتا ہی۔

گورنمنٹ پنجاب کے بُک ڈپو کی ملازمت سے پیشتر قیاساً مولننا حالی کے خیالات وہی تھے جو طرز قدیم کے تعلیم یافتہ آدمی کے ہوسکتے ہین لیکن بُک ڈپو کا تعلق اس قسم کا تھا کہ جو کوئی کتاب کسی زبان سے ترجمہ یا تالیف ہوکر شائع کیجاتی وہ پہلے اُنکی نظر سے گذرتی۔ اس قسم کی کتابون مین تراجم کا حصہ زیادہ تھا۔ اِن کے مطالعہ سے مولننا حالی کو مغربی لٹریچر پر عبور کرنے کا بہت اچھا موقع مل گیا اور جب مغرب کے طرز ادا اور اسلوب بیان سے جسمین دلفریبی کے ساتھ اصلیت کا بھی پہلو عموماً موجود ہوتا ہی مانوس ہوگئے تو اُنکی آنکھین کھلین اور اُنھون نے دیکھا کہ اُنکی شاعری کا درجہ کیا ہی۔ اصلی پھولون کے آگے مصنوعی پھول کبھی پسند نہین ہوتے۔ اُنھون نے معلوم کرلیا کہ ہماری شاعری بالکل پست حالت مین ہی اور جس چیز سے یورپ والے اخلاق و معاشرت کی اصلاح کا کام لیتے ہین ہمارے یہان وہ حد درجہ مخرب اخلاق بنگئی ہی اور اُس سے اصلاح و ترقی مین امداد حاصل کرنے کی توقع اُسوقت تک بالکل فضول ہی جب تک اُسمین اُسکے حقیقی اوصاف نہ پیدا کیے جائین خیالات یہ اُلجھن تھی جسمین مولننا حالی شروع شروع مین یقیناً گرفتار ہوے ہونگے لیکن فراست و ذکاوت کی امداد سے بالآخر اُنھون نے نتیجہ نکال لیا کہ اُردو شاعری نہایت ذلیل ہو رہی ہی اور فائدے کی جگہ اس سے ملک و قوم کو نہایت سخت مضرت پہنچ رہی ہی۔ اور جب اُردو فن سخن کے چہرے کے بدنما خال و خط جنھین تصنع اور استعارون کے پوڈرنے چھپا رکھا تھا اسطرح ظاہر ہوگئے تو جس راستے پر پہلے قدم پڑ چکے تھے اُسے یک قلم ترک کردینے کی ٹھان لی۔ خیالات مین انقلاب آیا اور خود اُنھین کے لفظون مین

لہ یہ صرف قیاس ہی قیاس ہی ورنہ دیوان حالی کی قدیم غزلیات سے بھی اسکا ثبوت نہین ملتا۔ راقم الحروف کا خیال ہی کہ مولننا کی صرف وہی قدیم غزلین شامل دیوان کیگئی ہین جو ایک حدتک مذاق جدید کے موافق سمجھی جا سکتی ہین اور جنھین جو [illegible]

"جس شاعری پر ناز تھا اُس سے شرم آنے لگی"

مولانا حالی اپنے طرز کے موجد اور نیچرل اور قومی شاعری کے مجدد ہین۔ اس اعتبار سے اُن کا مرتبہ شعراء اُردو مین وہی ہے جو انگریزی مین گولڈ اسمتھ کا ہے جس نے اپنے یہان کی شاعری کو جو منزلہ ایک چمن کے تھی فضول گوئی اور مبالغہ پسندی کی جھاڑیون سے صاف کیا ہے۔ مولانا حالی اور گولڈ اسمتھ مین ایک طرح کی یون بھی مماثلت ہے کہ دونون کو ابتداء مین خاص و عام کی مخالفت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ گولڈ اسمتھ کے یہ الفاظ اس کا ثبوت ہین:-

اے میری پیاری نظم! تو اُن موقعون سے پہلے بھاگنے والی نظم ہے جہان نفسانی خواہشون کی طغیانی ہوتی ہے۔ تو اس بے قدری کے زمانے مین بجائے اس کے کہ دلون کو اپنی طرف مائل اور پاک شہرت حاصل کرے ہر جگہ ملامت کیجاتی ہے۔ تیری بدولت عام جلسون مین مجھے شرمندہ ہونا پڑتا ہے لیکن جب تنہا ہوتا ہون تو تجھپر فخر کرتا ہون۔

مولانا حالی بھی ایک عرصہ تک "ملامت" اور "شرمندگی" کا نشانہ بن چکے ہین۔ ایک بات اور بھی ان کے خلاف مخالفت کا جوش بڑہانے کی باعث ہوئی اُسے نفس شاعری سے حقیقت مین کوئی تعلق نہین مولانا حالی سرسید کی تعلیمی مہم مین ہمیشہ دست راست کی حیثیت سے شریک تھے۔ اُس زمانے مین عامہ مسلمین سرسید سے نہایت بدظن تھے اور اُن کے رفقاء کو بھی کافر و بدعتی سمجھتے تھے۔ ممکن ہے کہ اگر سرسید کا ساتھ دینے کا "الزام" اُن کے سر نہوتا اُنکی جدید طرز شاعری کی شاید اس درجہ لے دے نہوتی۔ بہر کیف اعتراضات اور اختلافات عامہ جسطرح مصلحان قوم کے لیے ناگزیر چیزین ہین اُسی طرح علوم و فنون کے نقطۂ خیال سے بھی۔ ہمارے کنسرویٹیو علماء آج بھی فلسفۂ جدید کے نام سے برافروختہ ہوجاتے ہین۔ انگلینڈ مین جارج سوم کے وقت مین جب دُخانی انجن وغیرہ ایجاد ہورہے تھے تو دستکارون کا غیض و غضب انتہائی درجے پر پہنچا ہوا تھا۔ ہیوڈ ہیوم نے جو انگلستان کا ایک وسیع النظر مورخ تھا جب اپنے رسالے شائع کیے تو پادریون مین اُسکی مخالفت کا ایک طوفان عظیم برپا ہوگیا تھا مختصر یہ کہ اصلاح کا کام کچھ عرصہ تک اعتراضات کا ہدف بنا رہتا ہے حالی کیونکر مستثنے رہتے؟ مخالفت کی ترکش مین کوئی تیر نہ تھا جو اُنپر نہ چھوڑا گیا ہو لیکن اُنکی سلامت روی اور مستقل مزاجی نے سپر کا کام دیا اور جو کچھ گولڈ اسمتھ نے اپنی نظم کو خطاب کرکے کہا تھا کہ

جہان کہین تجھپر نکتہ چینی ہو تو وقت کا مقابلہ کیجیو اور باد مخالف کے جھگڑون پر غالب آئیو اور اپنے دردناک نالون سے سچ کی مدد کیجیو

وہ مولانا حالی نے اپنے قول و فعل سے ثابت کر دکھایا۔ ایکدفعہ جو شاعرے سے یہ کہکر اُٹھے کہ ؎

بلبل کی چمن مین ہمزبانی چھوڑی — بزم شعراء مین شعرخوانی چھوڑی
جب سے دل زندہ تو نے ہمکو چھوڑا — ہمنے بھی تری رام کہانی چھوڑی

تو پھر نہ بیٹھے۔ بزم نشینون کا اصرار، پچھلی اُنسیت، دوستونکی مروت، اِن تمام نے دامن پکڑا مگر حالی نے یہ کہکر پیچھا چھڑایا ؎

اب اُلفت ہے نہ چاہت نہ جوانی نہ اُمنگ — سر ہے سودا سے تہی عشق سے دل ہے خالی
گر غزل لکھیے تو کیا لکھیے غزل مین آخر — نہ رہی جبکہ وہ مضمون سُجھانیوالی

جو تجویز ہونہار ہوتی ہے اُسکی کامیابی کے اسباب بھی خود بخود پیدا ہو جاتے ہین۔ حالی کو چار طرف سے معترضین اور مخالفین دشمنی کی نظرون سے گھور رہے تھے لیکن سرسید اور اُنکا گروہ ہمدردانہ محبت کے ساتھ اُنھین دیکھتا تھا اور پھر جیسے جیسے تعلیم پھیلتی گئی اور لوگون کے خیالات مین صلاحیت آتی گئی ویسے ویسے مخالفت کی جگہ اُنس کو ملتی گئی۔

کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر تعلیمات کا نام نامی ایک عرصے تک اردو کے یورپین محسنین کے زمرہ مین لیا جائیگا۔ کرنل صاحب نے اپنی

ذات سے مشرقی علوم وفنون کو جو تقویت پہنچائی ہے وہ باخبر اصحاب سے مخفی نہین - آپ نے ایک مجلس مشاعرہ بھی قائم کی تھی اور اُسمین جدت کا یہ پہلو رکھا تھا کہ بجائے مصرع طرح کے کسی خاص عنوان پر شعراء کو طبع آزمائی کا موقع دیا جاتا تھا - مولانا آزاد نے بھی سب سے پہلے اِسی گلشن مین جدت طرازی کے نغمے سنائے تھے اور حالی کی نظمین برکھارت، نشاطِ اُمید، مناظرہ رحم وانصاف، حب وطن وغیرہ اِسی مشاعرے مین پڑھی گئی تھین - گویا فکر کے سانچے مین جذبات کی تصویرین جو آئندہ ڈھلکر نکلنے والی تھین اُن کا یہ ابتدائی نمونہ تھا۔

لیکن مولانا حالی کے علمی کارنامون مین جنکا تعلق اُنکی عمر کے اولین حصہ سے ہے دو ایک کتابین اور بھی قابل ذکر ہین مثلاً تریاق مسموم جو اُن کے ایک ہموطن مسلمان کی ایک کتاب کے جواب مین ہے جس نے مسیحی ہونیکے بعد اسلام پر اپنے خیال کے مطابق چند اعتراضات قلمبند کرکے کتابی صورت مین شائع کیے تھے - اسیطرح آپ نے ایک کتاب تعلیم نسوان کے متعلق لکھی تھی جو آج شاید کمیاب ہے لیکن ہمارے خیال مین اُسکی دوبارہ اشاعت خالی از نفع نہوگی اور اِس زمانے مین جبکہ نصاب تعلیم مستورات کی تکمیل مین دقتین واقع ہو رہی ہین مولانا حالی کی ایسے مبصر کی تصنیف کی موجودگی بہت کارآمد ہوسکتی ہے - اس کتاب کے صلے مین تعلیمی دربار دہلی کے موقع پر آپ کو گورنمنٹ کے جانب سے چار سو روپیہ کا اعزازی انعام بھی عطا ہوا جو لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھون آپ کو ملا تھا - یہ کتاب غالباً پنجاب کے مدارس مین کچھ عرصہ تک داخل کورس بھی رہ چکی ہے - اِن دونون کتابون کے علاوہ آپنے طبقات الارض پر ایک کتاب کا ترجمہ بھی کیا تھا - اصل کتاب فرانسیسی زبان مین تھی - مصر کے ایک عالم نے اُسکا عربی ترجمہ کیا اور مولانا حالی نے اُسے اُردو کا لباس پہنایا - یہ علمی خدمات ہر طرح مستحق شکریہ تھین اور ساتھ ہی انسے حالی کی لیاقت وعلمیت کا سکہ بھی بیٹھ سکتا تھا لیکن آپ کی مابعد کی تصنیفات اور شاعری نے آپ کی منزلت کو جس رُتبہ پر پہنچا دیا ہے وہ اول الذکر کے ذریعے سے ناممکن تھا

مولانا کی مستقل تصانیف کی فہرست یہ ہوسکتی ہے:-

حیات سعدی

مسدس حالی

دیوان حالی

شکوۂ ہند

یادگار غالب

حیات جاوید

ان کے علاوہ آپ کی بیشمار نظمین مستقل قدر وقیمت کی چیزین ہین اور بہت سے علمی مضامین شرح تہذیب الاخلاق اور دوسرے ملکی رسائل مین وقتاً فوقتاً شائع ہوچکے ہین بجائے خود ایک ضخیم کتاب ہین حیات سعدی، یادگار غالب، اور حیات جاوید، مین اول الذکر شیخ سعدی کی ثانی الذکر مرزا اسد اللہ خان غالب کی اور آخری کتاب سر سید احمد خان کی مشرح اور مبسوط لائف ہے - یہ کتابین آجکل ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے مین عام طور پر متداول ہین غالب کے کلام اور تصانیف کی تنقید یادگار غالب مین جس پیرایے مین کیگئی ہے وہ حالی ہی کا حق تھا - اِس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت مین غالب کے واقعی طور پر پہچاننے والون مین اُن کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔

"حیات سعدی" غالباً اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے اور اُسکے محاسن وفضائل کے متعلق اسیقدر کہنا کافی ہوگا کہ "سعدی شیرازی" کو ہندوستان جدید سے روشناس کرنیکی خدمت "سعدی پانی پتی" سے بہتر کوئی نہ انجام دیسکتا تھا۔

سرسید کی لائف اُس مقدس بزرگ اور قومی خادم کی تمام عمر کی جانکاہی اور جانفشانیون کی مطول داستان ہے۔ جو لوگ سرسید کے متعلق ذرا ذراسی بات بھی دریافت کرنے کے خواہشمند ہون اُنھین اِس کتاب کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

یہ تینون کتابین مفصل ریویو کی محتاج ہین۔ محض دو ایک سطرونسے اُنکی ظاہری و باطنی خوبیون کا انکشاف ناممکن ہے۔ اِس مضمون مین چونکہ ہمین اپنی رائے زنی کو اُنکی شاعری تک محدود کرنا ہے اس لیے ہمین افسوس ہے کہ انکی نثر تصانیف کی بابت تفصیل سے نہین لکھ سکتے۔

اَب ہم مولنا حالی کی شاعری پر نگاہ تنقید ڈالتے ہین۔ سب سے پہلے ہم اُن کے دیوان کو لیتے ہین اُسکے بعد اُنکی متفرق نظمون کو دیکھین گے۔ مسدس حالی کی نسبت ہمین جو کچھ کہنا تھا وہ تمہید مین گذر چکا ہے۔

۱۸۹۳ء مین مولنا حالی کا دیوان شائع ہوا۔ وَلی دکھنی کا کلیات جب پہلے پہل دلی مین آیا تھا تو اُسوقت وہان کی علمی مجالس مین جو کیفیت پیدا ہوئی تھی وہی ہندوستان کے لٹریری حلقو نمین دیوان حالی کی اشاعت سے دیکھنے مین آئی۔ اپنے اپنے وقت مین دونون نئی چیزین تھین اور دیکھنے والون کے لیے حیرت و استعجاب بڑہاتی تھین لیکن ان دونون کے ابتدائی تاثرات مین فرق ہے۔ ولی کے کلام کی تقلید کا شوق بہت جلد تمام ہندوستان مین پھیل گیا اور آج بھی اُسکی لکیر کے فقیر یہان کونے کونے مین موجود ہین۔ لیکن حالی کے کلام کو یہ عزت نہین ملی۔ اُنکی روش سے اہل ملک پہلے سے کچھ واقف تھے لیکن دیوان حالی کی اشاعت تک وہ قابل مصنف کی ہمہ گیر طبیعت کے رنگ سے ناواقف تھے۔ عام مذاق کو دیکھتے ہوے پرجوش خیر مقدم کی توقع حضرت حالی کو خود بھی نہ تھی اور ایسا ہی ہوا کہ اُنکے مجموعۂ افکار نے قدامت پسند ونکو بجائے خوش کرنے کے ملول کر دیا۔ اعتراضات کی بھرمار اور مخالفت کے طومار سے اُنھون نے حالی کا ناطقہ بند کرنا چاہا لیکن مستقبل شناس آنکھین اب سے کئی صدیون آگے تک کے واقعات نگاہ مین رکھتی ہین۔ حالی یہ بھی جانتے تھے کہ اس قسم کی مخالفت بھی لازمی چیز ہے اگر اسکا مقابلہ ثابت قدمی سے کر لیا تو میدان مارا ہوا ہے۔ یہی بات آخر کو سچ ثابت ہوئی۔ وہی طبائع جن کے لیے کلام حالی زہرہ سے زیادہ تلخ تھا اُسمین اب شہد و شکر کی حلاوت پاتی ہین۔ اسمین شک نہین کہ ابھی باشندگان ہند کی ایک کثیر تعداد ایسی ہے جو اُنھین قدما کی عظمت کا مستحق نہین جانتی تاہم اُن کے کلام کے سودمند نتائج کا ہر شخص کو اقرار ہے اور حالی کی سب سے بڑی جیت یہی ہے۔

دیوان حالی مین سب سے پہلے اور مقدمہ اور دیباچہ کے بعد قطعات کو جگہ دی گئی ہے جو اخلاقی نکات پر مبنی ہین۔ پھر غزلیات کی باری آتی ہے۔ اُسکے بعد رُباعیات ہین۔ آخر مین قصائد، ترکیب بند، مرثیہ، قطعے، متفرقات، اور تاریخین ہین۔ دیوان کا مقدمہ بجائے خود فن شاعری پر ایک مبسوط اور معرکۃ الآرا کتاب ہے۔ اس مین شعر کی مدح و ذم، تاثیر سخن، مختلف ممالک کی شاعری کے مدارج، اسلام اور شاعری، شاعری کے عروج و زوال، شاعری اور سلطنت کے تعلقات عہد وسطی اور زمانہ اخیر کی شاعری کا فرق، سوسائٹی پر شاعری کا اثر، غرض اس قسم کے اکثر نہایت نازک اور دلچسپ مسائل پر بہت خوبی سے معنی خیز رائے زنی کی ہے۔ اُردو شاعری کے عیوب روز روشن کیطرح ظاہر کیے ہین لیکن اساتذۂ متقدمین کا ذکر نہایت متانت اور تہذیب سے کیا گیا ہے۔ خواہ مخواہ کسی کو اعتراضات کا نشانہ نہین بنایا۔ آخر مین اُردو فن شعر کی صلاح

کے باب مین جو قابل قدر خیالات ظاہر کیئے گئے ہین وہ حصہ بہی خواہان ادب اُردو کے خاص غور و خوص کا محتاج ہی۔ جو شعرا قدیم شاہراہ سے ہٹکر حالی کے قدم بقدم چلے ہین اُنسے قطع نظر اگر پُرانی شاعری کے دلدادہ او رحالی کے نام پر خار کھانیوالے حضرات اُسے ٹھنڈے دل سے دیکھین تو ممکن نہین کہ اُنھین حالی کی رائے سے اتفاق نہ کرنا پڑے۔

یہ ممکن ہی کہ حالی کے مخالفین اُنکی شاعری کو کسی پایہ کا نہ سمجھین اور یہ بھی ہو سکتا ہی کہ حالی کی شاعری کسی پایہ کی نہ بھی ہو تاہم مقدمہ دیوان حالی اپنے ذی منزلت مصنف کی اصابت رائے کی کافی دلیل ہی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہی کہ حالی کو فن شاعری کے اُصول و فروع اور اُسکی تاریخ پر کتنا قابو حاصل ہی جس مسئلہ پہ قلم اُٹھایا ہی اُسکے ہر پہلو پر نظر ڈالی ہی اور اپنے خیالات کی تائید عقلی دلائل کے ساتھ مشرق و مغرب کے اُن اہل الرائے اشخاص کی آرا سے کی ہی جو ہر طرح مستند اور قابل قبول سمجھی جا سکتی ہین۔

اخلاقی قطعات، گلستان کے باب ہشتم کے نصائح کا گویا جواب ہین جو سبق آموز باتین اُنھین سوجھی ہین اُنھین نظم کا لباس پہنا کر قوم کے سامنے پیش کر دیا ہی۔ چند عنوان مختلف قطعون کے درج کیئے جاتے ہین۔ ناظرین اُنسے نفس مطلب کا قیاس کر سکتے ہین "چھوٹون کا بڑا بن جانا"۔ "شعر کی طرف خطاب"۔ "بے تمیزی ابنائے زمان"۔ "آزادی کی قدر"۔ "قحط اہل اللہ"۔ "نیشن کی تعریف"۔ "استفادہ"۔ "اسراف" او رعلیٰ ہذا القیاس۔

اِن مین سب سے بڑی خوبی یہ ہی کہ نصیحت کی تلخی کو قصے اور مکالمے کی چاشنی دیکر خوشگوار بنایا ہی۔ پند و موعظت کا بہترین طریقہ یہی ہی کہ اُسے گفتہ آید در حدیث دیگران کے مصداق اسطرح ادا کیا جائے کہ سامع کو اسکی تمیز نہو کہ خطاب اُسیکی طرف ہی۔ دوسری خوبی اِن قطعات مین یہ ہی کہ جن مضامین پر طبع آزمائی کیگئی ہی وہ زمانہ جدید کی ضروریات کے مطابق ہین۔ دو رُخ وجدّت اور حشو و نشر کی موشگافیون سے سروکار نہین رکھا بلکہ جو بات کہی ہی وہ جچی تلی اور آج کل کے رنگ مین۔ اِس فرق کو بوضاحت ذہن نشین کرنے کیلئے ہم اُن کا ایک منتخب قطعہ درج کرتے ہین۔ اِس سے ناظرین کو ہمارے منشا کے سمجھنے مین آسانی ہوگی۔ فرماتے ہین ؎

حالی سے کہا ہمنے کہ ہی اسکا سبب کیا — جب کرتے ہو تم کرتے ہو مسرف کی مذمت
لیکن بخلاف آپکے سب اگلے سخنور — جب کرتے تھے کرتے تھے بخیلو نکو ملامت
حالی نے کہا رُک کے نہ پوچھو سبب اسکا — یارون کیلئے ہی یہ بیان موجب رقت
کرتے تھے بخیلو نکو ملامت سلف اُسوقت — جب قوم مین افراط سے تھی دولت و ثروت
اور اب کہ نہ دولت ہی نہ ثروت ہی نہ اقبال — گھر گھر پہ ہی چھایا ہوا افلاس و فلاکت
ترغیب سخاوت کی ہی اب قوم کی ایسی — پرواز کی ہو جیونٹیون کو جیسی ہدایت

بعض قطعے اختصار مضمون و کثرت معنی کے اعتبار سے بےمثل ہین۔ "قحط اہل اللہ" کے عنوان سے ایک جگہ فرماتے ہین ؎

کل خانقاہ مین تھی حالت عجیب طاری — جو تھا سو چشم پُرنم۔ اپنا تھا یا پرایا
دنیا سے اُٹھگئے سب جتنے تھے مرد صادق — یہ کہکے شیخ کا دل بیساختہ بھر آیا
ہم نے کہا مُریدی باقی رہی نہ پیری — یہ کہکے ہم بھی روئے اور اُنکو بھی رُلایا

"شعر کو خطاب کرکے آپ نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہی اُسکے صحیح ہونے مین کسکو شک ہوگا۔ کہتے ہین ؎

اے شعر دلفریب نہو تو تو غم نہین — پر تجھ پہ حیف ہے جو نہو دلگداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام — ہان سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
اہل نظر کی آنکھ مین رہنا ہی گر عزیز — جو بے بصر ہین اُنسے نہ رکھ ساز باز تو
چپ چاپ اپنے پیچ سے کیئے جا دلون مین گھر — اونچا ابھی نہ کر علم امتیاز تو

پہلے دو شعر اس امر کی تشریح ہین کہ شعر فی الحقیقت کسکو کہتے ہین آخری دونون اشعار کی لے گولڈ سمتھ کی تان کا مزا دیتی ہی جو کہتا

ہو کہ "تو وقت کا مقابلہ کیجیو اور باد مخالف کے جھگڑون پر غالب ہو"
"ترک سوال" کی نصیحت کس جدت کے ساتھ نئے پیرائے مین کی ہی۔ معنوی طور پر گویا یہ بھی جتا دیا ہی کہ مہذب اور ترقی یافتہ اقوام گداگری کو سخت عیب خیال کرتی ہین۔ دیکھیے ؎

عادت تھی اک فقیر کی کرتا تھا جب سوال ۔۔۔ انگریز کے سوا نہ کسی سے تھا مانگتا
مدت تک اسکی جب یہی دیکھی گئی روش ۔۔۔ پوچھا کسی نے اُس سے کہ تھا سبب ہے کیا
بولا کہ عادت اس لیے کی ہی یہ اختیار ۔۔۔ چھٹ جائے تا کہ مجھسے یہ لپکا سوال کا
پہلے تو بھاگوانوں سے ملتی تھی روز بھیک ۔۔۔ آتا تھا مانگنے مین بہت بھیک کے مزا
پر جب سے ہی سوال کا اس قوم پر مدار ۔۔۔ منت سے عجز سے کبھی ملتا نہین ٹکا
امید کہ مانگنے کی چھوٹ جائے لت ۔۔۔ گرچند روز اور رہا اس سے سابقہ

ظاہر ہی کہ پند و نصیحت مین زبان اور لطف بیان کا چٹخارا بہت مشکل سے پیدا ہوتا ہی خصوصًا جب شاعر کو خود یہ باتین ناپسند ہون۔ جو لوگ اس قسم کے قطعات مین واسوخت امانت یا مثنوی میر حسن کا مزا ڈھونڈھتے ہون وہ غلطی پر ہین مجلس وعظ ہم سن احباب کی صحبت کیطرح کبھی کیفیت انگیز نہین ہو سکتی۔ البتہ کہین کہین کلام کی روانی اور محاورات کے استعمال سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہی۔ مثلاً ؎

تم اے خود پرستو طبیعت کے بندو ۔۔۔ ذرا وصف اپنے سنو کان دھر کے
نہین کام کا تمکو اندازہ ہرگز ۔۔۔ جدھر ڈھل گئے ہو ہے بس اُدھر کے
جو گانے بجانے پہ آئی طبیعت ۔۔۔ تو چیخ اُٹھے دو دن مین ہمسائے گھر کے
چڑھا بھوت عشق و جوانی کا سر پر ۔۔۔ تو پھر گھاٹ کے آپ ہین اور نہ گھر کے
جو کھانا تو بیحد جو پینا تو آٹ گٹ ۔۔۔ غرض یہ کہ سرکار ہین پیٹ بھر کے

زبان اور طرز بیان کی کمی قطعات مین کھٹکتی ہی اور یہ کمی بعض اوقات ناگزیر ہوتی ہی اُسکی تلافی غزلیات مین بہت کچھ ہو گئی ہی۔ غزلیات حالی دو حصوں مین باعتبار اوقات فکر تقسیم ہو سکتی ہین یعنی قدیم و جدید۔ دونون قسم کی غزلون کا مقابلہ کرنیسے رنگ طبیعت کے تدریجی تغیرات کی تمیز بآسانی ہو جاتی ہی۔ قدیم غزلون کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہی کہ ابتدا مین بھی آپ کا مذاق بہت سنجیدہ اور متین تھا۔ یہ ہو سکتا ہی کہ اس مجموعہ مین آپ کی وہ غزلین عمدًا نہ شامل کیگئی ہون جنمین مستی سرمہ اور کنگھی چوٹی کے مضامین لکھے گئے ہون۔ کیونکہ ہمارا خیال ہی اسکی بابت ہم اوپر بھی کہین کنایۃً لکھ چکے ہین کہ پہلے پہل انسان کو اسی قسم کے خیالات نظم کرنے پڑتے ہین تاہم اگر ان قدیم غزلونکو جنکی صراحت موجود ہی بالکل ابتدائی نہ سمجھا جائے تو بھی ان سے یہ قیاس ہو سکتا ہی کہ رنگ جدید اختیار کرنیسے پیشتر اُنکی شاعری کا کیا عالم تھا ہمارے خیال مین اُصولاً یہ سخت غلطی ہو گی اگر ہم کلام حالی مین میر جرأت اور داغ کی خصوصیات تلاش کرین جب حالی نے اپنا مشرب ہی جدا رکھا تو اُنمین پرانی باتونکا ہونا ایسا ہی ناممکن ہی جسطرح افلاطون کا شیکسپیر بن جانا۔ دیکھنا صرف یہ ہی کہ شاعری کا جو مفہوم حالی نے قرار دیا ہی اُس لحاظ سے اُن کے کلام کی کیا حالت ہی اور جب ہم اس معیار پر اُسکو دیکھتے ہین تو وہ کھرا اُترتا ہی۔ اُنکی پرانی غزلین بھی اُنکی اعتدال پسندی اور سلامت روی کا ثبوت ہین دیکھیے یہ مطلع کس قدر بلیغ ہے ؎

ہی جستجو کہ خوب سے ہی خوبتر کہان ۔۔۔ اب ٹھیرتی ہی دیکھیے جا کر نظر کہان

اسی کے ساتھ یہ شعر غالب کے طرز بیان کی یاد دلاتا ہی ؎

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر ۔۔۔ تھا اُسکو ہم سے ربط مگر اسقدر کہان

مندرجہ ذیل مطلع باعتبار اختصار و طرز ادا کے کتنا اچھا ہی ؎

رنج اور رنج بھی تنہائی کا ۔۔۔ وقت پہنچا مری رسوائی کا

ایک غزل کے چند اشعار قابل ملاحظہ ہین ؎

پیش از ظہور عشق کسیکا نشان تھا ۔۔۔ تھا حسن میزبان کوئی میہمان تھا

ملتے ہی اُنکے بھول گئین کلفتین تمام　　گویا ہمارے سر پہ کبھی آسمان نہ تھا
کچھ میری بیخودی سے تمھارا زیان نہین　　تم جانتا کہ بزم مین اک خستہ جان نہ تھا
رات اُسکو بات بات پہ سُنو سُنو دیئے جواب　　مجکو خود اپنی ذات سے ایسا گمان نہ تھا

اور دیکھیئے فرماتے ہین ؎

اَب وہ اگلا سا التفات نہین　　جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہین
رنج کیا کیا ہین ایک جان کے ساتھ　　زندگی موت ہے حیات نہین
ذرہ ذرہ ہے مظہرِ خورشید　　جاگ اے آنکھ دن ہے رات نہین

زندگی کو کس خوبی سے موت ثابت کیا ہی۔ اور آخری شعر معرفت شناسی کا گویا آئینہ ہی۔ اسیطرح ایک یہ شعر کسقدر مضمون خیز ہی ؎

کوئی محرم نہین ملتا جہان مین　　مجھے کہنا ہی کچھ اپنی زبان مین

یہ مختصر انتخاب اُنکی قدیم غزلیات کا ہی۔ جدید طرز پر جو کچھ کہا ہی وہ دُنیا ہی اَور ہی۔ مضمون آفرینی کے ساتھ سوز و گداز اور درد کا پہلو ہاتھ سے جانے نہین پایا۔ اِن غزلون مین ایک بڑی خوبی یہ ہی کہ اکثر مسلسل اور قطعہ بند ہین، شروع سے آخر تک ایک ہی مضمون کے اشعار لکھے گئے ہین، اور سلسلۂ خیالات کے اسطرح قائم رہنے سے عجیب لطف پیدا ہو جاتا ہی، شادمانی الوداع، جوانی الوداع، اِس زمین مین کہتے ہین اور کس حسرت سے کہتے ہین ؎

اے بہار زندگانی الوداع　　اے شباب اے شادمانی الوداع
اے بیاضِ صبحِ پیری السلام　　اے شبِ قدرِ جوانی الوداع
روزگارِ ضعف و سستی الصلا　　وقت سعی و جانفشانی الوداع
فرصتِ عشق و جوانی الفراق　　دورِ عیش و کامرانی الوداع
تجکو سمجھے تھے نعیم جاودان　　اے نعیم جاودانی الوداع
آلگا حالی کنارے پر جہاز
الوداع اے زندگانی الوداع

ہم اوپر ایک جگہ کہہ چکے ہین کہ حالی کے کلام کو خود اُن کے مقرر کردہ معیار پر جانچنا چاہیئے۔ اس لیے ہمین یہان یہ دیکھنا ہی کہ مولنا نے غزل گوئی کے کیا اُصول رکھے ہین اور پھر یہ کہ خود اُنھون نے اُنکی پابندی کہان تک کی ہی۔ عشقیہ مضامین کے متعلق آپکی رائے ہی کہ

وہ ایسے جامع الفاظ مین ادا کیئے جائین جو دوستی اور محبت کی تمام انواع واقسام اور تمام جسمانی اور روحانی تعلقات پر حاوی ہون۔

نفس مضمون کے متعلق آپ کا خیال ہی کہ اسکا دائرہ وسیع کرنا چاہیئے یعنی محض عشق و محبت کی باتون پر محدود نکرنا چاہیئے بلکہ

جس بات کا سچا جوش اور ولولہ اُٹھے خواہ اُسکا منشا خوشی ہو یا غم یا حسرت یا ندامت یا شکر یا شکایت . . . . . یا حُبِّ وطن یا قومی ہمدردی . . . . . یا کوئی جذبہ جذباتِ انسانی مین سے اُسکو بھی غزل مین بیان کرسکتے ہین۔

لیکن حقیقت یہ ہی کہ مولنا کا یہ مشورہ بہت بعد از وقت ہی۔ متقدمین نے خود غزلیات کا انحصار عشقیہ باتون پر نہین رکھا۔ ہان اُن کے یہان حُبِّ وطن، ایثار نفس، قومی ہمدردی، اور اسی قبیل کے مضامین پر بہت کم توجہ کیگئی ہی اور شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ اُن کے زمانے مین اسکی ضرورت نہ تھی۔ ہان آجکل اس قسم کے جوش آفرین خیالات کے ذریعے سے قوم کے جمود کو توڑنا فرض تھا اور اس مین کلام نہین کہ اس مقصد کی تکمیل مولنا حالی کے دم سے ہوئی مختصر یہ کہ مولنا کی غزلیات اُن مضامین سے لبریز ہین جنکی تاثیر کسی مردہ قوم مین زندگی کی حرکت پیدا کرسکتی ہی۔ فرماتے ہین ؎

معنی کا تم نے حالی دریا اگر بہایا　　یہ تو بتائین حضرت کچھ کرکے بھی دکھایا
اے بانگ طبل شاہی دن ہوگیا جب آخر　　خوابِ گران سے تو نے ناحق ہمین جگایا
تقلید قوم ہی پر گر ہی مدار تحسین　　تو ہمنے دوستونکی تحسین سے ہاتھ اُٹھایا

باپ کا ہی جبھی پسر وارث　　ہو ہنر کا بھی اُسکے گر وارث

گھر ہنر ور کا ناخلف نے لیا — تیرا ہی کون اے ہنر وارث
ہو اگر ذوقِ کسب سے آگاہ — کرین میراث سے حذر وارث
قوم بے پر ہو دین بیکس ہے — گئے اسلام کے کدھر وارث

جو جذبات قومی امراض کے حق مین اکسیر سمجھے جاتے ہین اُنکے اُکسانے مین مولنٰنا حالی نے کمال دکھایا ہی۔ جو لوگ اپنی پست حالت دیکھکر ہمت ہار بیٹھے تھے اُنھین اسطرح ڈھارس دیتے ہین ؎

ہی کہین اقبال کی نوبت کہین اِدبار کی — سبکو کرنی ہونگی پوری اپنی اپنی باریان
زیست بے عقلونکو ہوجائے بسر کرنی محال — اتنی بھی اے عاقلو اچھی نہین ہشیاریان

تلخیِ دوران کے ہین سب شکوہ سنج — یہ بھی ہی یارو! کوئی رنجونمین رنج
رنج و شادی یان کے ہین سب بے ثبات — اور اگر سوچو تو شادی ہے نہ رنج

پہنچ اے خضر کہ موقع ہے مددگاری کا — ڈگمگاتی ہی بہت دیر سے منجدھار مین ناؤ
اے شرافت تجھے بکنا ہی اگر مفت تو بک — آجکل کیجئے کیا ہی یہی بازار مین بھاؤ
قافلے ساتھ کے جا پہنچے حرم کے لگ بھگ — وقت اب ہاتھ سے جاتا ہی جو آتے ہو تو آؤ

قوم کے ظاہر و باطن کی تصویر جو مندرجۂ تحت شعرون مین الفاظ کے ذریعے کھینچی ہی کتنی صحیح اور سچی ہی ؎

خوبیان اپنے مین گو بے انتہا پاتے ہین ہم — پر ہر اِک خوبی مین داغ اِک عیب کا پاتے ہین ہم
دلمین دردِ عشق نے مدت سے کر رکھا ہی تنگ — پر اسے آلودۂ حرص و ہوا پاتے ہین ہم
ٹھہرتے جاتے ہین جتنے چشمِ عالم مین بھلے — حالِ نفسِ دون کا اُتنا ہی بُرا پاتے ہین ہم
گو بھلائی کر کے ہم جیسو سے خوش ہوتا ہی جی — تہ نشین اُسمین مگر دُردِ ریا پاتے ہین ہم
ہی ردائے نیکنامی دوش پر اپنے مگر — داغ رسوائی کے کچھ زیرِ ردا پاتے ہین ہم

نور کے ہمنے گلے دیکھے ہین اے حالی مگر
رنگ کچھ تیری الاپ مین نیا پاتے ہین ہم

اِن اشعار کی کیفیت اور خیالات کی حقیقت قابل داد ہی ؎

صلح ہے اِک مہلتِ سامانِ جنگ — کرتے ہین بھرنے کو یان خالی تفنگ
عہدِ گیتی پر نہ بھولین کامران — آخر اسکی آشتی لائیگی رنگ
علم گیا، اخلاق گیا، ہتھیار گیا، — سب بشر کے مار رکھنے کے ہین ڈھنگ
کام کا سشایہ زمانہ ہوچکا — دلمین اب اُٹھتی نہین کوئی اُمنگ
کاہشون سے پرورش پاتی ہو روح — اب لگا کھایا پیا سب آگے انگ

حمد کے یہ چند شعر معانی کے اعتبار سے کسقدر دلچسپ اور مضمون خیز ہین ؎

کامل ہی جو ازل سے وہ ہی کمال تیرا — باقی ہی جو ابد تک وہ ہی جلال تیرا
کاوش مین ہر آلہی دکھا مین ہی طبیعی — جو حل ہوا نہوگا وہ ہی سوال تیرا
دل ہو کہ جان تجھ سے کیونکر عزیز رکھئے — دل ہی سو چیز تیری جان ہی سو مال تیرا

لیکن نیچے کے یہ دو شعر اور ہی کیفیت سے پُر ہین ؎

نہ جی رُکھائی سے تیری چھوٹے نہ بے نیازی سے آس ٹوٹے
ہے سدا نامراد جو یان اُنھین بھی اُمیدوار دیکھا
خبر نہین یہ کہ کیا ہی کیسا ہی کون ہی اور تو کہان ہے
یہ اپنے مین اور تجھ مین ہمنے علاقہ اِک اُستوار دیکھا

نعت کا یہ شعر کتنا بلیغ ہی۔ اِس سے زیادہ صحیح تعریف ناممکن تھی ؎

قال ترا اور حال نشۂ وحدت مین — اوڑھنا تیرا خدا اور بچھونا خدا

مسئلہ عشق کی نزاکت و دقائق سے مولنٰنا حالی بے خبر نہ تھے لیکن بعض متقدمین کی بدولت عشق بھی لڑکون کا کھیل بن گیا اور رفتہ رفتہ عوام الناس اِس پاک جذبہ کو بھی شاہد بازی کا مرادف سمجھنے لگے۔ حالی کو معلوم تھا کہ اِس حالت مین جبکہ اُسکے حقیقی معانی سے بے خبری کا یہ عالم ہو عشق و محبت کی تعلیم قوم کیلئے غیر مفید ہوگی۔ یہی سبب ہے کہ اُنھون نے اکثر اسکا ذکر ایسے الفاظ مین کیا ہی جس سے تشویق کی جگہ تخویف کا پہلو نکلتا ہی۔ کہتے ہین ؎

اے عشق تو نے اکثر قومونکو کھاکے چھوڑا — جس گھر سے سر اٹھایا اسکو بٹھا کے چھوڑا

ابرار تجھسے ترساں احرار تجھسے لرزاں   جو زد پہ تیری آیا اُسکو گرا کے چھوڑا
رایونکے راج چھینے شاہونکے تاج چھینے   گردن کشونکو اکثر نیچا دکھا کے چھوڑا

آگے چلکر تو صاف صاف کہدیا ہی ۵

جیتے جی موت کے تم مُنھ مین نجانا ہرگز   دوستو دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز
عشق بھی تاک مین بیٹھا ہی نظر بازونکی   دیکھنا شیر سے آنکھین نہ لڑانا ہرگز
چاہت اک طلعت مکروہ ہی برقع مین نہان   کسی دلالہ کے دھوکے مین نہ آنا ہرگز
ہاتھ ملتے نہون پیری مین اگر حسرت سے   تو جوانی مین نہ یہ روگ لگانا ہرگز

یہ چارون شعر مولنٰنا حالی کی ایک مشہور غزل سے لیے گئے ہین یہ غزل سرتاپا مرصع ہی' اور تسلسل کلام مین جہان دہلی کا ذکر آگیا ہی وہان حسرت ویاس کا عجیب عالم پیدا ہوتا ہی ۵

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ   نہ سنا جائیگا ہم سے یہ فسانا ہرگز
ڈھونڈھتا ہی دل شوریدہ بہانے مطرب   دردانگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
صحبتین اگلی مصور ہمین یاد آئینگی   کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
لیکے داغ آئیگا سینے پہ بہت اے سیاح   دیکھ اس شہر کے کھنڈر مین نہ جانا ہرگز
چپے چپے پہ ہین یان گوہر یکتا تہِ خاک   دفن ہوگا کہین اتنا نہ خزانا ہرگز
کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمھارا دلی   ہمکو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
کر دیا مر کے یگانون نے یگانہ ہمکو   ورنہ یان کوئی نہ تھا ہم مین یگانا ہرگز
داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن مین   نہ سُنیگا کوئی بُلبل کا ترانہ ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر   اب نہ دیکھوگے کبھی لطف شبانا ہرگز

بزم ماتم تو نہین بزم سخن ہی حالی
یان مناسب نہین رو رو کے رُلانا ہرگز

حالی کی نظرون سے دہلی کا سمان جو گذرا تھا اُسکے درہم برہم ہونے پر جو الم آگین جذبات پیدا ہوسکتے ہین اُنھین حالی سے زیادہ کون محسوس کرسکتا تھا- حق یہ ہی کہ حالی نے یہ داستان چھیڑ کر اپنے ساتھ سامعین کو بھی خوب رُلایا ہی- اسیطرح قومی انقلاب کا فوٹو بھی بعض اوقات نہایت موثر طریقے پر دکھایا ہی- اسلامی عروج و زوال کا مرقع ایسا نہین کہ کوئی دیکھکر اپنے دل کو قابو مین رکھ سکے ۵

پھر زخم پھوٹ نکلا حالی نہ چھیڑنا تھا   فصل خزان کا قصہ ذکر گل و سمن مین
وہ قوم جو جہان مین کل صدر انجمن تھی   تمنے سنا بھی؟ اُسپر کیا گذری انجمن مین
وہ دن گئے کہ موتی مشہور تھے عدن کے   ہی کال موتیون کا اب سر بسر عدن مین
قبر اویس پر ہی بس خراب قرن کا   زندہ اویس کوئی باقی نہین قرن مین
خرد و بزرگ ساری ہین بدحواس گویا   لُٹنے کی قافلے کی پہنچی خبر وطن مین
حالی بس اب نہین یان سننے کی تاب باقی   مانا کہ ہی بہت کچھ وسعت ترے سخن مین

نوک زبان تیری سینون کو چھید ڈالا،
ترکش مین ہی یہ پیکان یا ہی زبان دہن مین

رُباعیات حالی بھی دیگر اصناف سخن کیطرح مفید خیالات کی جامع ہین- کہین وحدت کا ترانہ ہی کہین صلح کل کی لے اور کہین انقلاب عالم پر فلسفیانہ جذبات کا اظہار- یہ دو رُباعیان جن مین وجود وحدت باری تعالی کی پُر اثر اور سچی دلائل سے کام لیا گیا ہی بہت مشہور ہین ۵

کانٹا ہی ہر اک جگر مین اٹکا تیرا   حلقہ ہی ہر اک گوش مین لٹکا تیرا
مانا نہین جسنے تجکو جانا ہی ضرور   بھٹکے ہوئے دل مین بھی ہی کھٹکا تیرا

ہندو نے صنم مین جلوہ پایا تیرا   آتش پہ مغان نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے   انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

قومون کے باہمی اتفاق اور میل جول کی خوبی یون ظاہر کی ہی

ہندو سے لڑین نہ گبر سے بیر کرین   شر سے بچین اور شر کے عوض خیر کرین
جو کہتے ہین یہ کہ ہی جہنم دنیا   وہ آئین اور اس بہشت کی سیر کرین

دُنیا کے فانی ہونے سے کسکو انکار ہوگا لیکن یہی خیال اسلاف اوقات بڑے کامون کی تکمیل مین حارج ہوتا ہی- اس نکتہ کو مولنٰنا حالی یون ادا فرماتے ہین ۵

دُنیاے دنی کو نقشِ فانی سمجھو ۔ رودادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا ۔ ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

غزلیات اور رُباعیات کے بعد قصائد ہین۔ متقدمین نے قصائد نگاری کے جو اُصول موضوعہ مقرر کیئے ہین اُنکے اعتبار سے خصوصیت کے ساتھ یہ صنف حالی کے مذاق سے کوئی مناسبت نہین رکھتی۔ لیکن اُنکی جدید مدحیہ نظمین اور قصائد مناسبات کا ثبوت ہین کہ اِس خارزار مین بھی اُنھون نے اپنا علیحدہ راستہ نکال لیا ہے۔ حال مین آپ کی ایک تازہ نظم حضور نظام میر عثمان علیخان فرمانرواے دکن کی تخت نشینی کے موقع پر شائع ہوئی تھی اُسکے چند اشعار مندرجہ ذیل سے اُن کا رنگ طبیعت ظاہر ہوگا۔ سعدی کیطرح حالی کا بھی کہنا یہی ہے کہ ؎

چہ حاجت کہ نہ کرسی آسمان ۔ نہی زیرِ پاے قزل ارسلان
مگو پاے عزت برافلاک نہ ۔ بگو روے اخلاص بر خاک نہ

مبالغہ اور تصنع کی گلکاریون سے کلام مین گلزار کی سی دلفریبی پیدا کرنیکی جگہ آپنے ممدوح کو اُسکی ذمہ داریون سے آگاہ کرنا پہلا فرض سمجھا ہے۔ فرماتے ہین ؎

فلک مرتبت میر عثمان علیخان ۔ مبارک تمھین مسندِ شہریاری
مبارک ہو تمکو وہ دشوار منزل ۔ جہان چپے چپے پہ ہے ذمہ داری
مبارک بزرگون کی میراث تمکو ۔ جنھون نے کہ جھیلی ہین کڑیان یہ ساری
اب اُنکی جگہ آپ کو ہے اُٹھانا ۔ خدا کی امانت کا یہ بوجھ بھاری
جو بے بس ہین دنیا ہے اُنکو سہارا ۔ جو بے یار ہین اُنکی کرنی ہے یاری
نکمے جو ہین اُن کو کامی بنانا ۔ بڑھانا دل اُنکا جو ہین کاروباری
جگانا اُنھین نیند کے جو ہین ماتے ۔ پڑھانا اُنھین علم سے جو ہین عاری

قصائد کے بعد مدحیہ قطعات ترکیب بند اور تاریخی قطعے ہین اور شاعر کی طبعی مناسبت کے لحاظ سے بہت اچھے ہین لیکن ہمارے خیال مین اُنکی عظمت و منزلت یہ چیزین نہین بلکہ اُنکی وہ نظمین ہین جنکے عملی نتائج سے مسلمان آج متمتع ہو رہے ہین۔ اُنکی تعداد ایک دو نہین بلکہ بیسیون ہے اور اُنہین سے بعض اپنی شہرت کے لحاظ سے مسدس کے بعد ہی جگہ پانے کا استحقاق رکھتی ہین۔ مثلاً قصیدۂ الغیاثیہ اور شکوۂ ہند۔ اول الذکر جس موثر پیرایہ مین لکھا گیا ہے اُسکا اندازہ چوٹ کھائے ہوے دل خوب کر سکتے ہین۔ اسے شروع سے آخر تک دیکھیئے اور عالمِ سکوت مین اسکی معنی آفرینیون اور طرزِ بیان کی خوبیون کا موازنہ کیجیے۔ اللہ اللہ کس جوشِ محویت مین کہتے ہین ؎

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دُعا ہے ۔ اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

یہی حال شکوۂ ہند کا ہے۔ ایک ایک لفظ تیر و سنان کا کام کرتا ہے۔ مولنا حالی کے مبصرانہ اور عالی دماغ شاعر ہونیکی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اُن کا کلام محل اور موقع کے مناسب ہوتا ہے اسلیئے سامع کے دل و دماغ پر اُسکا اثر ضرور پڑتا ہے۔ یہ صفت اکثر جدید رنگ کے شاعرون مین مفقود ہے اور اسی وجہ سے مخالفین نئی شاعری کو غلطی سے بالعموم بے اثر اور روکھی پھیکی کہنے لگتے ہین۔

حالی کے پہلو مین ایک ستم رسیدہ دل ہے اس لئے اُن کی زبان سے جو بات نکلتی ہے وہ عموماً سوز و گداز کی مجموعی کیفیات سے مملو ہوتی ہے۔ مرزا غالب، سر سید، اور حکیم محمود خان کے مرثیے اسکی کافی شہادت ہین۔ غالب کا مرثیہ مجروح نے بھی لکھا ہے لیکن حالی کو نہین پہنچے۔ حکیم محمود خان کے نوحہ کی تمہید مین دہلی کی بربادی اور تباہی کا حال کتنا عبرت خیز ہے۔

مولنا حالی کے فیضان قلم سے ذکور و اناث دونون کو فائدہ پہنچا ہے، اور بعض خاص نظمین تو خالص طبقہ نسوان سے متعلق لکھی ہین مناجاتِ بیوہ اسی قبیل کی پہلی نظم ہے اور "چپ کی داد" غالباً سب سے آخری۔ مجھے وہ دن نہین بھولتا جب مین نے "چپ کی داد" خود مصنف کی زبانی سے سُنی تھی۔ حضور نظام میر محبوب علی خان خلد مقام کی جوبلی چہل سالہ

کا جشن حیدرآباد مین عام طور پر منایا گیا تھا۔ مولنا حالی جو اس دولت ابدمدت کے قدیم متوسلین مین سے ہین مہاراجہ مدارالمہام کی دعوت پر وہان تشریف لائے تھے۔ "ینگ منس ڈبیٹنگ فورم" کے اہتمام سے بھی ایک جلسہ قرار پایا تھا۔ مولوی عزیز مرزا مرحوم، مولوی ظفر علیخان مولوی عبدالحق وغیرہم شریک تھے۔ مہاراجہ کشن پرشاد بہادر وزیر اعظم دولت آصفیہ صدر نشین تھے۔ مولنا حالی بھی حیدرآباد مین تھے اسلیے آپ سے بھی تشریف آوری کی درخواست کیگئی تھی۔ تازہ نظم لکھنے کا موقع نہین تھا۔ آپ نے جلسہ مین چپ کی داد سنائی تھی جلسے کی شہرت عام ہو چکی تھی۔ وقت مقررہ پر نواب میر فیاض علیخان کی پُر فضا کوٹھی حاضرین سے پر تھی۔ اِس ذوق و شوق کے باوجود اکثر احباب کا خیال تھا کہ عالم نسوان کے متعلق مولنا حالی اُن خیالات پر کیا اضافہ کرسکینگے جو دس پندرہ سال کی طویل طویل مدت مین مولوی محب حسین نظم و نثر کے ذریعے سے ملک کے سامنے وہان پیش کر چکے تھے لیکن جسوقت مولنانے اپنی متین اور موثر آواز مین پہلا ہی شعر پڑھا کہ ؎

اے ماؤ بہنو بیٹیو قومونکی عزت تمسے ہے
شہرونکی بستی ہو تمھین دنیا کی زینت تمسے ہے

تو حاضرین کی چیرز نے زمین کو آسمان پر اُٹھا لیا اور اُسکے بعد تو خود رفتگی کا سا عالم تھا۔ مہاراجہ صدر نشین نے اپنی تقریر صدارت مین اس نظم پر دلی پسندیدگی کا اظہار کرکے یہ تمنا کی تھی کہ اسے کم از کم مملکت نظام کے مدارس نسوان کے نصاب مین داخل کیا جائے۔ اسمین کلام نہین کہ مولنا حالی کا کلام اگر انتخابی شکل مین کورس کی کتابون مین داخل کیا جائے تو بہت فائدہ مند ہوگا پنجاب کی کتابون مین پہلے ہی ایسا کیا جاتا ہے لیکن ضرورت ہے کہ ہر حصۂ ملک کی اُردو کتابین جو لڑکون یا لڑکیون کے لیے تالیف کیجائین اُنمین کلام حالی کو نمایان جگہ دیجائے۔

مولنا حالی اور اُن کے کلام کے متعلق تفصیلی بحث کی گنجائش یہان اِس سے زیادہ نہین نکل سکتی ورنہ ابھی دو ایک پہلوؤن پر اور روشنی ڈالنے کی ضرورت تھی۔ تاہم اُمید ہے کہ ان سطور سے ناظرین کو اُنکی شاعری کے متعلق ہمارے ذاتی خیالات کا اندازہ ہوجائیگا اور وہ خود بھی آخری فیصلے پر آسانی سے پہنچ سکین گے۔

حالی کا دم ہندوستان مین غنیمت ہے۔ اُنکی قومی خدمات اگرچہ زیادہ تر مسلمانون تک محدود ہین لیکن اُنکی شاعری ہندو، مسلمان پارسی، عیسائی، سبھون کیلئے یکسان نتیجہ خیز ہے۔ اسکے علاوہ ہندوستان کی مختلف اقوام کے درمیان میل جول اور محبت آمیز روابط قائم کرانے کے وہ ہمیشہ حامی رہے ہین۔ یہ راز اصحاب ہنود سے بھی چھپا ہوا نہین ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام کے قدردان مسلمانون سے قطع نظر اور لوگ بھی کثرت سے ہین اور خیالات وجذبات مین جیسے جیسے اصلاح ہوتی جائیگی اُسیطرح کلام حالی کی ہردلعزیزی کا حلقہ وسیع ہوتا جائیگا۔

کم از کم تعلیم یافتہ مسلمانون مین اُنھین "قومی شاعر" کا پوزیشن ضرور حاصل ہے اور اُنکی یہ حیثیت اسلامی جماعتون مین عام طور پر بلا اختلاف عقائد تسلیم کیجاتی ہے۔ اب اُن کے مخالفون کا بھی وہ زور نہین رہا اور اُن کی شہرت ہندوستان سے گذر کر یورپ تک جا پہنچی ہے۔ انگلینڈ مین اُنکی رباعیات کا ترجمہ انگریزی مین چند سال پیشتر ہوچکا ہے۔ گویا وہان والون پر ثابت ہو گیا ہے کہ ہندوستانی دماغ بھی انسانی زندگی کی رمز شناسی اور نیچر کی زبردست طاقت سے استفادہ حاصل کرنے کا کم وبیش ملکہ رکھتے ہین۔

حالی کا سب سے بڑا وصف بقول ایک نکتہ رس نقاد کے یہ ہے کہ "اُن کا کام اور کلام ایک ہے" حقیقت مین قول وفعل کی جو دلپسند مطابقت مولنا حالی کی ذات بابرکات مین ہے وہ کسی دوسرے مین نہوگی آجکل ہندوستان مین ایسے ہی شاعرونکی ضرورت ہے ہمین امید ہے

یا میر و داغ کی عظمت سے انکار نہین بلکہ بہت سی باتو نہین ہم اُنھین حالی سے بہتر سمجھتے ہین۔ لیکن زمانۂ جدید کی تمدنی و معاشرتی اور ادبی ضروریات کا جنکی تکمیل پر ابقاء قومی کا انحصار ہے تقاضا ہے کہ حالی ایسے شاعر پیدا ہون۔ ہم مخالفین کی تشفی کیلئے اُن تمام عیوب و نقائص کو تسلیم کرتے ہین جو وہ حالی کی "متشاعرانہ" سخن سنجی مین بتاتے ہین لیکن اس کے باوجود بھی ہم اُن کی شاعری کو فضول اور یا وہ گوئی نہین سمجھتے بلکہ برخلاف اسکے ہمارا عقیدہ ہے کہ اُن کی شاعری بہت سے مفید نتائج کا سبب ہے جس سے مسلمان بالخصوص متمتع ہوئے ہین۔

خود اُن کا یہ شعر اُن کے حسب حال ہے ؎

گو کہ حالی اگلے اُستادون کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک مین ایسے ہی اَب دو چار ہیچ

سید محمد فاروق

اساتذۂ اُردو کی فارسی شاعری

زبان اُردو کی ترکیب امتزاجی پر جسنے غور کیا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ زبان جو اسوقت انڈیا کی لنگوافرینکا ہے کن کن عنصرون سے مرکب ہوئی ہے اور ایشیا و یورپ بلکہ افریقہ تک کی زبانین کسطرح اسمین کم و بیش دخیل ہین۔ ہماری زبان کے اصل الاجزاء کی طرف غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ہندی سرزمین مین فارسی تخم بویا گیا۔ اُسکا ثمرہ ہے "اُردو" اور بنگلی تلنگی، مرہٹی، گورکھی، بنگالی، وغیرہ یہ پراکتین سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہین مین نے جو ہندی کا لفظ استعمال کیا ہے اِس سے مراد اُسوقت کی ہندوستانی بولی ہے جو اُس قطعہ ملک مین مستعمل تھی جہان اُردو نے جنم لیا ہے۔ خواہ وہ برج بھاشا ہو اور خواہ سندھی اور مرہٹی۔

فارسی مین عربی سیلاب کچھ اسطرح اُمنڈ کر آیا کہ فارسی حروف تک بدل گئے۔ اسی لیے فردوسی کی زرین یادگار شاہنامہ سمجھا جاتا ہے جسمین برائے نام عربی الفاظ لائے گئے ہین۔ اب تو یہ شوق زمانہ نے سرد کر دیا ہے لیکن ہمارے بچپن کی بات ہے کہ اچھے فارسی دان اچھی فارسی اُسکو کہتے تھے جسمین عربیت کا حصہ کم اور بہت کم ہو اور یہ سر جیسی کاہش و کاوش کرتے تھے یہ اُنھین کی وضع پرستی تک محدود تھی۔ اِس مختصر سی تمہید سے غرض صرف اتنی ہے کہ اُردو زبان عربی کی کچھ بہت زیادہ بلا واسطہ ممنون نہین ہے، اور اگر چند عربی مذاق بزرگون سے اُردو نے ذرا نفع اُٹھایا ہے تو وہ شمار کے قابل نہین۔

یہ عجیب بات ہے کہ فارسی شاعری کی ابتداء خود عربی مین منت اسلام ہے لیکن خود فارسی شاعری پر بحیثیت شاعری عربی کا کوئی خاص اثر نہین ہے۔ عرب کی شاعری کی بناء سادگی جوش اور تقاضائے فطرت پر ہے لیکن فارسی شاعری کو اِس حصہ سے کوئی بہرہ نہین ملا۔ بات یہ ہے کہ تمدن کی اعلی ترقی معاشرت کی انتہائے معراج اور پھر آزادی و آزادروی کا فقدان فارسی شاعری کی جان ہے۔ ایسی حالت مین وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ چنانچہ خود عرب شاعری نے بھی دوسری صدی مین یہی رنگ اختیار کر لیا، اور آورد کے ساتھ آمد کا تبادلہ ہو گیا۔ شہادت کیلئے آج بھی گھر گھر دیوان متنبی موجود ہے۔ عرب کی اصلی شاعری سے یہ اور انکے معاصر کتنے دور ہین؟ ایک ہی نگاہ مین معلوم ہو سکتا ہے۔

اُردو شاعر کو تکمیل شاعری کے لیے ضرورت تھی کہ وہ ہندی اور فارسی دونون سے علی وجہ الکمال واقف ہوتا کیونکہ دُنیا مین صرف اُردو زبان ہی ایک ایسی زبان ہے جسکو شاعری کا استحقاق

من تهبت الامام والالاب حاصل ہی۔ یہ لطف اتفاق ہو کہ عربی جو خود شاعری کی جان ہو وہ فارسی سے آنکرلی۔ موجودہ فارسی جو بحیثیت زبان عربی کی سخت دست نگر ہو وہ خود شاعری کیلئے ایسی موزون ثابت ہوئی کہ باوجود کس مپرسی کے اَب بھی اُسکے قدردانون سے دنیا خالی نہین ہو۔ فارسی ایسی زبان سے آنکرلی جو گویا شاعری ہی کیلئے خلق ہوئی تھی۔ اور "اُردو" اسکے نتیجہ کا نام ہو۔ مسلمانون نے ہندوٗن کے علوم وفنون کا مطالعہ اور تحصیل نہایت علمی شغف کے ساتھ کی اور اسکا انکار کرنا انتہائی کوتاہ نظری ہو لیکن اسکو مان لینا چاہیئے کہ اُردو اساتذہ نے ہندی زبانون کی طرف بہت ہی کم توجہ کی۔ اگر کسی نے مقامی خصوصیات کا بیان کیا ہو اور جیحون وسیحون کو چھوڑ کر گنگا وجمنا اور لیلی ومجنون کے بدلے ہیر رانجھا کا ذکر کیا بھی ہو تو یہ علی سبیل الجدت تھے اور اسکا دائرہ صرف جدت وندرت اور تفنن طبع تک محدود رہگیا۔

تکمیل شاعری کیلئے ہمنے تحصیل فارسی اور ہندی کی ضرورت کا اظہار کیا ہو۔ ہمکو اس حصہ سے مسرت ہو کہ ہمارے اساتذۂ اُردو کین شاعری کے پاس فارسی علمی ذخیرہ ایسا تھا کہ اگر وہ اُردو چھوڑ کر صرف فارسی کی طرف رُخ کرتے تو اس میدان مین بھی علم اُستادی بلند کر سکتے تھے لیکن افسوس ہوتا ہو کہ اِن بزرگون کو ہندی شاعری کی طرف توجہ نہ تھی جس کا نتیجہ اکثری صورت مین آپ بے اثری پاتے ہین۔

آج ہم اُردو کے چند مشہور اساتذہ کے فارسی اشعار پیش کرتے ہین جس سے یہ معلوم ہوسکے گا کہ اُنکی فارسی قابلیت کس درجے کی تھی۔

ہمنے اس فہرست سے خان آرزو، مرزا مظہر، مولانا آزردہ، مرزا غالب جیسے بزرگوارون کا نام خارج کر دیا ہے کیونکہ درحقیقت یہ حضرات فارسی کے شاعر تھے انکا ذکر "فارسی اساتذہ کے اُردو اشعار" کے ذیل مین آنے کے قابل ہو۔

میرؔ | حضرت میر تقی میرؔ جنکے بہتر نشتر مشہور ہین اور جنکے لیے غالبؔ وناسخؔ کا متفق علیہ قول موجود ہی[۵۲]

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہی بقول ناسخؔ   آپ بے بہرہ ہی جو معتقدِ میرؔ نہین

تلاش کے بعد میر صاحب کے دو ہی شعر ملے۔ واضح رہنا چاہیئے کہ میر صاحب نے خان آرزو جیسے مسلم الثبوت اُستاد فارسی کے زیر تربیت پرورش پائی تھی۔ نواب صدیق حسن خان مرحوم نے لکھا ہو کہ میر صاحب نے ایک فارسی دیوان بھی جسمین دو ہزار اشعار تھے اپنی یادگار چھوڑا ہے[۵۳]

گفتم آن آتش سوزان سر طور چہ شد   دل اشارت بجگر کرد کہ اینجا اُفتاد
گر باین رنگین خرامی بگذری از طرف باغ   سرو را شوق تماشا یت برفتار آورد

دردؔ | حضرت خواجہ میر دردؔ علیہ الرحمۃ کا نام نامی اُردو شاعری مین میرے نزدیک ایک اور وجہ سے مصرع ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام او" ہو کہ اُنھون نے ہی صوفیانہ خیالات کو سب سے پہلے اُردو نظم مین ادا کیا۔ خود اہل درد تھے اور خاندان سوز و درد کے جانشین اسلیئے اسوقت کے اہل تصوف کیطرح فارسی کی شان بھی آپنے برقرار رکھی۔ بہت سے فارسی رسالون کے ساتھ ساتھ ایک فارسی دیوان بھی موجود ہی۔ فارسی مذاق دن بدن انحطاط پر ہو اسلیے انتخاب بھی ہم مختصر کرتے ہین[۵۴]

سو آمد خبرے زرآمد او   من بعد خبر نماند مارا

---

۵۱ عجیب ترین واقعہ یہ ہو کہ حسان الہند سید غلام علی آزاد نے ہندی شاعری اور ہندی صنائع وبدائع سے بہت کچھ اپنے عربی اشعار مین لیا ہو۔ اور اسیطرح حضرت امیر خسرو نے اپنے کلام کو ان جواہرون سے رونق دی ہو۔ ملاحظہ ہو سبحۃ المرجان وشعر العجم حصہ دوم

۵۲ شمع انجمن صفحہ ۴۱۔   ۵۳ آب حیات آزاد۔

۵۴ شمع انجمن از نواب صدیق حسن خان مرحوم۔

بر سرکوی تو ام کیباری باید گریست — ابرتا داند که این مقداری باید گریست
ناسازی مزاج بکس ساختن نداد — چندے بخویش این ہمہ ناچار ساختیم
خود را میان محکمۂ جبر و اختیار — مجبور بودہ ایم کہ مختار ساختیم
گویند رحمت ست طلب گارِ بخششی — خود را باین امید گنہگار ساختیم
بیک تغافل از شگفتہ خاطرے ام کن — مژدہ بہم زن واین بزم جملہ را برہم کن

سودا | اُردو کے انوری و سوزنی میرزا رفیع السودا در اصل کابلی النسل تھے۔ اُنھون نے بھی فارسی مین ایک دیوان یادگار چھوڑا لیکن اُنکے قصائد ہی اُنکی فارسی قابلیت کے لیے اچھے سارٹیفکٹ ہین علاوہ ازین عبرت الغافلین ایک ایسی یادگار ہی جو مرزا کی اُستادانہ قابلیت کا سکہ بٹھا رہی ہی۔ یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہی کہ مرزا پہلے فارسی ہی کہتے تھے۔ خانِ آرزو کی تحریک سے ریختہ گوئی شروع کی[۵۱] ؎

بستانم از کہ زین دو عدو خون بہائے دل — دل جرم چشم گوید و چشم گناہ دل
سازم بجنین مرگ عوض عمر ابدرا — سر را چو دم نزع بزانوے تو بینم

مصحفی | شیخ غلام ہمدانی جنھون نے آٹھ اُردو دیوان یادگار چھوڑے ہین۔ اپنے فارسی تذکرہ مین سودا[۵۲] کے متعلق لکھتے ہین "آخر آخر خیال شعر فارسی ہم پیدا کرد مگر از فہم و عقلش این امر بعید بود کہ کرد غرض غزلہائے فارسی خود نیز کہ در لکھنو گفتہ بقید ردیف ترتیب دادہ داخل دیوان ریختہ نمودہ" مگر آپ کو تعجب کرنا چاہیئے کہ مصحفی خود بھی صاحب دیوان فارسی ہین۔ سودا کے لیے جسکو غلطی سے تعبیر کرتے ہین اُسی غلطی مین خود بھی پھنسے ہین بگر میرے خیال مین یہ کوئی غلطی نہین ہی کہ ایک شخص دو دو اور تین تین زبانون مین شعر لکھے ان اتنی بات ماننی چاہیئے کہ "ایک زبان کی مشق اور مزاولت دوسری زبان کے اعلیٰ درجۂ کمال پر پہنچنے مین سنگ راہ ہوتی ہی[۵۳]" تین شعر پیشکش ناظرین ہین ؎

جانم بلب و وقت شمارِ نفس ست این — منشین نفسے چون نفس باز پس ست این
بر بکیسیٔ کشتۂ تیغت نظرے افگن — در خاک کنون طعمۂ مور و مگس ست این
چون نقش مرا از سر کویش گذر افتاد — انگشت بدندان شد و گفتا کہ کس ست این

انشا | ہر فن مولا میر انشاء اللہ خان انشا جنکے مولد[۵۴] ہونے کا بنگالہ کی سر زمین کو فخر ہی یہ وہ جوہر قابل تھا جسکو شاعری نے برباد کر دیا طبقۂ شاعر مین اس دل و دماغ اور ہمہ گیر طبیعت کا مخلوق کم ہوا ہی۔ آزاد[۵۵] نے اُن کے فارسی دیوان پر جو رائے لکھی ہی ہم اُسکو نقل کر دیتے ہین "باتون ہی باتون کا مزا ہی جس غزل کو دیکھو گویا دو ایرانی ہین کہ کھڑے باتین کر رہے ہین اور فقط مسخرا پن۔ مضمون کو دیکھو تو کچھ بھی نہین۔ یہ سب کچھ ہی مگر لطف زبان اور خوبی بیان کی تعریف نہین ہو سکتی اور اس مین کچھ شبہہ نہین کہ اگر چند ساعت کیلئے اپنے رفیق طبعی یعنی تمسخر سے جدا ہوتے اور ذرا زبان کو قابو مین رکھتے تو خدا جانے اپنے زمانے کے خاقانی اور انوری ہوتے یا سعدی اور خسرو" مختصراً چند شعر انتخاب کیئے دیتے ہین۔ دیوان ہر جگہ ملتا ہی ؎

بہار بیتو برنگ پریدہ مے ماند — گل شگفتہ بجیب دریدہ مے ماند
تو و خدائے تو لے شیخ را بخواہی گفت — شمائل تو بہیچ آفریدہ مے ماند
نگاہت رنگ مستی بر در میخانہ می ریزد — باندازے کہ صہبا از لب پیمانہ مے ریزد

مومن | حکیم مومن خان جو دنیا کی دنیائے شاعری مین ایک خاص طرز[۵۶] کے بانی شمار ہوتے ہین اُنکی فارسی قابلیت کے لیے خود اُن کا اُردو کلیات کافی ہی جسمین جستہ جستہ اور خوش اسلوب فارسی ترکیبین اور قصائد مین توالی اضافت اور خوش آیند فارسی تلمیع کی کوئی کمی نہین ہی چند فارسی شعر کا انتخاب حاضر ہی[۵۷] ؎

دل گرفتند و ز دلدار نشانم دادند — آنچہ بُردند ز من بہتر از آنم دادند
اے مرگ ترا جان شدہ مشتاق ترا مشب — سوے تو خود آید تو نہ آئی اگر امشب

---

۵۱ آبِ حیات حالاتِ سودا۔ ۵۲ آبِ حیات۔ ۵۳ شمعِ انجمن۔

۵۴ انشا مرشدآباد مین پیدا ہوئے۔ ۵۵ آبِ حیات حالاتِ انشا۔ ۵۶ آبِ حیات حالاتِ مومن ۵۷ شمعِ انجمن۔

باکفر و آستان کلیسا تراچہ کار — مومن بدین بہانہ نشستن برائے کیست
فریب لطف نہانی نخوردہ کس جز من — ز بزم راندہ نشستم بر آستان گستاخ
مردم ز کشاکش آسان کردم — رحم بر بازوئے جانان کردم

امیر | مین نے صرف تطویل مضمون کے خیال سے قدیم اساتذہ مین سے کئی نامور بزرگون کو چھوڑ دیا ہے۔ دور ششم کے اساتذہ بھی اس لطف سے خالی نہ تھے مفتی امیر احمد مینائی عربی کے بہت اچھے فاضل تھے اور شاعری کی برکت سے مولوی سے منشی امیر احمد بنگئے تھے۔ دور ششم مین ہمارے خیال مین ان جیسا جامع کمالات شاعری کوئی نہین ہوا ہے۔ فارسی کلام بھی متانت سخن[۵۱] سے لبریز ہے ؎

خنجرے ناز بنا بد جگرے بہتر ازین — اے بتو بان تو ظالم نظرے بہتر ازین
سر پائے تو ہم نیست کسے بہتر ازین — ردم از خویش بنا شد بسبے بہتر ازین
می برد دل بادائے کہ ندانند کہ چہ — غمزہ اش باد ندارد ہنرے بہتر ازین
بوسد اوی و لب خویش مکید از ناز — اے شکر لب بادائے دگرے بہتر ازین
یار سرمست و ہوا سوی و می ناب بجوش — ساقیا باز بنا بی سحرے بہتر ازین
نگہے کردی و دل بردی و جانم باقیست — جان من گرد تو گردم نظرے بہتر ازین
بیخودی برد بسر منزل مقصود امیر — نیست در راہ جنون راہبرے بہتر ازین

داغ | بلبل ہندوستان جنھون نے جرأت کے طرز کو درجۂ کمال تک پہنچایا انکے متعلق یہ بہت کم لوگون کو معلوم ہوگا کہ انھون نے کبھی اپنی زندگی مین فارسی شعر بھی کہا ہو۔ حضرت نساخ نے سخن شعرا مین جو ریمارک کئے ہین اسوقت حضرت داغ کی ابتدا تھی لیکن انتقال سے پہلے نساخ نے ایک تذکرہ اپنے فارسی گو معاصرین کا لکھا ہے افسوس ہے کہ یہ پورا چھپنے بھی نہ پایا کہ آپ نے انتقال فرمایا۔ اسمین حضرت داغ کے متعلق لکھتے ہین "از مشاہیر شعرائے ریختہ گوے دہلی و ارشد تلامذہ شیخ محمد ابراہیم ذوق دہلوی ست فکر رسا و طبع شوخ دارد و اقسام شعر نغز و نیکو میگوید۔ استاد مسلم الثبوت ست۔ فکر شعر فارسی نمی کند بپاس خاطر راقم الحروف شعرے چند برائے درج این تذکرہ گفتہ"[۵۲] ہم یہان اس مقبول عالم شاعر کی پوری غزل نقل کرتے ہین ؎

عجب انداز وقت مرگ من آن اشک تر دارد — تبسم زیر لب دارد تاسف در نگہ دارد
ز شوخی کے بود تمکین مزاج لاابالی را — خیال عاشق شیدا ندارد گاہ گہ دارد
نہ در سرو سہی بینی نہ در تاج فلک یابی — ادائے خاص کان رعنا جوان کج کلہ دارد
بدین بار گران انسان نہ زل کے رسد — کراماً کاتبین بر دوش و بر سر صد گنہ دارد
گنج باد آورد و رو نمی آرد ز استغنا — گدائے کوچۂ جانان دماغ بادشہ دارد
کلام داغ چون خواندم صدا برخاست از محفل — خدائے پاک از عین الکمال اورا نگہ دارد

اس دور کے شاعرون مین حکیم امیر، منیر، تسلیم، مجروح، ظہیر مسلم الثبوت استاد گنے گئے ہین۔ العصر کے صفحات مین اگر گنجائش ہوتی تو سبھون کے فارسی انتخاب ہم دیسکتے تھے۔ آخر مین صرف ایک بزرگوار کے ذکر کے بعد اس مختصر مضمون کو ختم کئے دیتے ہین۔

حالی | مولانا خود عربی کے فاضل اور مرزا غالب کے شاگرد رشید ہین آزردہ، حسرتی، مومن خان، جیسے اساتذہ کرام کے صحبت یافتہ ان کی فارسی کیسی ہوگی، کیا پوچھنا ہے۔ اس قابلیت کو دیکھتے ہوے بے ضرورت اور خواہ مخواہ انگریزی الفاظ کا استعمال مولانا حالی کے دامن شہرت پر بدنما دھبہ ہے۔ اور ساتھ ہی ایسی ٹھیٹ بولی جو متانت اور ثقاہت زبان سے بہت بعید ہے بہرحال ہم ایک غزل انتخاباً درج کرتے ہین[۵۳] ؎

شوقی بدوست راہ نما داشتم چہ شد — دردے بہ از ہزار دوا داشتم چہ شد
عمرے ست دل بہ بند پیام وصال نیست — چشمے بہ رہگذار صبا داشتم چہ شد
در دست جام بادہ و در سر ہوائے دوست — وقتے چو اہل دل بصفا داشتم چہ شد

---

۵۱ نگارستان سخن
۵۲ تذکرہ شعرائے فارسی نساخ۔
۵۳ تذکرۂ فارسی نساخ۔

سُود زیان خویش نبردی مراز جائے پنہان بہ معاملہ با داشتم چہ شد

یادم کنون نماندہ کہ پیمان چہ بودہ است درسینہ خار خار وفا داشتم چہ شد

کارم زسعی خضر بجائے نمی رسد در ظرف خویش آب بقا داشتم چہ شد

حالی خوش آنکہ بودم رانکیہ بر وفا

ذوقے بدل زجور و جفا داشتم چہ شد

دوستو اب تک ماتم تھا کہ اُردو شاعری ماں کی طرف سے بدنصیب ہے لیکن اَب زمانہ آگیا ہو کہ باپ کی طرف سے بھی بیچاری محروم ہو جائے اور نوحہ یتیمی ہر قدر دان اُردو کی زبان سے نکلے۔

حبیب الرحمٰن

نواب فریدون جنگ بہادر

وابستگان دولت آصفیہ کی فہرست بسطرح مطول و مفصل ہو اسیطرح اُسمین ایسے نام بہت کم پائے جاتے ہین۔ جنکے تعلقات دیرینہ یا موروثی ہون۔ حیدر آباد کی "سول لسٹ" پر ایک نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہو کہ دو چار ہی نام اِس قماش کے مل سکتے ہین اور انمین مسٹر فریدونجی جمشید جی غالباً سب مین ممتاز اور نمایان ہین جنھین حضور نظام کی غاشیہ برداری کا فخر حاصل کیئے ہوئے دس مین نہین بلکہ چالیس سال سے بھی زیادہ مدت گذر چکی ہو۔

حیدر آباد کی تمام خوبیون کا اعتراف کرنے کے ساتھ ہی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہو کہ وہان کے آئے دن کے انقلابات و تغیرات قابل اور ہوشیار سے ہوشیار شخص کو بھی دس پانچ برس سے زیادہ ٹھہرنے کا موقع نہین دیتے۔ اس صورت مین مسٹر فریدونجی کا ذمہ دارانہ خدمات کے ساتھ اتنا طویل زمانہ بغیر کسی خرخشہ کے گذار دینا جہان خود مسٹر موصوف کی بے غرضانہ روش پر دلالت کرتا ہو وہان فرمانروائے دکن کی صفاتِ قدر شناسی و رعایا پروری بھی اُس سے آشکار ہوتی ہین۔

مسٹر فریدونجی پارسی نژاد ہین لیکن حیدر آباد مین کوئی طبقہ یا کوئی گروہ ایسا نہین جو آپ کا نام عظمت و عزت کے ساتھ لینے کا عادی نہو۔ اور اسکا راز یہی ہو کہ آپنے ہمیشہ بے لاگ اور غیر طرفدارانہ طور پر اپنی خدمات انجام دی ہین حیدر آباد مین ملکی و غیر ملکی کا قضیہ نہایت شد و مد سے چل رہا ہو لیکن چونکہ ایک طرف آپ کو ملکی ہونے کا حق بھی حاصل ہو اور دوسری طرف آپ کی رفتار و گفتار ہمیشہ انصافانہ رہی ہو اسوجہ سے کسی پارٹی کو بھی آپ سے منغض ہونے کا موقع نہین ملا۔ مسٹر فریدونجی کے والد ڈاکٹر جمشید جی جن کی اولاد اکبر ہونے کا آپ کو فخر ہو ریاست دکن کے سلسلہ ملازمت مین منسلک تھے۔ مسٹر فریدونجی صوبہ اورنگ آباد مین ۱۸ ستمبر ۱۸۴۹ء پیدا ہوئے اور اِس لیے قانوناً وہ "ملکی" تھے۔ ملازمت دکن کی شروعات اُسوقت سے ہوئی کہ آپ کی عمر ۱۸ سال سے کسیطرح متجاوز نہ تھی اور اُسوقت سے اسوقت تک مختلف عہدون کی نازک ذمہ داریان اس خوش اسلوبی سے انجام دی ہین کہ مخالف تک بھی آپکی ثنا و صفت مین رطب اللسان ہین۔

سر سالار جنگ اول کا زمانہ اصلاح دکن کی تاریخ کا پہلا باب تھا۔ ابواب آمدنی کو مستقل و باقاعدہ کرنے کیلئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ مالگذاری کا طریقہ برٹش انڈیا کے نمونہ پر جاری کیا جاے اور اِسی سلسلہ مین بمبئی کے نمونہ پر بندوبست اراضی کا کام شروع کر دیا گیا۔

مسٹر فریدونجی کے ذمہ اضلاع اورنگ آباد، بیٹر اور پربھنی کی پیمائش اور "سروے" کی خدمت سپرد ہوئی جسکی مجموعی مقدار پندرہ ہزار مربع میل تھی۔ چونکہ مسٹر موصوف مین کام کرنے کا سلیقہ خداداد موجود تھا آپ نے اپنے فرائض کچھ ایسی خوبی اور عمدگی سے ادا کیئے کہ "سمارک ہند" ایسے دور اندیش او رنقاد مدبر سے خراج تحسین وصول کیا یعنی سر سالار جنگ اعظم نے بطور خوشنودی ایک طلائی گھڑی معہ زنجیر بجلدوے حسن خدمات مرحمت فرمائی اور "سروے" کے اختتام پر آپ اضلاع اورنگ آباد مین اول تعلقدار (ڈپٹی کمشنر) مقرر کر دیئے گئے۔ گویا اعزاز و مناصب کی جو شاندار عمارت آگے چلکر کھڑی ہونے والی تھی، اُسکی بُنیاد نیک ہاتھون سے او رنیک ساعت مین اسطرح ڈالی گئی۔

سنہ ۱۸۸۳ء مین جنرل کلاسفرڈ کے خانہ نشین ہونے پر مسٹر فریدونجی اُنکی جگہ "سروے سٹلمنٹ کمشنر" مقرر کیئے گئے۔ اسمین شک نہین کہ یہ بہت بڑا اعزاز تھا جو اُنھین نہایت قریب تر زمانہ مین حاصل ہوا، لیکن سچ یہ ہو کہ یہ خدمات مسٹر فریدونجی کی ہمہ گیر طبیعت سے کچھ زیادہ موافقت نہ رکھتی تھین اور اسبات کی ضرورت تھی کہ کسی اور شعبہ مین اُنکی ذکاوت و فراست سے فائدہ اُٹھایا جائے۔

اس ضرورت کو سب سے پہلے جس نے محسوس کیا وہ نواب لائق علیخان سر سالار جنگ ثانی تھے۔ جب بعد وفات سر سالار اعظم قلمدان وزارت عظمیٰ ان کے سپرد ہوا تو مسٹر فریدونجی کو اُنھون نے اپنے معتمد خصوصی (پرائیوٹ سکرٹری) کے منصب پر فائز کیا اور سالہا سال کے تجربہ اور عمل کے بعد آج کہا جا سکتا ہو کہ نواب سر سالار جنگ ثانی کا انتخاب اسقدر کامیاب ثابت ہوا ہو کہ باید و شاید۔ اُسوقت سے لیکر آجتک مسٹر فریدونجی وزیر اعظم دکن کے پرائیوٹ سکرٹری ہین وزارتین تبدیل ہوئین، انقلاب آئے، تغیرات ہوئے، لیکن مسٹر موصوف نے اپنے عہد کے فرائض جس خوبصورتی سے پورے کیئے اُسکو پیش نظر رکھکر ہر ایک نے انکی کاردانی اور تجربہ کاری سے نفع اُٹھانا پسند کیا۔ نواب لائق علیخان مرحوم کے بعد اور عہد جدید سے پہلے سر آسمان جاہ مرحوم، سر وقار الامرا مرحوم اور پھر مہاراجہ سرکشن پرشاد کی وزارت کے دور آئے، اور اسمین شبہہ نہین کہ ہر دور مین بہت سی اہم تبدیلیان ہوتی رہین لیکن مسٹر فریدونجی جون کے تون اپنی جگہہ پر قائم ہے اور نہایت مسرت کی بات یہ ہو کہ انکی ہر دلعزیزی مین کبھی اور کسی زمانے مین بھی سر مو فرق نہین آنے پایا۔ اسی ایک بات سے مسٹر موصوف کی دانشمندی او رزمانہ شناسی کا اندازہ کافی طور پر ہو سکتا ہو۔

اُن فرائض کے علاوہ، جو آپکے عہدۂ معتمد خصوصی سے وابستہ ہین آپ کو باوجود عدیم الفرصتی و کثرت کار کے، کبھی کبھی اور کام بھی محض اسوجہ سے سپرد کیئے گئے ہین کہ ان کا انفصال آپ کے ہاتھون بہت اچھی طرح ہونے کی اُمید تھی۔ مثلاً سر آسمان جاہ مرحوم کے عہد وزارت مین، جسوقت معدنیات دکن کا مشہور مقدمہ چل رہا تھا اور جسکے دریافت حال کے لیے ولایت مین پارلیمنٹ کے جانب سے کارروائی ہونے والی تھی مسٹر فریدونجی اس لیئے منتخب کیئے گئے تھے کہ نواب محسن الملک مرحوم کے ساتھ بہ حیثیت قائم مقام دولت نظام ولایت جاکر اُس کارروائی مین شریک ہون اسیطرح بزمانۂ مہاراجہ سرکشن پرشاد جب مسٹر کیسن واکر، معین المہام فنانس رخصت پر جارہے تھے تو مسٹر فریدونجی کے ذمہ صیغۂ معدنیات و ریلوے کی نگرانی سپرد کیگئی تھی۔ اسیطرح بہ حیثیت پرائیوٹ سکرٹری وزیر اعظم حیدرآباد آپ کو ہمیشہ اپنے وقت کا بہت بڑا حصہ اُن سرکاری مہمانونکی خدمت اور خبرگیری مین گذارنا پڑتا ہو جو مختلف بلاد و امصار سے آئے دن وہان آتے رہتے ہین اور جنھین زیادہ تر تعداد یورپین

سیاحون کی ہوتی ہے۔ لیکن اسقدر مصروفیت کے باوجود آپ کا کام دائمی طور پر وقت پر ہوتا ہے اور توجہ کے ساتھ، یہی وجہ ہے کہ آپ کے خلاف کسیکو بھی نکتہ چینی کا موقع نہین ملا۔

حضور نظام مرحوم نے آپ کی بے لاگ روش کو ہمیشہ بہ نظر استحسان دیکھا ہے اور آپکے اعزاز و اکرام مین کبھی رتی برابر کمی نہین کی۔ بلکہ جب موقع آیا ہے تو اُسمین زیادتی ہوتی گئی ہے چنانچہ مہاراجہ کشن پرشاد کے زمانے مین پرائیوٹ سکرٹری کی خدمات کے ماسوا گورنمنٹ نظام کے پولٹیکل سکرٹری کا منصب بھی مسٹر فرید ونجی کے حصہ مین آیا۔ اس عہدے کے فرائض جسقدر نازک اور ذمہ داری سے پُر ہین ظاہر ہے لیکن مسٹر موصوف نے کمال عقل و فہم سے کام لیکر ابتک اپنی سرکار کو الگ خوش رکھا ہے اور گورنمنٹ ہند کو الگ۔ حضور نظام سے "نواب فرید ون جنگ بہادر" کا خطاب بھی عنایت ہوا ہے لیکن آپ کا نام (فرید ونجی) دکن مین کچھ ایسا ہر دلعزیز اور مشہور ہو گیا ہے کہ خطاب کا استعمال تحریرات کے سوا، معمولاً بہت کم ہوتا ہے۔

گورنمنٹ آف انڈیا نے مسٹر فرید ونجی کی خدمات کا اعتراف کئی موقعون پر اور مختلف صورتون مین فرمایا ہے۔ ۱۹۰۳ء مین آپ کو سی آئی۔ ای کا خطاب دیا گیا اور خود ویسرائے ہند کے ہاتھون دربار دہلی کے موقع پر آپ کو یہ اعزاز ملا۔ سر ڈیوڈ بار جنکا زمانہ بحیثیت رزیڈنٹ حیدر آباد، کئی معنون مین یادگاری سمجھا جاتا ہے اپنی ایک اسپیچ مین جو حیدر آباد سے رخصت ہوتے وقت کیگئی تھی، مسٹر فرید ونجی کی خدمات شایستہ کا اقرار کرتے ہوے انکی بہت کچھ مدح سرائی کی تھی۔ لارڈ کرزن نے بھی کسی خاص موقع پر تعریفی الفاظ مین آپ کا ذکر فرمایا تھا۔ ابھی حال مین دربار دہلی ۱۹۱۱ء کے موقع پر مسٹر موصوف سی۔ ایس۔ آئی کے خطاب سے مخاطب کئے گئے اور یہ تمام باتین اسکی شاہد ہین کہ پرائیوٹ سکرٹری اور پولٹیکل سکرٹری کے فرائض کی انجام دہی اور گورنمنٹ ہند اور ریاست دکن کے سیاسی دوستانہ تعلقات کے قائم رکھنے اور انھین زیادہ تر اُستوار کرنے مین مسٹر فرید ونجی نے پوری پوری کامیابی حاصل کی ہے۔ ۱۹۰۹ء مین مسٹر فرید ونجی نے چاہا تھا کہ پنشن لیکر اور خدمات کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر اپنی پیرانہ سالی کا زمانہ بہ آرام بسر کرین لیکن حضور نظام مرحوم نے جنھین مردم شناسی کا کمال حاصل تھا آپ کے تجربہ و عملیات سے ریاست کو محروم رکھنا گوارا نہ کیا بلکہ یہ انتظام فرمادیا گیا کہ مسٹر موصوف کو ایک قابل مددگار دیدیا جائے تاکہ روزمرہ کے معمولی کامون کا بار مسٹر فرید ونجی پر نہ پڑے اور یہ رعایت بھی ساتھ ہی منظور فرمائی گئی کہ موسم گرما کے دو مہینے جبکہ خاص حیدر آباد کا قیام تکلیف دہ ہوتا ہے، وہ باہر جاکر بسر کرین تاکہ انکی صحت جسمانی اچھی رہے۔ اسی ایک واقعہ سے اسکا اظہار ہو سکتا ہے کہ مسٹر فرید ونجی کے حال پر آقائے نامدار کی کیسی کچھ توجہ تھی۔ اور یہ سب کچھ صلہ تھا خود آپ کی محنت و مشقت اور جانکاہی کا۔ ہمین اُمید کرنا چاہیے کہ دور جدید مین بھی اُن کے اعزاز کی افزونی کا سلسلہ برابر قائم رہیگا جسکے آثار ظاہر ہو رہے ہین۔ مسٹر فرید ونجی کے ذمے جو گرانبار خدمات آپڑی ہین اُنکی موجودگی مین یہ توقع کرنا فضول ہے کہ وہ اپنے وقت کا کچھ حصہ علمی مشاغل مین باطمینان گذار سکتے تاہم انسے وہ بالکل کنارہ کش بھی نہین رہے۔ آپ کا نام، اگرچہ مستقل مولف یا مصنف کی حیثیت سے نہ سہی، تاہم ایک قابل مضمون نگار کے طور پر ضرور لیا جا سکتا ہے۔ آپ کے اکثر مضامین، جو علمی و عملی خوبیون سے مملو تھے، انگریزی زبان کے مشہور و معروف موقت الشیوع پرچون مین نکلکر مقبول ہو چکے ہین۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین اینڈ آئرلینڈ اور کاٹڈن کلب کے آپ لائف ممبر ہین اور یہ کہنے کی ضرورت نہین کہ یہ اعزاز صرف اُنھین لوگونکو ملتا ہے جنکا علمی

شغف بدرجہ کمال پہنچا ہوا ہوتا ہے۔
شکار کا شوق بھی آپ کو بہت ہے۔ جو یورپین حکام حیدرآباد بغرض سیر و شکار آتے ہین اُن کی پارٹی کے ہمراہ مسٹر فرید ونجی ضرور ہوتے ہین۔ اور سیف آباد مین آپ کی کوٹھی مین شیر وغیرہ کی کھالین اور سر بافراط موجود ہین۔
مسٹر فرید ونجی کے اکلوتے صاحبزادے مسٹر رستم جی فرید ونجی بار مین ڈپٹی کمشنر ہین اور آپ کے دونون حقیقی چھوٹے بھائی مسٹر برزو جی جمشید جی اور مسٹر سہراب جی جمشید جی ریاست دکن مین معزز عہدون پر مامور ہین۔ اول الذکر کو اول تعلقداری کا منصب حاصل ہے اور مسٹر سہراب جی ناظم محکمۂ جنگلات (کنسرویٹر آف فارسٹ) ہین۔
ہماری دلی تمنا ہے کہ مسٹر فرید ونجی ناموری اور عزت مین روزافزون ترقی کرین اور نیکنامی کے ساتھ اُن کے کارنامون کا اختتام ہو۔

تنقید کتب

سوانح عمری پیغمبر عالم صلعم | مذہبی نقطۂ خیال سے قطع نظر حضرت محمد صلعم دُنیا مین افضل ترین ہادی و مصلح کا مرتبہ رکھتے ہین۔ لیکن مسلمانان ہند کیلئے یہ بات ضرور غیرت دلانے والی تھی کہ جس نبیؐ کے وہ نام لیوا ہین اُسکی کوئی مفصل و مدلل سوانح عمری اُردو زبان مین موجود نہین یہ ضرور ہے کہ حضرت محمد صاحب کے واقعات زندگی اور تلقینات و ارشادات کا تذکرہ عربی زبان مین بصورت مکمل موجود ہے اور اس امر خاص مین ابو علی ترمذی، ابو الفدا، واقدی کی مساعی جمیلہ زیادہ تر مشکور ہوئی ہین۔ اسیطرح انگریزی زبان مین کئی مستقل کتابین اسلام اور ہادی اسلام کے متعلق لکھی جا چکی ہین لیکن ہندوستان مین عربی زبان کا رواج کچھ ایسا کم ہو گیا ہے کہ بحالت موجودہ عربی تواریخ و کتب سیر سے (الا ماشاء اللہ) استفادہ حاصل کرنا ناممکن نظر آتا ہے ایسے ہی انگریزی مین گبن، کارلایل، جان ڈیون پورٹ، سر ولیم میور کی تحریرین یا تو مختصر ہین یا مفصل ہونے کی صورت مین بھی اُنمین بعض ایسی لغزشین محسوس ہوتی ہین کہ عقیدتمندون کو اُن کے مطالعہ سے کوئی انبساط نہین حاصل ہو سکتا۔ صورتِ حال جب یہ ہو تو یہ ضرورت مسلم ہوئی کہ اُردو مین آنحضرت کی مستقل سوانح عمری جدید طرز پر تیار کیجائے۔ شکر ہے کہ مولانا شبلی نعمانی نے اس کار عظیم کی تکمیل پر کمر باندھی ہے۔ خدا اُن کی ہمت مین برکت اور عزم مین استقلال دے کہ اُن کے اس تازہ ترین دماغی کارنامے سے مُلک کو مستفید ہونے کا جلد تر موقع ملے لیکن جبتک مولانا شبلی کی "سیرت نبوی" کا سر اور آنکھون سے خیر مقدم کرنیکا وقت نہ آجائے، ہم "سوانحعمری پیغمبر عالم" کو غنیمت سمجھتے اور اُسے جوش مسرت کے ساتھ خوش آمدید کہتے ہین۔ یہ سوانح عمری رکنان ہلال ٹریڈنگ کمپنی نے ترتیب دیکر شائع کی ہے اور کئی دفعہ کے متواتر و مسلسل مطالعہ کے بعد کہنا پڑتا ہے کہ اسکی تالیف مین محنت و دردسری سے ضرور کام لیا گیا ہے اور کتاب مین دلچسپی اور دلبستگی کے سامان بہم پہنچانے کی کسی امکانی سعی سے دریغ نہین کیا گیا۔
سب سے پہلے ایک مختصر تمہید کے بعد "آنحضرت کے سوانح نگار" کے عنوان سے ایک جُداگانہ باب ہے جسمین اس مبحث پر خصوصیت سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ کن کن مشاہیر اہل قلم نے آپکے سوانح نگار بننے کی عزت حاصل کی ہے۔ عربی، فارسی اور انگریزی وغیرہ زبانون کی سوانح عمریون کا تذکرہ کر کے اُن کی تنقید کیگئی ہے اور دکھایا گیا ہے

کہ کس مورخ مین کیا خوبی یا کونسی کمزوری ہی اور اسمین کلام نہین کہ جو کچھ بھی اور جسقدر بھی رائے زنی کیگئی ہی وہ نیک نیتی پر مبنی ہے۔

اہل عرب کے قدیم رسم و رواج اور عادات و اخلاق کا تذکرہ نہایت مبسوط ہی۔ اس کے پڑھنے کے بعد اندازہ ہو سکتا ہی کہ آنحضرت کا ایک ایسے بگڑے ہوئے مُلک مین ایک نئے مذہب کی تلقین کرنا اور پھر اُسمین کامیاب ہونا بجائے خود ایک معجزہ ہی۔ زمانۂ جاہلیت کے مراسم کے علاوہ مذاہب عرب کے دلچسپ حالات بھی درج ہین جنکا مطالعہ وسعت معلومات کیلئے ازبس مفید ہوگا۔

آنحضرت صلعم کے حالات زندگی بلا کم وکاست اسطرح قلمبند کیے گئے ہین کہ کوئی پہلو نظر انداز نہین ہونے پایا، مثلاً حسب و نسب، خاندان، ولادت، طفولیت، رضاعت، بعثت، غزوات، انمین سے ہر ایک عنوان کے تحت مین مفصل بحث کیگئی ہی اور معقول و منقول دلائل سے حسب ضرورت کام لیا گیا ہی اخلاق محمدی کی جو تصویر اس کتاب کے صفحات مین دکھائی گئی ہی وہ نہایت دلکش ہی۔ اعلائے کلمۃ الحق مین آپ کو ہزارون ناقابل برداشت تکالیف و مصائب کا سامنا کرنا پڑا لیکن کبھی آپنے اسکی پروا نہین کی اور اپنے فرض کا ہمیشہ خیال رکھا یہی ایثار یہی استقلال، یہی عزم وہ قوتین تھین جنکے ہاتھون اسلامی مشن تکمیل کو پہنچا ہی۔

تبلیغ اسلام مین جو دشواریان راہ مین حائل ہوئین وہ ایسی نہ تھین کہ معمولی آدمی کے ہوش و حواس بجا رہنے دیتین لیکن حضرت محمد صلعم کے عزم صمیم اور قوت ارادی کے جانفزا کرشمے دیکھئے کہ آپ ان کا کچھ بھی خیال نہین فرماتے اور برابر اپنے کام مین لگے ہوئے ہین۔ آخر یہی ہوتا ہی کہ دشمنی اور مخالفت کے پہاڑ علو ہمتی اور مستقل مزاجی کے زور سے پانی کیطرح کٹ جاتے ہین اور آپکے سامنے دشمن اور مخالف سب کے سب سر جھکا دیتے ہین۔

کئی مقالات پر بعض معرکۃ الآرا مباحث آگئے ہین مثلاً واقعہ شق صدر، واقعۂ معراج مبارک، یہ وہ اختلافی مسئلے ہین جنکے متعلق علمائے اسلام صدیون کی کوششون کے بعد بھی ایک مرکز پر نہین آسکے۔ اس کتاب مین ان مسائل کے متعلق یہ اچھا کیا گیا ہی کہ ہر قسم کے مضامین اور آرا، کا حوالہ بالتصریح دیدیا گیا ہی مثلاً یہ کہ قرآن شریف مین اسکا ذکر کسطرح پر ہی؟ احادیث سے اسکے متعلق کیا معلوم ہوتا ہی؟ سرسید مرحوم خطبات احمدیہ مین اس باب مین کیا فرماتے ہین؟ یا کسی اور اہل الرائے کیا خیال ہی؟ اس سے ناظرین کو بجائے خود رائے قائم کرنے کا موقع ملجائیگا۔

آخر کتاب مین چند ضمیمے شامل کیے گئے ہین جنمین بعض مطالب کی خاص طور پر وضاحت ہوتی ہی ضمیمہ سوم خصوصیت سے دلچسپ ہے اور اُس سے اس بات کا پتہ چلتا ہی کہ ہر جگہ اور ہر قوم مین خواہ خارجی اسباب موافق ہون یا ناموافق، ایک مخصوص طبقہ حق پسندون کا بھی ہوتا ہی جسکا کام صرف یہی ہوتا ہی کہ جو کچھ کہین سچ کہین اور طرفداری یا ناجائز تعصب اور ہٹ دھرمی کے شکار نہون۔

اس ضمیمہ مین وہ تمام آرا، جمع کیگئی ہین جو غیر مسلم اہل الرائے نے آنحضرت محمد صلعم کے متعلق بیان کی یا لکھی ہین۔ بخیال طوالت ہم صرف پادری بوسوتھ اسمتھ کا اقتباس درج کرتے ہین جس سے صاف گوئی اور راستبازی کی ایک قابل تعریف شان ظاہر ہوتی ہے:۔

ملک کے بادشاہ اور نبی ہونے کی حیثیت سے وہ ایک ہی وقت مین سیزر اور پوپ کا مرتبہ رکھتے تھے۔ وہ پوپ تھے لیکن پوپ کی سی

دغابازی سے معرا تھے۔ وہ سیزر تھے لیکن سیزر کی سی کارروائیون سے مبرا تھے۔ باقاعدہ فوج کے بغیر، حفاظت کے سپاہی نہونے کے باوجود، محل کے بغیر، مقررہ خراج کے ہوتے ہوئے اگر کوئی آدمی یہ کہنے کا حق رکھتا ہو کہ اُس نے خدای طاقت سے حکومت کی تو وہ محمد ہی تھے کیونکہ اُن کو یہ طاقت وحکومت سب مہیا تھی لیکن ہتھیار نہ تھے۔

اسیطرح گبن، کارلائل، راڈویل، ڈاکٹر لیٹنر، ڈیون پورٹ کے خیالات قابل دید ہین۔

لالہ لاجپت رائے کو بھی اسی سلسلہ مین جگہ مل گئی ہو جنکا یہ فقرہ بہت پُر معنی ہے:۔

مجھے یہ کہنے مین ذرا بھی تامل نہین کہ میرے دل مین پیغمبر اسلام کیلئے نہایت عزت ہو۔ میری رائے مین ہادیان دین و رہبران بنی نوع انسان مین اُن کا درجہ بہت اعلیٰ ہو۔

مہاراجہ کشن پرشاد بہادر شاد (حیدرآباد دکن) کے یہ اشعار بھی نمایان طور پر لکھے گئے ہین ؎

مدینہ کو چلو دربار دیکھو — رسول اللہ کی سرکار دیکھو
نہ روکین گے مجھے دربان کہ ہون مین — غلام احمد مختار دیکھو
خدا کو جانتا ہون دل سے واحد — کہ وحدت سے نہین انکار دیکھو
فدا ہون نام احمد مصطفےٰ پر — وہ بیشک ہین مرے سردار دیکھو

تاریخ کعبہ کا ضمیمہ بھی سودمندی سے خالی نہین غرض کہ یہ کتاب دلچسپ اور مفید ہو اور ملک کی عام قدردانی کی مستحق ہو۔ قیمت فی جلد عہ، کمپنی موصوف سے پیسہ اخبار سٹریٹ لاہور کے پتہ سے طلب کرنا چاہیئے۔

مباحثہ گلزار نسیم گلزار نسیم اُردو زبان کی ایک مشہور و معروف مثنوی ہو جو اپنی لٹریری اور شعری خوبیون کے لحاظ سے آج بھی باوجود اُن تغیرات کے جو مغربی لٹریچر کے اثر سے ہمارے مذاق علمی مین لازمی طور پر پیدا ہونے چاہیئے تھے ملک مین اسیطرح ہر دلعزیز ہو جسطرح کہ قدیم سوسائٹی مین تھی۔ امتداد زمانہ سے اُسمین یہ خرابی ضرور پیدا ہو گئی تھی کہ اسکا کوئی صحیح نسخہ دستیاب ہونا مشکل ہو گیا تھا۔ عام کتب فروشون کے پاس جو ایڈیشن ملتے تھے اُنمین اسقدر اختلاف تھا کہ کسی ایک کو دوسرے کے مقابلے مین مستند تصور کرنا محال تھا اور انھین اغلاط کی بدولت آجتک اس مثنوی پر بہت سے جا و بیجا اعتراضات کی بوچھار ہوتی رہی ہو۔ مسٹر چکبست لکھنوی نے یہ بہت اچھا کیا کہ گلزار نسیم کا صحیح نسخہ بہم پہنچا کر معہ ایک تنقیدی مقدمہ کے چھپوا دیا۔ اسکو شائع ہوئے کئی سال ہو گئے۔ اخبارات و رسائل نے اسپر حسب عادت ریویو کیئے۔ لیکن قاعدہ ہو کہ مذاق کے اختلاف کیوجہ سے رائین بھی مختلف ہو جاتی ہین۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے اپنے رسالہ "دلگداز" مین اس مثنوی کے نئے ایڈیشن پر اظہار رائے کرتے ہوئے جہان اُسکے محاسن پر روشنی ڈالی وہان معایب کو بھی نظر انداز نہین کیا۔ مولانا شرر کی نکتہ چینی کا جواب مسٹر چکبست نے "اودھ پنچ" مین چھپوایا اور جواب الجواب لکھنے مین شرر کے قلم سے "پنچ" کی شان مین بعض ایسے الفاظ بھی نکل گئے جو متانت اور تہذیب کے درجہ سے گرے ہوئے تھے۔ یہ ہوسکتا ہو کہ مولانا شرر نے "اودھ پنچ" کے ظریفانہ انداز کے مضامین کو دیکھکر جنمین جولانی فکر مضمون نگار کو کہین سے کہین پہنچا دیتی ہو اُسے "شہدے" کا لقب دیدیا ہو لیکن اگر وہ ایسا نہ کرتے اور یہ سمجھ لیتے کہ "پنچیانہ" انداز کا اقتضا یہی ہو تو خوب ہوتا۔ بہرحال معرکۂ "چکبست و شرر" کی شان نزول یہ ہو۔ پہلے تو یہ بحث صرف اُس طبقے تک محدود تھی جو "دلگداز" اور "اودھ پنچ" کا قدر شناس کہا جا سکتا ہو لیکن رفتہ رفتہ اسکی دلچسپی کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا اور اکثر اہم مسائل پر کئی نقادان فن کو قلم فرسائی کی ضرورت آپڑی۔ "مباحثہ گلزار نسیم" مین وہ تمام مضامین جمع کردیئے گئے ہین جو اس مبحث سے متعلق ہین عام اس سے

کہ وہ شرر کی تائید اور چکبست یا اودھ پنچ کی مخالفت مین لکھے گئے ہون یا اسکے برعکس - اور خواہ وہ دلگداز مین شائع ہوئے ہون یا کسی اور خبار یا رسالے مین۔ خلاصتہ الحکما میرزا محمد شفیع شیرازی ثم الکھنوی نے اس مجموعہ کو ترتیب دیکر گویا اس معرکتہ الآرا علمی مباحثہ کی یادگار قائم کی ہی اور اسمین شبہہ نہین کہ "مباحثہ گلزار نسیم" کے صفحات کو خیالات کی گوناگونی' جذبات کی بوقلمونی' اور آرا کی نیرنگی نے ایک نہایت پر لطف چیز بنا دیا ہی۔ شروع مین ایک دیباچہ بھی ہی۔ لیکن میرزا صاحب سے ایک اصولی لغزش ہوگئی ہی - یعنے آپ لکھتے تو ہین کہ -

اس علمی جنگ مین جناب شرر اور جناب چکبست کے درمیان معرکۂ پیش تھا۔ اب رہا یہ امر کہ ان دونون پہلوانان سخن مین سے کسکو فتح ہوئی اور کسکو شکست ہوئی اسکا فیصلہ کرنا ہمارا کام نہین - اسکا فیصلہ جناب احمد علی صاحب شوق' منشی سجاد حسین صاحب' حافظ جلیل حسن صاحب جلیل وجناب حسرت موہانی وجناب طپش بلگرامی وغیرہ نے کر دیا ہی۔

تاہم آپ کے انداز تحریر اور طرز بیان سے یہ ہویدا ہوتا ہی کہ آپ مسٹر چکبست کے طرفدار ہین۔ فی الحقیقت یہ کوئی قابل گرفت فعل نہین لیکن جب آپ نے تمام مباحث کو ناظرین کے پیش نظر رکھکر فیصلہ اُنھین پر چھوڑ دیا تو شرر کے متعلق یہ لکھنا عبث تھا کہ

آپ کے مضامین سے اکثر مقام پر بےجا غیض وغضب کا اظہار ہوتا ہی ہمکو مولنا شرر ایسے بزرگ کے قلم سے ایسے الفاظ نکلتے دیکھکر سخت تعجب ہی۔

یا یہ الفاظ :-

برعکس اسکے انصاف ہمین یہ کہنے پر مجبور کرتا ہی کہ جناب چکبست کے قلم سے جو مضامین جناب شرر کے اعتراضات کے جواب مین شائع ہوئے ہین اُنمین پوری شان تنقید قائم ہی -

اسی قسم کے اور بہت سے اقتباس پیش کیے جا سکتے ہین جن سے آپ مسٹر چکبست کے حامی ثابت ہوتے ہین - اور اگرچہ میرزا صاحب کے ان خیالات سے بہت بڑی حد تک ہم بھی موافقت رکھتے ہین تاہم اگر وہ اپنا عندیہ ظاہر نہ کرتے تو زیادہ مناسب تھا۔

اس کتاب مین کم نہ زیادہ پورے ۱۵ مضامین درج ہین - میرزا صاحب نے اس بات کی کوشش کی ہی کہ کوئی مضمون جو اس مباحثہ سے تھوڑا بہت بھی علاقہ رکھتا ہو اس مجموعہ مین شامل ہونیسے رہ نہ جائے۔ لیکن یاد پڑتا ہی کہ مولوی سید خورشید علی حیدرآبادی کا ایک مضمون اُسی زمانے مین مخزن مین نکلا تھا جو اگرچہ فی نفسہ اس مباحثہ سے بےتعلق تھا لیکن اگر وہ بھی لے لیا جاتا تو مولنا شرر کے اِس اعتراض کا ایک اور پہلو بھی روشن ہو سکتا تھا کہ "گلزار نسیم' دیا شنکر نسیم کی تصنیف نہین ہی" گلزار نسیم نسیم کی تصنیف ہو یا نہین' ہمین اس سے واسطہ نہین لیکن چونکہ سید خورشید علی کے مضمون سے اسقدر ضرور پتہ چلتا ہی کہ نسیم کے اس چراغ مین تیل تتی ایک دوسرے چراغ سے مستعار لیگئی ہی' اس خیال سے اُس کے لیے اس مجموعہ مین گنجائش نکالنا انصافاً لازمی تھا۔ سید خورشید علی کا مضمون کیا تھا؟ ایک قلمی مثنوی کے جس کا ایک غیر مطبوعہ نسخہ غالباً حیدرآباد کے کتب خانہ آصفیہ مین ابتک محفوظ ہی' متعدد مقامات کے اقتباسات تھے جو گلزار نسیم کے اقتباسات کے بالمقابل چھپوائے گئے تھے - اُس کے مطالعہ سے یا تو ناممکن توارد شعری کا جو سرقہ کی حد تک پہنچ گیا ہو' قائل ہونا پڑتا ہی یا کسی ایک کو دوسرے کا خوشہ چین ماننا پڑتا ہی۔

مضامین مندرجہ "مباحثہ" مین چند مضامین ایسے بھی ہین جن کے مطالعہ سے بہت سے علمی وادبی نکتے ذہن نشین ہو سکتے ہین خصوصاً "جنت کی ڈاک" کا سلسلہ جسکے تحت مین آتش کے

خطوط موسومہ شرر لکھے گئے ہین، جو سب کے سب "اودھ پنچ" مین چھپے تھے۔ مولنا شوق قدوائی کا مضمون بھی یقیناً قول فیصل کا درجہ رکھتا ہی لیکن بعض مبتذل مضامین اسمین ایسے بھی پائے جاتے ہین، جو اگر بحالت موجودہ نہوتے تو بہتر تھا۔ مثلاً "ہوا خواہ نسیم" کی ہرزہ سرائی خیالات کی پختگی، تنقید کی قابلیت، توازن کی لیاقت کا تو گویا اسمین ایک سرے سے فاتحہ پڑھا گیا ہی ہان مثنوی سحر البیان کے عیوب گنولانے مین البتہ شاطرانہ کمال سے کام لیا گیا ہی حالانکہ جو اعتراضات بزعم خود کیئے گئے ہین وہ نہایت عامیانہ اور خود حضرت معترض کی ناواقفیت اور کم علمی کے شاہد ہین۔

بعض مضامین اور کارٹون اودھ پنچ کے ایسے بھی لئے گئے ہین جنمین ظریفانہ رنگ پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہی۔ جہان تک تفریح طبع کو تعلق ہی یہ دونون خاص دلچسپی کی چیز ہین۔ اور انکو دیکھکر کہنا پڑتا ہی کہ منشی سجاد حسین نے اپنی بے مثل قابلیت کی بدولت "اودھ پنچ" کو جس رتبہ تک پہنچایا تھا وہ اُنھین کا کام تھا۔

مباحثہ گلزار نسیم مین مسٹر چکبست والا ایڈیشن معہ مقدمہ کے شامل ہی جو اس کتاب کے خریدارون کو مثنوی کے جُدا گانہ نسخہ کی ضرورت سے مستغنی کر دیتا ہی۔ افسوس ہی کہ کتابت کی غلطیان "مباحثہ" مین اس کثرت سے موجود ہین کہ ہمین حضرت مولف کی توجہ اسطرف خصوصیت سے مبذول کرنا پڑی ہی۔ ضرورت تھی کہ پروف کی صحت کا خیال رکھا جاتا۔ معمولی لاپروائی بھی کتاب کی اصل خوبیون کو خاک مین ملا دیتی ہی۔ کتاب کے ملنے کا پتہ مطبع منشی نولکشور لکھنؤ قیمت ۲؎ جو تقریباً پانچسو صفحات کی کتاب کیلئے کچھ زیادہ نہین۔

دیوان خیال جانان علاقہ کاٹھیاوار مین ریاست منگرول ایک مشہور جگہ ہی۔ یہان کے فرمانروائے سابق شیخ محمد حسین میان صاحب بہادر نہایت علم دوست اور بامذاق رئیس گذرے ہین جنکی علمدوستی اور معارف پروری کی بدولت کسی زمانے مین منگرول رامپور کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ میان صاحب بہادر کو شعر و سخن سے نہایت درجہ دلچسپی تھی اور آپ کا دربار کملاء فن سے ہر وقت معمور رہتا تھا۔ ایک وقت تھا کہ داغ، جلیل، تسلیم، شمشاد، اور احسن، ایسے نغز گو شعراء کو رئیس کی علمی قدرشناسی نے وہان کھینچ بلایا تھا۔ قاعدہ ہی کہ حاکم وقت کا رجحان طبیعت جسطرف ہوتا ہی اُسی جانب عوام الناس کی طبائع بھی جھک پڑتی ہین۔ انھین مولوی محمد عمر صاحب جنون شاگرد جلال مرحوم کو خاص امتیاز حاصل ہی۔ "خیال جانان" جسکا دوسرا نام "ریاض فکر" بھی ہی حضرت جنون کے کلام کا مجموعہ ہی جو ہمارے یہان بغرض اظہار رائے موصول ہوا ہی۔ اسکو دیکھکر انصافاً یہ کہنا پڑتا ہی کہ حضرت جنون ایک اچھے شاعر ہین، اور اگر مشق سخن کا سلسلہ قائم رہا تو اُن کے کلام کی پختگی اور نفاست روز افزون رہیگی۔

اس دیوان مین ایک جدت خصوصیت سے قابل ذکر ہی یعنی حضرت جنون نے اکثر ایسے مضامین قطعی طور پر ترک کر دیئے ہین جو ایشیائی شاعری کا مدت مدید سے جزو لاینفک بنے ہوے چلے آتے ہین لیکن کثرت استعمال سے مبتذل ہو گئے ہین مثلاً کوہ طور اور موسیٰ، لیلی مجنون، مصر اور بازار، سکندر و آئینہ اسیطرح بعض متروک الفاظ کے متعلق یہ التزام کیا گیا ہی کہ قصائد وغیرہ مین بھی آنے نہ پائین جیسے پر، تک، ولے۔ اچھا ہوتا اگر جناب جنون چند اور مبتذل اور مخرب اخلاق مضامین کا استعمال بھی جائز رکھتے مثلاً شب وصل، تیغ قاتل، بوس و کنار۔

زبان کے اعتبار سے حضرت جنون کا کلام اگرچہ اسوجہ سے مستحق ستائش ہی کہ آپ کا وطن کاٹھیاوار ہی جہان کی زبان ابھی

اسقدر ترقی یافتہ نہین ہی کہ اُسمین اصلاح کی گنجائش نہ سمجھی جائے تاہم آپ نے زبان کی صفائی، بندش کی درستی اور محاورات کے صحیح استعمال کا بہت خوبی سے خیال رکھا ہی۔ ہان خال خال ایسی مثالین نظر آتی ہین جہان کسی محاورے یا لفظ کا استعمال صحت کے ساتھ نہین کیا گیا مثال کیلئے یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

مینوش اُٹھین اپنے قدح کی منائین خیر
آما ہی ابر ادھر وہ کہین سے اُٹھا ہوا

"قدح کی خیر منانا" محاورہ ضرور ہی لیکن اس موقع پر اس کا استعمال غلط ہوا ہی۔

یا یہ شعر ؎

تو بھی آیا نہ اے خیال صنم　　رات بھر ہم تجھے پکارے ہین

اسمین "پکارے ہین" آجکل کے رواج کے اعتبار سے غیر فصیح ہی۔

اسیطرح اس شعر مین ؎

شوخ ہو جائینگے کہہ دیتے ہین اُنکے تیور
اول شب جو وہ شرماتے ہین شرمانے دو

"کہہ دیتے ہین" کے عوض "کہے دیتے ہین" ہونا چاہیئے۔

ان معمولی فروگذاشتون کے علاوہ حضرت جنون کا کلام داد کا مستحق ہی۔ بعض غزلین خاص طور پر دلچسپ پائی گئی ہین اکثر اشعار تاثیر اور بیساختگی کی گوناگون خوبیون سے مالامال ہین۔ مثلاً

اگرچہ وصل سے ہر یاس لیکن آس ہی اتنی　　کہ میرا نام شامل ہی ترے امیدوارون مین
وہی کچھ معتبر اب آپکے نزدیک ٹھہرے ہین　　گنا کرتے تھے جنکو آپ بھی بے اعتبارون مین
نہ سمجھا وقت پر مین ہائے اب سمجھا تو کیا سمجھا　　وہ سب کچھ کہہ گئے تھے ترچھی چتونکے اشارون مین

وہ پوچھین مرا حال یون ملتفت ہوئے　　مگر اُن کو دھوکا ہوا ہے کسی کا

والے قسمت اُسنے جب پوچھا تو رُعب حسن سے　　کہہ دیا مین نے کہ میرا مدعا کچھ بھی نہین
غیر سے وہ تذکرہ میرا ہی کرتے تھے مگر　　مین نے جب پوچھا تو جھنجلا کر کہا کچھ بھی نہین

غزلیات کے ماسوا، قصیدے، سہرے، قطعے اور خمسے بھی ہین اور سب اپنی اپنی جگہ اچھے ہین۔ شروع دیوان مین ایک دیباچہ شامل ہی جسمین مصنف کے سوانحی حالات پر کافی روشنی ڈالی گئی ہی لیکن ایک بحث کے درمیان مندرجۂ ذیل شعر کو غلطی سے غالب کی تصنیف خیال کر لیا گیا ہی ؎

ڈیڑھ جز پر بھی تو ہی مطلع و مقطع غائب
غالب آسان نہین صاحب دیوان ہونا

کتاب ملنے کا پتہ:۔ منشی عبدالرحمٰن محمد محسن صاحب خوشتر مدرسۂ اسلامیہ۔ منگرول (کاٹھیاوار) قیمت غالباً ۱۰ ار

بہار جوش | یہ نام ہی ایک مختصر دیوان کا جو جناب حفیظ جونپوری نے حکیم برہم صاحب کے مطبع مین گورکھپور سے شائع کیا ہی۔ عالیجناب بابو مہیشور پرشاد صاحب رئیس اعظم مظفرپور اسکے مصنف ہین۔ بابو صاحب جوش تخلص کرتے ہین اور غالباً حضرت حفیظ سے تلمذ ہی۔ کتاب عمدہ کاغذ پر صفائی کے ساتھ طبع ہوئی ہی۔ کتاب کی لوح رنگین و مطلا ہی حسن ظاہری کے ساتھ ایک عیب نہایت نمایان طور پر محسوس ہوتا ہی کہ کتابت کی غلطیان بہت سی پائی جاتی ہین۔ اگر پروف کی صحت کا کسیقدر التزام کیا جاتا تو آخر مین صحت نامہ کے شمول کی ضرورت نہ ہوتی۔

نفس شاعری کے متعلق ہماری رائے مین جوش صاحب اچھا کہتے ہین اور عاشقانہ مضامین بہت خوبی سے نظم کرتے ہین۔ اکثر غزلیات امیر، داغ، مضطر وغیرہ کے طرح کہی گئی ہین اور قابل پسندیدہ ہین۔ کاش کچھ زیادہ متانت اور جدت کا خیال رکھا جاتا، جس سے کلام کی عظمت دوبالا ہو جاتی۔ بہت سے عامیانہ مضامین کے

اشعار جنکو سنتے سنتے طبیعت سیر بلکہ بیزار ہو گئی ہو اگر مطلقاً نظر انداز کر دیے جاتے تو دیوان کی دلچسپی مین فرق نہ آ سکتا تھا۔ مثلاً

دل حسینون سے لگانا چاہیئے — زندگی کا لطف اُٹھانا چاہیئے
دیکھیئے آج آتے ہین وہ یا نہین — جذب دل کو آزمانا چاہیئے
آج درد سر نہ آنے کا ہے عذر — روز اک حیلہ بہانا چاہیئے

ہان کہین کہین بحر یا قافیہ و ردیف کیوجہ سے انھین معمولی مضامین مین بھی لطافت آگئی ہے جیسے ؎

نیند فرقت مین جب اُچٹتی ہے — تارے گنتے ہی رات کٹتی ہے
نہ لگی آنکھ جب سے آنکھ لگی — عمر بیتابیون مین کٹتی ہے
کھل گیا منہ سنورتے ہی کاکل — دن کے بڑھتے ہی رات گھٹتی ہے

دیکھتے ہین ہمین لیلیٰ بنا کر تم ہو مجنون — جنون کا جوش وحشت کا تماشا ہم بھی دیکھینگے

خاتمہ دیوان پر، متفرق اشعار سے پہلے، دو ایک مختصر قومی نظمین بھی شامل ہین مندرجہ ذیل اشعار سے اس صنف مین رنگ طبیعت آشکار ہوگا ؎

واہ کیا خوب ہے ہندو کالج — سب کو محبوب ہے ہندو کالج
یوسفستان ہے ہندو کالج — چشم یعقوب ہے ہندو کالج
قوم کی شان ہے ہندو کالج
ہند کی جان ہے ہندو کالج

لعل رُمان یہ ہے ہندو کالج — آب حیوان ہے یہ ہندو کالج
آئے دن قوم کی سر سبزی کے — ابر نیسان ہے یہ ہندو کالج
قوم کی شان ہے ہندو کالج
ہند کی جان ہے ہندو کالج

انمین سے ہر تیسرا مصرعہ، باقی تینون مصرعون سے، باعتبار قافیہ و ردیف مختلف ہے اگرچہ یہ جدت پسندیدہ نہین کہی جا سکتی لیکن یہی التزام آخر تک قائم رہتا تو اعتراض کی گنجائش نہ تھی۔ مگر پانچوین بند مین بابو صاحب فرماتے ہین ؎

راجہ صاحب کی توجہ ہو اگر — جائین گے قوم کے سب کام سنور
طلبا کہتے رہین آٹھ پہر — زندہ مہراج کو رکھے ایشور
قوم کی شان ہے ہندو کالج
ہند کی جان ہے ہندو کالج

تعجب ہے کہ پبلشر صاحب نے جو خود ایک ذکی الحس اور نازک خیال شاعر ہین اس معجون مرکب نظم کے لیے اس مجموعہ مین کیون جگہ نکال لی۔ قومی شاعری کی طرف رُجحان پیدا ہونا ملک کے حق مین ایک نیک فال ہے لیکن اُصول شاعری سے انحراف کر کے قومی شاعری کی مٹی پلید کرنیکی بھی ضرورت نہین حضرت جوش کو اس صنف خاص مین کافی واقفیت بہم پہنچانے کے بعد طبع آزمائی کرنا چاہیئے تھی جن صاحبونکو اس دیوان کے مطالعہ کا شوق ہو وہ حضرت مصنف سے استدعا کرین قیمت کچھ نہین لکھی اور غالباً مصنف کی دریا دلی سے اسکی قیمت کچھ رکھی بھی نہین گئی

زوال بغداد | یہ نام ایک جدید الاشاعت تاریخی ناول کا ہے، جو مولانا محمد عبد الحلیم صاحب شرر لکھنوی کے رشحات قلم کا تازہ ترین نمونہ ہے مولانا کی بے مثل قوت فسانہ نگاری تعریف و توصیف سے اسیطرح مستغنی ہے جسطرح آفتاب عالمتاب چراغ کی روشنی سے۔ یہ غنیمت ہے کہ ان کے تعلقات منقطع ہو جانے کے بعد آپ کو لٹریری خدمات کے لیے بہت کچھ وقت ملجاتا ہے اور ملک کو آپ کا تہ دل سے ممنون ہونا چاہیئے کہ آپکی ساری کوششین علم ادب اُردو کے سنوارنے اور درست کرنے مین ہمیشہ وقف رہتی ہین۔

"زوال بغداد" مین جیسا کہ اسکے نام سے ظاہر ہے اُس زمانے کے واقعات دکھائے گئے ہین جبکہ خلافت عباسیہ کا چراغ، شمع سحری کی صورت، ٹمٹما رہا تھا اور سطوت ہارونی محض ایک فسانہ

بن چکی تھی۔ تخت سلطنت پر مستعصم باللہ، بہ حیثیت خلیفۃ المسلمین و امیر المومنین متمکن تھا لیکن اُسکا رُعب، اُسکی عظمت، اور اُسکے اثر کا دائرہ بالکل محدود تھا۔ مولوی محمد عبد الحلیم صاحب شرر نے اُسوقت کی خرابیوں اور بد انتظامیوں پر کافی روشنی ڈالی ہی اور نہایت خوبی سے تاریخی واقعات کو قصہ کے پیرائے مین بیان کرنے کی کامیاب کوششین کی ہی۔ سب سے زیادہ دردناک وہ سین ہین جہان قومی فرقہ بندی اور جہالت آمیز تعصب کے ہاتھون سنی اور شیعہ باری باری سے ایک دوسرے کا گلا کاٹتے ہوے دیکھے جاتے ہین۔ ناول کا پلاٹ فردوس برین سے بہت ملتا ہوا ہی اور ہمعصر علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کا یہ ریمارک صحیح ہی کہ

"زوال بغداد" کے واسطے مصنف کو کسی خاص دماغ سوزی کی ضرورت نہین پڑی صرف فردوس برین کی زمین پر زوال بغداد کی بنیاد اُٹھا دی گئی ہے۔

اِس کے باوجود بھی "زوال بغداد" کی خوبیون سے انکار نہین کیا جا سکتا۔ عیارون کے گروہ کی سچی کیفیت کا انکشاف عمدگی سے کیا گیا ہی۔ ناول کے آخر حصہ مین اس گروہ کے اسرار سربستہ سطرح کھولے گئے ہین کہ کوئی بات، جو قصہ کے درمیان مین ایک طلسم سے کم نہین معلوم ہوتی، حیرت انگیز یا مافوق العادت نہین رہجاتی "عیارون" کا مقصد بظاہر یہ معلوم ہوتا ہی کہ وہ مختلف فرقون مین کسی حیلہ و فریب سے آتش عناد و منافرت مشتعل کرتے رہین چنانچہ اُنھین کی ابلہ فریبیون مین آکر شیعہ اور سُنی ہزارون اور لاکھون کی تعداد مین مرکھپ جاتے ہین، محلے کے محلے تلوار کی بھینٹ چڑھتے ہین، بوڑھون، بچون کا خون پانی کیطرح بہتا ہی۔ عصمت مآب پردہ نشین خواتین علانیہ بے آبرو کیجاتی ہین۔ یہ سب کچھ کون کرتا ہی؟ مسلمان۔ اور کسپر ہوتا ہی؟ مسلمانون پر۔ رفتہ رفتہ اس

جدال و قتال کا سلسلہ یون ختم ہوتا ہی کہ ابن علقمی جو مستعصم باللہ کا وزیر اور مذہبًا شیعہ ہی خلیفہ کو سمجھا بجھا کر فوج مین افراتفری کردیتا ہی اور تاتاریون کو مدعو کرتا ہی کہ خلافت بغداد کو حلوائے بے دود کی طرح ہضم کر جائین۔ ہلاکو خان آتا ہی اور نتیجہ وہی ہوتا ہی جسکی یاد اب بھی بدن کے رونگٹے کھڑے کرنے کو کافی ہی ملت فروشی کی جو نفرت خیز تصویر وزیر سلطنت (ابن علقمی) کی شخصیت مین دکھائی گئی ہی اُسکے نظارہ سے دلمین بے اختیار حقارت کے جذبات پیدا ہوتے ہین۔ تعصب نے اُسکی آنکھون پر پٹی باندھ دی تھی اور ناجائز جوش مذہبی نے اُسے اگر بصارت سے نہین تو بصیرت سے ضرور محروم کر رکھا تھا۔ کاش اُسے اپنے آقا کے نمک کا کچھ بھی پاس ہوتا اور جہالت اور تعصب نے اُسے اندھا نہ کردیا ہوتا تو باوجود خلیفہ مستعصم کی کمزور حکومت کے، خلافت بغداد کا خاتمہ اسقدر عجلت سے اور اس عبرت انگیز طریقے پر کبھی نہو سکتا تھا کہ ناصح شیراز کو مواعظ حسنہ و نصائح دلپذیر کے عوض اسکی مرثیہ خوانی کا فرض ادا کرنا پڑتا ہی کہ ؎

آسمان را حق بود گر خون ببارد بر زمین		بر زوال ملک مستعصم امیر المومنین
اے محمد گر قیامت می بر آری سر ز خاک		سر بر آور دین قیامت در میان خلق بین
نازنینان حرم را خون خلق نازنین		ز آستان بگذشت و ما را خون دل از آستین

خلافت عباسیہ کا خاتمہ اچھا ہو یا بُرا، ہو گیا۔ لیکن جسطرح اُسکے ذکر سے کوئی تاریخ عالم خالی نہین رہ سکتی اُسیطرح خلافت کے حسرت خیز انجام کے تذکرہ کے ساتھ ابن علقمی کا نام ضرور لیا جایا کرے گا اور قوم فروشی و نمک حرامی کے جُرم مین خلق خدا کی طرف سے اُسپر لعنت کی بوچھار ہوتی رہیگی۔

"زوال بغداد" کے دیکھنے سے اندازہ ہو سکتا ہی کہ باہمی عداوت، مذہبی عناد، جاہلانہ تعصب، اور ان کے ہاتھون، بالکل خفیف سی

خفیف شروعات پر کیا کیا خرابیاں پیدا ہو جاتی ہین۔

اس ناول کی قیمت ۸؍ فی جلد ہے اور ملنے کا پتہ یہ ہے "منیجر دلگداز کٹڑہ بزن بیگ خان، لکھنؤ۔"

رام پتر یعنی خطوط رام لالہ امیر چند صاحب اس سے پہلے "کلیات رام" شائع کر چکے ہین۔ اب انھین کی کوشش سے "خطوط رام" نام کی کتاب عمدگی اور خوبی کے ساتھ چھپکر نکلی ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اسمین سوامی تیرتھ رام جی ایم اے کے وہ تمام خطوط جمع کئے گئے ہین جو پبلشر کو کہین نہ کہین سے دستیاب ہوئے۔ سوامی صاحب موصوف کی مقدس شخصیت ضرور اس قابل رہ چکی ہے کہ انکی ہر ایک چیز محبت اور عزت کی نظر سے دیکھی جائے اور انکی یادگار سمجھکر تبرک کے طور پر ملک کے ہاتھون مین پہنچائی جائے۔ اردو زبان مین رقعات غالب (اردوئے معلی وغیرہ) کے بعد اور کئی مجموعے اسی قبیل کے چھپ چکے ہین مثلاً خطوط سر سید و مکتوبات امیر مینائی۔ اور خطوط رام اپنے طرز کی آخری کتاب ہے جو ذخیرۂ اردو مین شامل ہوئی ہے۔

اس کتاب کی لکھائی چھپائی اور کاغذ کی عمدگی اور نفاست کا بہت خیال کیا گیا ہے۔ تقطیع و مسطر بھی مناسب و موزون ہین اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ کتاب مجلد ہے۔ مضامین کے لحاظ سے ہم بلا تامل کہتے ہین کہ "خطوط رام" ایک نہایت دلچسپ اور سبق آموز کتاب ہے۔ اسمین ۱۸۸۶ء سے لیکر (جبکہ سوامی جی کی عمر صرف ساڑھے بارہ سال کی تھی) آخر وقت تک کے خطوط جمع کیئے گئے ہین اور اسوجہ سے گویا یہ مجموعہ سوامی جی کی ایک خود نوشت سوانح عمری ہے جس سے زیادہ مستند اور قابل وثوق حالات کہین اور نہین مل سکتے۔

بھگت دھنا رام جی، سوامی تیرتھ رام جی کے گرو ہین اور زیادہ تر خطوط اس کتاب مین وہی پائے جاتے ہین جو سعادتمند شاگرد نے شفیق استاد کو لکھے ہین خطوط کے مطالعہ سے کئی اخلاقی فوائد حاصل ہو سکتے ہین۔ سوامی جی نے جن مشکل اور دشواری کے باوجود اور مالی تکالیف مین رہکر اپنی تعلیم کی تکمیل کی ہے وہ دوسرے شائقین علم کیلئے ایک زبردست سبق ہے۔ کہین کہین وہ اخلاقی نکتے حل ہو گئے ہین جنکا مطالعہ نفع سے خالی نہین ہو سکتا۔ ایک جگہ لکھتے ہین:۔

"مین نے ان دنون ایک نیا شعر پڑھا ہے ؎ داغ

تہیدستوں کا رتبہ اہل دولت سے زیادہ ہے — صراحی سر جھکا دیتی ہے جب پیمانہ آتا ہے

یعنی تہیدست لوگ دولتمندون سے اچھے ہین جیسا کہ اس بات سے ظاہر ہے کہ جب تہی پیالہ بھری ہوئی صراحی کے پاس آتا ہے تو صراحی اپنے سر کو نیچے کرتی ہے گویا کہ خالی پیالے کو سلام کرتی ہے اور اس کو اپنے سے اچھا سمجھتی ہے۔"

مالی مشکلات، جو سوامی جی کو اکثر پیش آتی رہین اُن کا اندازہ ذیل کے ایک اقتباس سے ہوگا۔ لکھتے ہین:۔

"میرے اس دفعہ دیر سے خط لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ میرے کارڈ ختم ہو گئے تھے اور نہ میرے پاس کوئی پیسہ تھا .... کل دس بجے رات کو لالہ صاحب کے دفتر سے ٹھاکر کو کہکر یہ کارڈ نکلوایا۔ جواب آپ کو بھیجتا ہون۔"

ایک جگہ اور لکھتے ہین:۔

"میرا وہان آنا ذرا مشکل ہے اس کے کئی سبب ہین جن مین سے ایک یہ بھی ہے کہ اب میرے لیے کرایہ کے لئے روپیہ دو روپیہ مہیا کرنے بھی کچھ آسان معاملہ نہین ہے۔"

ان تکالیف کے باوجود سوامی جی کی پیشانی پر کبھی شکن نہین آئی اُن کی ضروریات گو حد سے زیادہ محدود تھین لیکن وہ اپنے گرو کی خدمت

مین تھوڑی بہت رقم ضرور بھیجتے رہتے تھے۔ قناعت اُنکی گھٹی مین پڑی تھی۔ اولوالعزمی بھی اسیکے ساتھ اُن کی عادات کا ایک قابل تعریف جزو تھی۔ اُنھون نے کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہین پھیلایا اِن بعض نیکدل بندے جو سوامی جی کی خدمت کو اپنا شرف جانتے تھے وہ جو کچھ نذر کرتے تھے اس سے انکار بھی نہ تھا۔

طالب علمی، اسکول لائف، ملازمت، پروفیسری اور اسی کے ساتھ اور بہت سے خانگی حالات کا صحیح صحیح تذکرہ "خطوط رام" کے صفحات مین موجود ہے جس سے زیادہ صحت کے ساتھ کہین اور ملنا ناممکن ہے۔ یہ کتاب بیحد دلچسپ ہے اور وہ لائبریری بہت بدقسمت ہوگی جہان اسکا ایک نسخہ نہو۔ ہم نے چاہا تھا کہ اسکے چند خطوط من وعن نقل کرتے اور بعض قابل ذکر خصوصیات دکھاتے لیکن بخیال طوالت نظرانداز کرتے ہین۔ ہان اسکے خواہشمند ہین کہ علم دوست اصحاب اس کتاب کی خریداری ضرور کرین۔ قیمت قسم اعلیٰ مجلد ۱۲ر قسم دوم غیر مجلد ۸ر جو کتاب کی خوبیون کے مقابلے مین ہیچ ہے۔ ملنے کا پتہ یہ ہے:- لالہ امیر چند پریم دہام، بڑا دریبہ۔ دہلی۔

"سید القلم"

کلامِ شاد

(از مہاراجہ بہادر راجہ سر کشن پرشاد صاحب شاد بالقابہم)

درد فرقت سے نہو دل کی تسلّی نہ سہی — گر نہین لیتے خبر تم مرے دل کی نہ سہی

نالۂ غم مین بھی لذت مجھے اب ملتی ہے — نہ سہی لب پہ مرے نغمۂ شادی نہ سہی

عکس اور شخص کی نسبت تو مجھے حاصل ہے — میری صورت تری تصویر سے اچھی نہ سہی

نہین دیتے جو تسلّی تو لگاؤ خنجر — یہ بھی منظور نہو تم کو تو یہ بھی نہ سہی

قابلِ جلوہ گہِ یار تو دل ہے اے قیس — گر نہین اسمین ابھی جلوۂ لیلیٰ نہ سہی

ساتھ پارس کے جو لوہا رہے سونا ہو جائے — تم مین جو کچھ ہے نہین مجھ مین وہ خوبی نہ سہی

تم بھی بانکے ہو ادا بھی ہے تمھاری بانکی — تم اگر بات نہین کرتے ہو سیدھی نہ سہی

کوزہ و جام بنانیکی تو تھی خاک مری — اسکے بھی کام کی گر یہ نہین مٹی نہ سہی

معرفت علم لدنی ہے کہون کیا تجھ سے — واعظا گر تو سمجھتا نہین معنی نہ سہی

اسمین بھی شک ہے تمھین کیا کہ نہین بندۂ رب
خیر کافر ہی سہی شاد جو صوفی نہ سہی

شکریہ

کیونکر ادا ہو شکر اے پروردگار تیرا   مجھ پر بنا اک احسان ہی لحظہ وار تیرا
بندون پہ کسقدر ہی اللہ پیار تیرا   مایوس کب ہوا ہے امیدوار تیرا

والے برائے خلقت تیری ہی ہی نگاہِ شفقت
یکسان ہی سب کے جانب تیری نگاہِ شفقت

اے پاک ساز سارے عیبونسے پاک تو ہی   سب مین ہی اور پھر بھی لا اشتراک تو ہی
تقویتِ جہان ہی بے بیم و باک تو ہی   تسکین فزائے قلبِ اندوہناک تو ہی

تعظیم کے ہی قابل ہر ایک نام تیرا
ارض و سما سے بالاتر ہے مقام تیرا

ہر برگ و بار سے تو پیدا ہی بو کی صورت   مخلوق کی زبان پر تو گفتگو کی صورت
کُل کائنات مین ہی حُسن و نمو کی صورت   ہر دل مین جلوہ آرا ہی آرزو کی صورت

قطرہ مین آب ہو کر تو ہی جھلک رہا ہی
ذرہ مین مہر بنکر تو ہی چمک رہا ہی

ہر پردۂ جہان مین مستور راز تیرا   خاموشی و سکون مین بجتا ہی ساز تیرا
تار نشیب مین ہی نور فراز تیرا   مخصوص ہر سمان مین ہی امتیاز تیرا

معشوق مین عیان ہی رنگ جمال بنکر
عاشق کے دل مین پنہان نقش خیال بنکر

تیرے ہی فیض سے ہی قائم بہار ہستی   مظہر مین تیرے سارے نقش و نگار ہستی
موقوف ہی تجھی پر دار و مدار ہستی   اور تیرے ہی سہارے چلتا ہی کار ہستی

معبود اک حقیقی شاہ و گدا کا تو ہے
روز ازل سے مالک ارض و سما کا تو ہے

اے خالق دو گیتی، راحت فزائے عالم!   اے مخزن کرم! اے حاجت روائے عالم!
اے جان نواز مطلق! اے آشنائے عالم!   اے ابتدائے عالم! اے انتہائے عالم!

تجھسا شفیق صادق کوئی نہین کسی جا
تجھسا رفیق واثق کوئی نہین کسی جا

ہر لحظہ دل سے تیری آواز آ رہی ہی   احکام پاک تیرے ہمکو سُنا رہی ہے
نیرنگی جہان کا پردہ اُٹھا رہی ہی   راہِ نجات یعنی سب کو دکھا رہی ہے

کہتی ہی کان سے سُن تو میرا گیان ہر دم
کہتی ہی من سے رکھ تو میرا ہی دھیان ہر دم

افضل ترین تیرا ہے پایۂ ہدایت   اور حد سے بھی فزون ہی سرمایۂ ہدایت
توفیقِ پاک دے ہان اے مایۂ ہدایت   سارے جہان پر اپنا رکھ سایۂ ہدایت

ہر ایک آرزوے بیجا سے ہون الگ ہم
دُنیا مین رہ کے پھر بھی دُنیا سے ہون الگ ہم

ہان ایسی کر نوازش قیدِ الم سے چھوٹین   لطف و سکون ہو حاصل فکرِ درم سے چھوٹین
ہو کثرتِ محاسن عیب اور ذم سے چھوٹین   یعنی کہ نفس بد کے جور و ستم سے چھوٹین

دل سے نہ اپنے تجھکو صالا کبھی بھلائین
تیری عنایتون کا ہر لحظہ راگ گائین

اقبال ورما سحر

حمد

ہر ذرہ سے عیان ہی یارب ظہور تیرا   دل مین چمک رہا ہی مومن کے نور تیرا
ارض و سما مین جلوہ تیرا سما رہا ہی   روشن ہی تام سب پر نزدیک و دور تیرا
یارب تری عطائین دُنیا مین گو بہت ہین   انعام اور ہوگا روزِ نشور تیرا
ہی نام پاک تیرا دل کے لیے تسلّی   ہر قلبِ مضطرب کو کافی سرور تیرا
انسان ہی گو کہ اشرف لیکن ہی تجھسے غافل   لیتے ہین نام سارے وحش و طیور تیرا
پشہ سے کم حقیقت عالم کو جانتا ہی   حاصل ہوا ہی جسکو قرب و حضور تیرا

یارب! مجھے بچالے خطرے مرے مٹا دے
بندہ تو ہون مین آخر ربِ غفور تیرا

رو رو کے التجا کر ا اللہ سے دعا کر!   بیڑا ہی پار پھر تو بندے ضرور تیرا
یہ کارگاہِ ہستی اک شانِ ایزدی ہی   تجھکو نظر نہ آئے تو ہے قصور تیرا

زیبا نہین تکبّر اچھی نہین تعلّی   اک دم مین مٹ نہ جائے سارا غرور تیرا
لوثِ گناہ چھوٹے تو کسطرح سے چھوٹے   دل ہی نہین ٹھکانے ہے بے شعور تیرا
غفلت مین عمر اپنی اے اشک تو نے کھوئی
ساری تری خطا تھی سارا قصور تیرا

اشک بلند شہری

نالۂ حمید

کسکو سناؤن ساقی جو کچھ بھرا ہی جی مین   تو نے اُڑائین اکثر باتین مری ہنسی مین
لیکن مری مصیبت بندونکی ہی تباہی   غمخوار ہین خدارا اس دردِ بیکسی مین
لا بھر کے ایک ساغر ساقی مئے کہن کا   اِک تازہ غم ہی مجھکو اس رنج بیدلی مین

اہل وطن نے ملک برباد کر دیا ہے   جس گھر کی تھی ضرورت ہم سب کو زندگی مین
بھولے ہین دوست باہم اُلفت سے ملکے رہنا   کیون جا گرے ہین ہمدم غفلت سے گمرہی مین
جینے کیواسطے اب ہر قوم مر رہی ہی   یہ موت ڈھونڈتے ہین ہر جا یہ زندگی مین

کیون ضد ہی برہمن کو شیخِ حرم نشین سے   کیا شیخ کا بُرا ہی مندر کی آرتی مین
تیرتھ ہی گیا نیونکا من کی اجودھیا مین   پرم آتما کی مایا رکھی ہی سبکے جی مین
ہر گھٹ مین رام جی ہین اور رام نام داتو   کیون مر رہے ہو ناحق اِک جنگ زرگری مین
ساری جہان کی توہین جھگڑے کا کر رہی ہین   تم پھنس رہے ہو پیارو کس دردناکی مین
توحید ہی کا قشقہ پنڈت کی ہی جبین پر   طرّہ ہی حق کی وحدت دستارِ مولوی مین
یارو عدو تمہین ہین ہیسو سب ہماری   پنہان نجات سبکی ہی صلح و آشتی مین
آپس کی الفتون مین گرگیان ہی ہمارا   سب کچھ ملے گا ہمکو دانش کی آگہی مین
ہی کسقدر مصیبت بدلا ہی کیا زمانہ   جانِ حمید نالان ہی سخت بیکسی مین

در محفلیکه یاران شربِ مدام کردند
چون نوبت بما شد آتش بجام کردند

حمید کوٹلوی

کلام اکبر

جب کہا مین نے خدا سے آپ ڈرتے کیون نہین   وہ بگڑ کر بولے اُٹھو آپ مرتے کیون نہین
جب یہ حالت ہی ضائع کی تو کیون کہتے ہین لوگ   اکبر اُٹھتے کیون نہین واعظ اُبھرتے کیون نہین

آبرو اگر ملے جو ہے نام و نمود مین   کیا حرج زندگی ہو اگر حال زشت مین
دوزخ کے داخلے مین نہین اُنکو عذر کچھ   فوٹو کوئی لگا دے جو اُنکا بہشت مین

یہ پوچھو مجھسے یہ کیون ہی اور ایسا کیون نہین   شیخ! یہ پوچھو تمہارے پاس پیسا کیون نہین

مغربی سایہ اٹھا لاتے ہین اثر کے ساتھ   ساری بھی اُنکی ہو گئی غائب کمر کے ساتھ
ہستی ہی تیری کیا ہی کہ ہو اُنکا ہمسفر   موجون کا اے حباب نہ دے تو ابھر کے ساتھ

شیخ صاحب مے سُرخ مجھے تو ہے مفید   شغل کچھ آپ بھی فرمائین جو انکار نہو
مے بھی ہوٹل مین پئو چندہ بھی دو مسجد مین   شیخ بھی خوش رہین شیطان بھی بیزار نہو
پھیر سکتی نہین تقوے سے مجھے کوئی صدا   شرط یہ ہی کہ وہ پازیب کی جھنکار نہو

جذباتِ شوق

یہ حسنِ عارضی یہ دو روزہ بہار کیا   اس ڈھلتی پھرتی چھاؤن کا یار اعتبار کیا
دل بجھ رہا ہے سانس اُلٹتی ہی بار بار   ہونا ہی آج اے مرے پروردگار کیا؟
دیتا ہی لطف آنے نہ آنے کا سوچ بھی   مجھکو گران ہو کشمکش انتظار کیا
بھولا ہوا سا خود ہی ہے جو شباب پر   یاد اور کو کرے وہ فراموشگار کیا

ناصح! اک بت سے ہی کام اک بندۂ اللہ کا   جا کے سمجھا دے یہ سودا ہی خدا کی راہ کا
حبسِ دم سے زہد کس کا فکر کو ہی مدِ نظر   سیکھتے ہین ضبط سے ہم روکنا آہ کا

سمجھا نہ بات فہم مین ہی یہ قصور کیا اب بار بار پوچھ رہا ہون حضور کیا

دشوار ہو گیا ہی مجھکو خود اپنا ملنا سے کیا وسیع عالم میری رہ نوردگی کا
وہ ہوش مین ہمارے آتی اگر کسی دن
ہم دیکھتے تماشا شوق اپنی بیخودی کا

اے جنون ایون تو نہ چھوڑونگا اگر ڈھونڈونگا اینٹ سے اینٹ بجا دونگا تو گھر چھوڑونگا
ڈھونڈھ ہی لونگا چھپے لاکھ وہ ہر گز نہین نہ کوئی گل نہ کسی گل کا شجر چھوڑونگا

جبر شیوہ نہین ارباب وفا کا ورنہ تو مقید کشمکش دل کے اثر مین رہتا
غیر سے راز چھپانا تھا تو میری جانب کچھ تغافل ترے اندازِ نظر مین رہتا

دیارِ عشق

تشبیب قصیدہ

چلا ہون دشتِ محبت کی سمت مین ناشاد قدم قدم پہ صدا مرگ نو مبارکباد
یہ جانتا ہون بلا خیز دشتِ الفت ہی رکھا ہی اسپہ قدم سینے ہر چہ بادا باد
وہ ہولناک یہ وادی ہی اے معاذ اللہ سنائی کچھ نہین دیتا جہان بجز فریاد
عجیب رنگ ہی اس ہولناک جنگل کا کہین ہی دام کہین ہی قفس کہین صیاد
چلا ہی جاتا ہون کچھ انتہا نہین ملتی ہر اک قدم کی مسافت ہے طولِ روزِ معاد
ہر اک قدم پہ ہے لبریز میرا پیمانہ کہ آبلونکی تپک بڑھ گئی ہی حد سے زیاد
خدا ہی مجکو نظر آ گیا وہ عالم ہی نہ آدمی ہی یہان کوئی اور نہ آدم زاد
کہین ملا جو کوئی زندہ دل شگفتہ مزاج ہزار حیف کہ قسمت سے وہ بھی تھا جلاد
نظر بھی آئی تو کچھ جا بجا جلی ہوئی خاک مگر اٹھا کے جو دیکھا تو تھا دل ناشاد
کہین پڑے ہوئے ڈھانچے ستم رسیدونکے کھلا ہے دفترِ ... عالم اجساد
کہین پہ ڈھیر ہین کچھ استخوان بوسیدہ کہین پہ منظرِ ویرانہ عدم آباد
دیارِ حسن مین جنکے کہ دور دورے تھے بنے ہین عنصرِ خاک اب وہ خانمان برباد
وہ پاے شوق جو چلنے مین ایک آندھی تھے اسیکی خاک فلک کر رہا ہی اب برباد
دہن یہ عشق نے دی آج انکے مہر سکوت جو پھونکتے تھے کبھی صور نالہ و فریاد
نجانے کون ہین یہ کیسے ہونگے انکے خیال وہ چند کاسہ سر دیکھکر یہ آیا یاد
بجاے آب ہین کچھ خون تازہ کے دریا جہاز جسمین روان ہین سوے عدم آباد
سنا ور اسکے بہت ہاتھ پاؤن مارتے ہین مگر ابھر نہین سکتے کسی طرح ناشاد
بشکل چاک گریبان کھلا ہی اک زندان جہان چلے ہین گرفتار ہو کے چھٹ آزاد
صدا یہ ہی کہ قدم تک کسیکی زلف آئی ہے تا بحشر اسیرون کی مدتِ میعاد
غرضکہ منزلین ایسی ہزارہا دیکھین وفورِ غم سے پریشان ہوا دل ناشاد
وہ دل جو پیرِ طریقت بنا تھا ساتھ مرے وہ دل کہ جس سے ملا تھا افاضۂ امداد
لرز رہا ہے کچھ اسطرح دیکھکر یہ حال نہ زورِ نالہ و زاری نہ طاقتِ فریاد
یہی صدا دل ناشاد تبت خیال کی ہی کہ مین تو چلدون اور آپ کرین ہمین برباد
سنی جو حضرتِ دل نے عزیز کی تقریر جو تیلے لہجہ مین غصہ سے یہ کیا ارشاد
یہ دشت کیا یہ منازل ہین کیا یہ ویرانیا قسم ہی حضرت محبت کی سب ہین بے بنیاد
یہ امتحان فقط تھا تری طبیعت کا ابھی جو چاہون تو دم بھر مین سب ہین یہ برباد
تمام عمر وہان مین نے خاک چھانی ہی جہانکے ذرے سے کمتر ہے عالمِ ایجاد
سمجھکے کچھ تو ہوا ہون اسیرِ دامِ بلا وگرنہ چاہون تو ہو جائے موم ابھی فولاد
بنا ہون ہاتھ سے خود اپنے بیکس و مجبور غرض ہی اس سے فقط آزمائش بیداد
نگاہِ قوتِ اعجاز عشق پیدا کر دکھاؤن کیا تجھے تاثیر نالہ و فریاد
تجھے خبر ہی نہین رازِ اہلِ الفت کی کہ زندہ رہتے ہین کیونکر یہ خانمان برباد
تمام عمر جو رویا ہو خون کے آنسو ہی کربلاے محبت مین کچھ وہی دلشاد
گلے مین جسکے ہو طوق اور پاؤن مین زنجیر
دیارِ عشق مین ہی وہی بندۂ آزاد

عزیز لکھنوی

سمندر اور دل

اے سمندر تیری وسعت دیکھکر آرزوئیں میری کیسی شاد ہیں
جسطرح موجیں ہیں تجھ میں جلوہ گر یونہیں میرے دلمیں یہ آباد ہیں

تو اگر ہی بحر ناپیدا کنار اور لہروں کی نہیں کچھ انتہا
یونہیں ارمان ہیں مرے بھی بیشمار اور وسعت دل کی تجھ سے بھی سوا

جسطرح تجھ میں تلاطم ہے بپا اور مد و جزر کا ہے زور شور
یونہیں طوفان رکھتا ہی جذبات کا میرا دل جس کا نہیں کچھ اور چھور

جسطرح تہ میں لئے بیٹھا ہے تو بیش قیمت دُرِ مکنوں سیکڑوں
میرے دل میں بھی اگر ہو جستجو ایسے ہی نکلیں گے مضموں سیکڑوں

جسطرح تجھکو سکون حاصل نہیں ایک حالت پر نہیں رہنے کی تاب
چین سے اِک لحظہ رہتا دل نہیں یہ بھی ہی یونہیں رہیں اضطراب

سطح پر تیری رواں ہیں جسطرح یہ دخانی کشتیاں اور یہ جہاز
آتے جاتے دلمیں بھی ہیں اسطرح حسرت و اُمید کے راز و نیاز

ہیں ہزاروں ہستیاں گم تجھ میں غرق جس سے تو گنجِ شہیداں بنگیا
پھر بھی کچھ ہوتا نہیں ہے اِس سے فرق ہے تمناؤں کا مدفن دل مرا

اے سمندر! میں تو سمجھا ہوں یہی تو جدا دل سے کوئی ہستی نہیں
تجھ میں اور دل میں ذرا بھی واقعی امتیازِ رفعت و پستی نہیں

ارشد تھانوی

ناشاد بیوہ

اے حسرتو خدارا مجکو نہ اب ستاؤ لِلّٰہ اے اُمنگو دلمیں مرے نہ آؤ
بہرِ خدا نہ چھیڑو بیوہ ہوں رحم کھاؤ بس بس سنگار کی اب ترغیب تا دلاؤ

اُترا ہوا سا چہرہ کیا آرسی میں دیکھوں
مغموم شکل اپنی میں کس خوشی میں دیکھوں

رنگین کوئی کپڑا بھاتا نہیں ہے دلکو پان اور مسی کا چرچا بھاتا نہیں ہے دلکو
اب آہ کوئی گہنا بھاتا نہیں ہی دلکو آئینہ کا تماشا بھاتا نہیں ہے دلکو

پھولوں میں اب وہ خوشبو آتی نہیں ہی مجکو
برگِ حنا کی رنگت بھاتی نہیں ہی مجکو

دلمیں ہی دردِ فرقت لب پر ہی آہ و زاری رہتے ہیں چشمِ تر سے ہر وقت اشک جاری
سوزِ غمِ جدائی سے اُف رے بیقراری کروٹ بدل بدل کے کٹتی ہی رات ساری

تا صبح ہو کے مضطر دلکو مسوستی ہوں
ہر دم تڑپ تڑپ کے قسمت کو کوستی ہوں

ہمجولیوں میں جاتے آتی ہے شرم مجکو ساتھ اُنکے گیت گاتے آتی ہی شرم مجکو
ہنسکر اُنھیں ہنساتے آتی ہے شرم مجکو اب دلکو گدگداتے آتی ہی شرم مجکو

کاشانۂ الم میں اک گوشہ گیر ہوں میں
کنجِ قفس میں گویا مرغِ اسیر ہوں میں

کسکو سناؤں اپنی حسرت بھری کہانی سنتا ہی کون میری مجھسے مری زبانی
یہ وہ گھڑی ہی جسمیں اکدن ہی جان جانی برباد ہو رہی ہی اُٹھتی ہوئی جوانی

جینے سے تنگ جی سے بیزار ہو گئی ہوں
جسدن سے وہ مرے ہیں بیمار ہو گئی ہوں

رعد جونپوری

اس ماہ کی رنگین تصویر کے متعلق جو نظم آئی تھی وہ سہواً چھپنے سے رہ گئی۔
ناظرین آئندہ ماہ کا انتظار کریں۔

تضمین قطعۂ صفیر بلگرامی

مرا نامہ لیکر تو جا سوئے شاہد   بیان کر پُر اسرار جو ہین مقاصد
ٹھہرنا نہ رستے مین تو آن واحد   بڑے شوق سے بھیجتا ہون مین قاصد
رہیگی نظر راہ پر دیکھ لینا

سفر کوے قاتل کا تجھکو مبارک   بنا خاک کو وہان کی تو تاج تارک
سفر پُر خطر ہے نہین ہمین کچھ شک   نہ تو خیر سے پھر کے آئے گا جب تک
نہ ٹھہرے گا دل نہ جگر دیکھ لینا

ادھر آ کہ اک بات جتلاؤن تجھکو   رہے دھیان اُسپر سکھلاؤن تجھکو
مرقع ستمگر کا دکھلاؤن تجھکو   پتہ کوئے قاتل کا بتلاؤن تجھکو
جو کہتا ہون سب ڈھونڈکر دیکھ لینا

تو پہنچیگا جب تا سر کوسے دلبر   نظر آئے گا تجھکو اک قصر احمر
وہان پر بپا ہوگا سامان محشر   کوئی ہوگا دھونی رمائے وہان پر
کسی کو کھڑے ننگے سر دیکھ لینا

کوئی گریۂ خون پیے ہوگا اپنا   کوئی نیم جان دل دیے ہوگا اپنا
کوئی جامہ عریان سیئے ہوگا اپنا   کوئی چاک دامن کیئے ہوگا اپنا
کہین پر کھڑے بخیہ گر دیکھ لینا

کوئی بے خبر مست جام محبت   کوئی مائل شکوۂ یاس و حسرت
کسیکی زبان پر حکایات فرقت   کوئی شام غم مین گرفتار کلفت
کسی لب پر آہ سحر دیکھ لینا

دیئے ہونگے جان مرنے والے کسیکے   پڑے ہونگے وہان جا بن کے لالے کسیکے
رُلائین گے خون تجھکو چھالے کسیکے   ہلا دینگے دل تیرا نالے کسیکے
کسی کی فغان بے اثر دیکھ لینا

جو منزل تجھے ہی ہوگی آخر سفر کی   خطرناک ہے راہ وہان سے گذر کی
کہین کھو پڑی ہوگی قاصد کے سر کی   کہین ہڈیان طائر نامہ بر کی
کسی جا کبوتر کے پر دیکھ لینا

نہ رُکنا وہان تجھکو کوئی جو روکے   نہ ڈرنا خبردار اگر کوئی ٹوکے
قدم کو بڑھائے چلا جانا آگے   یہ سامان گلی مین وہ کوٹھے پر ہونگے
پھری سب سے اُن کی نظر دیکھ لینا

نظر آئیگا اک سمان طرفہ دیگر   جسے دیکھ کر تیرا دل ہوگا مضطر
نشان ٹھیک سے دیکھ لینا ملاکر   لحد ایک حسرت بھری عین در پر
لکھی نظم یہ لوح پر دیکھ لینا

"ادھر دیکھا کیون محو زینت ہے غافل   پرارمان یہ مرقد ہے عبرت کی منزل"
"پڑا اسمین سوتا ہے اک تیرا بسمل   تجھے اپنی آنکھونکی سوگند قاتل"
"مری قبر روز اک نظر دیکھ لینا"

سید حجت حسین بی اے بی ایل

اپنے عکس سے دو دو باتین

ایک لڑکے نے کسیدن راہ مین   آئینہ پاکر کہا قسمت مری
پھر وہ بولا عکس اپنا دیکھکر   واہ واہ کیا خوب ہے صورت مری
کیون ہین ناخوش دیکھنے والے مرے   اُنکے دل مین کیون نہین اُلفت مری
مین حسینون سے ہون کس خوبی مین کم   چاہیئے دنیا کرے عزت مری
اے مرے ہمشکل اے میرے شبیہ   تو ہی کر بتلا کچھ مدحت مری
عکس نے سنکر دیا فوراً جواب   عفو گستاخی کرین حضرت مری
ذرۂ ناچیز ہون مین کیا کہون   پست ہے اس باب مین ہمت مری
آپ کا وصف اور مجھسے ہو سکے   کیا مجال نطق کیا طاقت مری
مجھسے اور سرکار کا ارشاد ہو   تھی کہان ایسی بھلا قسمت مری
ہے مگر اک عرض گر سُن لین حضور   روبرو کہنے کی ہے خصلت مری
آپکا ہر رنگ مین ہمرنگ ہون   آپکی تصویر ہے صورت مری
آپ مین جاندار یہ حکم خدا   اور مین بیجان یہ قسمت مری

آپ مین جو وصف ہین مجھ مین کہان · لغو سمجھین آپ گو حجت مری
ہی نظر مین میری یکسان ہر بشر · بس اسی جوہر سے ہی عزت مری
ہو اگر انسان مین بھی یہ صفت · پھر نہ منھ تکتی رہے حیرت مری
خود نمائی مجھ سے لیتے ہین حسین · جھوٹ سے بھی سیکھ لین نفرت مری
دل مین رکھنا ہمنشینون سے غبار · دیکھ سکتی ہی کہان غیرت مری
آپ عاقل ہین تو لین مجھسے سبق · راستی سیکھین جو ہے فطرت مری

ہو دو بالا آپکا حسن و جمال
کاش اس صورت پہ ہو سیرت مری

حمید میرٹھی

تازہ غزلین

مجدد الوقت مولانا سید احمد حسن صاحب شوکت میرٹھی

جلوہ افگن ہی مرقع حسن عالمگیر کا · آئینہ حیرت سے منھ تکنے لگا تصویر کا
کھینچ لیگا اُن کو جذبہ آہ پر تاثیر کا · کام دیگا میرا ہر تار نفس زنجیر کا
حشر کے ہنگامہ مین وہ آئینگے جو کم نظر ہین · ہم کو چھپنا چاہیئے آب دم شمشیر کا
جب ترے جلوے سے حیرت کا مرقع بنگیا · میری صورت دیکھکر رنگ اُڑ گیا تصویر کا
رکھکے فرق کبر اسکو حباب آسا نہ بھول · تاج شاہی مُہرہ ہے بازیچۂ تقدیر کا
ہی مژہ ناوک تو اسکے واسطے پر ہی نگاہ · ترک کر اے ترک تو ترکش مین رکھنا تیر کا
کیا ملائیگا تو مجھ وحشی سے آنکھ اے چارہ گر · دیکھ چشم شیر ہے حلقہ مری زنجیر کا
چارہ گر خود قید نے بخشا مجھے پائے گریز · خانۂ زنجیر مین نالہ ہون مین زنجیر کا
بے ثباتی کی ہوا مین اُڑ رہا ہون رات دن · یا خدا رنگ پریدہ ہون مین کس تصویر کا
سینہ گر گھائل نہو ناموس غم کا داغ ہو · دل اگر زخمی نہو تو زخم ہی تقدیر کا
لذت دست نزاکت سے ہوئے دونون شہید · چل رہا ہی میرے دم کے ساتھ دم شمشیر کا
وسعت وحشت کے آگے تنگ آیا اسقدر · دام صحرا بنگیا حلقہ مری زنجیر کا

بول جائین دم مین چمن شوکت سخن کے عیب چین
شعر نے پھیرا ہے منھ ہر شیر آہو گیر کا

منشی عبدالرحمن محمد محسن صاحب نشتر منگرولی

حیات چند روزہ جسطرح سے ہو بسر کر لو · عدم کا ہی سفر در پیش سامان سفر کر لو
دکھا دو چاہنے والونکو تم انداز محبوبی · سما جاؤ نظر مین سب کی دلمین سب کے گھر کر لو
اس انداز حیا سے لو چوری کھل گئی دل کی · کہا تھا کس نے تم سے چھپ کر نیچی نظر کر لو
تمنا ازاہد وا حور و نکی کرنا بعد مرنے کے · پرستش ان بتان ماہ وش کی عمر بھر کر لو
یہ خالی جام ساقی میکشو کیا کام آئیگا · اگر لیتے ہو ساغر بادۂ رنگین سے بھر کر لو
جو محفل ہی وہ مقتل ہے جو بیدل ہین وہ بسمل ہین · جو خنجر ہاتھ مین اپنے کبھی تم بن سنور کر لو
شب وعدہ جو آئے ہو نہ چھیڑو ذکر دشمن کا · نہ رنجش کی کرو تم بات ال جل کر سحر کر لو
نہایت سرفرازی اسکو ہوتی عشاق مین حاصل · پسند اجان اجو نشتر تم خوشتر کا سر کر لو

سید محمد اسمٰعیل صاحب ساحر ہمدانی گیاوی

کیا دھوان دھار گھٹا اُٹھی ہی میخانے سے · ساقیا نور کا مینھ برسے گا پیمانے سے
کھل گیا رنگ ہر اک گل کا بہار آنے سے · حسن دونا ہوا صورت کے نکھر جانے سے
حلق پر تیغ دو دم کھلکے بھی پھیری نگئی · کیا ملا تجھکو ستمگر مرے تڑپانے سے
وصل مین دلکے نہ ارمان نکلنے پائے · جان پر بنگئی ظالم ترے شرمانے سے
رہے ہر حال مین تقدیر پہ شاکر انسان · سب بنے کام بگڑ جاتے ہین گھبرانے سے
قتل کے بعد ہی یہ حسرت و افسوس عبث · جی نہ اٹھونگا مین ظالم تیرے پچھتانے سے
واہ رے ضبط دم قتل ترے عاشق کا · دم نہ مارا تہ خنجر ترے فرمانے سے
مرگیا مین تو وہ شانے کو ہلا کر بولے · جاگ او نیند کے ماتے مرے جھنجھلانے سے
ہجر مین شعر و سخن کی ہی عبث فکر رسا · خون دل پینے سے فرصت نہ غم کھانے سے

الوا افکار میر عاجز سہسوانی

دیکھکر جلوہ ترا مخلوق شیدائی ہوئی · محو حیرت کس قدر چشم تماشائی ہوئی
جلوۂ وحدت کی کثرت مین خود آرائی ہوئی · ذرے ذرے سے نمایان شان یکتائی ہوئی
روئے روشن ہی ترا چشم و چراغ شمع طور · چشم موسیٰ کی طرح خلقت تماشائی ہوئی
پائمال غمزہ دل جان رفتۂ ناز خرام · اک قیامت ڈھا رہی ہی چال اٹھلائی ہوئی
آپکے جاتے ہی عاجز نے کیا رونا شروع · یکقلم دل سے جدا صبر و شکیبائی ہوئی


میر مہدی مجروح

العصر

حرکت کا پہلا قانون

زمین کی محوری حرکت بند ہو گئی ہے! کل صبح آفتاب عالمتاب افق مشرق سے طلوع نہین ہو گا بلکہ صبح کی نورانی سفیدی کبھی آشکارا نہین ہو گی!! جہاں دن ہے وہاں دن رہیگا اور جہاں رات ہے وہاں رات کی ابدی تاریکی صفحۂ زمین کو انسان کی آخری نسلوں کا ایک عالمگیر قبرستان بنا دیگی!!!

انسانی طبائع کا صحیح مطالعہ کرنا مقصود ہو تو کسی طریقہ سے اس سنسنی خیز خبر کو عارضی شہرت دیدیجیے پھر دیکھیے جہالت کی نیند کے متوالوں کی آنکھیں کس طرح کھلتی ہیں۔ مارکونی گرام[1] اور تار برقیاں کس عجلت اور شوق کے ساتھ پڑھی اور سُنی جاتی ہیں۔ کیسی مستعدی کے ساتھ اجرام فلکی کا مشاہدہ کیا جاتا ہے اور خواہش ظاہر کی جاتی ہے کہ اگر ایک دفعہ پھر زمین کی باقاعدہ اور مسلسل حرکت شروع ہو جائے تو اُسکا وسیع مطالعہ کرینگے۔ لیکن جب ایک گرانبہا نعمت ہمیں عطا کی گئی ہے اور ہم ہر لمحہ اُس نعمت کے جان بخش فوائد سے متمتع ہو رہے ہیں ہماری غفلت شعاری اور کوتاہ اندیشی ہمین اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اِن آسان لیکن مہتم بالشان مسائل پر کماحقہ غور کرین اور زمین کی محوری حرکت کے علل اور نتائج پر عبور حاصل کرنے کے بعد اُس کے مسلسل اور باقاعدہ قیام کے متعلق جہاں تک انسانی سمجھ اور علم کام آسکتا ہو غایت درجہ کے متیقن ہو جائیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف انسانوں کے میل ملاپ میں بلکہ مظاہر قدرت کے متعلق بھی حضرت انسان کا یہی معمول ہے کہ بے تکلفی اور روزمرہ کی ملاقات کا نتیجہ اگر نفرت نہین تو لاپروائی ضرور ہوتا ہے۔ اس اصول کی تشریح مذکورۂ بالا عسیر الحصول اور مرگ افزا مثال سے اگر کافی طور پر نہ ہوتی ہو تو

[1] مارکونی گرام (Marconigram) جو پیغام برقی رو کی مدد سے تاروں کے بغیر اتھیر کے تموج اور برقی لہروں کے ذریعہ سے ایک مقام سے دوسرے مقام پر وصول کیے جاتے ہیں ان کو بغیر تار کی برقی پیغام رسانی کے ایک اطالوی موجد یعنی مارکونی (Marconi) کے نام پر مارکونی گرام کہتے ہیں۔

اپنی زندگی کے جس شعبہ پر چاہو نظر ڈالکر اپنی تسلی کرلو جب یورپ مین بغیر تار کے برقی پیغام رسانی کا سلسلہ شروع ہوا تو ہر شخص اسکے سمجھنے کے لیے حد سے زیادہ خواہشمند نظر آتا تھا اور علمی ترقی کے میدان مین پیچھے رہ جانے ممالک کے سرتاج نیم وحشی نیم مہذب ملک ہندوستان مین تو آج تک یہی حالت ہو کہ وہ لوگ بھی جو علمی نقطۂ خیال سے مردوں کا حکم رکھتے ہیں اور علمی دنیا سے تا متر بیخبر ہین "بلا تار برقی" کے نئے نام سے چونک اُٹھتے ہیں۔ علمی زندگانی کی ایک عارضی لہر انکے مُردہ دلوں کو جلا دیتی ہو اور اس عجوبۂ دریافت کے سمجھنے کے متمنی نظر آتے ہیں حالانکہ یہی وہ لوگ ہین جنکو معمولی تار برقی پیغام رسانی کے متعلق ذرہ برابر ادراک نہیں ہو اور نہ ہی اسکے سمجھنے کی خواہش ہے۔ فرق دونوں حالتوں میں صرف یہ ہے کہ "معمولی تار برقی" ایک روزمرہ کی چیز ہے جب سے ہمنے ہوش سنبھالا ہے معمولی تار برقی کا نام سنتے آئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اگر نفرت نہیں تو لاپروائی اس کے متعلق ضرور پیدا ہوگئی ہے۔ برعکس اس کے "بلا تار برقی" ایک انوکھی چیز ہے اگر اس کے متعلق تھوڑی بہت گفت وشنید کرتے ہیں تو ہماری فطری جدت پسندی کی تسکین ہوجاتی ہے۔ وگرنہ علمی نقطۂ خیال سے معمولی تار برقی اس امر کی زیادہ مستحق ہے کہ اسے بلا تار برقی سے پہلے سمجھا جائے مَیں خیال کرتا ہوں کہ اگر دنیا میں قدیم سے یہی رواج ہوتا کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ کھوکھلی نلیوں کے ذریعہ سے باتیں کرتے یعنی آواز کی موجوں کو کھلی ہوا میں گزارنے کی بجائے نلیوں میں سے گزارتے تو شاید نلیوں کی مدد سے باتیں کرنا ایک ویسی ہی معمولی بات سمجھی جاتی جیسی کہ تار کے ذریعہ سے برقی رو کا گزارنا سمجھا جاتا ہے۔ اور نلیوں کی وساطت کے بغیر براہ راست کھلی ہوا کے ذریعہ سے باتیں کرنا ویسا ہی عجوبہ متصور ہوتا جیسا بغیر تار کے برقی پیغام رسانی کا سلسلہ فی زمانا سمجھا جاتا ہے حالانکہ بغیر نلی کے باتین کرنا جیسا کہ ہم ہمیشہ بغیر سوچے سمجھے کرتے ہیں ویسا ہی ہے جیسا کہ بغیر تار کے برقی رو کا ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچنا۔ ایسا ہی چیزوں کے بوجھ کا مسئلہ اور اُن کا زمین کی طرف گرنا ایک ایسا عام مشاہدہ ہے کہ محض عمومیت کی وجہ سے لوگوں کی نظروں میں اس کی اہمیت باقی نہیں رہی۔ جہاں معمولی سمجھ کا آدمی یہ سوال کرنے کے لیے تیار ہوجاتا ہے کہ یہ امر کیوں ہوا؟ اور وہ امر کیوں ہوا؟ اس کے دل میں اس خیال کا خیال بھی نہیں آتا کہ زمین چیزوں کو کیوں کھینچتی ہے؟

مندرجۂ بالا اصول کسی مفصل تصدیق کا محتاج نہیں ہے اور نہ اسکے ثبوت کا بہم پہنچانا ہمارے مبحث میں داخل ہے۔ ہمارا منشا موجودہ سلسلۂ مضامین کے لکھنے سے برادران وطن میں ایک علمی تحریک پیدا کرنا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ہمنے ایسے مضامین انتخاب کیے ہیں جن سے ناظرین میں اپنے مشاہدات اور عام علمی استعداد بڑھانے کی خواہش پیدا ہو۔ مضمون زیر بحث یعنی حرکت کے پہلے قانون کے ضمن میں زمین کی روزانہ اور سالانہ گردش کے متعلق چند نہایت ضروری سوالات یہ ہیں کہ زمین کیوں اپنے محور اور سورج کے گرد گھومتی ہے؟ ہم کس طرح اس بات کا یقین کرتے ہیں کہ یہ ہمیشہ اسی رفتار کے ساتھ اپنے محور اور سورج کے گرد گھومتی رہیگی؟ ہمارے پاس اس یقین کے لیے نظری اور علمی ثبوت کیا ہیں؟ اِن سوالات کا مفصل تسلی بخش جواب اپنی اپنی جگہ پر اس مضمون کے دوران میں آجائے گا۔

نظام بطلیموسی[1] کے مطابق زمین ساکن متصور کی جاتی تھی اور اسے عالم کا مرکز مانا جاتا تھا۔ گردش لیل ونہار یعنی طلوع وغروب آفتاب کے متعلق متقدمین کے عجیب عجیب خیالات تھے۔ قاعدہ کی بات ہو کہ انسان اپنے گرد وپیش کے واقعات کی توجیہ کے لیے ضرور کوئی نہ کوئی وجہ بنا لیتا ہو جس سے ایک حد تک اس کے دل کی تسلی ہوجاتی ہو۔ یہ دوسری بات ہو کہ اسکے دریافت کردہ اسباب صحیح نکلیں یا غلط۔ لیکن یہ ضرور ہوتا ہو کہ

۱؎ بطلیموس (Ptolemy) زمانۂ قدیم مین ایک قابل مہندس ہوگزرا ہو جسنے پہلی صدی عیسوی میں فروغ پایا تھا۔

اِن اسباب کی حقانیت کا اعتبار اس زمانہ کی معلومات کے مطابق ہوتا ہے آج جن باتوں پر مدرسہ کے طلباء کو ہنسی آتی ہے وہی باتیں اپنے اپنے وقت میں لاانتہا دماغ سوزی کا نتیجہ ہونے کی وجہ سے مقبول خاص و عام تھیں۔ ہم لکھ رہے تھے کہ طلوع و غروب آفتاب کے متعلق متقدمین کے عجیب و غریب خیالات تھے۔ شروع شروع میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ سورج ایک دیوتا کا مظہر ہے جو اپنے رتھ میں بیٹھ کر ہر روز مشرق سے مغرب کی طرف سیر کرتا ہے۔ یاد رہے کہ یونان میں ہندوستان کی طرح ہر قدرتی طاقت کا کم از کم ایک دیوتا ضرور ہوتا تھا۔ لہٰذا سب سے پہلے اُنھوں نے سورج کے دیوتا کی سواری سے سورج کے طلوع اور غروب ہونے کو تعبیر کیا۔ ازاں بعد متقدمین میں یہ خیال رائج ہوا کہ سورج دیوتا نہیں ہو سکتا اس لیے کہ کبھی کبھی (گرہن کے موقع پر) اسکی روشنی میں نقص واقع ہوتا تھا لہٰذا اُنھوں نے سوچا کہ ولکن[۱] ہر روز جلتی ہوئی آگ کا ایک بہت بڑا گولا بنا کر مشرق کی سمت سے نہایت زور کے ساتھ اوپر کی طرف پھینک دیتا ہے۔ چونکہ گرمیوں میں سردیوں کی نسبت سورج آسمان پر زیادہ مسافت طے کرتا نظر آتا ہے اس لیے اُنھوں نے خیال کیا کہ ولکن سورج کو مختلف موسموں میں کم و بیش زور کے ساتھ اوپر کی طرف پھینک دیتا ہے۔ شام کے وقت ان کا خیال تھا کہ سورج بحرِ ظلمات میں گر کر ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ ساری رات ولکن ایک نیا سورج بنانے میں مصروف رہتا ہے اور علی الصبح اُسے ختم کر کے پھر اوپر کی طرف پھینک دیتا ہے۔ اس کی توجیہ کے خلاف خود ہی اُن کے دل میں دو اعتراضات گذرے۔ ایک تو یہ کہ ہر روز ایک نئے سورج کا بنانا ولکن کے لیے بھی باوجود اس کی دیوتائی طاقتوں کے زحمت سے خالی نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ جہاں سورج بحرِ ظلمات میں گرتا ہوگا وہاں اسکے گرنے اور سرد ہونے سے بہت شور ہوتا ہوگا اور پانی میں ایک طوفان اُٹھتا ہوگا اس لیے اُنھوں نے ایک اور وجہ سوچی جو ان دونوں نقائص سے مبرا تھی۔ اس نئی تجویز کے مطابق ولکن علی الصبح سورج کے پھینکنے کے بعد ایک سنہری کشتی میں بیٹھ کر مغرب کی جانب جلدی جلدی پہنچ جاتا ہے اور شام کے وقت سورج کو سمندر میں گرنے سے بچا لیتا ہے۔ اس تجویز کے مطابق نہ تو ہر روز ایک سورج کا نقصان ہوتا ہے اور نہ سمندر میں طوفان ہی برپا ہوتا ہے۔ ساری رات ولکن سورج کو کشتی میں لیے ہوئے مشرق کی طرف چلا آتا ہے اور صبح ہونے پر پھر وہی پہلے دن کا سا حساب ہوتا ہے۔

بطلیموس کا نظام اور یہ لچر و پوچ توہمات یورپ میں ازمنۂ مظلمہ میں تقریباً ڈیڑھ ہزار برس تک مقبول خاص و عام رہے ہیں۔ سولھویں صدی عیسوی میں کوپرنیکس (Copernicus) نے جو ۱۴۷۳ء میں پولینڈ میں پیدا ہوا تھا اور نیوٹن اعظم کی پیدائش سے پوری ایک صدی پہلے ۱۵۴۲ء میں مرا تھا بطلیموسی نظام اور ان قدیم توہمات اور دیو پری کی قصہ کہانیوں کا قلع قمع کیا۔ اس نے ثابت کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور یہ کہ سورج نظام شمسی کا مرکز ہے نہ کہ زمین! لیکن کوپرنکی نظام باوجودیکہ پہلے نظاموں سے بدرجہا اعلیٰ اور بہتر تھا اور آج تک صحیح مانا جاتا ہے لیکن اُس وقت یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ زمین کیوں سورج کے گرد گھومتی ہے۔ اس کے لیے ابھی ایک اور صدی کی علمی تحقیقات اور علم دوستوں کی تین پشتوں کی ضرورت تھی۔ کیپلر (Kepler) نے ۱۵۷۱ء سے ۱۶۳۰ء تک اور (Galileo) گے لی لیو نے ۱۵۶۴ء سے ۱۶۴۲ء تک اور سب سے زیادہ سر آئزک نیوٹن نے ۱۶۴۲ء سے ۱۷۲۷ء تک اپنی قیمتی عمر کی لگاتار محنت کے بعد بیشمار دوسرے ہیئت دانوں کی عمر بھر کی محنتوں کا فائدہ اُٹھا کر نظام شمسی کے مختلف افراد کی حرکتوں کو قوانینِ حرکت سے منضبط کیا۔ سب سے زیادہ قابل قدر کام جو انکی وسیع تحقیقات نے سر انجام کیا

۱؎ ولکن ایک دیوتا کا نام ہے۔

وہ حرکت کے پہلے قانون کو صحیح طور پر سمجھا تھا۔ کیپلر نے سیارگان نظام شمسی کی حرکت کے انضباط کے لیے تین قوانین وضع کیے جو قوانین کیپلر کے نام سے موسوم ہیں لیکن وہ بھی اس عقدہ کو کہ سیارے ایک ہی مرکز کے گرد کیوں گھومتے رہتے ہیں حل نہ کرسکا۔ یورپ کے ایام جہالت کے توہم پرستوں کی طرح اُس نے بھی ہر سیارے کا محرک (حرکت دہندہ) ایک جابک سوار دیوتا یا روح مقرر کیا جو اپنی اَن تھک طاقت سے سیاروں کو ان کی گردشوں میں سست نہیں ہونے دیتا تھا۔ سب سے بڑی بات جو انسانی دماغ میں موجزن تھی وہ سیارونکی گردش کے متعلق تھی۔ سیارے کیوں متحرک ہیں؟ اُس زمانہ میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ہر متحرک چیز کی حرکت قائم رکھنے کے لیے ایک لگاتار کام کرنیوالی طاقت کی ضرورت ہے۔ یہی ایک خیال تھا جس کا ظہور مختلف صورتوں میں ہوتا رہتا تھا۔

گیلیلیو کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ کوپرنیکی نظام کا ثبوت اور زمین کی حرکت کا سبب بیان کرنا ہے۔ لیکن پیشتر اس کے کہ ہم گیلیلیو کے طریقۂ ثبوت پر نظر ڈالیں ہم چاہتے ہیں کہ اس جلیل القدر عالِم کی پُرآشوب زندگی سے ناظرین کو مختصر الفاظ میں واقف کرادیں۔ گیلیلیو فلارنس کے ایک معزز گھرانے میں ۱۸ فروری ۱۵۶۴ء کو پیدا ہوا تھا۔ ۱۷ برس کی عمر میں پیزا (پیسا) کی یونیورسٹی میں طب کی تعلیم کے لیے داخل ہوا۔ طالب علمی کے زمانہ ہی میں گیلیلیو نے اپنی خداداد ذہانت کا ثبوت اس طرح دیا کہ اپنے معلموں کو گرنے والے اجسام کے متعلق انکی غلطی سے متنبہ کیا۔ گے لی لیو کے زمانہ تک ارسطا طالیس یعنی ارسطو کی متابعت میں تمام یورپ اس بات کا قائل تھا کہ ایک ہی بلندی سے گرنے کا وقت مختلف وزن کی چیزوں کے لیے مختلف ہے۔ دنیا میں اگر بڑے نام نے صدیوں تک بنی نوع انسان کو گمراہ کیا ہے تو وہ ارسطو کا نام ہے۔ ارسطو کا معمول تھا کہ ناکافی مشاہدات کی بنا پر غلط نتائج جلدی سے مترتب کرلیتا تھا۔ ہم کسی دوسرے موقع پر ارسطو کی غلطیوں کے متعلق بحث کرینگے۔ یہاں صرف یہ دکھانا مطلوب ہے کہ علمی حوصلہ نام سے نہیں ڈرتا۔ بلکہ رعب میں آنے کے بجائے تجربہ کی طرف راجع ہوتا ہے۔ گے لی لیو نہ تو اپنے اُستادوں کے غلط ادعا سے متأثر ہوا اور نہ ارسطو کے باسطوت نام سے مرعوب ہوا۔ ایک دن علی الصبح شہر پیزا کے مینار لرزاں کے اوپر دو پتھر لے کر چڑھ گیا۔ ایک کا وزن ۵۰ سیر کے قریب تھا اور دوسرے کا نصف سیر۔ ارسطو کے قانون کے مطابق چاہیے تھا کہ اگر ۵۰ سیر وزنی پتھر زمین پر ۵ ثانیہ میں گرے تو نصف سیر وزنی پتھر اس وقت سے سو گنا زیادہ وقت میں گرے یعنی ۵۰۰ ثانیہ میں۔ گے لی لیو نے نہایت شد و مد سے اس غلط فلسفہ کی تردید کی اور عملی طور پر دکھا دیا کہ دونوں پتھر اگرچہ ان کے وزن میں بہت فرق تھا ایک ہی وقت میں گرتے ہیں۔ اُس نے مینار کے کنارہ پر دونوں پتھروں کو رکھدیا اور پھر ایک ساتھ نیچے گرادیا۔ دونوں ایک ساتھ گرے اور ایک ساتھ ہی سطح زمین سے ٹکرائے۔ یہ صحیح ہے کہ ہلکے اجسام مثلاً کاغذ کے ٹکڑے وغیرہ ہوا کی وجہ سے آہستہ گرتے ہیں لیکن یہ فرق ذاتی نہیں ہے بلکہ ہوا کی رُکاوٹ کی وجہ سے ہے۔ اگر کسی جسم میں سے ہوا نکال لیجائے اور دو مختلف چیزیں ایک ہلکی اور ایک بھاری ایک ساتھ گرائی جائیں تو وہ یکساں رفتار کے ساتھ اس خلا میں گرتی ہیں۔ اسی امر کی توضیح کے لیے ایک عام تجربہ Guinea and Feather Experiment گنی اور پر کے نام سے مشہور ہے۔ چونکہ گے لی لیو نے ایک مقبول عام خیال کی تردید کی اس لیے پیزا میں اسکی ہر دلعزیزی میں فرق آگیا اور بہت سے فلسفیوں کو اس سے کینہ ہوگیا۔ لہذا ۱۵۹۲ء میں اس نے پاڈوا کی یونیورسٹی میں پروفیسری قبول کرلی۔

دوسرا بڑا کارنامہ جو گے لی لیو نے اپنی زندگی میں کیا وہ دُوربین کی تکمیل ہے۔ ہم گے لی لیو کو دُوربین کا موجد نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس

حیرت انگیز ایجاد کا قرعہ ۱۶۰۸ء میں ایک عینک ساز مڈل برگ کے رہنے والے ہنس لیپرشے (Hans Lippershey) کے شاگرد رشید لڑکے کے حصہ میں آیا ہی۔ لڑکے نے دو عینک کے شیشوں کو کھیل کے طور پر ایک دوسرے کے آگے رکھ کر دیکھا تو نزدیک کے گرجا کی چوٹی اُلٹی اور بہت نزدیک نظر آئی۔ افواہ ہی کہ جرمنی کے ایک امیر آدمی نے لڑکے سے اُس کھلونے کو خرید لیا اور ایک شہزادہ کو بطور نذر پیش کیا لیکن ہمارے لیے جو ضروری بات ہی وہ یہ ہی کہ اس واقعہ کی خبر کسی نہ کسی طرح اٹلی سے گے لی لیو تک پہنچ گئی۔ خبر سنتے ہی اُس نے اس کے متعلق تحقیقات شروع کر دی۔ وہ تمام رات جاگا اور بالآخر ۱۶۰۹ء ہی میں اس نے دوربین کے نظریہ کو عملی طور پر ایک کمال تک پہنچا دیا کہ مشتری (جو پی ٹر Jupiter) کے چاند دریافت کیے۔ زہرہ اور عطارد کو دیکھا کہ وہ چاند کی طرح گھٹتے بڑھتے اور ہلال اور بدر کی شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ زحل کے حلقے دیکھے اور اس طرح کوپرنیکی نظام کو دوربین کی مدد سے ایک مضبوط بنیاد پر کھڑا کر دیا۔ آخری حصۂ عمر میں گے لی لیو گرنے والے اجسام کے مطالعہ سے حرکت کے قوانین کی بنیاد ڈالتا رہا۔ آخر عمر میں اس نے ایک کتاب شائع کی جس میں بطلیموسی نظام اور کوپرنیکی نظام کے متعلق چار مکالمات درج ہیں۔ روما کے پوپ کا حکم صادر ہوا تھا کہ زمین چپٹی ہی ساکن ہی اور عالم کا مرکز ہے۔ اس کے خلاف عقیدہ رکھنا کفر تھا ستر برس کی عمر میں گے لی لیو کو کفر کے الزام سے روما میں طلب کیا گیا وہاں قید اور تکالیف شدیدہ[1] کے بعد بوڑھے آدمی نے تنگ آکر گھٹنے ٹیک کر اور ہاتھ باندھ کر زمین کے گول اور متحرک ہونے سے انکار کیا باوجود ان تمام سزاؤں کے بقیہ عمر کے لیے گے لی لیو سرکاری طور پر قید رہا۔ اسکی توبہ کے بعد فی الفور زمین کی حرکت سے انکار اور اسکے چپٹا ہونے کا بیان تمام یونیورسٹیوں میں بھیجا گیا تاکہ پروفیسر اپنی اپنی جماعتوں میں طلبا کو پڑھ کر سنائیں۔ ملٹن کی طرح گے لی لیو کی زندگی کے آخری ایام نورانی اندھیرے میں کٹے۔ وہ جس نے دوسروں کو علم کی روشنی دکھائی اور آسمانوں کی سیر کرائی تھی خود اندھا ہو کر اپنے آس پاس کی چیزوں کے دیکھنے سے عاجز ہو گیا۔ علم کی بڑھتی ہوئی روشنی کے رومائی دشمنوں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے کہ گے لی لیو کی زندگی کا خاتمہ کرنے کے ساتھ اُس کے کام کا بھی خاتمہ ہو جائے لیکن انسانی کوششیں کبھی ایسے نمایاں طریقہ سے ناکام نہیں ہوئی تھیں جس طرح رومائی کوششیں علم کی روشنی کے مٹانے میں ناکامیاب ہوئیں۔ جس سال گیلیلیو مرا اُسی سال نیوٹن پیدا ہوا اور جو کام گے لی لیو نے شروع کیا تھا نیوٹن نے اُسے پایۂ کمال تک پہنچایا۔

رومائی کوششوں سے گے لی لیو کی تقریباً ساری کتابیں جلا دی گئی تھیں خود اسکے بیٹے نے اپنے باپ کے بہت سے مسودے آگ کے سپرد کر دیے تھے لیکن اسکی ایک تصنیف حرکت اور مشینوں کے متعلق موسوم میکانک (میکینکس Mechanics) خوش قسمتی سے اسکے ایک شاگرد رشید کی وساطت سے بچ گئی تھی۔ شاگرد موصوف گے لی لیو کو اُسکی موت سے دو تین سال قبل ملنے آیا تھا اور حسن اتفاق سے یہ کتاب اپنے ساتھ لیجانے میں کامیاب ہوا تھا۔ ازاں بعد اُس نے اِسکو ہالینڈ میں شائع کر دیا۔ گے لی لیو نے مدت العمر کی محنت سے اجسام کی حرکت کے متعلق اپنی جملہ معلومات کو چند قوانین کی شکل میں بیان کیا تھا۔ نیوٹن نے بعد ازاں اُنھیں قوانین کو نہایت قابلیت کے ساتھ مختصر الفاظ میں رکھا۔ آج زمانہ میں نیوٹن کی بڑھی ہوئی شہرت کے غلبہ سے حرکت کے تینوں قوانین نیوٹن کے قوانین حرکت کہلاتے ہیں۔

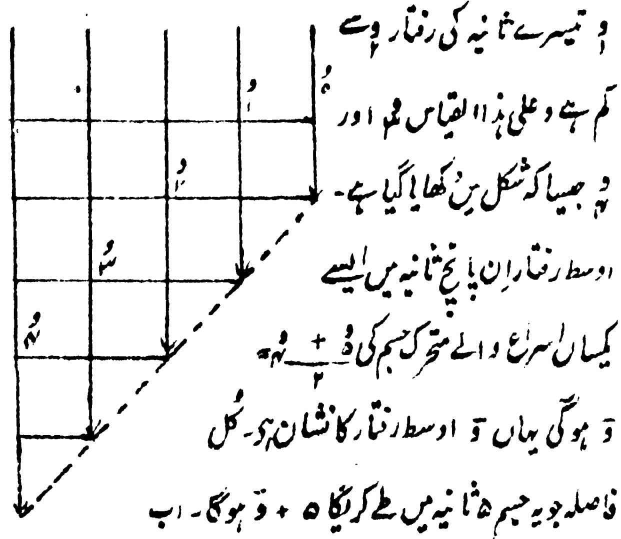
حرکت کا پہلا قانون نیوٹن کے الفاظ میں یوں ادا کیا جا سکتا ہی

[1] روما میں کافروں کی تادیب کے لیے ایک ظالمانہ عدالت بنام انکویزیشن (Inquisition) قائم تھی جس کا ادنیٰ کارنامہ یہ ہی کہ علم اور حق کی حمایت کی پاداش میں سیکڑوں آدمی چتا پر جلا دیے گئے اور ہزاروں شکنجہ کی مصائب میں مبتلا کیے گئے۔

"ہر ایک جسم تا وقتیکہ اُس پر کوئی طاقت عمل نہ کرے اپنے سکون یا حرکت کی حالت پر قائم رہتا ہے"۔ یا بالفاظ دیگر "اگر کوئی طاقت ایک متحرک جسم پر عمل نہ کرے تو وہ ایکساں رفتار کے ساتھ متحرک رہتا ہے"

اس زبردست قانون کے متعلق چند باتیں قابل غور ہیں۔ اگر ایک جسم ساکن ہے تو وہ خود بخود متحرک نہیں ہو سکتا۔ ایک ساکن جسم میں حرکت جبھی پیدا ہوتی ہے جب کوئی طاقت اُس پر عمل کرے۔ اگر وہ جسم متحرک ہے تو وہ اپنے آپ یکساں رفتار[۱] کے ساتھ حرکت کرتا رہیگا۔ اس کی حرکت میں کمی بیشی[۲] یا کجی جبھی واقع ہوگی جب کوئی طاقت اُس پر عمل کرے۔ ایک متحرک جسم کی حرکت قائم رکھنے کے لیے کسی طاقت کی ضرورت نہیں۔ طاقت کی ضرورت صرف اُسکی حرکت میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ حرکت میں تبدیلی دو طرح پر ہو سکتی ہے۔ یا تو رفتار میں کمی بیشی یعنی اسراع اور تعویق ہو یا سمت بدل جائے۔ نیوٹن اور گیلیلیو کے اس حصۂ کام کی زیادہ وقعت اس لیے ہے کہ ان مقدمات کی مدد سے عالم میں ستاروں وغیرہ اجرام فلکی کی حرکات بالعموم اور نظام شمسی کے افراد کی حرکات بالخصوص بنی نوع انسان کو ایسے طریقہ پر سمجھ میں آگئی ہیں کہ اب ان میں شک وشبہ یا اور کسی طرح کے رد و بدل کا امکان نہیں ہے۔ موجودہ سائنس یہ کہنے سے عاجز ہے کہ سب سے پہلے اجرام فلکی کی حرکت کس طرح شروع ہوئی۔ لیکن اگر یہ سوال خارج از بحث کر دیا جائے تو باقی مسئلہ تمامہ سائنس نے کماحقہ سمجھ لیا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ مشیّت ایزدی سے اجرام فلکی متحرک ہوگئے تو اور کسی بیرونی طاقت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ تشریح کے لیے ہم زمین ہی کی مثال لیتے ہیں۔ جب یہ ایک دفعہ اپنے محور کے گرد گھومنی شروع ہوگئی تو حرکت کے پہلے قانون کے مطابق اب کسی طاقت کی ضرورت اِس محوری حرکت کے قیام کے لیے باقی نہیں رہتی۔ متقدمین کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ ان کے

[۱و۲] حرکت کے متعلق چند اصطلاحات ضروریہ کی تشریح مناسب معلوم ہوتی ہے۔ اگر ایک جسم کبھی ایک مقام پر اور کبھی دوسرے مقام پر ہو تو اُس جسم کو متحرک کہتے ہیں گویا حرکت نقلِ مکانی کا دوسرا نام ہے۔ جتنا فاصلہ ایک متحرک جسم ایک ثانیہ میں طے کرتا ہے اُسے رفتار کہتے ہیں۔ مثلاً ایک متحرک جسم ایک منٹ میں بیس گز چلتا ہے تو اسکی رفتار (Velocity) ۲۰ گز فی منٹ یا ایک فٹ فی ثانیہ ہوگی۔ جس رفتار میں کمی بیشی نہ ہو یعنی مختلف اوقات پر برابر عرصہ میں برابر فاصلے طے ہوں اُسے یکساں رفتار یا حرکت یعنی (Non-accelerated Motion or Uniform Velocity) کہتے ہیں۔ جس کی رفتار میں کمی بیشی ہوئے ویری ایبل ویلاسٹی (Variable Velocity) کہتے ہیں۔ ایک ثانیہ میں رفتار جس قدر بڑھتی یا گھٹتی ہے اُسے اسراع (Acceleration) یا تعویق (Retardation) کہتے ہیں۔ مثلاً ایک ریل گاڑی اسٹیشن سے روانہ ہونے کے بعد پہلے پانچ منٹ میں دو میل اور دوسرے پانچ منٹ میں ۴ میل فاصلہ طے کرے تو اُسکی اسراع ⅖ میل فی منٹ ہوگی۔ اگر ایک جسم کو بلندی پر سے نیچے کی طرف پھینکا جائے تو زمین کی کشش سے اسکی رفتار لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جائیگی چونکہ کشش زمین ایک نہ بدلنے والی طاقت ہے۔ ہر لحظہ اسراع برابر مقدار سے ہوگی۔ فرض کیجیے کہ ایک متحرک جسم کی رفتار یکساں اسراع کے ساتھ بڑھ رہی ہے یعنی پہلے ثانیہ میں رفتار $و_1$ دوسرے ثانیہ کی رفتار $و_2$ سے اتنی کم ہے جتنی کہ $و_2$ تیسرے ثانیہ کی رفتار $و_3$ سے کم ہے وعلی ہذا القیاس $و_4$ اور $و_5$ جیسا کہ شکل میں دکھایا گیا ہے۔



اوسط رفتار اِن پانچ ثانیہ میں ایسے یکساں اسراع والے متحرک جسم کی $\frac{و_1 + و_5}{2} = \bar{و}$ ہوگی یہاں $\bar{و}$ اوسط رفتار کا نشان ہے۔ کل فاصلہ جو یہ جسم ۵ ثانیہ میں طے کریگا $5 \times \bar{و}$ ہوگا۔ اب اگر اسراع کو $و_2 - و_1 = و_3 - و_2 = و_4 - و_3 = و_5 - و_4$ کو ب کہا جائے تو پہلے ثانیہ میں رفتار کی زیادتی ب ہے (باقی بر صفحہ آیندہ)

نزدیک حرکت جاری رکھنے کے لیے ایک مستقل طاقت کی ضرورت تھی اُو اسی لیے انھیں اتنی دورازکار دلیلیں کرنا پڑتی تھیں۔ ایک آدمی جو بائیسکل پہ بیٹھا "بائیسکل چلا رہا ہے" فی الاصل اپنی طاقت بائیسکل کو حرکت دینے میں صرف نہیں کرتا بلکہ اُس مزاحمت کے اثر کو رفع کرنے کے لیے طاقت صرف کرتا ہی جو بوجہ راستہ کی رگڑ اور ہوا کی رُکاوٹ کے بائیسکل کی رفتار میں تعویق پیدا کرتی ہی۔ اگر راستہ بالکل صاف اُو بغیر رگڑ (Friction) کے ہو تو صرف ہوا کی رُکاوٹ باقی رہجاتی ہے اور اس حالت میں بائی سکل کی رفتار یکساں رکھنے کے لیے کم طاقت صرف کرنا پڑتی ہے ازاں بعد رفتار کی کمی جو رگڑ اور ہوا کی مزاحمت سے پیدا ہوتی ہے طاقت کے صرف سے پوری کیجاتی ہی۔ اگر یہ نہو تو بائیسکل ابدالآباد تک ایک سیدھی لکیر میں یکساں رفتار کے ساتھ چلتی رہے بعینہ یہی مثال اجرام فلکی کی حرکت کے لیے مفید ہو سکتی ہی۔ اجرام فلکی ایک دفعہ متحرک کیے گئے ہیں۔ ان کے رستہ میں کوئی چیز ایسی نہیں ہی جو حرکت کی مزاحم ہو سکتی ہی۔ اس لیے اب ابدالآباد انکی حرکت یکساں حالت میں جاری رہیگی۔ راستہ کی رگڑ وغیرہ کے علاوہ اور بھی اسباب حرکت کے مانع ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اگر بائی سکل کے بریک باندھ دیے جائیں تو بائیسکل کی رفتار کم ہو جائیگی۔ اسی طرح زمین کی محوری حرکت کی حالت میں جہاں تک سائنس کی معلومات کام کر سکتی ہیں کوئی ایسی طاقت از قسم راستہ کی رگڑ وغیرہ نہیں ہی۔ اس لیے سائنس داں امید کرتے ہیں کہ اگر کوئی اُو ایسی طاقت جس کا اُنھیں فی الحال علم نہیں ہی زمین کی محوری حرکت بند یا سست[۱] نہ کر دے تو زمین ہمیشہ یکساں رفتار کے ساتھ اپنے محور کے گرد حرکت کرتی رہیگی اور گردش لیل و نہار کبھی منقطع نہ ہوگی۔

زمین کی سالانہ حرکت جس میں سورج کے گرد یہ گھومتی ہی اسی طرح نقص یا زیادتی سے آزاد خیال کیجاتی ہی۔ حرکت کے پہلے قانون کے مطابق زمین کو ایک خط مستقیم میں حرکت کرنا چاہیے لیکن یہاں ہمیں ایک اور مستقل مرکزی طاقت سے واسطہ پڑتا ہی۔ سورج چونکہ زمین سے بہت بڑا ہی اس لیے تجاذب مادی کے عالمگیر قانون کے مطابق زمین سورج کے مرکز کی طرف کھینچی جاتی ہی۔ پس یہاں دو طاقتوں کا مقابلہ ہے۔ ایک تو وہ طاقت جس نے ہمیشہ کے لیے زمین کو ایک خط مستقیم پر چلا دیا ہی اور دوسری سورج کی کشش جو ہر لحظہ عمل کر رہی ہے۔ اِن دونوں قوتوں کی مثال آسانی سے یوں دیجا سکتی ہے۔ ایک پتھر کو کسی رسّی کے ایک سرے سے باندھیے۔ دوسرے سرے کو پکڑ کر پتھر کو زور سے گھمائیے۔ آپ محسوس کرینگے کہ پتھر کی Centrifugal Porce (یعنی وہ طاقت جس کی وجہ سے پتھر مرکز سے دور بھاگنا چاہتا ہی) کی وجہ سے رسی آپ کے ہاتھ سے چھوٹ جانا چاہتی ہے لیکن آپ کے ہاتھ کی Centripetal Force (یعنی وہ طاقت جو پتھر کو مرکز کی طرف کھینچتی ہے) پتھر کو ایک دائرہ میں گھماتی ہی۔ جتنے زور سے آپ

(بقیہ صفحہ گزشتہ) دوسرے میں ۲ × ب۔ تیسرے میں ۳ × ب وغیرہ وغیرہ۔ ت عدد ثانیہ میں رفتار کی زیادتی = ت × ب آخری ثانیہ کی رفتار برابر ہوتی ہے حاصل جمع رفتار کی زیادتی کے۔ اسلیے ت ثانیہ کے بعد قطعی رفتار = ﮦ × ت × ب = لہذا اوسط رفتار و = ﮦ + ﮦ + ت × ب / ۲ = ﮦ + ۱/۲ ت × ب اور کل فاصلہ جو اس اثنا میں طے ہوا = ت × و = ت ﮦ + ۱/۲ ب ت۲ = اگر ایک جسم سکون کی حالت سے شروع ہو تو چونکہ ﮦ صفر کے برابر ہے د = ۱/۲ ب ت۲ = اگر ایک جسم ساکن زمین کی طرف سکون کی حالت سے گرایا جائے تو مشاہدہ سے دیکھا گیا ہی کہ پہلے ثانیہ میں ۱۶ فٹ گرتا ہی دوسرے ثانیہ میں ۴۸ فٹ تیسرے میں ۸۰ فٹ وعلی ہذاالقیاس۔ گویا پہلے ثانیہ میں رفتار ۱۶ فٹ فی ثانیہ دوسرے میں ۴۸ فٹ فی ثانیہ اور تیسرے میں ۸۰ فٹ فی ثانیہ ہوتی ہی۔ لہذا زمین کی کشش کا اسراع ۳۲ فٹ فی ثانیہ ہی۔ کل فاصلہ جو یہ جسم ایک ثانیہ میں طے کرتا ہی ۱۶ فٹ ہی۔ دو میں ۶۴ فٹ تین ثانیہ میں ۱۴۴ فٹ وعلی ہذاالقیاس۔

[۱] ہمنے ایک جداگانہ مضمون میں جس کا عنوان "کیا زمین کی حرکت فی الواقع سست ہو رہی ہی" ہے اس موضوع پہ مفصل بحث لکھی ہے۔

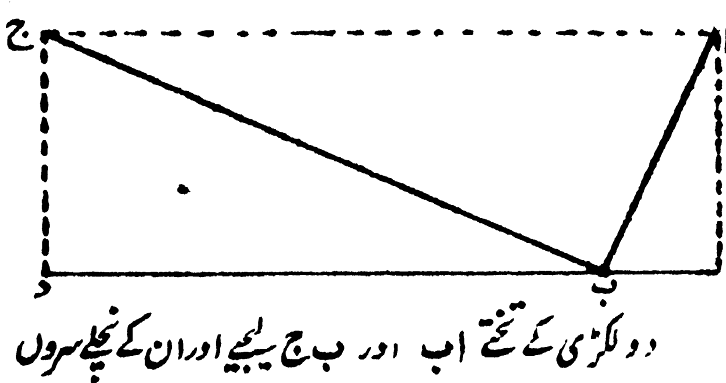
پتھر کو گھمائیں گے اُتنے ہی زور سے آپ کو مضبوطی کے ساتھ رسی پکڑنی ہو گی اور جتنی رسی لمبی ہو گی اُتنا ہی زیادہ وقت ایک دائرہ کی تکمیل کے لیے درکار ہو گا۔ اگر آپ رسی کو ہاتھ سے چھوڑ دیں تو پتھر سیدھا ایک سمت میں جائیگا اُسی سمت میں جس میں وہ اُس وقت حرکت کر رہا تھا جب آپ نے ہاتھ سے رسی چھوڑی۔ بالکل یہی حالت سورج اور زمین کے درمیان ہے۔ رسی کے بجائے یہاں تجاذبِ مادّی کی باہمی کشش ہے جسکے لیے کسی مادی میڈیم (Medium) (اُس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ یا جس کے بیچ میں سے گزر کر کوئی اثر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا ہو) کی ضرورت نہیں ہے۔ جب تک سورج کی کشش میں کوئی فرق نہیں آئیگا زمین اپنی سالانہ گردش میں متواتر مصروف رہیگی۔

پس ہم دیکھتے ہیں کہ قدرت کے تجربہ خانہ (معمل۔ لے بارے ٹری Laboratory) میں حرکت کے پہلے قانون کا ثبوت ہمارے مشاہدہ میں ایک عظیم الشان پیمانہ پر آتا ہے۔ ہمارا نظریہ ہے کہ فضای بسیط کے ایتھر میں یہ خاصہ ہے کہ اجرام فلکی اس میں بغیر رگڑ کے حرکت کرتے ہیں لہذا چونکہ حرکت کی کمی کے لیے کسی طاقت کی ضرورت ہے اور اجرام فلکی کی حرکت کم کرنیوالی کوئی طاقت نظر نہیں آتی امید ہے کہ یہ حرکت ہمیشہ کے لیے قائم رہیگی یہاں تک کہ کوئی غیر متوقع حادثہ جو سردست ہمارے ادراک سے باہر ہے نظام عالم کا خاتمہ نہ کرے۔

ہم زمین پر حرکت کے پہلے قانون کا ثبوت صرف ایک نامکمل طریقہ سے دے سکتے ہیں۔ اس لیے کہ رگڑ وغیرہ حرکت کی کم کرنیوالی طاقتیں ہم کبھی معدوم نہیں کر سکتے ہاں ان کو ایک خاص حد تک جتنا چاہیں کم کر سکتے ہیں اور اس حد تک اپنے مشاہدات کو وسیع کر سکتے ہیں۔ گزشتہ صدی کے ایک نہایت ہی قابل سائنسدان کلرک میکسویل (Clerk Maxwell) نے حرکت کے پہلے قانون کو اس طرح ثابت کیا تھا کہ اُس نے مفرّغ الہوا کے ذریعہ سے ایک برتن میں سے جہاں تک اس سے ہو سکا تمام ہوا نکال لی اور پھر اپنا بنایا ہوا ایک بہت بڑا لٹو (Top) اسکے اندر گھمایا تو گھنٹوں تک اُسکی حرکت بند نہیں ہوتی تھی۔ حالانکہ کھلی ہوا میں بہت جلدی اُسکی گردش جاتی رہتی تھی۔ اسی طرح صاف زمین پر ایک گول پتھر بہت دور تک لڑھکتا ہوا چلا جاتا ہے اور اگر برف کی صاف سطح میسر ہو تو پتھر کی حرکت بہت سا فاصلہ طے کرنے کے بعد ضائع ہوتی ہے۔ رگڑ کے کم کرنے کے لیے کلوں کے پرزوں کو تیل (جس کو اصطلاح میں لُبری کنٹ Lubricants کہتے ہیں) لگایا جاتا ہے۔ گریفائٹ (Graphite) جس سے غلط طور پر مشہور سیسہ کی پنسلیں بنتی ہیں رگڑ کم کرنے کے لیے کئی تیلوں سے بہتر ہے۔ لیکن کیسا ہی عمدہ سے عمدہ لُبری کنٹ کیوں نہ ہو تھوڑی بہت رگڑ ضرور باقی رہتی ہے۔ لہذا یہ تمام تجارب جن میں ایک ٹھوس جسم کی حرکت دوسرے ٹھوس جسم کے مقابلہ میں دیکھی جاتی ہے ذیل کے تجربہ سے افضل نہیں ہیں۔

ایک باریک دھاگا یا تار کو کسی اونچی جگہ باندھیے اور نچلے سرے کے ساتھ ایک بھاری جسم لٹکا کر اسے ہلا دیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ بھاری جسم بہت دیر تک اِدھر سے اُدھر تک حرکت کرتا رہیگا اور اگر یہی تجربہ خلا میں کیا جائے تو اور بھی زیادہ کامیاب ہو گا۔

گے لی لیو کا اصلی تجربہ جس کی بنا پر حرکت کا پہلا قانون وضع ہوا تھا اس قابل ہے کہ اسے غور کے ساتھ سمجھا جائے۔



دو لکڑی کے تختے اب اور ب ج لیجیے اور ان کے نچلے سروں

کو ملا کر ڈھلوان رکھ دیجیے اس طرح کہ خطِ مستقیم س ب ت سے ان کے اوپر کے سروں کا عمودی فاصلہ برابر ہو۔ گے لی لیو نے مشاہدہ کیا کہ اگر ایک جسم ایک تختہ کی چوٹی پر رکھ کر چھوڑ دیا جائے تو اُس میں اتنی حرکت پیدا ہو جاتی ہے کہ دوسرے تختہ کی چوٹی تک پہنچ جاتا ہے۔ اگر دونوں تختے کافی صاف ہوں اور رگڑ بہت کم ہو تو دوسرے تختہ کی لمبائی خواہ کتنی زیادہ ہو لُڑھکتا ہوا جسم اُسکی چوٹی تک پہنچ جائیگا بشرطیکہ اسکی عمودی بلندی پہلے تختہ کی عمودی بلندی کے برابر ہو۔ بہ الفاظ دیگر رفتار کی کمی اگر رگڑ نہ ہو تو صرف عمودی بلندی سے واقع ہوتی ہے لیکن انتہائی حالت میں اگر دوسرا تختہ بالکل افقی ہو اور اس میں رگڑ نہ ہو تو حرکت و رفتار میں کوئی کمی واقع نہ ہو گی متحرک جسم ابدالآباد تک ایک افقی خطِ مستقیم میں یکساں رفتار کے ساتھ حرکت کرتا رہے گا۔

حرکت کے پہلے قانون کا یہ نظری ثبوت اس قابل ہے کہ اسکے متعلق مفصل بحث کی جائے لیکن ہم طوالت کے خوف سے اسی اجمال پر اکتفا کرتے ہیں۔

فیروز الدین مراد

تحصیل سائنس کی اہمیت

انگلستان کے مشہور فلاسفر فرانسس بیکن نے ایک کتاب نیو اٹلانٹس (New Atlantis) کے عنوان سے لکھی تھی جسمیں کامل سوسائٹی اور قابل نمونہ انتظام ریاست سے بحث کی ہے۔ وہ ایک جگہ "سلیمان کے مکان" کی بابت کہتا ہے:-

اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ موجودات کی مخفی حرکات، انقلابات اور اسباب کا علم حاصل کریں، اور بنی آدم کی سلطنت کی حدود کو وسیع کریں تاکہ وہ سب چیزوں پر حاوی ہو جائے۔

اس سے بیکن نے علم سائنس کا منتہائے کمال ظاہر کر دیا ہے جس کی غایت نہ صرف کائنات کے اندرونی تغیرات و تبدلات کے اسباب و نتائج کا کھوج لگانا بلکہ انسانی علوم کو اتنا وسیع کرنا ہے کہ کوئی شے زمین و آسمان میں ان کے احاطے سے باہر نہ رہنے پائے۔

تجربی علم کی ضرورت

لوگ پوچھتے ہیں کہ سائنس کے کیا فائدے ہیں؟ کیوں اپنے لڑکوں کو طبیعیات کیمسٹری وغیرہ پڑھائی جائے؟ اس سے تو کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا ہم ایسے غیر مفید علموں کی تحصیل میں کیوں اپنا وقت، اپنی دماغی محنت، اور روپیہ صرف کریں؟ جو لوگ زندگی کو بنیا گری کے اصول پر بسر کرنا چاہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی بنیے بقالوں کی طرح ہر معاملہ میں نفع و نقصان کو مدنظر رکھتے ہیں اُنھیں جیالوجی، فلکیات، باٹنی، زوآلوجی، بیالوجی، کے مطالعہ کے استفادہ سے خبر نہیں لیکن سائنس کی کائنات اسی جگہ ختم نہیں ہوتی۔ وسیع ترین معنی میں اس کا اطلاق تمام اُن علوم و فنون پر ہوتا ہے جو انسان نے صدیوں کی دماغی محنتِ شاقہ اور ذہنی کاوش سے حاصل کیے ہیں اور نیز اس سے مراد ایسا علم بھی ہے جس کی صحت کی تجربہ سے تائید و تصدیق ہو سکتی ہے ایسا علم حاصل کرنا ہر ایسے انسان کے لیے لازمی ہے جو کشاکش زیست میں اپنے ہم جنسوں کے مقابلہ میں عہدہ برآ ہونا اور مہذب و متمدن اقوام کے افراد کے ساتھ مساویانہ رابطہ کرنے کا آرزومند ہے۔ تحصیل سائنس کے فوائد کا پوچھنا گویا علم کی ضرورت اور اہمیت پر شک کرنا ہے۔

سائنسی اختراعات کی خدمات

سائنس کے فوائد پر مطول بحث کرنا لاحاصل ہے۔ ہم اسکے بعض اکتشافات اور فتوحات کا مختصر ذکر کیے دیتے ہیں جس سے اس کی فیض رسانی آپ سے آپ

منکشف ہو جاتی ہے۔ یہ تار جو تھوڑی سی دیر میں ایک روپیہ کے صرفہ سے آپ کے عزیز کو آپ کا پیام بمبئی میں پہنچا دیتا ہے سائنس کی اختراع ہے۔ ریل گاڑی کا انجن جو ہزاروں من بوجھ ایک دن میں سیکڑوں میلوں پر لیجا کر ڈال دیتا ہے سائنس کے توسط سے وجود میں آیا تھا۔ دیا سلائی کی ڈبیا جس سے آپ کئی ہفتوں تک کام لیتے ہیں سائنس کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ اسی طرح آٹا پیسنے، کپڑے بُننے، سُوت کاتنے، کپڑے سینے کی کلیں، گاڑیاں، موٹر کار اور سیکڑوں آلات جو ہماری جسمانی راحتوں کے ضروری ستون ہیں سائنس ہی کے معجزے ہیں۔ یورپ کیوں تمام دنیا پر حکمران ہے؟ سائنس کے زور سے جاپان نے کیوں روس ایسی زبردست سلطنت کو جس سے بڑی بڑی سلطنتیں خائف رہتی تھیں تھوڑے ہی عرصہ میں تمام دنیا میں ذلیل و خوار کیا اور اب ترقی یافتہ اقوام کی اگلی قطار میں کھڑا ہے؟ سائنس کی بدولت۔ الغرض کہاں تک بیان کیا جائے۔ سائنس کے اکتشافات کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔

سائنس کا مقصد

سائنس کا اصل مقصود یہ ہے کہ اشیا کے انقلابات کا مشاہدہ کرے۔ اشیا اور ان کے تغیرات کے درمیان جو تعلق ہے اُسے دیکھے۔ اور نیز یہ دریافت کرے کہ اشیا یعنی اسباب و نتائج کا ایک دوسرے کے ساتھ کیا لگاؤ ہے اور جو شخص موجودات کے مشاہدہ اور اپنے مشاہدہ کے صحیح صحیح حالات قلم بند کرنے یا کائنات کے اندر کوئی بڑا قانون معلوم کرنے کی دُھن میں مستغرق رہتا ہے وہ سائنس کے فوائد کی داستان سننے کی چنداں پروا نہیں کرتا۔ کئی اعتبار سے سائنس صناعی کی طرح ایک ہنر بنجاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ صناع قلم اور برش سے مختلف رنگ ملا کر ایک صورت پیدا کر دیتا ہے مگر سائنس داں اپنے قلم سے اشیا کا ایسا چشم دید اور واضح بیان لکھتا ہے کہ پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے ایک لفظی تصویر کھنچ جاتی ہے۔ سائنس ایک ہنر یا پیشہ ہے جو انسان کی ذہنی راحت اور اخلاقی مسرت کا موجب ہوتا ہے۔ بیکن کہتا ہے:-

اور جتنی خوشیاں ہیں ان میں ایک یہ بات عجیب ہے کہ ان سے طبیعت بہت جلد سیر ہو جاتی ہے۔ جب طبیعت کو ایک دفعہ حظ حاصل ہو گیا تو وہ بعد ازاں بدمزہ اور پھیکی ہونے لگتی ہے۔ مگر علم کی خوشی کی یہ کیفیت ہے کہ طبیعت بھرتی ہی نہیں۔ جی اُکتاتا نہیں بلکہ جتنا حاصل کرو اور لطف اُٹھاؤ اتنا ہی اشتہا تیز ہوتی ہے۔ اس لیے تحصیل علم کی خوشی مستقل، اعلیٰ، اور پاک ہے۔

اس امر پر بحث کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ خوشی اور شادمانی اخلاقی، روحانی، ذہنی اور جسمانی زندگی کے لیے کتنی ضروری اور مفید ہے۔ سو غذاؤں کی ایک غذا خوشی اور شادمانی ہے۔ اگر آپ کا دل مغموم اور کبیدہ ہے تو آپ کوئی کام انجام نہیں دے سکتے اگر طبیعت پر ظلم کر کے کیا بھی تو وہ خوبی اور کمالیت کبھی نہیں پیدا ہو سکتی جو شاد اور خوش دل سے ممکن ہے۔ اس واسطے سائنس کے مطالعہ اور نئی نئی باتوں کی ٹوہ میں رہنے سے راحت قلبی اور لطف عقلی حاصل ہوتا ہے جو زندگی کے چھکڑے کے پہیوں کے لیے بمنزلہ تیل کے ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو شور و غل پیدا ہوتا اور رفتار دھیمی رہتی ہے۔

سائنس اور روزانہ زندگی

تحصیل سائنس کے لیے ضروری نہیں کہ آپ اپنا گھر بار چھوڑ کر کسی بڑی یونیورسٹی میں داخل ہوں اور وہاں اسکے مختلف شعبوں کا بڑے بڑے محققوں اور عالموں کے زیر نگرانی مطالعہ کریں۔ نہیں نہیں۔ آپ سائنس کے مسائل سے روزمرہ کے کاروبار میں دوچار ہوتے ہیں اور جس ڈھنگ سے مختلف ملکوں اور صدیوں میں روزانہ ضروریات زندگی کو بہم پہنچانے کی کوشش کی گئی اس سے سائنس کو ترقی نصیب ہوئی۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ اگر آپ سائنس کے مسائل کی تاریخ پر نگاہ ڈالیے گا تو یہ امر بخوبی ثابت ہو جائیگا۔ آپ علم نباتات کو لیجیے۔ باغوں کے پودوں، ان کے خواص و فوائد، کھیتوں کی جڑی بوٹیوں کی معمولی واقفیت سے اسکی ابتدا ہوئی۔ یہی حال طب کا ہے۔ جڑی بوٹیوں کے خواص اور فوائد کے علم کی وسعت سے اس علم کی بنیاد پڑی۔ جو علم الحیوٰۃ (بیالوجی) کی ایک شاخ ہے۔ پھر پودوں کو پھل پھول کی خاطر لگانے اور ان سے عمدہ اور بکثرت پھل

حاصل کرنے کی کوشش کیجاتی ہے۔ اس لیے خاص طریقہ وضع کیے جاتے ہیں جو سب کے سب علم نباتات کے تحت میں آتے ہیں۔ یہی کیفیت علم حیوانات (زوآلوجی) کی ہے جو خانگی جانوروں یعنی کتے، بلی، گائے، بھینس، گھوڑے، خچر، بھیڑ، بکری، مرغ، کبوتر، تیتر، بٹیر سے شروع ہوتا ہے۔ پھر اس کا تصرف علاقہ کے جانوروں پر ہوا۔ بعد ازاں ضلع پھر صوبہ پھر ملک اور اخیر میں تمام دنیا کے چرند و پرند اسی کے ماتحت نظر آتے ہیں۔ گویا سائنس ہمارے گھروں میں وجود قبول کرتا ہے اور ہماری خدمت گزاری کے لیے ہے جسے اگر وفادار خانہ زاد کے نام سے پکارا جائے تو غیر موزوں نہ ہوگا۔

روزمرہ ضروریات زندگی سے سائنس پیدا ہوا

پروفیسر ایسی نس کا یہ مقولہ ہے کہ "عمل خیال پر مقدم رہتا ہے" یعنی ہم عملاً سائنس کی بہت سی باتیں سیکھ لیتے ہیں۔ تجربے کرتے رہتے ہیں لیکن نظریہ یا مسئلہ بعد ازاں بنتا ہے جبکہ ہم اپنے علم کو معقول اصول اور طریقہ سے ظاہر کرتے ہیں۔ اب آپ اس سے اندازہ کر لیجیے کہ سائنس کا ہماری عملی زندگی سے کتنا اہم اور قریبی تعلق ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ روزمرہ کے مشاہدہ اور تجربہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ نامعقول اور سائنس کے متضاد نہیں جیسا کہ سائنس کی چند کتابیں پڑھ کر بعض لوگ اپنے کو منتہی تصور کرنے لگتے ہیں اور بعض مروجہ دستوروں اور رایوں کو دقیانوسی، فرسودہ، ناموافق زمانہ، ٹھہرانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اصل یہ ہے کہ تمام علوم، سائیکالوجی اور سوشیالوجی کے ماسوا، قوم کے روزانہ کاروبار اور تجربہ سے وجود قبول کرتے ہیں۔ ریاضیات مجرد علم سے سمجھا جاتا ہے لیکن اسکی تاریخ بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ تجربہ اور روزانہ کاروبار کے درمیان اسکی ولادت ہوئی تھی۔ پروفیسر ٹی۔کیس صاحب لکھتے ہیں:۔

حساب کی ابتدا ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کی گنتی سے ہوئی تھی اور مساحت نے ہاتھ پاؤں اور بازوؤں کی لمبائی چوڑائی سے وجود حاصل کیا تھا۔ مدت تک ہاتھ اور بازو کی لمبائی اجسام کے طول و عرض کی پیمائش کا پیمانہ تسلیم ہوتی رہی۔ مساحت کی معنی زمین کا پیمانہ ہے۔ مصریوں کی سب سے پہلی اور پرانی کتاب اس فن پر ۱۷۰۰ ق م میں تصنیف ہوئی تھی جس میں سطح ستون، مخروطی مینار، کھلیان، اور دیگر چیزوں کی پیمائش کا ذکر ملتا ہے۔ الغرض ریاضیات کا آغاز محسوسات سے ہوا اور رفتہ رفتہ مجردات کی بحث میں غائب ہو گیا۔

سائنس کا دھرم پتا

یہ امر قابل غور ہے کہ سائنس نے ہمارے معمولی پیشوں اور ہنروں کے جھگڑے میں جنم لیا تھا مگر یہ ایک اہم اخلاقی پہلو بھی لیے ہوئے ہے۔ مسٹر برلن فرڈ لکھتے ہیں:۔

ہم اپنے بزرگوں کی یاد کو فراموش نہیں کر سکتے۔ جیسے محقق طبیعیات لوہار ہے اسی طرح ماہر نباتات کسان۔ اور عالم حیوانات شکاری۔ جغرافیہ داں ملاح، مورخ بافروش ڈاکٹر جادوگر، اور قانون داں ملا ہے۔ رہا ریاضی داں، اس کا علم بہت سے پیشوں اور ہنروں سے ماخوذ ہوا ہے اور سب سے پرانا ہے۔ اگر وہ اپنے علم کی ابتدا اور اسکی عہد بہ عہد ترقیوں پر غور کرے تو وہ اپنے کو تمام زمانوں اور قرنوں کے پیشہ وروں کا وارث پائیگا۔ پھر اسے ہمارے تمام دھندوں سے بہت ہمدردی پیدا ہو جائیگی اس اہم امر کو کبھی مت بھولو کہ تمام علم اور علمی مسائل اور علوم کے شعبے ابتداءً اس تجربہ سے وجود پذیر ہوئے جو انسان نے مختلف ہنروں سے حاصل کیا تھا۔ یہ مت سمجھو کہ سائنس کوئی جانور ہے جو آسمان میں اڑتا پھرتا ہے۔ اور اسے ہمارے دنیا کے روزانہ دھندوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے اور کسی نامعلوم طریقہ سے ترقی کرتا رہتا ہے... سائنس شروع شروع میں اُن کوششوں اور خواہشوں سے پیدا ہوا تھا اور پیدا ہو رہا ہے جو اسکے ہول میں موجودات کے انقلابات اور باہمی راہ و رسم کی تہ میں ابتدائی اصول دریافت کر کے اپنے پیشوں میں کمال حاصل کرنے کے متعلق پیدا ہوئی تھی۔

مختلف علوم کی گوناگوں خدمات

سائنس کے فوائد اور اس سے انسان جو خدمات حاصل کر رہا ہے انکا ذکر قدرے وضاحت سے کرنا چاہیے۔ ۱۹۱۲ء کے شروع میں مسٹر ہنکس نے ایک کتاب فلکیات پر لکھی تھی اور ایک جگہ اُسکے علمی فوائد کا ذکر کیا ہے جسے ہم نقل کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:۔

جہازرانی فلکیات ہی کے وسیلہ سے ہوتی ہے۔ زمین کی پیمائش کرنے اور نقشے مرتب کرنے والے اسی علم کی بدولت روٹی کھاتے ہیں۔ وہ دنیا کو صحیح وقت بتاتے ہیں۔ سمندر میں جو جہاز چلتے ہیں فلکی انھیں پیام بے تار کے وسیلہ سے دن اور وقت بتاتے رہتے ہیں۔ کیمسٹری کے معرض وجود میں آنے سے پہلے یوزہ کشی، صابون سازی اور رنگسازی کا رواج تھا لیکن علم کیمیا کی بدولت کتنی دست کاریاں اور فن پھیل رہے ہیں ان کا بیان کرنا ہی دشوار ہے۔ خام سونے چاندی اور دیگر دھاتوں کو اسی علم کے وسیلے سے صاف اور خالص کیا جاتا ہے۔ کول تار سے بنزوئن بنتی ہے اور اس سے اسکے اور بہت سے مرکبات طیار ہوتے ہیں۔ مصنوعی رنگ جیسے نیل کیمیا ہی کے وسیلہ سے تیار ہوتا ہے۔ فولاد کو بہتر بنایا جاتا ہے۔ برقی قوت کے وسیلہ سے جو چیزیں تیار ہوتی ہیں وہ کیسی اعلی ہوتی ہیں۔ زمین کو زرخیز بنانے کے لیے نائٹروجن سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ سب کیمسٹری کے کرشمے ہیں۔ طبعیات کی بدولت تار، ٹیلیفون، بے تار برقی، برقی انجن، اور اڑنے کی کلیں تیار ہو گئی ہیں۔ جمادات اور علوم ارضیہ کی بدولت لوہا، سیسہ، تانبا، اور دیگر فلزات، کوئلہ وغیرہ صدہا چیزیں انسان کے فائدہ کے لیے دستیاب ہو رہی ہیں۔ دبے خزانے شکم زمین سے برآمد ہو گئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ سمندر سے مچھلیاں نکل رہی ہیں اور علم حوادث ارض و سما سے جانیں بچ جاتی ہیں اور فصلوں کی بابت پہلے ہی سے کچھ علم ہو جاتا ہے کہ کیسا موسم ہوگا اور اس سے کس قسم کی فصلیں ہونے کی امید ہے۔ اس علم سے موسموں کے تغیر و تبدل اور اسکے وسیلہ سے زرعی پیداواروں کی آیندہ کیفیت معلوم ہو جاتی ہے۔ بیکٹریا (Bacterica) جراثیم کے اکتشافات سے فن جراحی، حفظان صحت اور زراعت پر نہایت عمدہ اثر پڑا ہے اور اس سے اشیاے خوردنی بھی دیر تک محفوظ رہ سکتی ہیں۔ فزیالوجی کے اکتشافات سے افعال اعضا کے عیب معلوم ہو گئے ہیں۔ منڈل کے معلوم کردہ قانون توارث (Law of Heredity) سے ہم گھریلو جانوروں کی نسل عمدہ بنا سکتے ہیں اور اس سے کام لیکر پودوں کی قدرتی حالت کو بدل سکتے ہیں۔

انیسویں صدی کے تیرہ اختراعات

ڈاکٹر والس نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں انیسویں صدی کی اختراعات کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں گذشتہ صدی میں تیرہ اختراعات سے روزانہ کاروبار میں کام لیا گیا اور انکی بدولت ہمارے طرز معاشرت میں مستقل انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں۔ ریلوے، اسٹیم انجن کے وسیلہ سے جہازرانی، تار برقی، ٹیلیفون، دیا سلائی، گیس کی روشنی، برقی روشنی، فوٹوگرافی، فونوگراف، ایکسرے، اسپکٹروسکوپ کے ذریعہ سے تاروں کے اجزاے ترکیبی معلوم کرنے کا طریقہ، مخدرات (Anaesthetics) کا استعمال اور آپریشن کے بعد زخم کو ایسے طریقہ سے باندھنے کا ڈھنگ جس سے مضر جراثیم اسے خراب نہ کر سکیں۔ اس سے پیشتر کی صدیوں کی نہایت مفید اختراعات دوربین، چھاپہ، قطب نماے بحری، اعداد، اور رسم الخط ہیں۔ اور انکے ساتھ مقیاس الہوا اور اسٹیم انجن بھی شامل ہو سکتا ہے۔ علم تراشہاے مخروطی اور علم ہندسہ سے جہازوں، قلعوں، عمارتوں وغیرہ کے بنانے میں ہمیں کس قدر فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ بیسویں کلیں اقلیدس کے قاعدوں سے بنتی اور چلتی ہیں جس سے ہمارے سیکڑوں کام انجام پذیر ہوتے ہیں اور ہمیں بیحد نفع پہنچ رہا ہے۔ فرانس کے مشہور محقق پاسٹر (Pasteur) کی تحقیقات سے بنی آدم کو کتنا عظیم نفع پہنچ رہا ہے۔ اسکے مسئلہ جراثیم کے اکتشافات سے کیمیائی حرفتوں میں انقلاب پیدا ہو گیا۔ اب سگ گزیدگی کا خاطرخواہ علاج ہوتا ہے۔ مرغوں مرغیوں اور مویشیوں کی وبا کا انسداد ہو سکتا ہے۔ اسکی دریافت سے جوزف لسٹر نے جراحی میں کام لیا اور اس امر کا خاطرخواہ انتظام کر لیا کہ آپریشن کے بعد زخم سڑنے نہ پائے۔ الغرض کہاں تک بیان کیا جائے کہ سائنس انسان کی خدمت کس طرح کر رہا ہے۔ ہربرٹ اسپنسر نے اسکا فیصلہ کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے "سائنس زندگی کے لیے ہے اور زندگی سائنس کے واسطے"۔ پروفیسر آرتھر جے ٹامسن کہتے ہیں:۔

بیشک سائنس زندگی کی راحت و آرام کے لیے ہے۔ مگر "زندگی" کی نسبت کوئی تنگ خیال نہ ہونا چاہیے۔ کیا زندگی کھانے پینے سے زیادہ نہیں ہے اور کیا لباس جسم سے بڑھا ہوا نہیں ہے؟ آج کل کی مہذب قوموں کے نوجوانوں کی زندگی کا کچھ

حصہ سائنس کی تحقیقات کے لیے بھی ہونا چاہیے ورنہ وہ تہذیب کے تمام لوازم سے بہرہ یاب نہیں ہوں گے ۔ ہماری رائے یہ ہو کہ سائنس ہی صنف آدمی کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچاتا ہو بشرطیکہ اُسے کام کرنے کا موقع دیا جائے۔

سائنسی مطالعۂ فطرت کا اثر اخلاق ذہن اور روح پر

سائنس ہماری تمدنی راحت و آرام میں اضافۂ کثیر کرنے کے علاوہ ہمارے ذہن کی تربیت کرتا ہی۔ ہمیں صحیح صحیح مشاہدہ کرنے کی تلقین دیتا ہی۔ ہمارا دماغ سوچنے اور غور کرنے کے قابل بنتا ہی۔ ہماری قوّتِ ممیزہ شستہ اور قوتِ استدلال صائب اور قوی بنتی ہی۔ سائنس سے موجودات اور اپنے اردگرد کی اشیا کا بغور ملاحظہ ضروری ہی۔ اس سے ہم ان کے درمیان مشابہت یا اختلاف، اتحاد نوعی یا تفرقِ جنسی دیکھتے ہیں جس سے رفتہ رفتہ ذہن بال کی کھال اُتارنے کے قابل ہوجاتا ہی۔ ہمارے خیالات اور آرا پختگی، اصابت، اور معقولیت حاصل کرتے ہیں۔ اس سے ہمارا علم حقیقی اور صحیح علم بنتا ہی۔ کتابی علم مردہ ہوتا ہی۔ سائنس ہمارے اخلاق کو بھی سدھارتا ہی۔ ہم کائنات کی خوبصورتی کی قدر کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ ہم مناظرِ طبعی سے حظ حاصل کرتے ہیں۔ زمین و آسمان کی اشیا ہمارے مشاہدے کے لیے ہیں اور ہم ان سے لطف اٹھانے کے مجاز ہیں اور سب کے اخیر میں سائنس حاسۂ مذہب اور ایمان قادرِ علی الاطلاق کو قوی اور اعلیٰ بناتا ہی۔ ہم کائنات کے اندر ہزاروں عجائبات دیکھتے ہیں اور جب اُن کی بناوٹ اور ماہیت پر نگاہ دوڑاتے ہیں تو صانع حقیقی کی صنعت کاریوں اور اُسکی حکمت و دانش کی بیحد تعریف کرتے ہیں بلکہ عقل حیران ہوجاتی ہی اور اُسکی قدرتِ لایزال اور ہستیِ لازوال کی یقینیا رد اد دیتے ہیں۔ ہم اپنی طبعی کمزوری اور خامی سے واقف ہوکر اُس ہستی کی طرف رجوع ہوتے ہیں جو دانائی اور حکمت کی مصدر، زمین اور آسمان کی خالق و مالک ہی۔

تاروں بھری رات میں ذرا مکان کی چھت پر چڑھ کر کہکشاں اور دیگر تاروں کو دیکھو۔ اُنکی ماہیت پر غور کرو۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد سوچتے سوچتے عقل آپ سے آپ ان روشن بلوروں اور نامعلوم عالموں کے بنانیوالے کی طرف مائل ہوگی اور اپنی لاچاری اور مجبوری سے ہوکر خداوند قادر مطلق کے سامنے جھک جائیگی اور اُسکی ثناخوانی میں محو ہوجائے گی۔ اس وجہ سے مطالعہ سائنس روحانیت پیدا کرتا ہی حاسۂ مذہب کو بیدار کرکے اُسے استحکام بخشتا ہی۔ کیونکہ اس سے خدا کی حکمتوں اور صنعتوں کے راز ہمپر آشکارا ہوتے ہیں۔ اور اس کے ذریعہ سے ہمارا ایمان زور پکڑتا اور کفر و الحاد دُم دباکر چلدیتا ہی۔ سائنس کے فوائد پر کتاب لکھی جاسکتی ہی مگر ہمارے مطلب کے لیے یہی کافی ہے۔ اس سے پڑھنے والوں کے دلوں میں اس کے استفادے کا علم پیدا ہوگا اور وہ بطور خود سوچنے کے قابل ہوسکتے ہیں۔

جے - آر - رائے

حیات بعد الممات

(۱)

زندگی کیا ہے؟ عناصر کا ظہورِ ترتیب — موت کیا ہے؟ انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

کائناتِ عالم کے نظامِ تمدن میں خلاق عالم نے کچھ ایسی گوناگونی و دل فریبی پیدا کر دی ہے کہ عقل انسانی باوجودیکہ عقل کل کی ایک ذاتی جز ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اس کی عقدہ کشائی سے بالکل عاجز و حیران ہے۔ بظاہر تو قدرت کی کرشمہ سازیاں انسانی قلوب کو اپنا گرویدہ بنا ہی لیا کرتی ہیں لیکن نہایت جانفرسا و پریشاں کن خیالات ہیں جو دماغ میں ایک حواس مختل کی طرح ہمیشہ چکر لگایا کرتے ہیں اور جن کا ماخذ یہ ہے "حیات بعد الممات" یعنی ہستی انسانی کے فنا کے بعد صورت تکوین و وجود کیا رہتی ہے۔ یہ نہایت ہی اہم و جامع مسئلہ ہے۔ یہی وہ خیالات ہیں جو زمانہ کے مختلف دورین قومی رفارمروں نے ترقی و وسعت دے دے کر لوگوں کو سکھائے اور ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ لیکن ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک لاینحل مسئلہ ہے۔ بہرحال جہاں تک لوگوں نے اسکی تحقیقات کی ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا تعلق انسانی ہستی سے بالکل روحانی ہے، اور بقاء ہستی کا تعلق ایک دوسرے عالم سے ہے جسے ہم عالم ارواح کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ عالم ارواح خود ایک مسئلۂ متنازعہ ہے۔ کچھ لوگ اسکے وجود کے قائل ہیں اور کچھ اسکی ہستی کے منکر۔ علمائے ہنود آواگون (تناسخ روح) کے پیرو ہیں اور انکا عقیدہ ہے کہ روح (ہستی) ہمیشہ نقل قالب کرتی ہے اور اُسکی اچھی یا خراب حالت اُسکے پچھلے افعال کی جزا یا سزا ہے۔ اسکا فنا، نقل قالب کرتے کرتے بالکل پاک ہو کر ہستیِ حقیقی میں مل جانا ہے جس کو وہ نروان یا آتما کا پرماتما میں وصل ہو جانا یا دوسرے الفاظ میں "واصل بحق ہو جانا" کہتے ہیں۔ اسلامی فلسفہ اسکے بارے میں کچھ اور کہتا ہے۔ فی نفسہٖ دونوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے لیکن عقائد میں کچھ ممتاز تفریق نظر آتی ہے۔ وہ سزا و جزا کے تو ضرور قائل ہیں لیکن ایک دوسرے طریق سے۔ وہ کیا؟ روح انسانی کا مرکز اصلی ذات حقیقی ہے۔ پتلۂ خاکی کے فنا ہو جانے کے بعد روح (جو غیر فانی ہے اور جسکے ہر دو فرقے قائل ہیں) کچھ مدت مقررہ کے لیے ایک دوسرے عالم میں رکھی جاتی ہے جسے عالم ارواح کہتے ہیں۔ کسی ایک خاص روز میں کائنات عالم فنا ہو جائے گی اور اُس روز ہر ہستی کی روح کو اپنے اپنے افعال کی سزا یا جزا ملیگی۔ سزا یہ ہوگی کہ دوزخ میں روحیں ڈالی جائینگی اور جزا یہ ہوگی کہ بہشت میں۔ ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان دونوں عقائد میں کس درجہ کی روحانیت پائی جاتی ہے اور قریب قریب جتنے فرقے ہیں وہ سب اپنے اصول کو روحانیت کی عمیق تہ میں رکھتے ہیں۔ نئی روشنی کے سائنٹفک لوگ اس مسئلہ ہی سے کچھ بیزار ہیں کہ وہ اس پر خامہ فرسائی نہیں کرتے۔ بہرحال ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ واقعی قابل اطمینان حل زندگی کن کن اصولوں پر مبنی ہے۔ ہر چیز کے ثبوت کا انحصار اسکے علمی یا ذہنی تجربات پر ہے۔ ہر شخص جو کچھ بذات خود دریافت یا معلوم کرتا ہے وہ دوسروں پر ظاہر کرتا ہے اور اُسکی تعلیم دیتا ہے۔ اُسکے خیالات کا صائب ہونا اُسکے مذاق سلیم پر منحصر ہے۔ اب تک انسان نے جو کچھ ایجادیں کیں یا اصولات قائم کیے اُسے بذات خود ایک دفعہ تجربہ کر لیا ہے یا مشاہدات کی رُو سے ایک حقیقی اصول قائم کر لیا ہے۔ اس امر کو جانے دیجیے کہ اُسکے تجربات کو لوگوں نے صحیح مانا یا نہیں یا اُسکے خیالات کا ایک صحیح معیار قائم کر سکے یا اُسکو غلط ٹھیرایا لیکن شخص مذکور نے خود تو

اُسکو جان لیا ہی۔ اسی طرح مسئلہ فنا و بقا کو ہر شخص تسلیم تو ضرور کر لیا۔ تسلیم کرنے سے یہ مراد نہیں کہ جو کچھ اصول ٹھیرا دیے اُسکو مان لیا بلکہ یہ کہ ہر شخص ایک دفعہ پیدا ہوتا ہی اور پھر مرجاتا ہی اور اسکو بڑی سخت ایک نہ ایک دفعہ ہمیشہ جھیلتا ہی۔ لیکن کوئی شخص آج تک ایسا نہ پیدا ہوا (فرضی و مذہبی قصص سے قطع نظر کرکے) جو یہ بتا سکے کہ وہ کس حالت سے مرا؟ مرنے کے بعد کیا کیا مراحل پیش آئے؟ کیا اُسکو اپنی پچھلی ہستی یاد تھی؟ کیا اُسکو معلوم تھا کہ مرنے کے بعد پھر اُسکی کیا حالت ہوگی؟ کیا نقل قالب کرتے وقت اُسے نقل کی کیفیت محسوس ہوئی تھی؟ اُس دوسرے عالم کی کیا کیفیت تھی وغیرہ وغیرہ۔ میرا تو خیال ہی کہ کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جو اِن سوالات کا اطمینان بخش جواب دینے میں سچا اُتر سکے۔ کوئی شخص عالمِ ارواح سے انھیں جو اس انھیں خیالات کے ساتھ واپس نہیں آسکا کہ اُس سے وہاں کی کچھ کیفیت معلوم ہوسکتی۔ اب اگر کوئی شخص کہہ سکتا ہو کہ یہ سب باتیں کشف و ضمیر سے معلوم ہوئیں تو یہ مسئلہ ذرا توضیح طلب ہی۔ یہ بات غالبًا ہر شخص مان لیگا کہ ہر فرد انسانی میں ایک نہایت اہم و زبردست قوّت ہوتی ہی جسے ہم قوّتِ اِرادی کہتے ہیں۔ قوّت ارادی ہی گویا اس مرکبِ عنصری کی روح رواں ہی۔ یہی قوت ہر فرد میں یکساں صورت میں پیدا کی گئی ہے اور اسکے خواص و واقعیت ہر حالت ہر زمانہ ہر قوم میں بالکل ایک طرح کی ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص کہے کہ "نہیں قوّتِ ارادی بالکل یکساں نہیں پیدا کی گئی ہے" تو اُسکا دعوی بالکل پوچ ہے۔ کیونکہ تیلۂ خاکی کا صانع حقیقی ایک ہی ہے اور مادۂ تکوین وجودِ حیاتِ انسانی ایک ہی مادۂ کثیف یا لطیف سے مرکب ہی۔ حیات و ممات بالکل عناصر اربعہ کی ترتیب و پریشانی پر منحصر ہے۔ بہرحال انسان بصورت ساخت و وجود ہمیشہ یکساں ہی۔ تفریق مشرب و مذہب تفریق ساخت و ہستی سے بالکل جداگانہ ہی۔ یہاں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ ہر انسان کی قوتِ ارادی ایک ہی۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ کسی میں کم کسی میں زیادہ یہ انسان کے مختلف قوائے ذہنی کے سریع الحس یا بطی الحس یا مضبوط یا کمزور ہونے کی وجہ ہی۔ کشف و ضمیر کیا ہیں؟ اپنے قوائے ذہنی و قوتِ ارادی میں ایک ایسی حرکت غیر متناہی پیدا کرنا کہ جب اُس میں ذرا سی ہل چل ڈال دیجیے ذاتِ خود میں وہ روشنی کا تلاطم پیدا ہو کہ انسان (مراد ہستی انسان) اپنی موجودہ حالت کو بالکل بھول جائے اور عالمِ استغراق میں ہوکر اپنی ہستی کو چشمِ باطن ہی سے ملاحظہ کرے۔ بہرحال یہ تو صوفیاے کرام کا کشف تھا۔ علماے فلسفۂ جدیدہ یہ کہیں گے کہ کشف وہ ہی کہ انسان اپنی قوّتِ ارادی کو اس درجہ تکمیل کو پہونچائے کہ وہ کسی دوسرے شخص کے قواے ذہنی کو اپنی قوّۃ ارادی کے ذریعہ سے متأثر کر سکے۔

اب اگر عالمِ ارواح کا پتہ کسی نے لگا لیا ہوگا تو محض اپنی قوّتِ ارادی ہی سے۔ لیکن جہاں تک ہم دیکھتے ہیں یہ معلوم ہوتا ہی کہ جتنے مہاتماو رشیوں پیغمبروں اور درویشوں نے اس عالم راز کا پتہ لگایا سبھوں نے اُسے مختلف حالتوں میں پایا اور ہر ایک نے مختلف اُصول قائم کیے۔ ہنود کے علمانے اِس عالم کو دوسری حالت میں پایا۔ اسلامی فلسفہ اسکی بابت کچھ اور کہتا ہی۔ داتا بُدھ کے اقوال اور ہیں۔ مسیحی پیشواؤں نے ایک دوسرا پہلو اختیار کر لیا۔ غرض مختلف مذاہب میں مختلف صورت میں عالمِ ارواح کی تعلیم دی گئی ہی۔ قطع نظر مذہبی اختلاف کے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آخر اس بیّن تفریق کی وجہ کیا ہی؟ سب سے بڑی وجہ اس باہمی اختلاف کی یہ ہی کہ پیشواؤں نے اصول تو سادے و آسان مقرر کیے لیکن امتداد زمانہ سے اُس میں فرعات ایسی پیدا کر دی گئیں کہ اب وہی سہل الاصول قواعد کچھ ایسے پیچیدہ ہوگئے کہ ایک ناقابل اطمینان صورت میں پائے جاتے ہیں۔ یہ آفت ہر مذہب میں پائی جاتی ہی۔ یہ کوئی نئی بات بھی نہیں ہی۔ روحانیت کا مسئلہ ہی ایسا ہی۔ عوام تو

سمجھ ہی نہیں سکتے۔ رہے تعلیم یافتہ لوگ ان میں بھی ایک معقول تعداد محض تقلید ہی تقلید کرتی ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو شاید سمجھے ہوئے ہیں لیکن ان کا سمجھنا ہی کیا وہ بالکل صم بکم رہتے ہیں۔ بہر حال یہ بات نہیں ہے کہ اس عالمِ اجسام کے سوا اور کوئی عالم ہی نہیں ہے۔ لیکن ہاں یہ ضرور ہے کہ ابھی اُس کی کافی چھان بین نہیں ہو سکی ہے اور لوگ اس کے آخری زینہ تک نہیں پہنچے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ متقدمین نے اسکی تلاش میں بڑی سرگرانی کی ہے اور روحانیت اور عالمِ ارواح پر بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی ہیں لیکن افسوس ہے کہ اب تک قابلِ اطمینان صورت نہیں پیدا ہو سکی۔ اس کے فرقے بھی بالکل جدا ہو گئے لیکن وہ بھی منزل مقصود تک نہیں پہنچے۔ مختلف مذاہب ہوئے لیکن وہ بھی آخر میں ناکامیاب رہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ سب باتیں لاطائل و فضول ہوئیں لیکن ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ قابلِ اطمینان رستہ ابھی تک اُن لوگوں کو نہیں ملا ہے۔ اگر لوگوں نے اس کا پتہ لگا لیا تو پھر اُنکی تعلیم میں یہ اختلاف کیوں ہے؟ ہر ایک پیشوا کو ایک ہی تعلیم دینی چاہیے تھی۔ کیونکہ سب لوگوں نے ایک ہی قوتِ ارادی سے عالمِ ارواح کا پتہ لگایا تھا۔ روحانیت کا سوال اب تک حل نہیں ہوا اور "حیات بعد الممات" ایک ایسے گہرے راز سے تعلق رکھتا ہے کہ انسان کو فنا ہونے کے بعد ہی معلوم ہو سکتا ہے اور جب وہ فنا ہو گیا تو اُسکے معلومات بھی فنا ہیں اور یہ مسئلہ جوں کا توں ہی رہ گیا۔

مادۂ تکوین و وجود ہستی میں اگر فلسفۂ جدیدہ کا لحاظ رکھا جائے تو اثبات باری میں ایک نہایت اہم رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ جن اشیاء موجودہ میں مذاہب مختلفہ نے ایک نادیدہ دست تصرف کو صانعِ حقیقی گردانا ہے اُن کی ساخت و صنعت میں علمائے متاخرین نے ایک ترکیبی ساخت مادی کا اصول قائم کیا ہے۔ اِن دو مخالف تعلیموں کا ہمارے مضمون سے ایک گہرا تعلق ہے۔ جن متقدمین نے اصولِ روحانیت کو صورتِ ہستی کا ایک حقیقی معیار گردانا ہے اُنکی تعلیم کا دائرہ دُنیا (مراد نظامِ عالم کی صورتِ موجودہ) ہی تک جا کر ختم نہیں ہوتا بلکہ وہ صورتِ حال و صورتِ ماضی کا انتہا ایک نہایت جامع و اہم مستقبل رکھتے ہیں اور منزلِ ہستی کو عالمِ بقا کے زائرین نہیں بلکہ مہاجرین کی جادہ پیمائی کا ایک دور وسطی سمجھتے ہیں۔ مسئلہ روحانیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ انسان کا لبدِ خاکی کو چھوڑنے کے بعد ایک اور ہی عالم میں ہوتا ہے۔ لیکن صورت ہستی بقائے دوام کی منزل پر پہنچنے کے بعد ایسی نہیں رہتی کہ اُس پر اصول ہستی کو مدنظر رکھ کر ہم وجودِ حقیقی کا اطلاق کر سکیں۔ وجودِ حقیقی سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ شے (روح۔ آتما۔ ہستی وغیرہ) بصورت کسی خاص نوعِ معلومہ کے ہو بلکہ وہ ایسی صورت میں ہوتی ہے جس پر محض ایک ہستی کا اقدام ہو سکتا ہے۔ قدم ہستی کے وجود کا معیار دنیا کے لوگ نہیں کر سکتے۔ اب یہاں سے یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ انسان کشف و ضمیر سے اُس وجودِ حقیقی کا اندازہ کیسے کر سکتا ہے؟ عالمِ دوام و بقا کے وجود ہستی کا معیار اُس حواس سے کیونکر معلوم ہو سکتا ہے جبکہ عالمِ ارواح کے وجود کا نظام صورتِ موجودہ سے بالکل جداگانہ ہے۔ دنیاوی بعض اپنی اُس صورت کو کیونکر معلوم کر سکتی ہیں جو اپنے قالب کو دنیا کے پورے نظام تمدن میں تنہا چھوڑ کر پرواز کر گئی ہیں۔ ہر شے کی صورت ماسبق صورتِ موجودہ سے اِن حالتوں میں اختلاف کرنے لگتی یا اِن وجوہ سے چیزیں بطور خود اختلاف کرنے لگتی ہیں (۱) شے مذکور کا نظامِ اسباب (۲) مختلف حواس خمسہ سے معیار قائم کرنا (۳) عالمِ مختلفہ کے مختلف نظام قدرت۔ اِن اصولوں کو مدنظر رکھ کر ہم موجود مذہبی تعلیم کی کسوٹی پر کہاں تک سچے اُتر سکتے ہیں۔ صرف مسئلہ روحانیت کو لے لیجیے کیونکہ ہمیں کسی اور شے سے یہاں مطلب نہیں ہے۔ عالمِ دنیا و عالمِ بقا کے ہستی دوام میں کتنی متاثر تفریقیں نظر آتی ہیں

اس بات میں تو غالباً کسی فرد کو عذر نہ ہوگا کہ صرف روح ہی ایک ایسی شے ہے جو اِن دونوں عالم میں ایک بین تفریق ڈالے ہوئے ہے۔ لیکن روح بذاتِ خود ایک مسئلہ معرکۃ الآرا ہے۔ بہرحال خواہ جو کچھ ہو میرا مطلب اُس شے موجودہ سے ہے جو قالب انسان کو چھوڑ کر علیحدہ ہو جاتی ہے اور جسکے نکل جانے پر انسان کو مردہ کہا جاتا ہے۔ اب صورتِ حال و صورتِ مستقبل سے اسکا مقابلہ کیجئے ہم اُنہیں اصولات کو مدنظر رکھ کر اسکا معیار قائم کرینگے جنھیں ہم اوپر درج کر آئے ہیں۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے اسکا اندازہ ہر سہ اصولات سے ہو سکتا ہے۔

(۱) شی مذکور کا نظام اسباب۔ نظام اسباب ملاحظہ فرمایئے۔ انسان کے وجود کی بنا اُسکے قالب میں یا نظام جسم میں ایک حرکت غیر اِسترازی پیدا ہونا۔ مختلف عادات۔ حرکات۔ سکنات وغیرہ سے اُسکا تربیت پانا۔ اخلاقی و معاشرتی زندگی بسر کرنے سے روح پر نیک اثر ہونا اور بُرے خیالات و افعال قبیحہ سے اُسکو متاثر کرنا اِن صورتوں سے انسان کے اعضائے رئیسہ متاثر ہو کر روح پر اپنا ایک گہرا تصرف اور اُسکی شکل نوعیہ میں تفریق ڈالتے رہتے ہیں۔ ہر سہ دفعات بذات خود ایک نہایت بسیط مضمون سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۲) مختلف حواس خمسہ کا معیار قائم کرنا۔ جن حواسات سے لوگ معیارِ ہستی قائم کرتے ہیں چونکہ وہ بذاتِ خود اختلاف رکھتے ہیں اس لیے ثبوت میں بھی اختلاف ہونا ضروریات سے ہے۔ جس شخص نے کسی چیز کی ماہیت محض آواز سن کر دریافت کی ہے اُس کے خیالات گو بذاتِ خود درست ہوں لیکن اُس شخص کے خیالات سے مطابقت نہیں کر سکتے جس نے اُس کو چھو کر دریافت کیا ہے۔ اثباتِ وجودِ ہستی کا جس شخص نے محض قیاسی اصول قائم کیا ہے جبکہ فلسفیوں اور منطقیوں نے دعوے کیا ہے' اُنکا دعوے از سر تا پا اختلاف کرے گا اُن لوگوں سے جنھوں نے اس کا عملی اصول قائم کیا ہے جیسا کہ صوفیوں اور درویشوں کا اصول ہے۔

اب رہا تیسرا اصول "عالم مختلفہ کے مختلف نظام قدرت"۔ ہر شے دو مختلف عالم میں ہونے سے اختلاف کرنے لگتی ہے۔ اگر کوئی شخص عالم محویت میں ہو تو اُسے وہ چیزیں جو اُس نے عالم بیداری میں دیکھی ہیں مختلف نظر آئیں گی۔ کیونکہ ایک تو اُسکے دماغ کی کیفیت حال دگرگوں ہے اور دوسرے ہر دو نظام اسباب ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ اسکے خلاف کرنے کا یہ باعث نہیں ہے کہ اُس شخص نے اُن چیزوں کو ہر حالت میں مختلف پایا بلکہ وجہ یہ ہے کہ ہر عالم میں نظام قدرت ہی جداگانہ ہوتا ہے۔

آمدم بر سر مطلب۔ ان حواساتِ ظاہری سے عالم ارواح کا پتہ ہم کیسے لگا سکتے ہیں جبکہ اسباب دریافت ہر حالت میں اختلاف رکھتے ہیں دنیا کے نظام اسباب اور ہی ہیں۔ حواسات بالکل جداگانہ ہیں۔ عالم ارواح ان تمام باتوں سے بالکل مبرّا و منزّہ ہے۔ رہا کشف و ضمیر کشف و ضمیر سے انسان کسی دوسرے عالم کا پتہ نہیں لگاتا بلکہ وہ ذاتِ خود میں اس درجہ منہمک ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی ذاتِ ہستی کو بالکل بھول جاتا ہے۔ اس لیے اگر اُس نے کسی بات کا پتہ لگایا تو بس یہی لگایا کہ ذاتِ خود سے ذاتِ موجودہ کو کیا تعلق ہے؟۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ انسان اپنے جذبات میں بالکل جذب ہو جاتا ہے (لفظ انسان یہاں پر بحث طلب ہے۔ انشاءاللہ آئندہ کسی نمبر میں ہم لفظ "انسان" کے مادہ و معنی پر کافی روشنی ڈالینگے) گویا وہ اُس وقت ایک دوسرے عالم میں ہوتا ہے لیکن وہ عالم ارواح میں نہیں ہوتا۔

عالم ارواح کی ایک یہ بھی صفت ہے کہ وہ روح کے پرواز ہو جانے کے بعد روح کا مسکن ہو جاتے ہیں اور جب تک روح کو جسم سے تعلق ہے اُس کا وہاں تک گزر ہونا نا ممکن ہے۔

رشید احمد (صدیقی)

میر مہدی مجروح

خاکِ پاکِ دِلّی میں وَلی کے بعد سودا اور میر نے جو محفل برپا کی تھی اور جس کی صدارت کی عزت بمراتب سید انشا، شاہ نصیر، ذوق، اور غالب کے حصہ میں آئی تھی میر مہدی حسین مجروح اُسی کی آخری شمع تھے محفل کو اُجڑے اور اہلِ محفل کو اس جہان سے گزرے زمانہ گزرا۔ لیکن اس شمع کی روشنی اُس دلچسپ سامان کے درہم برہم ہونے پر بھی ابھی تقریباً نو برس پہلے تک بزم نشینوں کا نام چمکاتی رہی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اسکی ضو ہر کہ ومہ تک نہیں پہنچی لیکن جس طرح جنگل بیابان میں چراغِ سرِ مزار بھولے بھٹکوں کی رہنمائی کرتا ہے اسی طرح میر مجروح باوجود گوشۂ خموشی میں پڑے رہنے کے طالبانِ فن کے لیے بلاشبہ مشعلِ ہدایت کا کام دیتے تھے۔

ہاں وہ طبعاً شہرت پسند نہ تھے لیکن اگر وہ عوام سے پورے طور پر رُو شناس نہیں ہوے تو اس کے اور اسباب بھی ہیں جن میں سے اہم ترین سبب یہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ دہلی کی بربادی اور کملاے دہلی کی مفارقت نے اُن کے دل و دماغ کو اس درجہ متاثر کر دیا تھا کہ انہیں اپنے جوہرِ شاعری کی تشہیر کا خیال تک نہ آیا۔

میر مجروح اُن خوش نصیبوں میں ہیں جن کو دہلی کی گلیوں کی گوناگوں دلچسپیوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا ہے۔ حکومت تو جسم بیجان تھی لیکن اُس وقت بھی دِلّی ہندوستان کا قرطبہ و بغداد بنی ہوئی تھی۔ جو شخص یہاں کی کیفیت کا مشاہدہ عروج کے زمانہ میں کر چکا ہو اُسکے واسطے تباہی و بربادی کا منظر کس قدر قیامت خیز نہ ہوگا۔ مجروح کی مثال اُس بلبل کی سی ہے جس نے باغ کو بہار میں دیکھا ہو اور پھر خزاں میں بھی دنیاوی نشیب و فراز اور کمال و زوال کی یہ مجسم تصویر دیکھنے کے بعد یقینی بات ہے کہ میر مجروح کا دل بیٹھ گیا ہوگا۔ اسی مایوسی اور ناکامی کا پرتو ہم اُن کے کلام میں بھی پاتے ہیں۔

مجروح کے عالمِ طفلی میں دِلّی گلزار تھی اور غالب، ذوق، مومن، آزردہ، شیفتہ، صہبائی، نیر وغیرہ اسکے چہکتے ہوے طائرِ خوش نوا تھے۔ ان کی نغمہ سنجیاں آج بھی علمی حلقوں میں سامعہ نوازی کا دلپذیر ذریعہ سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن یہ خوش آہنگیاں جس شخص نے اپنے کانوں سے سنی ہوں بلکہ جسے ہمصفیری کی عزت بھی مل چکی ہو وہی خوب بتا سکتا ہے کہ یہ صدائیں کان سے گزرنے کے بعد دل پر کیا خوشگوار اثر ڈالتی تھیں۔

میر مجروح کو شاعری کا شوق عالمِ شباب سے تھا۔ اگرچہ انسان فطری مناسبت کے بغیر کسی فن میں مشاق نہیں ہو سکتا تاہم بعض خارجی اثرات سے اُسے تکمیلِ مقصد میں کافی مدد پہنچتی ہے۔ مجروح کو وہ ذہنی و دماغی قابلیتیں حاصل تھیں جن پر اکتسابِ کمال کا انحصار سمجھا جاتا ہے لیکن چند اور بھی اسباب اُنکی تشویق کا ذریعہ ہوے۔ باپ میر حسن فگار خود ایک خوشگو شاعر تھے بھائی چچا دونوں قابل، آپ خود تعلیم یافتہ، اہلِ کمال کی صحبت، ان تمام باتوں نے اُن کے طبعی شوق کے ساتھ تیز رَو رخش پر کوڑے کا کام کیا۔ اُستاد بھی نصیبوں سے غالب ملے جن کا نظیر دنیاے شاعری اُردو ابتک پیدا نہیں کر سکی۔ غرض مجروح کے لیے غیب سے مفید مطلب سامان مہیا تھے پھر اگر اُنھوں نے فنِ شعر کو درجۂ اعلیٰ پر پہنچایا تو اُس سے ناواقفوں کے لیے تعجب کی گنجایش کہاں رہتی ہے۔

وہ لڑکا جو اپنے خاندان کا نام روشن کرے سپوت ہوتا ہے اسی طرح جو شاگرد اپنے اُستاد کی عظمت و شہرت کا باعث ہو اُسکے سرمایۂ ناز ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ مجروح نے غالب کا نام روشن نہیں کیا کیونکہ وہ خود آفتاب تھے لیکن وہ اپنے اُستاد کی زندہ یادگار ضرور تھے۔ وہ اصل کی ایک ہوبہو نقل تھے۔ وہ آسمانِ سخن کا ماہتاب تھے۔ جس طرح چاند فی الحقیقت آفتاب سے اکتسابِ نور کر کے آسمان و زمین کو منور کر دیتا ہے

اسی طرح مجروح نے جو افادے حضرت غالب سے حاصل کیے اُن سے تمام طالبان کمال کو مستفید کیا۔ وہ شاگرد خوش نصیب ہی جس پر اُستاد کی فخر آمیز نگاہیں پڑتی ہوں۔ مجروح بلاشبہ ایسے ہی شاگرد تھے جن پر غالب کو بجا طور پر ناز تھا۔

اُستاد و شاگرد کے تعلق عموماً بے تکلفانہ نہیں ہوتے لیکن یہ کلیہ غالب اور مجروح پر صادق نہیں آتا۔ غالب یوں بھی اپنے تلامذہ سے بے تکلف ملنے جُلنے کے عادی تھے لیکن مجروح کے ساتھ اُنکے روابط بہت بڑھے ہوے تھے۔ اس کی شہادت اُردوے معلّی کے صفحات دے سکتے ہیں جو اُنکے نام کے خطوط سے مملو ہیں۔ یہ خطوط اُس زمانہ کے ہیں جبکہ فتنہ ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی میں افراتفری پڑگئی تھی اور شرفا بخیالِ تحفظِ آبرو تتر بتر ہو گئے تھے۔ مجروح یہاں سے پانی پت پہنچے اور کچھ زمانہ تک وہاں انصاریوں کے محلہ میں مقیم رہے۔ پانی پت سے اُنھیں مہاراجہ الور نے بلا بھیجا اور یہ وہاں گئے۔ مہاراجہ کے انتقال پر یہ کچھ دنوں جے پور میں رہے اور بالآخر وطن کی کشش اُنھیں پھر دِلّی کھینچ لائی۔ یہ زمانۂ مفارقت اُستاد اور شاگرد دونوں کے لیے صبر آزما تھا۔ زبان سے باتیں ہونا غیر ممکن تھیں۔ خط کے ذریعہ سے جو کچھ ہوتا کہہ سن لیتے تھے۔ مرزا غالب کے طرزِ تحریر سے اُنکی قلبی محبت اور دلی اُنسیت کا ثبوت ملتا ہی۔ اللہ اللہ کیسے محبت بھرے دل تھے اور کیسے محبت کی قدر جاننے والے۔ اب ان کا نشان بھی نہیں ملتا۔

میر مجروح کے کلام کی تقسیم تین حصّوں میں کیجا سکتی ہی۔

۱۔ غدر کے پہلے کا کلام۔

۲۔ درمیانی کلام۔

۳۔ آخری کلام

پہلی شق میں اُن کے کلام کا وہ حصّہ سمجھا جا سکتا ہی جو دہلی کی بربادی و تباہی سے پیشتر لکھا گیا تھا۔ اس وقت طبیعت میں اُمنگ تھی۔ مشاعرے کثرت سے ہوتے تھے۔ اہل کمال کا مجمع تھا۔ مُسلّم الثبوت ماہرانِ فن کی داد ا

حوصلہ افزا ہوتی تھی۔ درمیانی کلام اُس وقت کا ہی جب اُنھیں وطن سے دور رہنے کی ضرورت آپڑی تھی۔ اس میں اُس وقت کا کلام بھی شریک ہو سکتا ہی جب وہ سفر سے واپس آکر دہلی میں آرہے تھے۔ اس زمانہ میں طبیعت میں وہ ترنگ تو نہ تھی پھر بھی بعض پچھلے یاروں دوستوں کی یکجائی سے مزاج میں اطمینان سا ہو گیا تھا۔ اور سب سے بڑی تقویت کی چیز حضرت غالب کا وجود تھا جو انکی واپسی دہلی کے بعد بھی کچھ عرصہ تک بقید حیات رہے۔ آخری نمبر پر انکی فکرِ سخن کا وہ حصّہ آتا ہی جو حضرت غالب کی وفات کے بعد کہا گیا ہی۔ ہمارے پاس کوئی ثبوت اس کا نہیں کہ کون سی غزل کس عہد کی ہی لیکن اگر شاعر کا کلام اُس کی طبیعت کا رنگ کچھ بھی دکھا سکتا ہی تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو غزلیں شوخیِ کلام اور معاملات کے مضامین سے پُر ہیں وہ کلام اولیں ہی اور عہد وسطیٰ کی خصوصیات یہ ہونا چاہیے کہ شوخ بیانی کے ساتھ کچھ حصّہ رنج و مایوسی کا بھی پایا جائے۔ اور آخری یادگار اُن کے وہ اشعار ہو سکتے ہیں جو سوز و گداز کا مرقع کہلانے کا حق رکھتے ہیں۔ میر مجروح طبعاً بہت رقیق القلب تھے اور پُر درد دل رکھتے تھے چنانچہ یہ خصوصیت اُن کے کلیات میں تمام و کمال پائی جاتی ہی۔ لیکن آخر آخر میں اُن کا اصلی رنگ یہی بن گیا تھا۔ غزل کی غزل حسرت و یاس کے مضامین سے لبریز ہی اور ناظر یا سامع ممکن نہیں کہ اُن کا کوئی شعر پڑھ یا سُنکر مُتاثر ہوے بغیر رہ سکے۔ کہتے ہیں کہ "آپ بیتی کا اثر دل پر ہوتا ہے" مجروح نے بھی گویا وہی باتیں لکھی ہیں جن کا تجربہ اور مشاہدہ اُنھیں اپنی زندگی میں کرنا پڑا۔ اس لیے ان کی سرگزشت تاثیر سے کیونکر خالی رہتی۔

افسوس ہی کہ ہمیں باوجود سعی کے مجروح کے صحیح تفصیلی کوائف نہ مل سکے ورنہ اُن کا قلمبند کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوتا۔ دہلی سے باہر پانی پت الور اور جے پور میں ان کا قیام رہ چکا ہی اور یہ جہاں رہے اپنا نام اُچھالتے رہے۔ اول الذکر ریاست کا حکمران مہاراجہ شیو دان سنگھ بہت علم دوست آدمی تھا۔ مجروح کے بھائی سید سرفراز حسین

اُس کے یہاں مصاحبت سے سرفراز تھے۔ میر مجروح کو بھی نائب تحصیلداری اور پھر تحصیلداری کے عہدہ پر ممتاز کیا۔ حُسنِ اتفاق سے دہلی کے شعرا میں سے ظہیر اور آنور بھی یہاں موجود تھے۔ بہرحال رئیس کی قدردانی سے الور ایسے غیر آباد و دور دراز مقام پر مجروح و ظہیر ایسے صاحب کمالوں کا اجتماع خاص دلچسپی کی چیز تھا۔ شیودان سنگھ خود شاعر نہ رہے ہوں لیکن شعر فہم ضرور تھے۔ ہر ہفتہ باغ دلکشا میں جلسۂ مشاعرہ ترتیب دیا جاتا اور وہ خود اُس میں شریک ہوتے اور شعرا کا کلام سنتے تھے۔ مہاراجہ موصوف کی غیر متوقع اور بے موقع موت نے اس مجمع کو پریشان کر دیا ورنہ شاید شیودان سنگھ کی راجدھانی میں لکھنؤ اور دلی کی کیفیت انگیز حالت پیدا ہو جاتی میر مہدی مجروح نے مہاراجہ کی شان میں دو قصیدے بھی کہے ہیں۔ ایک کے چند تمہیدی اشعار جو زبان کی شستگی کے باوجود معنوی خوبیاں رکھتے ہیں قابل ملاحظہ ہیں ؎

یہ توبہ اب یہ کیا آنے کے دن ہیں — خوشی سے مست ہو جانے کے دن ہیں
گئی گر فصل گُل ہے ابر موجود — ابھی کیا آپ میں آنے کے دن ہیں
نہ دے تو قطرہ قطرہ مے کا ساقی — یہ ساغر کے چھلک جانے کے دن ہیں
نکلنا گھر سے کیسا فصلِ گُل میں — یہ آپے سے نکل جانے کے دن ہیں
خُمِ مے کی طرح سے بے خودانہ — ہمارے جوش میں آنے کے دن ہیں
ہے ایسی کثرتِ عیش و طرب کیوں — مگر خلعت کے یہ آنے کے دن ہیں
سری شیودان سنگھ البتہ خوش ہیں — کہ اُن کے عیش فرمانے کے دن ہیں

یہ قصیدہ غزل کی زمین میں کہا گیا ہے۔ اس میں وہ جزئی خصوصیات البتہ ناپید ہیں جو عموماً قصیدہ سے منسلک خیال کیجاتی ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں کہ وہ قصیدہ نگاری پر قادر نہ تھے۔ وہ بیشک ذوق کی طرح اس فن کے کامل نہ تھے لیکن اُن کے قصیدے بہت سے مشہور شعرا کے قصائد سے بعض اوقات بہتر سمجھے گئے ہیں۔ دیکھیے اس تشبیب پر سودا کا دھوکا ہوتا ہے ؎

خاک میں گو جگر و دل کر لے ضبطِ فغاں — دیکھنا آتشِ غم جوش سے اُٹھے نہ دھواں
ہمسری اُس دہنِ تنگ سے کس طرح کرے — غنچہ ظاہر میں تو خوشبو ہے یہ وہ بات کہاں
میں جو کہتا ہوں تجھے قتل ہے میر منظور — کس صفائی سے وہ بیساختہ کہتا ہے کہ ہاں
پردہ ہی یار کا بہتر ہے کہ جوں شبنم و مہر — وہ اگر سامنے آیا تو یہ بیتاب کہاں
جہد لازم ہے ہر اک کام میں گر غور کرو — نہ تو مشکل کوئی مشکل ہے نہ آساں آساں
یاد رہتی ہے فقط نام سے دیکھو عنقا کو — نام رہنے کے لیے اُس نے مٹایا ہے نشاں
خوشدلی کے بہم اسباب کا ہونا معلوم — دل کہاں وقت کہاں عمر کہاں یار کہاں

شکوہِ الفاظ کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو ؎

تعالی اللہ ہوا قربِ الٰہی اور اس حد کا — کہ تھا قوسین سے نزدیکتر زانو محمدؐ کا
کیا سجدہ ملائک نے اُسی کی دیکھکر عظمت — ودیعت جبہۂ آدم میں تھا جو نور احمدؐ کا
خدا نے سب سے افضل تر کیا اسلاف کو تیرے — خلیل اللہ القاب ہایوں تھا تیرے جد کا
درِ اقدس پہ ہو ذرات مجکو شغلِ جاروبی — نہ برہم تر کہیں دارا ہو اس عیشِ مخلد کا

بہاریہ تشبیب دیکھیے ؎

کچھ نئے رنگ سے اس فصل میں ہے جوشِ بہار — باغباں کی نہیں کچھ بھی گلوں کو درکار
اس قدر باغ میں ہے غنچہ و گل کی کثرت — کہ ہوا باد صبا کا بھی گذرنا دشوار
سبزہ عالم کو کیا ابر و ہوا نے ایسا — آشیاں بننے کو بلبل کے نہیں ہیں خس و خار
ابر نے محو کیے جزوِ کدورت یاں تک — ہو گیا صاف اگر تھا کہیں آنکھوں میں غبار
معتدل فیض ہوا سے ہے یہ طبعِ عالم — کوئی نرگس کی صفت میں نہیں لکھتا بیمار

لیکن اہلِ نظر کا خیال ہے اور اس کے صحیح ہونے میں شک کو مطلق دخل نہیں کہ میر مجروح کے ایک حقیقی شاعر ہونے کی تصدیق ان کے قصیدوں سے نہیں بلکہ غزلیات سے ہوتی ہے۔ غالب کی طرح اُنھوں نے قصیدے کہے ضرور ہیں اور اچھے کہے ہیں لیکن صرف ان کی غزلیات اُستادی کی سند کا کام دے سکتی ہیں۔

غزل گوئی کے میر مجروح پورے ماہر تھے اور اس صنف سے اُن کو خاص مناسبت تھی۔ اُنھوں نے غزل کو محض عشقیہ مضامین تک محدود کر دینے کی کوشش نہیں کی بلکہ سچ پوچھیے تو جو باتیں غلطی سے عشق و محبت

کی مترادف سمجھ لی گئی ہیں اور عام شعراء اُنھیں کے درپے رہتے ہیں وہ مجروح کے کلام میں حتی الوسع جگہ نہیں پا سکیں۔ اُنھوں نے عاشقانہ راز و نیاز کا نقشہ جہاں کہیں دکھایا بھی ہے تو نہایت متانت کے ساتھ۔ اس میں کلام نہیں کہ عشق ایک فطرتی جذبہ ہے اور اس کے معاملات بھی نیچرل ہوتے ہیں، لیکن ہمارے بعض شعرا نے اس امر خاص میں اعتدال کو مدِ نظر نہیں رکھا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اکثر ناواقف اردو شاعری کو فحش کلامی کا دوسرا نام خیال کرتے ہیں۔ مجروح نے فلسفۂ محبت کے رموز پر جہاں قلم اُٹھایا ہے وہاں زیادہ تر بہت بلند جذبات کا اظہار کیا ہے جنھیں سوقیانہ خیالات سے مطلق تعلق نہیں چنانچہ مندرجۂ ذیل شعر کو دیکھیے۔ تسلیم و رضا کی تفسیر ہے ؎

زخمیِ عشق وہ کامل ہے کہ لذت پائے
جب نمک ریز ہو زخموں پہ نمکداں تیرا

اسی کے ساتھ ایک اور شعر نیازمندی کا فوٹو ہے ؎

میں رضامند ہوں تو دوزخ و جنت بھر دے
ایک ہے عدل ترا دوسرا احساں تیرا

معلوم ہوتا ہے کہ انقلابِ عالم کے ذاتی تجربہ نے اُنھیں ہستیِ انسانی کا راز بتا دیا تھا۔ اس مضمون پر اُن کے دیوان میں بیشتر اشعار موجود ہیں اور تخیل کے لحاظ سے اُنھیں فلسفۂ زندگی کا نچوڑ کہا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے منتخب اشعار ہم درج کرتے ہیں ناظرین خیال فرمائیں کہ ایک ہی مضمون پر اُنھوں نے کیا کیا جولانیاں دکھائی ہیں ؎

اپنی ہستی ہے خواب کی صورت   بود ہے یہ حباب کی صورت
اور ہی کچھ بگڑتی جاتی ہے   اس جہان خراب کی صورت

ہے یہ جانِ نزار کی صورت   جیسے اُجڑے دیار کی صورت
کاوشِ غم یہ ہے کہ پہلو میں   دل کھٹکتا ہے خار کی صورت

یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ ؎

نہیں رازِ ہستی جتانے کے قابل
یہ پردہ نہیں ہے اُٹھانے کے قابل

مطلب کی بات بیساختہ زبان پر آجاتی ہے اور کہتے ہیں ؎

خانماں سوز ہوا ہوں میں   اپنے سایہ سے بھی جدا ہوں میں
آنکھ تک ڈالتا نہیں گاہک   کچھ عجب جنسِ ناروا ہوں میں

بڑھا دیتا ہوں ہم جنسوں کا رتبہ   مثالِ نقطہ گو بے کار ہوں میں
تامل سے مجھے دیکھو تو جانو   کہ اک گنجینۂ اسرار ہوں میں

خود شناسی کی اعلیٰ ترین منزل طے کرکے پھر عجزِ فہم کا اقرار کرنے لگتے ہیں کہ ؎

حقیقت ہی نہیں کھلتی ہے میری
عجب اک عقدۂ دشوار ہوں میں

ان اشعار سے خیالات کی وسعت اور نظر کی بلندی کا اندازہ ہو سکتا ہے اس میں شک نہیں کہ مجروح کے کلیات کے مطالعہ سے اعلیٰ جذبات متحرک ہوتے ہیں اور دل پر وجد کی سی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے۔ انصاف کیجیے کہ اشعار ذیل کس پایہ کے ہیں۔ کیا اُردو شاعری کے خزانہ میں آج تک ان سے قیمتی جواہرات بھی ملے ہیں ؎

یہاں کی بھی ہے سیر کرنی ضرور   سفینہ کو جانے دو گرداب میں
نہ غربت میں کی بات تک خضر سے   رہے غرق یہ یادِ احباب میں
نہ کر شور اے نالۂ بے ادب   یہ ہیں کس کی آنکھیں شکر خواب میں

خبر کیا سُنی مرگِ مجروح کی
اداسی ہے کچھ بزمِ احباب میں

ہے ہم شبیہِ شکل۔ گر دیدہ ور کہاں   نرگس میں وہ نگاہِ محبت اثر کہاں
کیوں میری بود و باش کی پرسش ہے ہر گھڑی   تم تو کہو کہ رہتے ہو دو دو پہر کہاں
جنت میں دل لگا نہ درِ خلد کچھ جچا   لیجائے دیکھیے ہمیں ذوقِ نظر کہاں

کیا بتاؤں نشانِ منزلِ دوست دیر و کعبہ تو اسکی راہ میں ہیں

مہر و قہر اُن کا کچھ نہیں کھُلتا ہم تو مدت سے اشتباہ میں ہیں

خجلت سے گناہوں کی یہ دنیا میں ہے عالم اک دوزخِ جاوید میں تنہا ہوں پھنسا میں

غزل اول کا دوسرا شعر محویت کی ایک موثر تصویر ہے۔ اسی قسم کا ایک اور شعر استغراق کے مضمون پر قابل دید ہے

کس کو معلوم جان کب نکلی محو تھے ہم تو یادِ جاناں میں

اُس کے نیچے کا شعر عام رنگ میں ہے لیکن مصرعہ ثانی کی استفہامیہ ترکیب قابل داد ہے۔ دوسری غزل کا پہلا شعر کتنا بلیغ اور معنی خیز ہے۔ علی ہذا منزلِ دوست والا شعر، جس میں معرفت کا گہرا رنگ دیا ہے۔ اب تک شعرا نے اس قسم کے مضامین باندھے ہیں کہ یار کا مکان حرم ہے، دیر ہے، رگِ گردن ہے وغیرہ لیکن مجروح سب سے آگے نکل گئے ہیں اور کہتے ہیں منزلِ دوست کا پتہ کیا بتاؤں کیونکہ دیر و حرم جنھیں آخری سرحد خیال کرتے ہیں اُسکی راہ میں پڑتے ہیں اور وہ اُن سے بھی آگے ہے۔ جزاک اللہ

آخری شعر کی معنوی خوبی کے ساتھ دوزخِ جاوید کی ترکیب نہایت پسند ہے۔ خیالات کی نیرنگی اور تخیل کی گوناگونی ان کی غزلیات کو گلزار بنائے ہوئے ہے۔ ہم اس جگہ مختصراً یہ دکھانے کی کوشش کریں گے کہ اُن کی طبیعت میں ندرت پسندی کہاں تک تھی اور وہ معمولی باتوں کو بھی کس معنی خیز پیرایہ میں بیان کرتے تھے۔ مندرجۂ ذیل شعر میں "شوق" اور "رشک" کی کیفیات بالکل فطری ہیں

شوق کہتا ہے اُسے دیکھ تو لو ہمرہِ غیر
رشک کہتا ہے مجھے کب یہ گوارا ہوگا

شوق کی بہتی تعریف مصرعۂ اولی سے بہتر ممکن نہیں۔ محبوب کو ہمراہِ غیر دیکھنا عاشق کو کبھی گوارا نہیں ہو سکتا۔ لیکن شوق دیدار اس درجہ بڑھا ہوا ہے کہ وہ اس حالت میں بھی نظارگی ہونے کا متقاضی ہے۔ بالکل نئی بات ہے۔

مجنوں آج تک دیوانہ تھا لیکن میر مجروح کی تخیل نے فکر نے کس خوش اسلوبی سے "دیوانہ بکارِ خود ہشیار" کی سند سے اُسے زمرۂ عاقلین میں لا کر شریک کر دیا ہے۔ کہتے ہیں

دیوانہ بن کے مطلبِ اصلی کیا حصول مجنوں بھی عاقلوں میں بہت ذی شعور تھا

اسی زمین کے یہ دو شعر بہت اچھے ہیں

کہتے ہیں دردِ عشق سے کیوں مر گئے نہ تم لو اور سنیئے یہ بھی ہمارا قصور تھا

زاہد کا زہد دیکھ لیا۔ ہے مآل ایک میں مست بادہ اور وہ مست غرور تھا

محبوب کے بیوفا ہونے کے باوجود یہ کہہ کر کہ

رشکِ عدا تو سلّم ہے وے سچ یہ ہے جب وہ اپنا نہوا دوست تو کس کا ہوگا

اپنے دل کو اطمینان دلاتے ہیں کہ جب وہ ہم ایسے عاشق صادق کا نہ ہوا تو دشمن کا کیا ہوگا۔ اس شعر میں تغافل کی شان کتنی نیچرل ہے

وہ مجھ سے کہتے ہیں تو نام تو بتا اپنا تمام عمر کی محنت کا یہ مآل ہوا

فلسفۂ محبت کی پیچیدگی کا اظہار ان الفاظ میں ہوتا ہے کہ

ہر اک کو پیش آتا ہو نیا رنگ کھُلے کس طرح اسرارِ محبت

یہی خیال دوسرے پیرایہ میں یوں کہا ہے

ہوا مسئلہ عشق کا حل نہ اُن سے ہوئے دم بخود یاں زمانے کے قابل

لیکن پہلا مضمون بہت سچا، موثر، اور نیچرل ہے۔

اس شعر میں رشک کی کیفیت دکھائی ہے

گو اُسکے عام جلووں سے ہے بہرہ ور جہاں پر ہمکو فرطِ رشک سے تابِ نظر کہاں

غالب کا یہ شعر اس سے بہت ملتا ہوا ہے

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

اور مجروح کا یہ شعر گویا بالکل غالب کا ہے

نہیں لیتا ہوں فرطِ رشک سے نام ہر اک سے پوچھتا ہوں وہ کہاں ہے

لیکن "ترکِ رشک" کا مضمون نیچے کے شعر میں نہایت لطیف اور سچا ہے کہتے ہیں

لو رشک بھی اب چھوڑ دیا مضطربی میں
ہر ایک سے کہتا ہوں کوئی یار کے گھر جائے

قوتِ متخیلہ کی بلند پروازی گویا آسمان سے تارے توڑ لانے کے لیے ہر وقت تیار رہتی تھی۔ حق یہ ہے کہ اگرچہ کلام مجروح میں محاورات و معاملات کی نمکینی نہیں دیکھی لیکن ذوقیات کی حلاوت اس درجہ موجود ہے کہ دل اُسکے مزے میں پڑ کر کسی اور طرف نہیں جھکتا۔ زبان کے لحاظ سے مجروح کا دیوان اُردو لٹریچر کا بہترین کارنامہ ہے۔ بعض الفاظ ایسے ضرور موجود ہیں جو مجروح کے آخر عہد میں متروک ہو گئے تھے۔ مثلاً ؎

یہ کس سے ہو سکے ہے بجز فیضِ مصطفےٰ | جو معصیت میں بگڑ کھائے ثواب کا
کل نشہ میں تھا وہ بت مسجد میں گر آجاتا | ایماں سے کہو یارو پھر کس سے رہا جاتا
چمن تو پاس ہی پر کیونکہ جھانک کر دیکھوں | ہر ایک وقت تو رہتا ہے پاسباں صیاد

اصل یہ ہے کہ یہ الفاظ میر مجروح کے غالب حصۂ زندگی میں رائج تھے۔ انکی زبان پر بھی چڑھے رہے ہونگے اور اضطراری طور پر وہ استعمال کر گئے ہونگے یہ بھی ممکن ہے کہ اس قسم کے اشعار اُن کے ابتدائی کلام کا جزو ہوں اور اُس وقت یہ الفاظ متروک نہ تھے۔ اس سے قطع نظر کر کے دیکھیے تو زبان کی شستگی و صفائی بے نظیر ہے۔ خیالات میں غالب کی افکار کا رنگ کافی طور پر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن زبان کی وہ پیچیدگیاں جنھوں نے غالب کی شاعری کو بعض مخالفوں کو بے معنی ہونے کا یقین دلا دیا تھا مجروح کے کلام میں ناپید ہیں۔ حتی الوسع زبان نہایت سیدھی سادھی ہے میر کی زبان کا لطف آتا ہے۔ زبان فصیح، جملوں کی ترکیب سلجھی ہوئی، استعارے قریب الفہم، تلمیحات مانوس، غرض جو صفات کسی شعر کو ذوق سلیم کے لیے پُر لطف بنا دیتے ہیں ان کے کلام میں بوجہ احسن موجود ہیں۔ منجھے ہوئے طرزِ بیان کی بہترین مثال یہ اشعار ہیں ؎

صبر کیوں آج دل میں آیا ہے | اُس سے کہدو کہ یاں سے رخصت ہو
میرا مرنا سنا جو اُس بُت نے | ہنسکے بولا غریقِ رحمت ہو

خود بھی جا کر ملوں تو کہتے ہیں
تم تو مجروح بے مروّت ہو

تمھارا شکوہ اور میری زبانی | معاذ اللہ کتنے بدگماں ہو
ہمیں شکوہ ہے اک بیدادگر کا | اب اس میں آپ ہوں یا آسماں ہو

یہ اشعار کتنے برجستہ واقع ہوے ہیں ؎

یہ جو چپکے سے آئے بیٹھے ہیں | لاکھ فتنے اُٹھائے بیٹھے ہیں
وہ نہیں ہیں تو درد کو اُنکے | سینہ سے ہم لگائے بیٹھے ہیں
یہ بھی کچھ جی میں آ گئی ہوگی | کیا وہ میرے بٹھائے بیٹھے ہیں
ق
لاابالی خرام ہے مجروح | وضع کیسی بنائے بیٹھے ہیں
کل تقدس مآب مسجد تھے | آج رندوں میں آئے بیٹھے ہیں

مندرجۂ بالا اشعار سے ناظرین خیال فرما سکتے ہیں کہ راسخ الکلامی کے ساتھ اُنکا رنگ تغزل کس قدر دلچسپ ہے۔ مندرجۂ تحت شعروں کو دیکھیے اور بیساختگی کلام کا لطف اُٹھائیے ؎

غیروں کو بھلا سمجھے اور مجھکو بُرا جانا | سمجھے بھی تو کیا سمجھے جانا بھی تو کیا جانا
مانگوں تو سہی بوسہ پر کیا ہے علاج اسکا | یاں ہونٹھ کا ہل جانا واں بات کا پا جانا
کچھ عرضِ تمنا میں شکوہ نہ ستم کا تھا | میں نے تو کہا کیا تھا اور آپ نے کیا جانا
اک عمر کا دُکھ پائے سوتے ہیں فراغت سے | اے غلغلۂ محشر ہم کو نہ جگا جانا

مجروح ہوے مائل کس آفتِ دوراں پر
اے حضرتِ دل تمنے بھی دل نہ لگا جانا

عشق و الفت کی چھیڑ چھاڑ، عاشق و معشوق کے راز و نیاز، ہجر و وصل کا تذکرہ بھی کیا ہے لیکن اس میانہ روی کے ساتھ جس کا مطالعہ وجدان صحیح پر گراں نہیں ہو سکتا ؎

نہ تھے تم غیر کے گھر سچ ہے لیکن | یہ چرچے ہو رہے ہیں جا بجا کیا
دل جو کھنچتا ہے بدرِ کامل پر | ہے کسی کے شباب کی صورت
وہ جاتے ہیں دامن بچائے ہوے | تجھے جرأتِ شوق کیا ہو گیا

ہیں اس تندخو سے یہ گستاخیاں
تمھو تم کو مجروح کیا ہو گیا

دل میں اک شی جو کھٹکتی ہے بہت مدت سے   وہ ترے تیر جگر دوز کا پیکاں تو نہیں

آخری شعر والی غزل میں زاہد کا انسان نہ ہونا کس مذہب طریقہ سے ثابت کیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہمنے مانا کہ ہیں زاہد میں صفاتِ ملکی   خوبیاں سب ہیں مسلّم مگر انساں تو نہیں

اسی کے ساتھ زمانہ کی ناقدری کی کیا صحیح تصویر دکھائی ہے ؎

ہم ہنر لیکے کہاں جائیں کسے دکھلائیں   جنس اچھی ہے پر اسکا کوئی خواہاں تو نہیں

مندرجۂ ذیل نعتیہ شعر کا مضمون کس قدر نادر ہے۔ آج تک لوگ "گردِ پسِ کارواں" باندھتے تھے لیکن مجروح نے نہایت جدت سے اسکا عدم ثابت کیا ہے ؎

رہتی ہے اشتیاقِ مدینہ میں ساتھ ساتھ   اس قافلہ میں گردِ پسِ کارواں نہیں

اس میں اشتیاق کی من وعن حالت بتائی گئی ہے۔ اسی قبیل کا ایک شعر کہیں اوپر آچکا ہے جس میں "شوقِ دید" کی انتہائی کیفیت کا نقشہ کھینچا گیا ہے

ان اشعار میں اپنے اُستاد کا رنگ قائم رکھنے کی کوشش کامیابی کے ساتھ کی ہے ؎

محفل طرازیاں وہ کہاں اب تو کام ہے   گھر میں پڑے ہوئے در و دیوار دیکھنا

کیا شکایت کروں رقیبوں کی   وہ ہی جب اپنا آشنا نہوا

یاس اس درجہ ہوگئی ہے کہ اب   وصل بھی آرزو فزا نہوا

حیات اپنی ہے وابستہ نفس سے   عطائے خاص ہے یہ دمبدم کیا

ترحم طالبِ طاعت نہیں ہے   مرا محتاج ہے اُس کا کرم کیا

مرزا غالب کی ہم طرح غزلیں ان کے دیوان میں ہونا چاہیے تھیں اور متعدد ہیں اُستاد اور شاگرد کا مقابلہ کیا۔ اور پھر غالب ایسے مسلّم الثبوت نغز گو شاعر کے ساتھ۔ لیکن ہم یہاں انھیں غزلوں کے منتخب اشعار لکھتے ہیں۔ اربابِ فہم اندازہ کریں کہ کیسے ہیں۔ غالب کی ایک مشہور غزل ہے جسکا مطلع ہے ؎

کوئی دن گر زندگانی اور ہے   ہمنے اپنے جی میں ٹھانی اور ہے

اسی طرح میں مجروح کے کلام کا رنگ ملاحظہ ہو ؎

یہ جوابِ لطفِ زبانی اور ہے   کچھ مری الفت بڑھانی اور ہے

جانشیں ہیں اُسکے پیچیدہ ستم   طرزِ جورِ آسمانی اور ہے

ہوگئے نابود۔ پر باقی ابھی   اک نشانِ بےنشانی اور ہے

کیا مزا جب اور واقف ہوگئے   لذتِ دردِ نہانی اور ہے

یوں تو ہیں مجروح سب شاعر فصیح
میر کی یہ خوش بیانی اور ہے

ایسے ہی یہ اشعار غالب کی ایک ہمطرح زمین میں ہیں ؎

غم سے چھٹ جانے کی حکمت ہی سہی   جان دینا اُسے رشوت ہی سہی

کچھ تو ہے تلخیِ غم کی تدبیر   لبِ شیریں کی حکایت ہی سہی

کوئی لیجائے مجھے قاتل تک   غلبۂ شوقِ شہادت ہی سہی

ہاں شبِ غم تو بسر ہو مجروح
صبح کو روزِ قیامت ہی سہی

ہم اوپر ذکر کرچکے ہیں کہ فسادِ غدر میں دہلی کے اکثر شرفا ترکِ وطن کرکے جہاں تہاں چلے گئے تھے کچھ مدت کے بعد جب دلی میں امن ہوا تو یہ لوگ بھی رفتہ رفتہ واپس آگئے۔ ان کے اجتماع کے بعد ایک مشاعرہ منعقد ہوا جسمیں داغ، مجروح، شیفتہ، نیر، انور (اور شاید خود جناب غالب) وغیرہ شریک تھے۔ مشاعرہ کیا تھا دلی کی مرثیہ خوانی اور دردِ دل کی کہانی تھی طرح دیگئی تھی زبانِ دہلی۔ مکانِ دہلی۔ دو چار شعر میر مجروح کے بھی سنیے ؎

وہ کہاں جلوۂ جاں بخشِ بتانِ دہلی   کیونکہ جنت پہ کیا جاے گمانِ دہلی

انقلابے وجہ نہیں ٹوٹ کے ہونا برباد   ڈھونڈتے ہیں اپنے مکینوں کو مکانِ دہلی

مہر۔ زر۔ خاک کو کرتا ہے۔ یہ سچ ہے لیکن   اس سے کچھ بڑھکے ہیں صناع نظرانِ دہلی

وہ ستم دیکھ چکے تھے کہ رہے آسودہ   فتنہ و حشر میں آفت زدگانِ دہلی

کربت و غربت و تنہائی شبہائے دراز
اور مجروح دل افگار۔ بیانِ دہلی

شاعر کے پختہ طبیعت ہونے کا ایک ثبوت سمجھا جاتا ہے اگر وہ مشہور و

متداول طرحوں پر جنھیں قادر الکلام اساتذہ پامال کر چکے ہوں اپنے اسلوب سخن کو قائم رکھے۔ مجروح کی ایسی بہت سی غزلیں ہیں جنکے بالمقابل متقدمین و معاصرین کا کلام موجود ہی۔ اس اُمید کے ساتھ کہ مجروح کا موازنہ کسی دوسرے شاعر کے ساتھ کرنے میں ہماری نیک نیتی پر حرف نہ آئیگا ہم دکھانا چاہتے ہیں کہ ایک ہی شاخ پر بیٹھ کر دوسرے طائران چمن کی نوا سنجیوں میں وہ کس ڈھب سے شریک ہوتے ہیں۔

رند کی ایک نہایت مشہور غزل ہے ؎

کھلی ہے کُنجِ قفس میں مری زباں صیاد ۔ میں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں صیاد
دکھایا کنجِ قفس مجکو آب ودانے نے ۔ وگرنہ دام کہاں، میں کہاں کہاں صیاد

اب دیکھیے مجروح اپنی کہانی کس ڈھب سے کہتے ہیں ؎

شجر پہ برق کا کھٹکا زمیں پہ سیل کا ڈر ۔ ہم آشیانہ بنائیں بھلا کہاں صیاد
نہ سوجھتی ہو رہائی نہ موت آتی ہے ۔ نہ مہرباں ہو قسمت نہ مہرباں صیاد
تمام عمر رہا قید اب رہا کیا ہوں ۔ مجھے تو یاد نہیں اپنا آشیاں صیاد
کبھی نہ دانہ پہ گرتے نہ دام میں پھنستے ۔ کہیں میں اپنی نہ ہوتا اگر زباں صیاد

آخری شعر کس قدر بلیغ ہو۔ غنی کاشمیری کا ایک شعر صائب اپنے سارے دیوان کے عوض میں لینا چاہتے تھے۔ اس غیر انصاف پسند زمانہ میں آج کسی شعر گو کو ایسی حوصلہ افزائی کی امید فضول ہو لیکن ہم کہیں گے کہ مجروح کا دانہ و دام والا شعر اکثر شعراء کے ہزاروں اشعار پر بھاری ہو۔ غنی کا وہ شعر یہ ہے ؎

سبز خطے بہ خطِ سبز مرا کرد اسیر
دام ہمرنگ زمیں بود گرفتار شدیم

لیکن مجروح کا خیال بہت عمیق ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ دانہ کی ہوس یا دام کی گرفتنی نے ہمیں نہیں پھنسایا بلکہ خود صیاد کمین میں موجود تھا اور اُسے دیکھ کر ہم خود جا گرفتار ہوے۔ بظاہر مضمون سادہ ہو لیکن جب غور کیجیے کہ شکاری صیاد کو اگر دیکھ لیتا ہو تو دانے کی طرف بھی رُخ نہیں کرتا لیکن یہاں جذبۂ حُسن کی کشش قابلِ ملاحظہ ہو کہ صیاد کو دیکھ کر صید خود دوڑا چلا آتا ہے۔

داغ کا یہ مطلع ؎

اللہ اللہ ری پریشانی مری ۔ زلفِ جاناں بھی ہو دیوانی مری

ہر پہلو سے بہت بلیغ ہو لیکن مجروح نے بھی اپنی غزل کا مطلع اپنے رنگ میں بے نظیر کہا ہو ؎

جس کا رُو ہو وجہ حیرانی مری ۔ اُسنے صورت تک نہ پہچانی مری

اسکے ساتھ یہ دو شعر بھی جانِ غزل ہیں ؎

مہر ہر ذرہ ہے ہر قطرہ محیط ۔ اللہ اللہ ری فراوانی مری
دل میں نشتر کو نہ دیکھا ہو اگر ۔ دیکھ کا د شہاے پنہانی مری

ایک بہت مشہور اور پامال طرح ہو۔ آہ میں۔ نگاہ میں۔ امیر داغ اور دیگر موخرین نے اسپر خوب خوب طبع آزمائی کی ہو۔ امیر کا ایک مطلع ہو ؎

ہوں زار اس قدر کہ تری جلوہ گاہ میں ۔ چھپ جاؤں گا بن پردۂ گردِ نگاہ میں

لیکن مجروح نے اس سے کہیں زیادہ بلند خیالی سے کام لیا ہو۔ وہ کہتے ہیں ؎

اُسنے ملائی آنکھ نہ گھر میں نہ راہ میں ۔ کیا کیا خجل ہوا ہوں عدو کی نگاہ میں

امیر کہتے ہیں ؎

کس کام کی ہو آنکھ تری جلوہ گاہ میں ۔ کیا احتیاجِ شمع تماشاے ماہ میں

مجروح کا مطلع ہو۔ ناظرین خیال کریں کہ یہ مضمون گلستانِ تخیل کا کیا دل فریب پھول ہے ؎

جانا زبس ضرور تھا اُس جلوہ گاہ میں ۔ ہم دیر و کعبہ چھوڑ گئے دونوں راہ میں

امیر ؎

اترے جو نشہ توبہ کریں ہم شراب سے ۔ لغزش نہ تا زباں کو ہو عذرِ گناہ میں

مجروح ؎

لا تقنطوا نے خود لبِ گویا عطا کیے
ورنہ زبان لال تھی عذرِ گناہ میں

امیر مرحوم کی ایک دل پسند غزل ہے

کرم کو تیرے کرم کا امیدوار ہوں میں
گناہگار ہوں یارب گناہگار ہوں میں

اس میں کے چند اشعار یہ ہیں

فسردگی ہے مری باعثِ خزانِ چمن — شگفتگی میں تماشاے نوبہار ہوں میں
ہوا جو قصرِ فریدوں میں کل گذر اپنا — صدا یہ آئی کہ اُجڑا ہوا مزار ہوں میں
الٰہی آئے کوئی حورباغِ جنت سے — اُجڑ رہا ہوں کہ تنہا تہِ مزار ہوں میں

اب ان کے مقابل مجروح کے ترانہ کی لے قابل شنید ہے

سدا عروج پہ مانند حسنِ یار ہوں میں — خزاں کو دخل نہیں جس میں وہ بہار ہوں میں
مفید ہونے میں گو چند پختہ کار ہوں میں — مگر مزاج میں عالم کے ناگوار ہوں میں
شبِ فراق کی بے چینیاں معاذ اللہ — کہ ایک آن میں مرتا ہزار بار ہوں میں
فروغ بخشِ نظر ہوں نہ زیب کا شانہ — فضاے دہر میں شمعِ سرِ مزار ہوں میں
نظر جو جھپکے بھی ڈالی ہے چشمِ میگوں پر — نگاہِ ناز یہ کہتی ہے ہوشیار ہوں میں
ہے اُس سے دینِ خونبار کا یہی ایما — کہ لالہ رو ہو اگر تم تو لالہ کار ہوں میں

انصاف پسند غور فرمائیں کہ مجروح و امیر میں باعتبار تخیل و نزاکتِ شعری کیا فرق ہے۔ اسی زمین میں امیر نے یہ شعر بہت اچھا کہا ہے

ہزار مُردوں میں زندہ رہا جو ایک تو کیا — زمانہ مست ہے کیا خاک ہوشیار ہوں میں

لیکن دیکھیے اسی مضمون کو مجروح کس جدت سے ادا کرتے ہیں

زمانہ اہلِ غفلت سے ہے لبریز — رہوں تنہا اگر ہشیار ہوں میں

درد اور سودا کی مشہور غزلیں ہیں تپیدہ ہوں - آبدیدہ ہوں - اس طرح پر مجروح کی غزل کے یہ چند اشعار اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ ہر جگہ اپنا خاص رنگ قائم رکھنے میں کامیاب ہوے ہیں۔ کہتے ہیں

میں آہ ہوں تو خونِ جگر میں تپیدہ ہوں — میں زخم ہوں تو سودۂ الماس دیدہ ہوں
طوفانِ جہل نے مرا جوہر مٹا دیا — میں اک کتابِ خوب ہوں پر آب دیدہ ہوں
کیا کیا نہ بعد مرگ کے آسایشیں ملیں — میں قبر میں مسافرِ منزل رسیدہ ہوں
دیکھ لے رقیب سامنے آتا نہ تو مرے — میں دستِ روزگار میں تیغِ کشیدہ ہوں
اس خاکداں سے طبع کو ہوتا نہیں لگاؤ — کس جوہرِ لطیف سے میں آفریدہ ہوں

میر تقی کی طرح مجروح کی غزلیاتِ بحرِ خفیف انکی قادر الکلامی کا اہل ثبوت ہیں جن میں مضامین آفرینی اور زبان کی شستگی و صفائی کے ساتھ اسلوب بیان اتنا سلجھا ہوا ہے جسکی منزلت وجدانِ سلیم پر منحصر سمجھی جا سکتی ہے ناظرین ملاحظہ فرمائیں

رنگ کچھ اور اُنکو لانے ہیں — میری بدخوئی کے بہانے ہیں
رحم اے اضطراب رحم کہ آج — اُن کو زخمِ جگر دکھانے ہیں
کیا ہماری نماز کیا روزہ — بخشدینے کے سو بہانے ہیں
بسکہ اک جنسِ رائیگاں ہو نہیں — جتنا ارزاں ہوں گراں ہو نہیں
لطف پایا ہے خاکساری میں — ہوں زمیں گو کہ آسماں ہو نہیں
دل کی بیچینیاں گئیں نہ کہیں — اک کھٹک سی رہی کہیں نہ کہیں
اتنا مردود ہوں کہ ڈر ہے مجھے — قبر سے پھینکدے زمیں نہ کہیں
میں تو سمجھا ہوں عشق غیر غلط — اُنکو ہو جاے پر یقیں نہ کہیں
اُسکا ملنا تو ہے بہت دشوار — گم ہوں اس راہ میں ہمیں نہ کہیں

بزم سے کب ہیں چھوڑنے والے
ہونگے مجروح یاں کہیں نہ کہیں

محاورات کا چٹخارا کلام مجروح میں بہت کم ہے لیکن اسکی تلافی اور کئی خوبیوں نے کردی ہے۔ صحتِ زبان کے اعتبار سے وہ کسی اہلِ زبان سے کم نہیں اور اچھے اچھوں سے بڑھے ہوے ہیں اور اس اعتبار سے اُنھوں نے خزانۂ ادب اردو کو نہایت بیش قیمت جواہرات سے پُر کر دیا ہے یہ لعل و گوہر وہی ہیں جو کسی زمانہ میں مرزا غالب کی "دولت" تھی اور پھر اُسے "ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلہ کا رہنے والا لوٹ لیگیا" مجروح کی زبان کے محاسن کا اندازہ جہاں اُن کے کلام سے ہو سکتا ہے وہاں اس امر سے بھی کہ خود اُنکے اُستاد "رشک" کرتے تھے - اُن کے

کلام میں تاثیر ہو اور ممکن نہیں کہ کوئی سامع اُنکا پُر درد کلام سنکر اثر اندوز نہ ہو۔ کہتے ہیں کہ پڑھنے کا طرز بھی بہت موثر تھا کہ سننے والے محو ہو جاتے تھے

حضرت حالی مدظلہ العالی میر مجروح کے اُستاد بھائی ہیں۔ اول الذکر فن سخن کی جس شاہراہ پہ چلے ہیں اُسے مد نظر رکھ کر ان دونوں کا موازنہ چنداں موزوں نہ کہا جائیگا لیکن اس سے کچھ دلچسپی ضرور پیدا ہوسکتی ہو لوگ دیکھیں گے کہ ایک ہی اُستاد کے دو شاگرد، ایک ہی زمانہ دیکھے ہوے ایک ہی قسم کی تعلیم پائے، اور ایک ہی چشمۂ فیض سے سیراب ہوے، جذبات و خیالات میں ایکدوسرے سے بے تعلق ہونے کے باوجود کبھی کبھی کس طرح ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ حالی کی ایک مشہور غزل ہو جس میں دہلی کی اُس پاک اور مقدس سوسائٹی کی جسکے ساتھ دلی کی آن بان بھی رخصت ہو گئی اصلی تصویر دکھائی گئی ہو۔ پہلا شعر اُسکا یہ ہے ؎

جیتے جی موت کے تم مُنھ میں نہ جانا ہرگز　　دوستو دل نہ لگانا : لگانا ہرگز

اس میں عشق کو خطاب کر کے کہتے ہیں ؎

کوچ سب کر گئے دلی سے ترے قدرشناس　　قدریاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز

مجروح کی غزل اسی طرح پر ہو اور جو ہو شربا سین مولنا حالی نے اپنے اشعار میں دکھایا ہو اُسکی رنگ آمیزی مجروح کے قلم نے بھی کی ہو۔ اُن کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

حرف تم اپنی نزاکت پہ نہ لانا ہرگز　　ہاتھ بیدادِ ستم سے نہ اُٹھانا ہرگز

تم بھی چوری کو یقیں ہو نہ کہو گے چھا　　اب ہمیں دیکھ کے آنکھیں نہ چرانا ہرگز

ذکر بربادی دہلی کا سُنا کر ہمدم　　نیشتر زخم کہن پہ نہ لگانا ہرگز

میں ہوں اک مجمع احباب کا بچھڑا بلبل　　مجکو گلدستۂ رنگیں نہ دکھانا ہرگز

دار فانی میں نہ کر فکر قیام اے ناداں　　گذر سیل ہے یاں گھر نہ بنانا ہرگز

جن کے ایوان تھے ہم پایۂ قصر قیصر　　اُن کی۔ ملتا نہیں۔ قبروں کا ٹھکانا ہرگز

قصر حالی کے حوالی میں ذرا تم مجروح
اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد نہ بنانا ہرگز

اس قسم کی بعض غزلیں دہلی کے اُن مشاعروں میں پڑھی گئی تھیں جن میں لوگ خاص اہتمام سے طبع آزمائیاں کرتے تھے۔ مولنا حالی کا ایک شعر ہے ؎

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں　　نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز

اس میں شک نہیں کہ یہی لوگ تھے جن سے آخر آخر میں دلی کی عظمتِ شان زندہ تھی۔ مجروح خود کہتے ہیں اور صحیح کہتے ہیں ؎

گرد دیتی ہے کارواں کا پتہ　　یادگارِ گذشتگاں ہوں میں

افسوس ہو کہ اب یہ یادگار بھی دنیا میں باقی نہیں۔ لیکن اگر مجروح زندہ نہیں تو اُن کے علمی کارنامے ایک طرف اُن کی ذاتی بقاء کے کفیل رہینگے اور دوسری طرف اُن نامور اسلاف کا نام روشن رکھیں گے جنکے وہ سرمایۂ ناز یادگار تھے۔

۱۵۔ اکتوبر ۱۹۰۲ء آخری دن تھا مجروح کی پبلک لائف کا۔ حقیقت حال تو یہ ہو کہ وہ آخر حصۂ عمر میں بالکل گوشہ گیر ہو چکے تھے، بینائی جاتی رہی تھی اسلیے مشاعروں کی شرکت یا اسی قسم کے اور مشاغل سے وہ کنارہ کش تھے لیکن علی گڑھ کا تاریخی مشاعرہ غالباً بلکہ یقیناً سب سے آخری جلسہ تھا جس میں میر مجروح نے شرکت کی تھی اور اپنا کلام طرحی حاضرین کو سنا کر محو حیرت بنا دیا تھا۔ اُن کی یہ غزل ؎

اغیار کے آگے کے دکھا دو نگا نشاں اور　　بس چپ ہو کھلواؤ نہ اب میری زباں اور

یوں شعر تو کہنا بہت آساں ہو مجروح　　پر ہو روش غالب اعجاز بیاں اور

اُن کا آخری کلام ہونے کے سبب سے یادگاری چیز ہو۔ اربابِ فن و تلاشیان کمال اسے تبرک سمجھ کر آنکھوں سے لگائیں۔

۱۳۲۱ھ اُنکا سال وفات ہو۔ اب وہ دنیا کی کروہات سے کنارہ کیے درگاہ قدم شریف کے صحن میں زیر فصیل عیش و آرام کی میٹھی نیند سو رہے ہیں اور اپنے اس شعر کا مضمون زبان حال سے ادا کر رہے ہیں ؎

کیا کیا نہ بعد مرگ کے آسائشیں ملیں　　میں قبر میں مسافرِ منزل رسیدہ ہوں

سید محمد فاروق

قوتِ خیال

انسانی عنصر مین دو بڑے قیمتی جوہر رکھے گئے ہین **عقل** اور **خیال**۔
عقل مفاہیم کلیہ کا خزانہ اور خیال جزئیات کا خزانہ ہی۔ اِن دونون ظرفون مین مظروف آتے جاتے رہتے ہین لیکن بہت کم انسان ہین جو مفاہیم کلیہ اور جزئیات ذہنیہ کی ایک دوسرے سے شناخت کرسکین۔ مثلاً ہمارے ذہن مین جب انسانیت کلی کا خیال آئیگا تو فوراً معلوم ہوجائیگا کہ یہ وہی انسانیت ہی جو تمام افراد انسانی مین پائی جاتی ہے۔ یہ وہی ماہیت کلیہ ہی جس سے تمام افراد انسانی متصف ہین پس مفہوم کا جملہ افراد پر صادق آنا مفہوم کلیہ ہی اور ہر فرد کی نسبت جدا جدا خیال ہونا مفہوم ذہنی ہی۔ مثلاً زید کا تصور عقل مین نہین ہی بلکہ خیال مین ہی۔ بمبئی اور کلکتہ وغیرہ کے تصور کا خزانہ عقل نہین بلکہ خیال ہی۔ جب ہم غوص کرتے ہین تو یہ فرق فی الفور محسوس ہوجاتا ہی۔ یعنی بمجرد انتقال اور صدور کے معلوم ہوجاتا ہی کہ فلان شے کا تصور عقل مین ہی اور فلان کا خیال مین۔

خیال مین **قدرت** نے بڑے بڑے اثر رکھے ہین اور اسکو بوالعجب حکمتون سے مرکب کیا ہی۔ تمام کاروبار اور تمام سلطنتون کا انتظام محض خیال ہی پر موقوف ہی خیال مین ایک قوتِ مقناطیسی بھی موجود ہی جو ایک انسان سے دوسرے انسان پر سرایت کرتی ہی۔ مثلاً کسی شخص کی جانب سے تمھارے دل مین رنج اور کدورت ہی تو فوراً اُس کے دل مین بھی کدورت پیدا ہوجائیگی اور جس طرح تم اُس سے کھنچوگے وہ بھی تم سے کھنچے گا۔ "**دل سے دل کو راہ**" ہونے کے یہی معنی ہین۔ ایسے ہی ہر شخص کو اپنے دوست یا دشمن کی غائبانہ حالت بھی اسی خیال کے ذریعے سے معلوم ہوجاتی ہی۔ مثلاً کوئی حرمان نصیب عاشق فراق یار مین تمام رات بستر غم پر لوٹے اور یار جفاکار کسی رقیب کے پہلو مین رہے مگر صبح ہوتے ہی جب اِن دونون کی آنکھین چار ہونگین تو شب کا پردہ کھل جائیگا اور عاشق شرم آلود نگاہون کو دیکھکر صاف کہہ دے گا ~

مجھکو گھڑی گھڑی کی خبر رات بھر ملی
تم تھے جہان وہین مرا ایک خیال تھا　　ندرت

جن لوگون نے کچھ حاصل کیا ہی صرف تصفیۂ خیال اور اتحاد و اجتماع خیال سے۔ خیال ہمیشہ منتشر رہتا ہی اور اسکو انسانی تعلقات زیادہ منتشر رکھتے ہین۔ جب کسی شخص پر مصائب نازل ہوتے ہین اور افکار کا ہجوم ہوتا ہی تو قوتِ خیال بھی تھک جاتی ہی کیونکہ اُسکو کسی ایک کام پر جمنے کا موقع نہین ملتا۔ بہت سے خیالات کا تراکم اور تزاحم ہو کر ایک خیال بھی اپنے ظرف مین جمکر نہین رہ سکتا۔ روح جو مدبر بدن ہی خیالات کی اصلاح چاہتی ہی مگر بہت سے خیالات کا جمنا تو درکنار ایک خیال بھی پا قدم نہین جما سکتا۔ پس ناقص اور فاسد خیالات کو دل سے نکالنا انسان کا پہلا فرض ہے۔

کسی کی نسبت تمھارا عمدہ خیال ہوگا یا جس کو تم عمدہ بہتر اور پیارا سمجھوگے وہ بھی تمکو ایسا ہی سمجھے گا اور اُسکو تمھارے ایسے خیال کی کسی ذریعے سے ضرور اطلاع ہوجائے گی۔ جب کوئی "ہچکی" لیتا ہی تو عوام یہ خیال کرتے ہین کہ ہمکو کوئی یاد کر رہا ہی اور جب عورتون کی "بائین آنکھ" پھڑکتی ہی تو وہ یہ خیال کرتی ہین کہ اُن کا کوئی پیارا اُن سے ملے گا۔ یہ کیا بات ہی وہی قوتِ خیال ہی جس کی کشش کا اثر دل سے گزر کر انسانون کے جسم تک پہنچتا ہی۔ تصوف کے تمام ٹٹکے مسمریزم وغیرہ کے شعبدے اسی قوتِ خیال سے وابستہ ہین۔

حیوانات مین اگرچہ عقل نہین لیکن قوتِ خیال ضرور ہی جس کو واہمہ کہو یا آخذہ۔ مشہور ہی کہ برفستانی ملک کے طیور جب موسم سرما مین کابل وغیرہ سے آتے ہین تو وہان انڈے دیکر چھوڑ آتے ہین اور گو وہ ہندوستان کی جھیل

اور تالابون مین ایک عرصے تک رہتے ہین لیکن محض خیال کی سرگرمی سے اُن کو سیتے ہین اور ہندوستان سے واپس جانے پر بچے پاتے ہین۔ گو یہ بات ایک عام قصے کے طور پر مشہور ہے۔ لیکن جب ہم خیال کی مقناطیسی قوت پر نظر ڈالتے ہین تو ہمکو چندان تعجب معلوم نہین ہوتا۔

خیال بھی بے شک عمدہ چیز ہو لیکن تصفیہ خیال بڑی چیز ہو۔ اسکی مثال ایسی ہو کہ جسطرح خالص سونا ناقص دھات ملنے سے مغشوش ہو اور پھر کوئی شخص کیمیائی قوت سے تجربہ کر کے سونے کو علٰحدہ کر دے۔ اِسی طرح تصفیہ خیال سے ناقص خیالات جُدا ہو کر انسان کا دل سچے اور پاک خیالات کا مسکن بن جاتا ہو۔ جب انسان اپنے دل کو تصفیہ کی صیقل سے صاف کرتا ہو تو دل آئینہ کی طرح روشن ہو جاتا ہو اور اسکو عجائبات قدرت معلوم ہونے لگتے ہین اُمور قدرت مین جو تدبر اور تفکر کی ہدایت کیگئی ہو تو اُسکے یہی معنی ہین کہ دل کو ناقص خیالات سے صاف کر دو تو جلوۂ حقیقت تمکو نظر آئیگا آئینۂ زنگ اور کدورت سے صاف ہو تو اصل جوہر آشکارا ہو جائے۔ اب رہا یہ امر کہ تصفیہ خیال کیونکر ہو اور اسکے لیئے کونسا بہتر ذریعہ اور آلہ ہو تو مین جواب دونگا کہ اُس سچے معبود سے لو لگانا چاہیئے جس کے وجود کی کم و بیش تمام مذاہب ہدایت کرتے ہین گو بسا اوقات جھوٹ مین سچ اور کھوٹے مین کھرا ملا ہوا ہوتا ہو۔ یہ امر ہر شخص کے ”کانشنس“ پر منحصر ہو کہ جس طریقے کو وہ بہتر سمجھتا ہو اُسکے ذریعے سے منزل مقصود پر پہنچنا چاہتا ہو خواہ اُس کا خیال کیسا ہی ہو۔

ہر شے کے واسطے حد اور انتہا ہو مگر خیال کا میدان اسقدر وسیع ہو کہ اُسکے لیئے فی حد ذاتہ کوئی انتہا قائم نہین کی جاسکتی۔ ابھی یہ خیال سمندر مین پیرتا ہو ابھی یہ خیال آسمان مین تھگلی لگاتا ہو۔ ابھی یہ خیال اپنے گھر کی چار دیواری مین محدود ہو جسطرح خدا کی ماہیت کا معلوم ہونا محال ہو ایسے ہی انسان کیلئے ظاہر و باطن مین خیال کا اندازہ و تخمینہ محال ہے۔

انسانی خیال کی تاریخ بھی کوئی ایسی نہین جس سے اُسکے مختلف کوائف کا پورا نقشہ اُتر سکے۔ مگر ان جتنی انسانی تاریخین موجود ہین ایک مجمل طور پر انسانی خیال کے نقش کو لوح خاطر پر مرتسم کرتی ہین۔ فرہاد و شیرین کا قصہ، لیلی مجنون کا افسانہ، نل دمن کی داستان، وامق و عذرا کی کہانی تغیرات خیال کا نمونہ ہین۔

یہ دل کیا تھا ایک خیال تھا۔ خیال ہی نے تیشۂ فرہاد مین روانی اور بازو مین طاقت پیدا کی ورنہ کون اُمید کے بھروسے پر اتنی مدت تک سنگ تراشی کرتا۔ اگر مجنون کا خیال کسی قدرتی خوبی سے نہ لپٹا ہوا ہوتا تو عرب کے دشوار گزار میدان اور پُر خار جنگل ایک جلیل القدر شہزادہ پا پیادہ طے نہ کرتا اور لیلی کے تصور مین اپنی عمر عزیز کو فضول نہ کھوتا۔ آہ کیا خیال تھا کہ ایک معشوق مجازی کے پردے مین شاہد حقیقی کی تلاش تھی۔ معشوق ظاہری کا نہ ملنا ہی دلالت کرتا ہو کہ اسکو شاہد باطنی کا جلوہ نظر آگیا تھا اور وہ ایک ٹٹی کی آڑ مین ”شکار“ کھیلتا تھا۔ واہ یہ خیال بھی کیا رفیق طریق ہو کہ کبھی ہمارا ساتھ نہین چھوڑتا۔ زوال مین سایہ بھی ساتھ نہین دیتا۔ مگر یہ خیال اُس وقت بھی برابر کشور دل مین اورنگ نشین ہو کر جلوہ ریزی کرتا ہو۔ ایک شاعر نے اپنے خیال کو کس خوبی سے باندھا ہو ؎

میرا خیال بعد مرے پُر فشان رہے
افسوس ہو کہ مین نہ رہون اور جان رہے

ریل سے تار سے نگاہ سے جلد پہنچنے والا یہی خیال ہو۔ تار برقی تو دو گھنٹہ مین لندن تک پہنچتی ہو مگر ہم اپنے خیال کو آناً فاناً مین عالم بالا تک پہنچا سکتے ہین۔

علما و جہلا کے خیال مین صرف صحت و غیر صحت کا فرق ہوتا ہو ورنہ ماہیت شے مین کچھ اختلاف نہین۔ علما ایک صحیح خیال اُس شے کا کر سکتے ہین جس کو وہ سوچتے ہین برعکس اسکے جہلا غلطی کرتے ہین محسوسات مین تو شاید جاہلون کا خیال بھی چندان غلط نہین ہوتا مگر تصورات مین اکثر غلط ثابت ہو جاتا ہو۔ اسیواسطے ناقص خیال کے درست کرنے کا آلہ تعلیم

قرار دیا گیا ہے

مو یہ خیال شاید منطق سے زیادہ کوئی شے نہین صغریٰ، کبریٰ اور نتیجہ خیال ہی کی شطرنج ہے۔ مبارک ہین وہ لوگ جن کا خیال صحیح اور درست ہے۔ یہ حکما و متقدمین کا خیال ہی تھا جسنے زمین کو متحرک ثابت کر دیا ورنہ جمیع اقالیم کے باشندے ساکت خیال کرتے تھے اور کر رہے ہین۔ یہ خیال کتنا وسیع ہے کہ ہر طبیعت مین نئی شکل سے پیدا ہوتا ہے اور ایک سے دوسرے کا خیال لگا نہین کھاتا۔

جب قومی خیال ایک سمت مین یکسان ہو جاتا ہے اُسوقت اُس قوم کی ترقی شروع ہونے لگتی ہے۔ قومی خیال کی شراب ایسی طربناک ہے کہ سرپرستان قوم اسکو وہسکی اور شاپئین سے جو محض حیوان بنانیکے آلات ہین کہین بہتر سمجھتے ہین اور اسکی مداومت کو دل وجان سے پسند کرتے ہین۔ اگر یہ قومی خیال نہوتا تو نپولین کی فوج ظفر موج کبھی مصر و فرانس پر قابض ہوتی۔ قومی خیال کے دلدادے بڑے مبارک لوگ ہین پچھلے ازمنہ مین لوگ ان کو ولی کہتے تھے اور اُس زمانے مین قومی سرپرست اور لیڈر بولتے ہین۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ قوتِ خیال فی حد ذاتہٖ ہر حال مین اپنا اثر دکھاتی ہے اور اسکی کوئی حد اور انتہا نہین تو ہم اتنا ضرور کہین گے کہ اسکی توسیع مین علمی مذاق کو ضرور شامل کرنا چاہیے کیونکہ بغیر علمی تائید کے یہ قوتِ خیال کچھ بھی نہین۔

نُدرت میرٹھی

کلام حمید

جناب زاہد یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم فدائے جناں رہینگے
مین دل سے رو رو کے پوچھتا ہوں کہ ایسے عاشق کہاں رہینگے

کمال اُلفت کا مقتضا ہے کہ خود کو انسان بھول جائے
جو دوسروں کے لیے مرے ہیں وہ زندۂ جاوداں رہینگے

نہین ہے کوئی کسی کا دشمن ہم اپنے خود ہی عدوئے جاں ہیں
اُٹھے جو پردہ مغائرت کا تو سب یہ وہ مہرباں رہینگے

سُنا ہے دیر و حرم کی راہیں رہِ ہدا سے ملی ہوئی ہیں
تو برہمن اور شیخ کب تک تپ ستم سے تپاں رہینگے

جنھوں نے پی ہے مے معارف وہ رازِ ہستی سمجھ گئے ہیں
مرید کیسے وہ پیر بنکر فدائے پیرِ مغاں رہینگے

بھریں نہ پیرِ مغاں کا دم کیوں کہ لطف سے اُن کے میکشوں کو
ملی ہے پیری بھی اسطرح کی کہ عمر بھر وہ جواں رہینگے

لگے ہین تیرِ ستم ہزاروں مگر یہ دل ہے اُسی ہوا میں
ہمیں تو اُن کی وفا کے چرچے مدام وردِ زباں رہینگے

نہوگا اے چارہ گر کسی سے علاج دردِ جگر ہمارا
کہ ان کی تیغِ ادا کے بسمل اُسی طرح نیمجاں رہینگے

حمید یاروں کی تلخ باتیں سُنوں تو ہرگز بُرا نہ مانوں
کھلے گی اُن پہ حقیقت آخر وہ کب تلک بدگماں رہیں گے

حمید کوٹلوی

تنقیدِ کتب

خیالات عزیز | فارسی کی یہ مثل بھی کسقدر صحیح اور پُرمعنی ہے ؎

نوشتہ بماند سیہ بر سفید   نویسندہ را نیست فردا اُمید

انسانی زندگی ایک فنا ہونے والی چیز ہے۔ کوئی نہین کہہ سکتا کہ حیاتِ مستعار کی چلتی گاڑی کب رُک جائیگی۔ مولوی عزیز مرزا مرحوم کا واقعۂ وفات اسی قبیل کا تھا۔ ملک آپ کی خبر انتقال سُننے کیلئے بالکل تیار نہ تھا لیکن آئی ہوئی ساعت ٹلتی نہین اور یہی ہوا کہ غیر متوقع طور پر، ہندوستان کے علمی، ادبی حلقون کو آپ کا ماتم منانا پڑا۔ مولوی صاحب مغفور ہندوستان کے بہترین ادیب و انشا پرداز تھے اور آپ کی ذات سے صدہا تمنائین اور آرزوئین وابستہ تھین اور اسمین شبہ نہین کہ آپکے اچانک ارتحال نے اُن تمام تمناؤن اور آرزوؤن پر پانی پھیر دیا۔ سب سے زیادہ افسوس اسکا ہے کہ فرائض منصبی کی مصروفیت نے مرحوم کو کافی موقع ہی نہین دیا کہ وہ اپنے علمی کارنامون کی فہرست وسیع کر سکتے۔ دو ایک کتابین از قسم "گلگشتِ فرنگ" اور "سیرۃ المحمود" لاکلام آپ کی خداداد قابلیت و تحقیق پسندی کا مکمل نمونہ ہین۔ لیکن درحقیقت یہ کتابین نمونہ تھین۔ آگے چلکر آپ کے طبعی جوہر اور فطرتی کمال کی جو جیتی جاگتی تصویرین بزم ادب کی زیبائش کا سامان مہیا کرنے والی تھین اُن کے محاسن کا اسوقت اندازہ کرنا بھی محال ہے۔ افسوس موت نے مرحوم کو مہلت نہ دی اور اب ہمارے لیئے سوائے اسکے چارہ کیا ہے کہ آپ کی موجودہ الوقت تصانیف و تراجم وغیرہ کو غنیمت سمجھکر، اُردو زبان کے ایک گرانقدر محسن کی یادگار کے طور پر، اُنھین سر آنکھون پر لین۔ منشی دیا نرائن صاحب نگم کا خدا بھلا کرے کہ آپنے مرحوم کے اکثر علمی ادبی و تاریخی و ملکی مضامین کو ترتیب دیکر کتاب کی صورت مین چھپوا دیا ہے۔ مولوی عزیز مرزا مرحوم اُردو ادب کے زبردست حامی اور اسی لحاظ سے زمانہ کے مخلص سرپرست تھے اور ایڈیٹر زمانہ نے اِن مضامین کو شائع کر کے اُس خلوص و انسیت کا ثبوت دیا ہے جس کا اِن دنون قحط پڑا ہوا ہے۔ خدا کرے اُنکی یہ کوشش مشکور ہو۔

خیالات عزیز کے محاسن باطنی کے متعلق کچھ زیادہ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ مرحوم کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ عزت و احترام کا مستحق ہے۔ زباندانی، انشا پردازی، نکتہ شناسی، تحقیق پسندی، طرز بیان، ہر اعتبار سے "خیالات عزیز" کی ایک ایک سطر بے مثل ہے۔ مولوی عزیز مرزا مرحوم کے مضامین کی ایک مابہ الامتیاز خصوصیت آپ کا انداز تحریر ہے جسمین سلاست کے ساتھ متانت کی عجیب و غریب شان نظر آتی ہے۔ اِس مجموعہ کا ہر ایک مضمون اِس خوبی کا مشترک دعویدار ہے۔ شروع مین نواب وقار الملک بہادر کا لکھا ہوا ایک دیباچہ ہے جس کے مطالعہ سے مصنف "خیالات عزیز" کے دلچسپ حالات زندگی کے پہلو بہ پہلو اُنکی علمی مصروفیت اور ادبی ذوق شوق کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مصنف کی ہاف ٹون تصویر بھی شامل ہے جس نے کتاب کی ظاہری دلچسپیون مین اور اضافہ کر دیا ہے۔ لکھائی چھپائی، کاغذ، سب چیزین اچھی ہین اور رعایت مین یہ گرانقدر جنس بالکل ارزان ہے۔ مینیجر صاحب زمانہ کانپور سے طلب کرنا چاہیئے۔

الدلیل علی المولد والدخیل | ہندی مثل ہے کہ خربزہ کو دیکھکر خربزہ رنگ پکڑتا ہے۔ اسکی تطبیق زبانون پر بھی ہو سکتی ہے کہ جب دو مختلف زبانون کا میل جول ہوتا ہے تو ایک کا دوسرے سے متاثر ہونا لابدی امر ہے۔ اُردو زبان نے سنسکرت، عربی اور فارسی کے ہاتھون تربیت پائی ہے۔ لیکن اسوقت اگر اُردو کا کوئی جامع لغت تیار کیا جائے تو انگریزی الفاظ ہزارون کی تعداد مین ملین گے، اور نہ صرف انگریزی بلکہ پرتگالی، اور فرنچ زبانون کے الفاظ بھی۔ یہی عالم اسوقت عربی زبان کا بھی ہے کہ اُسمین

اکثر الفاظ غیر زبانون کے کچھ اسطرح آکر شامل ہو گئے ہین کہ اصل و مستعار مین کوئی بین فرق نظر نہین آتا۔ یہی سبب ہو کہ ہندوستان مین اکثر عربی خوان اصحاب، مصر کے عربی اخبارات پڑھکر تفہیم مطالب مین قاصر پائے جاتے ہین۔ مولٰنا سید سلیمان عربک پروفیسر دار العلوم ندوہ نے اسی قسم کے تقریبًا چار ہزار الفاظ کو مندرجۂ بالا نام سے ایک جگہ جمع کیا ہو اور اسمین کوئی شک نہین کہ مولٰنا کی یہ کوشش خاص طور پر قابل تعریف ہو۔ اسکی مدد سے عربی اخبارات و رسائل اور جدید تصنیفات کا مطالعہ از بس آسان ہو سکتا ہو۔

شروع مین مولٰنا سید سلیمان نے زبانون کے اصناف و اقسام پر نہایت قابلیت سے بحث کی ہو اور یہ دکھایا ہو کہ عربی زبان مین ضروریات تمدن کے سبب سے جدید اصطلاحات و محاورات کیون اور کسطرح شامل ہو گئے ہین۔ آپنے تمام الفاظ و اصطلاحات جدیدہ کو دو قسمون پر تقسیم کیا ہے۔ یعنی مولّد اور دخیل (یا معرّب) پھر ہر ایک کی جداگانہ اصناف کو امثال و نظائر کے ذریعہ سے واضح کر دیا ہو اور آخر مین اپنی کتاب کا موضوع حسب ذیل الفاظ مین قلمبند فرمایا ہے:۔

اس کتاب مین صرف وہ دخیل اور مولد الفاظ لئے گئے ہین جو ابتک مستعمل ہین اور کتب لغات قدیم مین وہ مدون نہین ہوئے۔ جو الفاظ اب متروک ہین یا لغات مین ملتے ہین اُنکی ضرورت نہین سمجھی گئی۔

"الدلیل علی المولد والدخیل" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہو کہ لسانی ضروریات کی تکمیل، بشرطیکہ اُس کے لیے حقیقی طور پر کوشش کیجائے کسقدر سہولت سے ہو سکتی ہو۔ اُردو مین اصطلاحات جدیدہ کی تدوین کا خواب برسون سے دیکھا جا رہا ہو لیکن اُسکا نتیجہ معلوم۔ عربی مین دیکھئے تقریبًا ہر جدید اصطلاح کے لیے کوئی نہ کوئی لفظ ایسا موجود ہی جس سے بہتر ہو نہین سکتا۔ عربی زباندانون کی وسیع النظری کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہوگا کہ اُنھون نے اپنی ادبی ضرورتون کے رفع کرنے کے خیال سے زیادہ ردوکد سے کام نہین لیا اور "لکھنؤ" اور "دلی" سے فتوے منگانے کی ضرورت محسوس نہین کی بلکہ اپنی سمجھ سے اصل اصطلاح مین کچھ تغیر و تبدل کر کے اُسے اپنے مطلب کا بنا لیا اور اُسکا استعمال شروع کر دیا، اور رفتہ رفتہ اُسکا رواج تمام مُلک مین ہو گیا۔ ہمارے ہان سب سے زیادہ کام اخبارات اور موقت الشیوع رسائل نے کیا ہو۔ اُردو اخبارات بھی اسی قبیل سے اپنی زبان کی بیش قیمت خدمت کر سکتے ہین۔ لیکن اس کے لیے دردمندی اور ضرورت شناسی درکار ہے۔

ہمین اُمید کرنا چاہیئے کہ اُردو اصطلاحات کا مجموعہ اگر کبھی مکمل ہوگا تو اُسکی ترتیب مین مولٰنا سید سلیمان کی اس مفید تالیف سے بہت مدد مل سکے گی، جو بقیمت عہ معین الندوہ لکھنؤ کے پتہ سے دستیاب ہو سکتی ہو۔

تو زک قیصری | پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی اس اعتبار سے مستغنی عن التعریف ہین کہ پنڈت جی کی اکثر قابل قدر نظمین مُلک کے علمی رسائل مین شائع ہو کر مقبولیت عامہ کا خلعت پا چکی ہین۔ مسدس کیفی جو مشہور "مسدس حالی" کے طرز پر لکھا گیا تھا اسبات کا شاہد ہو کہ حضرت کیفی کو تاریخی واقعات کے قلمبند کرنے مین کمال حاصل ہو اور اسکا تازہ ثبوت "تو زک قیصری" سے بھی ملتا ہو۔

"تو زک قیصری" دہلی دربار ۱۹۱۱ع کی یادگار مین لکھی گئی ہے جو تاریخی نظم کا درجہ رکھتی ہو اور جسمین ہند کے قدیم تاریخی واقعات سے لیکر دور جدید کے حالات تک نظم ہوئے ہین۔ حضرت کیفی ایک مشاق سخن گو ہین لیکن "تو زک قیصری" کے صفحات زباندانی کی اکثر معمولی معمولی اسقام سے مملو نظر آتے ہین۔ خواہ اسکی وجہ یہ ہو کہ آپ ان کی پروانہ کرتے ہون یا اس قسم کا سقم آپ کے نزدیک سقم نہو۔ مثال کے طور پر اس جگہ چند فروگذاشتون پر مصنف کو توجہ دلانیکی ضرورت معلوم ہوتی ہو۔

تخت دہلی پر تھا متمکن تھوڑا ان دنون
جسکی تدوین فارس اور خلفائے عباسی کی

فہم عالمگیر مین لیکن نہین آیا یہ راز

"متمکن" کی ت اور "مخلفائے" کا لام ساکن نہین بلکہ متحرک بہ فتح ہونا چاہیے۔ اور تیسرے مصرع مین "نہین" کی جگہ "نہ"۔ تقدیم و تاخیر کا عیب اکثر اشعار مین موجود ہی۔ بعض محاورے خالص پنجابی ہین اور گو اُن کا استعمال اخباری تحریرات مین پایا جاتا ہی تاہم زباندانان اُردو نے اُنھین ابتک صحیح نہین تسلیم کیا تھا۔

جن مین تازہ جوش تھا اسلام نے پھونکا ہوا

ہان ان اسقام سے قطع نظر تو تزک قیصری مین بہت سی خوبیان بھی ہین۔ تاریخی واقعات کے نظم کرنے مین غیر معمولی قوت فکر سے کام لینا پڑتا ہی۔ اور اس کا لحاظ رکھنے کے بعد حضرت کیفی کو اُنکی کامیابی پر مبارکباد دینا پڑتی ہی۔ بعض مقامات خصوصیت سے قابل تعریف ہین کہین کہین سلاست بیانی کے ساتھ تخیلات کی تازگی نے عجب پُر لطف کیفیت پیدا کر دی ہی۔ شلاً انگریزی راج کی مدح سرائی کرتے ہوے یہ اشعار کتنے اچھے کہے گئے ہین سه

دور اکبر اور تھا قیصر کا دوران اور ہی — ضابطہ کچھ اور ہی اور شخصی فرمان اور ہی
پہلے شاہی حکم تھا حکم خدا کا ہمردیف — ملک مین اب حکم شاہنشہ کا برہان اور ہی
حکم حاکم اب نہین مرگ مفاجات اسکجگہ — اب یہان تنقید جمہوری کا الحان اور ہی
ہی رعایا صدق دلسے بادشہ کی جان نثار
جانتا ہی شاہ اسکا آپ کو خدمت گذار

تزک قیصری کی کاپیان، جو معمولی طور پر مجلد بھی ہین، ۸ر قیمت پر حضرت مصنف سے جالندھر شہر کے پتہ پر درخواست کرنیسے مل سکتی ہین۔

کلام قیصر اعلیحضرت حضور ملک معظم اور برٹش تاج سے اہل ہند کو جو دلی ارادت و عقیدت ہی اسکا یہ قدرتی اور لازمی نتیجہ سمجھنا چاہیے کہ ذات شاہانہ سے نسبت رکھنے والی ہر چیز اُن کے خیال مین غیر معمولی عزت و احترام کی مستحق ہی۔ گذشتہ دربار دہلی کے موقع پر حضور موصوف کا محض رعایائے ہند کے خاطر بحری سفر کی صعوبات برداشت کے، ہندوستان تشریف لانا، انگریزی تاریخ ہند مین اپنے قسم کا پہلا واقعہ تھا۔ اہل ہند نے بھی جس خلوص و عقیدت کے ساتھ اپنے بادشاہ جم جاہ کو خیر مقدم کہا وہ بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے عدیم النظیر چیز تھی۔ عدن ہندوستان کا دروازہ تسلیم کیا جاتا ہی اور جوش وفاداری و ارادت کے اظہار کی شروعات بھی وہین سے ہوئی۔ یعنی حضور ملک معظم کی خدمت مین وہان کے لوگون نے ایڈریس پیش کرنے کا سب سے پہلے فخر حاصل کیا۔ ہندستان مین خاص قدم رنجہ فرمانے کے بعد حضور لامع النور کو مختلف شہرون مین مختلف طبقون اور حلقون کی جانب سے ایڈریس منظور کرنے اور اُن کا جواب ارشاد فرمانے کی ضرورت پڑی۔ کچھ شک نہین کہ بفحوائے "کلام الملوک، ملوک الکلام" اعلیحضرت حضور ملک معظم کی تمام جامع اور مانع تقاریر، جن مین سے اکثر اہل ہند کے ملکی و معاشرتی حقوق کی توثیق کا ذریعہ اور سند ہین، خاص اہمیت و وقعت رکھتی ہین۔ مسٹر ایم۔ ایل۔ رلیا رام بی اے۔ ایل ایل۔ بی، اور منشی غلام قادر فرخ ایڈیٹر انسان امرتسر تعریف و توصیف کا استحقاق رکھتے ہین کہ آپ دونون صاحبون نے اپنی مشترکہ مساعی جمیلہ سے ان تمام تقریرون اور جوابونکو کتاب کی شکل مین مدون کر کے اُنھین مستقل بالذات بنا دیا ہی۔ قابل مولفون نے اپنی مختصر لیکن کار آمد و دلچسپ تالیف کو مزید دلفریب و مفید بنانے کی غرض سے اسمین کئی ایک اچھی اچھی نظمین اور دو ایک نثر مضامین بھی اضافہ کر دیے ہین، شلاً ملک معظم و ملکہ معظمہ کی مختصر سوانح عمری، یا نادر کاکوروی، اور حضرت اقبال کی درباری نظمین اور اشعار۔ کاش ترجمہ مین سلاست اور روانی کا زیادہ خیال رکھا جاتا کیونکہ بحالت موجودہ اسمین یہ صفات مفقود ہین۔ لفظی ترجمہ کی پابندی سے بسا اوقات زبان پایہ فصاحت سے ساقط ہو جاتی ہی اور یہ نقص "کلام قیصر" مین بہت بڑی حد تک موجود ہی۔ یا درِ مشفقہ

ملکۂ معظمہ وکٹوریہ، حضور ایڈورڈ ہفتم، ملکہ الکزنڈرا، حضور جارج خامس و ملکہ میری اور لارڈ ہارڈنگ کی ہاف ٹون جداگانہ تصاویر سے کتاب کی دیدہ ریزی اور دل آویزی کئی حصے بڑھ گئی ہی۔ قدردانان علم و فن کو اس کتاب کا ایک ایک نسخہ اپنے پاس ضرور رکھنا چاہیے۔

مولفین نے عام ضروریات کو مدنظر رکھکر "کلام قیصر" کے ہندی اور گورکھی ایڈیشن بھی شائع کیے ہین۔ اُردو اور ہندی نسخہ ۲ر ہین اور گورکھی ۸ر ہین منیجر صاحب رسالۂ انسان امرتسر سے طلب کرنا چاہیے۔

النحل | اس چھوٹی تقطیع کے تقریباً سوا سو صفحے کی دیدہ زیب و دلپسند کتاب کے لیے جس مین محاسن باطنی وظاہری بحصّہ وافی موجود ہین ملک کو جناب سید راحت حسین صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ایل کا ممنون ہونا چاہیے۔ سید صاحب، دور جدید کے اہل قلم طبقے مین ممتاز و موقر شخصیت رکھتے ہین اور آپ کی کارآمد اور عالمانہ تحریرین اب سے بہت پہلے مقبولیت عامہ کی سند حاصل کر چکی ہین "النحل" مین جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہی شہد کی چھوٹی مکھیون کے حالات غیرمعمولی شرح وبسط سے قلمبند کیے گئے ہین۔ سید صاحب کو اس قسم کے مضامین پر قلم فرسائی کرنے کی غیرمعمولی دستگاہ حاصل ہی۔ اسکا ثبوت اس تازہ تالیف سے بھی ملتا ہی۔

سید صاحب نے اپنی اس جدید تالیف کی غرض وغایت اِن الفاظ مین بیان فرمائی ہے۔

> اول فائدہ جو اس مضمون کے مطالعہ سے ہمکو حاصل ہوتا ہی وہ یہ ہی کہ ہماری معلومات زیادہ ہوتی ہی . . . . . . یہ کتاب ہمکو اوقات کی پابندی، لگاتار محنت، کام کرنے کی عادت، کفایت شعاری، رموز سیاست و تمدن وغیرہ کا ایسا اچھا سبق سکھاتی ہی کہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہی۔ لیکن اس رسالہ کو لکھنے مین مولف کی بالکل دوسری غرض ہی اور وہ زراعت اور تجارت کی ترقی ہے۔

اسمین کوئی شبہ نہین کہ مکھیون کی پرورش اور شہد کی پیداوار تجارتی اور اقتصادی فوائد کے لحاظ سے بہت نفع بخش ہی اور ممالک یورپ اور بعض حصص عرب و افریقہ مین شہد کی مکھیون کے پلنے کا عام دستور بہت قدیم ہی۔ مولف کا بیان ہی کہ اقلیم روس و جرمن مین اسکا رواج خصوصیت سے بہت زیادہ ہی۔ ہمارے یہان ہندوستان مین شہد کی ضرورت مسلّم ہی اور اکثر جگہون پر نہایت اعلی درجے کا شہد پایا جاتا ہی لیکن آج تک کسی نے کبھی اس کی تجارت کو باقاعدہ بنانے اور اُسے فروغ دینے کا خیال نہین کیا۔ بلکہ آجکل یہان جس طریقے سے شہد حاصل کیا جاتا ہی وہ بہت ظالمانہ اور قابل اعتراض ہے، جس سے اندیشہ ہوسکتا ہی کہ شاید کسی وقت عمدہ نسل کی مکھیان اور اعلیٰ درجے کا شہد یہان سے قطعاً ناپید ہو جائے۔

حضرت مولف وعدہ فرماتے ہین کہ اگر اُن کا یہ رسالہ جس مین مکھیون کے واقعات زندگی درج ہین قدردانی کی نظر سے دیکھا گیا تو آئندہ اُنکی پرورش کے متعلق مبسوط ومشرح کتاب لکھکر ملک کے سامنے پیش کرینگے۔ مناسب تو یہی تھا کہ "واقعات زندگی" اور "طریق پرورش" پر جداگانہ رسائل لکھنے کی جگہ یہ دونون مضامین ایک ہی مستقل کتاب کی شکل مین قلمبند کیے جاتے اور موخرالذکر کی اشاعت کو ملک کی قدردانی کی شرط سے مشروط نہ کیا جاتا تاہم اب چونکہ پہلا حصہ نکل چکا ہی اس لیے یہی استدعا کافی ہوگی کہ وعدہ کا بہت جلد ایفا فرمایا جائے کیونکہ حقیقتاً "زراعت و تجارت کی ترقی" اُسی پر منحصر ہوسکتی ہی ورنہ موجودہ رسالہ سے کسی مستقل فائدہ کی اُمید کرنا فضول ہی لیکن اس سے یہ مطلب نہین کہ "النحل" کی اشاعت فضول ہوئی ہی بلکہ اسکے مطالعہ سے من چلی طبیعتین ضرور متحرک ہو سکتی ہین اور تحریص و تشویق کا اچھا سامان پیدا ہو سکتا ہی۔

"النحل" کی قسم کا مفید و کارآمد لٹریچر ہماری "لنگوا فرینکا" مین

بہت کم ہی اور اس اعتبار سے سید راحت حسین صاحب کا یہ رسالہ جو علم الحیوانات سے متعلق ہی قابل قدر چیز ہی۔ شہد کی مکھیون کے معمولی حالات، شاید عام لوگون کو بھی معلوم ہوتے ہین لیکن اس کتاب مین وافر معلومات علمی اور سائنٹفک ہین جنکا مطالعہ خواص وعوام دونو کیلئے بیکار نہین ہوسکتا۔ مکھیون کے حالات، اُن کے کام، اُن کی معاشرت اُن کے تمدن اور اُنکی زندگی کے ہر شعبے پر اس خوبی سے روشنی ڈالی گئی ہی کہ باید وشاید۔ عبارت کی سلاست اور طرز بیان کی خوبیون نے اس روکھے پھیکے مضمون کو نہایت دلچسپ بنادیا ہی اور واقعات اس ترتیب اور اس سلوب سے درج کیے گئے ہین کہ ناظر کو پڑھنے مین اُلجھن مطلق نہین ہوسکتی بلکہ اُسے ناول کا لُطف آتا ہی۔ گویا اس کتاب مین علمی پہلو سے قطع نظر ادبی نقطہ نگاہ سے بھی بہت سی خوبیان موجود ہین۔ مکھیون کے عجیب وغریب اور محیر العقول طرز معاشرت ونظام تمدن کا خاکہ جن الفاظ مین دکھایا گیا ہی وہ بجائے خود مستقل دلچسپی کی چیز ہی۔ دُعا ہی کہ "النحل" مُلک مین عام قدردانی کے ہاتھون لیجائے اور مولف کی وہ ساری تمنائین پوری ہون جن کو مدنظر رکھکر اسکی ترتیب وتدوین کی زحمت گوارا کیگئی ہی قیمت ۱۰/ ہی اور حضرت مولف سے جمولی ضلع مونگیر کے پتے سے مل سکتی ہے۔

القرض یہ ایک "لطیف مسدس" ہی جو منشی واحد علی اثر قدوائی کے نتائج افکار مین سے ہی۔ یہ نظم ماہ فروری مین مسلمانون کے ایک عام جلسے مین بمقام رامپور جسکی غرض انعقاد، خریداری تمسکات ترکی سے متعلق تھی پڑھی گئی تھی۔ مسدس کی زبان اور بیساختگی قابل تعریف ہی۔ اور اکثر اوقات ادائے مطلب کیلئے کچھ ایسا دردناک پہلو اختیار کیا گیا ہی جس کو پڑھکر اخوت وہمدردی کا جذبہ دل مین از خود پیدا ہوتا ہی۔ اس سے پہلے یہ مسدس اخبارات مین شائع ہوچکا ہی قیمت وغیرہ رسالے پر کہین درج نہین ہے۔

اسلامی پنچایت ڈھاکہ ہندوستان کے اُن کثیر التعداد شہرون مین جن کے نام کے ساتھ اکثر مہتم بالشان تاریخی واقعات اور اسلامی روایات وابستہ ہین، ڈھاکہ ایک امتیازی شہرت رکھتا ہی۔ صرف اسی قدر کہدینا ثبوت کیلئے کافی ہوگا کہ باوجود مرور ہوا کے وہان بعض نہایت قدیم رسم ورواج کا اسوقت بھی پتہ چلتا ہی اور پُرانی تہذیب وتمدن کی دلچسپ مثالین وہان ابتک باقی ہین جن کے منجملہ اسلامی پنچایت سسٹم خاص طور پر قابل ذکر ہی۔ اسی سسٹم کی مشرح ومبسوط کیفیت مندرجہ عنوان نام کے ایک رسالے مین خان صاحب خواجہ محمد اعظم صاحب رئیس اعظم ڈھاکہ نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ قلمبند کی ہے جو اسوقت ہمارے پیش نظر ہے۔

خواجہ صاحب نے سب سے پہلے لفظ "پنچایت" کی شرح فرمائی ہی اور اسکے مخرج کے متعلق کئی روایات پر نظر تنقید ڈالنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہین:-

> ہر ایک پنچایت مین پانچ ایسے منتخب ممبر ہوتے ہین جو بہ لحاظ سن وسال عقل وتجربہ دوسرے ممبرون سے ممتاز خصوصیت رکھتے ہین۔ اِن پانچ شخصون کا نام پنچایتی اصطلاح مین پانچ لائق برادر ہی۔ یہی لائق برادر سردار کی کونسل کے ارکان انتظامی ہین اور انھین پر اکثر اُمور کا دار ومدار رکھا جاتا ہی۔ پس چونکہ یہ جماعت درحقیقت اپنے اصلی اجزا، مقاصد مین پانچ شخصون کی تابع ہی اس لیے جماعت کا نام پنچایت رکھا گیا۔

خواجہ صاحب کی رائے مین" یہ توجیہ دیگر توجیہات سے زیادہ قرین قیاس ہی" اور ہم بھی اسکے ساتھ اتفاق کرتے ہین۔ "اسلامی پنچایت ڈھاکہ" کے حالات غایت درجہ دلچسپ قابل دید ہین اور خواجہ صاحب متعدد اسباب وعلل پر بحث کرنے کے بعد اس امر کے دعویدار ہین کہ اس اسلامی پنچایت کی ابتدا اُس وقت سے ہی جبکہ بنگال مین مسلمان حکمرانون کا قدم تک نہ پہنچا تھا اور اہل اسلام ہندو حکومت کے زیر سایہ

بطور رعایا کے زندگی بسر کرتے تھے۔ گویا مسلمانون نے امداد باہمی کے اُصول کو مد نظر رکھکر اپنے یہان اس طریقے کو رائج کیا تھا۔

"ڈھاکہ پنچایت" کے نظام عملی کی تفصیلی کیفیت نہایت حیرت انگیز اور سبق آموز ہی اور بالخصوص اس زمانے مین ایک نادر الوجود چیز ہی۔ اسکا مختصر حال یہ ہی کہ ایک محلہ مین ایک ایک پنچایت ہی۔ تمام لوگ ایک خاص شخص کے ماتحت ہوتے ہین جسکو زمانہ سابق مین "میر محلہ" اور اب "سردار" کہتے ہین۔ "سردار" کا عہدہ پہلے موروثی تھا لیکن اب اسکا تقرر بذریعۂ انتخاب عامہ ہوتا ہی۔ فرائض کی انجام دہی مین سہولت پیدا کرنے کی غرض سے "سردار" کے ماتحت ایک نائب سردار ہوتا ہی۔ ہر ایک محلہ وار پنچایت مین ایک خبر رسان ہوتا ہی جو برادری کی شادی وغمی کی اطلاع تمام لوگون کو کرتا ہی۔ جماعت پنچایت مین "پانچ لائق برادر" ہوتے ہین جو امور مابہ النزاع کے فیصلہ کے وقت سردار کی کونسل کے ممبر کے طور پر کام دیتے ہین۔ محلہ کی تقریبات شادی وغمی مین مناسب مدد دینا، تنازعات باہمی کا فیصلہ کرنا، پنچایت کا اصل اُصول ہی۔ یہ بات خصوصیت سے لکھنے کے قابل ہی کہ ڈھاکہ کی اسلامی آبادی ضرورت کے وقت کسی پیشہ ور کی محتاج نہین بلکہ جیسا کہ خواجہ صاحب فرماتے ہین شادی وغیرہ کی خبر گھر گھر پہنچانا یہ کام جیسا کہ ہندوستان بھر مین رائج ہی نائی کا نہین بلکہ اُسکو ایک پنچایتی عہدہ دار انجام دیتا ہی جسے "گرید" "خبر رسان" کہتے ہین۔ اسیطرح مردہ شو اور گورکن خاص پیشہ ور لوگ نہین ہین بلکہ اُسکو بھی پنچایت کے ہر ایک ممبر جو اس قابل ہون انجام دیتے ہین اور یہ یہان عیب کے بدلے مستحسن خیال کیا جاتا ہی۔

اتفاق، اُخوت باہمی، اور ایثار نفس کی اس سے زیادہ قابل قدر مثال ملنا ناممکن ہی اور مسلمانان ڈھاکہ اس کے لیے مبارکباد کے مستحق ہین۔

یہ تمام محلہ وار پنچایتین دو حصون مین منقسم ہین۔ ایک کو "بارہ" اور دوسرے کو "بائیس" کہتے ہین۔ یہ دونون فریق ۱۳۲ پنچایتون پر مشتمل ہین جن کے اوپر ایک سپرنٹنڈنٹ ہوتا ہی۔ خدا کا شکر ہے کہ آجکل یہ قومی عہدہ "اسلامی پنچایت ڈھاکہ" کے مرتب مولف جناب خانصاحب خواجہ محمد اعظم صاحب کو حاصل ہی جنکی دور اندیشی اور وسعت نظری کیوجہ سے بہت سی قابل قدر اصلاحین اسوقت تک عمل مین آچکی ہین۔ اسمین کوئی شک نہین کہ "اسلامی پنچایت ڈھاکہ" ہندوستان بھر مین ایک عدیم المثال معاشرتی جماعت ہی۔ اگرچہ قرین قیاس ہی کہ اسمین ضروریات موجودہ کے لحاظ سے کچھ ترمیم و اصلاح کی گنجائش نکل سکے لیکن قیود و شرائط کی بھرمار کر دینا کسی طرح مناسب نہوگا۔ پنچایت کا بہترین نفع یہی ہی کہ اس کے ذریعے سے متخاصمین کی نزاع کا فیصلہ بغیر قانونی پابندیون کے ہو سکتا ہے۔

خواجہ صاحب نے اپنے رسالہ کا ایک انگریزی ایڈیشن بھی شائع کیا ہے اور خوب کیا ہے۔ قیمت وغیرہ کتاب پر کہین درج نہین ہے۔

سید القلم

ضرورت

گریۂ مسکین

مین اسٹیمر پر بیٹھا ہوا ڈیرہ اسمٰعیل خان جا رہا تھا۔ میری بیوی بھی میرے ساتھ تھی جس کمرے مین ہم دونون بیٹھے تھے اُسے مین نے پہلے ہی سے رزرو کرا لیا تھا۔ آپسمین باتین کرتے کرتے دوپہر دن گذار دیا۔ شام ہونے سے کچھ عرصہ پہلے دریائے سندھ کی سرد ہوا کے جھونکون نے میری بیوی کو سُلا دیا۔ مین نے سوچا اوپر چھت پر چل کر غروب آفتاب کا نظارہ دیکھون اور ہوا خوری کرون۔

اُسوقت اسٹیمر دریا خان کے گھاٹ سے روانہ ہو چکا تھا کیبن کے اندر معلوم ہوتا تھا کہ سورج غروب ہو چکا ہی لیکن جب باہر نکلا تو دیکھا کہ سورج ابھی تیزی سے چمک رہا ہی۔ اس لیے چھت پر جانا مناسب نہ سمجھا۔ ڈوک پر ہی اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا سندھو ندی کی فراخ چھاتی پر ہلکی ہلکی موجین اُٹھ رہی تھین۔ پانی مین بھیگی ہوئی ہوا بدن کو آ کر لگتی تو نہایت فرحت بخش معلوم ہوتی تھی۔ مین دور ہٹتے کنارہ کو دیکھ رہا تھا کہ ایک مفلوک الحال نوجوان نے آ کر میرے پیرون کو چھوا اور بڑے ادب سے تعظیم کی۔

مین نے عینک اُتار کر اُس نوجوان کی طرف بڑے غور سے دیکھا لیکن حافظہ پر بہت زور ڈالنے کے باوجود معلوم نہ کر سکا کہ اِس سے پہلے مین نے کہان دیکھا ہی۔

اسکی عمر کم و بیش ۲۵ سال کی ہوگی۔ اکہرا بدن، آنکھین اندر کو گھُسی ہوئی، سر پر بڑے بڑے بال، اور اُن پر سفید پگڑی شکل و صورت کو دیکھکر خود بخود میرے دل مین خیال پیدا ہوا کہ وہ کسی تکلیف مین مبتلا ہے۔

مین نے بھوؤن کو کسیقدر سکیڑ کر پوچھا "آپ کون ہین؟"

اُس نے جواب دیا "میرا نام مولراج ہی اور مین ملتان کا رہنے والا ہون"

مولراج نام کا کوئی ملتانی میرا واقف نہ تھا اس لیے کسیقدر تامل کے بعد مین نے پھر کہا "آپ نے مجھے کیسے پہچانا؟"

اس نے ہنسکر جواب دیا "پنجاب مین ایسا کون ہی جو آپ کو نہین پہچانتا۔ آپ کے برابر ملکی صلاح و فلاح مین حصّہ . . ."

مین نے بات کاٹ کر پوچھا "خیر اب آپ کیا چاہتے ہین؟"

اُسنے بڑے تحمل سے جواب دیا "جو کچھ مین چاہتا ہون وہ ابھی آپ سے عرض کر دون گا۔ باتین بہت سی ہین اگر آپ تھوڑا وقت ہرج کر کے غور سے سُنین تو آپ کی عنایت ہی۔" اتنا کہکر اُسنے آنکھین نیچے کی طرف جھکا لین۔

مین حیران تھا کہ کیا اسرار ہی۔ آخر یہ سوچکر کہ شاید کچھ مانگتا ہوگا مین نے اپنا منہ پھیر کر کہا "بہتر۔ آپ جو کچھ چاہتے ہین کہ ڈالیے۔"

وہ بولا "جناب ذرا تنہائی مین چلیئے تو کچھ عرض کرون۔ آئیے وہ جگہ خالی ہے۔"

معاملہ کی تہ کو معلوم کرنے کی نیت سے مین "چلیئے" کہکر آگے آگے چل پڑا چند قدم چلکر مین اسٹیمر کی ریلنگ کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی میرے بغل مین کھڑا ہو کر میرے مُنہ کیطرف دیکھنے لگا۔

اسکی یہ صورت دیکھکر میرے دل مین یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید وہ کسی وقت اچھی حالت مین ہوگا اب اتفاقات زمانہ سے اس نوبت کو پہنچ گیا ہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سوال اِس کے منہ تک آ آ کر رُک جاتا تھا۔ آخر چند منٹ کی خاموشی کے بعد وہ بولا "آپ کچھ سمجھے مین نے آپ کو کس لیئے تکلیف دی ہے؟"

مین نے جواب دیا "بالکل نہین۔"

وہ کہنے لگا "آپ میرے باپ ہین۔

مجھے پہلے تو اسکی بات پر غصہ آنے لگا لیکن پھر بے اختیار ہنسی آ گئی۔ مین نے زور سے ہا ہا ہا ہا کر کے ہنس پڑا اور پوچھا "کیسے"

میری ہنسی پر وہ کسیقدر متین صورت بنا کر کھڑا ہو گیا اور بولا "آپ میرے باپ ہین یا نہین، مین ٹھیک نہین کہہ سکتا۔ البتہ آپ کی اہلیہ محترمہ میری والدہ ہین" اتنا کہکر اسنے آسمان کی طرف دیکھنا شروع کیا اور ہاتھ جوڑ کر پرنام کرنے لگا۔

مین اسکی حالت اور اسکی حرکت کو دیکھکر یہی سمجھا کہ کوئی دیوانہ ہے۔ میرے دل مین جو غصہ اور نفرت پیدا ہوئی تھی اس کا احساس اب دور ہو گیا اور اس کے بجائے رحم کا خیال پیدا ہوا۔

وہ میرے چہرے سے میرے دلی خیالات کا اندازہ کر کے گویا ہوا "آپکو میری بات پر یقین نہین آیا؟ یا شاید آپ مجھے پاگل سمجھتے ہین۔ معاف کیجیئے گا اسمین آپ کا کچھ قصور نہین۔ آپ کے بجائے اور کوئی ہوتا تو اسکے دل مین بھی ایسے ہی خیالات پیدا ہوتے لیکن یقین مانیئے کہ مین انھین اپنی ماتا ہی سمجھتا ہون آج پانچ برس کا عرصہ ہونے کو آیا کہ مین دق کے خوفناک مرض مین مبتلا ہون۔ بیشمار بید ون ڈاکٹرون اور حکیمون سے علاج کرایا کچھ فائدہ نہین ہوا۔ مین ڈی لے وی کالج کے بی اے کلاس مین پڑھتا تھا اُس تعلیم کو بھی بند کرنا پڑا۔ دیکھیئے اب بدن مین کچھ نہین رہا۔ صرف ہڈیان ہی ہڈیان ہین۔ اب مین زیادہ سے زیادہ چند روز کا مہمان ہون آج کم و بیش ایک ہفتہ کا عرصہ ہوا کہ مین شہر کے باہر پرہلاد یوی کے مندر مین جا کر دن بھر پڑا رہا۔ کتنا رویا کتنا چلایا۔ دیوی کے سامنے بہت پرارتھنا کی۔ آخر کو کچھ رات گئے گھر لوٹا۔ سوتے مین خواب دیکھا کہ دیوی میرے سرہانے کھڑی ہین۔ مین نے انکے قدم پکڑ لیئے وہ آپ کا نام لیکر کہنے لگین "ان کی استری تیری اگلے جنم کی ماتا ہین۔ ایک روز شراب پی کر تو نے انھین بہت سخت گالی دی تھی۔ اسکا نتیجہ تو اس مرض کی صورت مین بھگت رہا ہے۔ ان کے پاس جا اب بھی تیرا کچھ نہین بگڑا۔ جا اُنھین کا چرنامرت پی۔ اچھا ہو جائے گا" اتنا کہکر دیوی نظرون سے غائب ہو گئین۔

اسقدر کہنے کے بعد وہ چپ ہو گیا۔ مین حیران تھا کہ اس تہذیب اور روشنی کے زمانے مین ایک بی اے کا طالب علم جو شب و روز تکسلے اور رڈارون جیسے دہریون کی جمعیت مین رہتا ہو اس قدر ضعیف الاعتقاد کیونکر ہو سکتا ہے۔ لطف دیکھیئے کہ دیوی نے نام بھی بتایا تو ایک ایسے شخص کی بیوی کا جو راسخ الاعتقاد ہندوؤن سے بہت کم دلچسپی رکھتا ہے اور جو آریہ سماج کے اندرونی حلقہ مین داخل ہے۔

باوجود ان خیالات کے مین نے سارا معاملہ معلوم کرنے کی نیت سے پوچھا "پھر اب آپ کیا چاہتے ہین؟"

دونون ہاتھ جوڑ کر اس نے جواب دیا "سب کچھ تو آپ نے سنا اسپر بھی آپ مجھ حقیر کو "آپ" کے لفظ سے مخاطب کرتے ہین! "تو" یا زیادہ سے زیادہ "تم" کہیئے"۔

اتنا کہکر اس نے اپنے دونون ہاتھون سے میرا جوتا چھوا اور اُنھین ہاتھون کو سر آنکھون پر لگایا۔

مین نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر پوچھا "اب تم کہان جاتے ہو؟"

وہ کہنے لگا "مین سیدھا لاہور سے آ رہا ہون جہان مین آپ کو تلاش کرنے گیا تھا۔ وہان سے معلوم ہوا کہ آپ ڈیرہ اسمٰعیل خان اپنے ایک رشتہ دار کی بیمار پرسی کے لیئے روانہ ہو گئے ہین۔ اسلیئے مین بھی وہان سے سیدھا ڈیرہ ہی کو چل کھڑا ہوا۔

مین نے پوچھا "لاہور مین آپ کو کس نے بتایا تھا کہ مین ڈیرہ اسمٰعیل خان کی طرف روانہ ہو گیا ہون؟"

وہ بڑی آزردگی سے کہنے لگا "آپ مجھے پھر "آپ" ہی کے لفظ سے

مخاطب کرتے ہین"۔

مین نے مسکرا کر کہا "خیر نہ سہی یہ بتاؤ "تمھین" کس نے بتایا تھا؟"

وہ بولا "کسی نے بھی نہین اور سبھی نے ا کیا آپ سمجھ سکتے ہین کہ آپ جیسے پبلک مین کی نقل وحرکت پوشیدہ رہ سکتی ہے؟ آپ اس زمانے مین پنجاب کے ۔ ۔ ۔

وہ کوئی لمبا چوڑا تعریفی فقرہ کہنا چاہتا تھا۔ مین نے ٹالنے کی غرض سے کہہ دیا "چلو اچھا ہوا کہ مین ایک دن منٹگمری مین ٹھہر گیا تھا اس لیے آج تم سے اس جگہ ملاقات ہوگئی ورنہ ممکن تھا کہ تم کو میری تلاش مین زیادہ سرگردان ہونا پڑتا"۔

وہ چند منٹ چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر بڑی تعظیم کے لہجے مین پوچھنے لگا "میری ماتا آپ کے ساتھ ہی ہین؟"

مین نے جواب دیا "ہین تو سہی۔ کیا تمھین آج ہی چرنامرت درکار ہے؟"

وہ بولا "اگر آج ہی مل جاتے تو کل تک کس لیے ٹھہرون؟"

کوئی اور موقع ہوتا تو شاید مین ایسے ضعیف الاعتقاد شخص کی ایسی لغو باتین ماننے پر ہرگز آمادہ نہ ہوتا مگر اسوقت مین نے اسے ایک قریب المرگ کی آخری خواہش سمجھا کیونکہ واقعی مرض نے اسے قریب المرگ بنا رکھا تھا۔ پس مین اسے "اچھا ٹھہرو" کہکر کیبن کے اندر داخل ہوا۔

کیبن سے باہر آئے ہوئے مجھے ۲ منٹ سے زائد گزر چکے تھے۔ اندر جاتے ہی میرے پاؤن کی آواز سے میری بیوی کی آنکھ کھل گئی۔ مجھے دیکھکر اس نے منھ کو ہاتھ سے ڈھک کر جمائیان لیتے ہوئے پوچھا "اب تک کہان تھے؟"

مین نے اُس کے بستر کے قریب بیٹھکر اُس کے ریشم ایسے ملائم بالون مین اُنگلیان پھیرتے ہوئے جواب دیا "تم سو رہی تھین، گر یہان ایک بڑی ہی دلگی ہوئی ہے"۔

وہ حیران ہو کر پوچھنے لگی "کیا؟"

مین نے جواب دیا "تمھارا ایک لڑکا آیا ہے" اتنا کہتے ہی میرے دل مین اپنی زندگی کے بعض گذشتہ افسوسناک سانحے تازہ ہو گئے۔ اس فقرے سے مجھے تو جو تھوڑا بہت رنج ہوا سو ہوا میری بیوی کو بہت ہی تکلیف پہنچی۔ درحقیقت اس واقعہ سے ڈیڑھ سال پہلے ہمارا دو سال کا اکلوتا بچہ ہمین داغ جدائی دے گیا تھا۔ دل لگی مین فقرہ کہنے کو تو کہہ دیا لیکن پھر میرے دل مین سخت پشیمانی ہوئی کہ ہائے کس لیے مین نے اسے بے فائدہ رنج پہنچایا۔ چند منٹ تک وہ چپ چاپ بیٹھی رہی اور اس کی آنکھون سے آنسوؤن کے چند قطرے بھی گرے۔ پھر وہ ایک گہری سانس لیکر اُٹھ بیٹھی اور بولی "تم کیا کہہ رہے ہو؟"

مین نے اسے اپنی طرف کھینچکر کہا "اسٹیمر مین ایک سنیاسی کا درشن ہوا ہے وہ میرا ہاتھ دیکھکر کہتا تھا کہ تمھارے ایک بیٹا بہت جلد ہونے والا ہے"۔

مین ایک آریہ سماجی کی حیثیت مین سنیاسی لوگون کی پیشنگوئیون کا مطلق قائل نہین ہون مگر اسوقت جلدی مین اور کچھ نہ سوجھا تو ٹالنے کی غرض سے یہی کہہ دیا۔ لیکن میری یہ دروغگوئی بھی ضائع ہی گئی۔ اسکی دونون آنکھون سے آنسوؤن کا تار بدستور بندھا رہا۔ چہرے پر پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔ آواز بھاری ہو گئی تھی۔ ڈیڑھ برس پہلے کا واقعہ اس کے دل مین پھر سے تازہ ہو گیا۔ اس لڑکے کی سب باتین بتدریج ایک تصور کے مانند اسکی نگاہ تخیل کے روبرو پھرنے لگین۔ اسکا رونا، اسکا ہنسنا، اسکی پیاری پیاری میٹھی باتین سب اسے یاد آنے لگین۔ جون جون اس زمانہ کے واقعات اسے یاد آتے اسکی آنکھون کے دونون کونون سے آنسوؤن کے قطرے اور بھی تیزی سے بہنے لگتے تھے۔ مین نے اسکی یہ حالت دیکھکر اس کے دونون ہاتھ اپنے ہاتھون مین لیے اور اسے اپنی طرف کھینچکر تسلی دینے کے لیئے چھاتی سے لگایا۔ اسکے منھ کو بوسہ دیا۔ اسکے ساتھ خود بھی آنسو بہائے

اسکے بعد جیب سے رومال نکالکر اپنی اور اُسکی آنکھون کو پونچھا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کہکر بات ٹالون۔

کھڑکی مین سے دیکھا تو سورج غروب ہونے کا وقت تھا۔ مین نے کہا "چلو چھت پر چلکر غروب آفتاب کا نظارہ دیکھین۔ دریاے سندھ مین سورج کا غروب ہونا تو کبھی دیکھا ہی نہین"۔

وہ اُٹھی۔ دوسرے کمرہ مین جا کر مُنھ ہاتھ دھویا۔ بالون مین کنگھی کی اور پھر باہر آئی۔ ہم دونون چھت پر جا کر ٹہلنے لگے۔ تھوڑی دیر مین سورج غروب ہوگیا اور شام ہوگئی۔ سٹیمر کو اب تھوڑا ہی فاصلہ طے کرنا باقی تھا۔ ہم لوگ بھی چھت پر سے نیچے اُتر آئے۔

سیڑھی کے پاس ہی مولراج کھڑا تھا۔ ہمین دیکھتے ہی کہنے لگا "کیا یہی ماتا ہین"۔ جواب کا انتظار کیئے بغیر ہی اُس نے میری بیوی کو ڈنڈوت کی۔

وہ یہ دیکھکر حیرت سے ایک طرف کو کھڑی ہوگئی اور میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ مین نے کہا "ایک بات ہے کیبن مین چلکر کہونگا"۔ مولراج سے مخاطب ہو کر مین نے کہا "ٹھہرئیے آپ اسقدر کیون گھبراتے ہین"۔ وہ جلدی مین وہان سے ہٹ گیا اور کہنے لگا "مین اس انجن کے قریب ٹھہرتا ہون"۔

کیبن مین جا کر مین نے اپنی بیوی سے سب باتین کہہ سنائین۔ اسنے ہنسکر کہا "مین اپنے پاؤن کا دھوون نہین دے سکتی"۔

مین نے کہا "اسمین تمھارا کیا ہرج ہے؟"

وہ بولی "کیا تم اس کنجیڑی کی بات پر اعتبار کرتے ہو؟"

مین نے کہا "اعتبار تو نہین لیکن انسان کی اچھیا شکتی (قوت ارادی) بڑی زبردست ہے۔ اگر اُسے اس دھوون ہی پر یقین ہے تو اس سے یقینًا فائدہ پہنچے گا۔ اس بحث پر تو مغرب والون نے صدہا کتابین لکھی ہین"۔

وہ پہلے تو سُنکر چپ ہو رہی پھر تھوڑی دیر کے بعد بولی "اچھا تھوڑا پانی یونہی کیون نہین دے آتے؟ ضرورت تو صرف اسکے یقین کی ہے۔ تم اُسے یقین دلا دینا کہ یہی میرے پاؤن کا دھوون ہے"۔

مین نے کہا "اسطرح دھوکہ دینے سے کیا حاصل؟"

اتنا کہتے ہوئے مین نے چاء کی پیالی مین تھوڑا پانی اُنڈیلا۔ ہنستے ہنستے میری بیوی موزہ اُتار کر بولی "ہات تیرے کی! نہ جانے اس نے تمھین کتنا سادہ لوح سمجھا ہے؟ مجھے تو اس بات کا تعجب ہے کہ تمھین اسقدر بھولا بھالا دیکھکر ولایت مین کسی میم نے تم سے شادی کیون نہ کرلی"۔

مین نے ہنسکر جواب دیا "پھر تم یہ دُکھ کیونکر بھوگتین؟"

میری بیوی مذاقیہ گفتگو مین بڑی تیز تھی لیکن اُسکی بات پر جواب دیا جاتا تو چڑھ جاتی تھی۔ برداشت نہ کرسکتی۔ میری بات سنکر بولی "جاؤ جاؤ معلوم ہوا بڑے رسک ہوا"

مین نے اسکا کچھ بھی جواب نہ دیا اور اسکا پاؤن دھونے کی غرض سے ہاتھ مین لیا۔ وہ جلدی سے پاؤن کو پرے ہٹا کر کہنے لگی۔ "پیر کیون چھوتے ہو؟" پھر خود ہی میرے ہاتھ سے پانی کی پیالی لے اپنے پاؤن کا انگوٹھا ڈبو کر کہنے لگی "نوکر سے کہو لے جائے"۔

مین نے اُٹھکر کہا "اسے نوکر کیا جانے؟ مین خود ہی جا کر دے آتا ہون"۔ یہ کہکر مین نے پیالی اُٹھالی۔ وہ کہنے لگی "یہ کیا کرتے ہو؟ جو کہتے ہین وہ کیون نہین سنتے؟"

مین نے کسی قدر سنجیدگی سے جواب دیا "دیکھو عورتون کو لکھنا پڑھنا سکھانا گویا آگ پر گھی ڈالنا ہے۔ تم نے اتنا لکھنا پڑھنا سیکھا مگر ضد ابھی تک نہ گئی"۔

اتنا کہتے ہوئے مین کیبن سے باہر نکل آیا۔

(۲)

ڈیرہ اسمٰعیل خان مین مین اپنے دوست کے ہان صرف چند ہی یوم

ٹھہرا اور اس کے بعد لاہور واپس آ گیا۔ ایک روز شام کے وقت جب میں دن بھر کی کلفت کے بعد آرام سے ایک انگریزی رسالہ پڑھ رہا تھا ہمارا دربان سلیٹ ہاتھ میں لیئے اندر آیا۔ میں نے یہ دستور قرار دے رکھا تھا کہ جو حضرات گھر سے وزٹنگ کارڈ نہیں لاتے تھے انکے لیے ایک سلیٹ رکھ چھوڑی تھی۔ سلیٹ ہاتھ میں لیکر نام پڑھا تو یہ لکھا تھا "مولراج ملتانی"

دو مہینے کا پُرانا واقعہ یکایک ذہن میں نہ آیا۔ سوچا کوئی نیا موکل ہوگا، بُلوا بھیجا۔

مولراج کی صورت دیکھتے ہی میں نے اُسے پہچان لیا۔ اُس نے سامنے آتے ہی بڑے ادب سے بندگی کرکے میرے پاؤں کو چھوا۔

میں نے پوچھا "کہیئے آپ کیسے ہیں؟ کچھ فائدہ بھی ہوا کہ نہیں؟"

مولراج نے جواب دینے سے پہلے اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھکر کھانسنا شروع کیا۔ پھر بولا "مہاراج کچھ دن کے لیے تو میں خاصہ اچھا ہو گیا تھا" کھاؤں! کھاؤں! کھاؤں! (کھانسی کی آواز) پھر "کھاؤں! کھاؤں!" پھر پانچ سات دن" کھاؤں! کھاؤں! کھاؤں!...

اِس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ کھانستا کھانستا پاس ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

جسوقت اُسکی کھانسی کا زور کسی قدر کم ہوا تو میں نے کہا "تمہارا مرض اب اِس حالت کو پہنچ چکا ہے کہ پاؤں کا دھوون پینے سے کچھ فائدہ نہوگا۔ دھرم پور میں جاکر سینی ٹوریم میں رہو اور باقاعدہ علاج کرو۔"

"افسوس میں کہاں جاؤں" اتنا کہکر اس نے پھر بڑے زور سے کھانسنا شروع کر دیا۔

اُس روز ہمارے یہاں ڈنر تھا چونکہ ساڑھے سات بج چکے تھے اسلئے خیال پیدا ہوا کہ تھوڑی دیر میں مہمان آنے لگیں گے۔ یہ منحوس اس وقت کہاں سے آ بیٹھا اسے آسانی سے دفع کرنے کے خیال سے میں نے اپنی جیب سے پانچ روپیہ کا ایک نوٹ نکالکر حوالہ کیا اور کہا "جا کر کسی ڈاکٹر سے مل یا سیدھے پہاڑ کو چلدو۔ بھلے آدمی علاج کروگے تو بچوگے۔ کہیں پاؤں دھونیکا پانی پینے سے مریض اچھے ہوا کرتے ہیں!"

ٹھیک اِسی وقت کوٹھی کے سامنے مسٹر ہرنا داس کپور کی گاڑی آکر ٹھہری۔ میں نے مولراج سے جلدی میں کہا "اب تم جاؤ۔ میں آج ایک خاص کام میں مصروف ہوں۔"

وہ چپکے سے نوٹ کو جیب میں رکھکر چل دیا۔

اگلے روز صبح کے وقت جب میری آنکھ کھلی تو بہت دن چڑھ آیا تھا۔ چارپائی سے اُٹھکر میں تازہ ہوا کھانے کی غرض سے کھڑکی میں ہو بیٹھا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک شخص کالے سرج کی چادر اوڑھے اِدھر اُدھر ٹہل رہا ہے۔ جب تک اسکی پیٹھ میری طرف تھی میں اُسے پہچان نہیں سکا لیکن جونہی اُس نے مُنھ پھیرا تو دیکھا کہ مولراج ہے۔ اسے دیکھتے ہی گویا میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ کم بخت دن نکلتے ہی آ پہنچا۔ ابھی دربان سلیٹ لیکر آتا ہوگا۔

چائے کی میز پر صبح کے اخبار کے ساتھ ہی اسکا کارڈ بھی آ پہنچا۔ میری بیوی ابھی تک اوپر نہ آئی تھی۔ مولراج نے آتے ہی پہلے بڑے ادب سے میرے پاؤں کو چھوا پھر بولا "رات بھر مجھے نیند نہیں آئی۔ آپ نے کل میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس سے میری سخت دلشکنی ہوئی ہے۔ میں کون ہوں یا کون نہیں ہوں، آپ اس کا تو خیال نہ کیجیئے۔ مجھے صرف اِس بات کا رنج ہے کہ آپ نے میرا مدعا سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ مجھے دوا کے لیے اِن پانچ روپیہ کی ضرورت نہیں آپ لے لیجیئے۔"

اتنا کہکر اس نے جیب سے کل والا نوٹ نکالکر میز پر ڈالدیا۔

مولراج کی اِن باتوں سے میرا غصہ کسی قدر کم ہوا میں نے کہا نہیں نہیں روپیہ واپس کرنیکی کیا ضرورت ہے۔ یہ آپکے دوا دارو میں کام آئیگا۔"

وہ پھر کھانسنے لگا اور تھوڑی دیر بعد بولا "مہاراج میرا یقین تو

سب سے بڑھکر پرماتما ہی کی طاقت پر ہو۔ ڈاکٹری یا بیدک پر میرا قطعاً اعتقاد نہین۔ ایسی حالت مین دواؤن پر روپیہ ضائع کرنا فضول نہین تو اور کیا ہو؟"

مین نے کسیقدر سوچکر کہا "بیشک اگر تم اس بارے مین بالکل ہی غیر معتقد ہو تو دوا کا مفید ثابت ہونا مشکل ہے۔"

اس نے جواب دیا "میرا تو دلی اور پکا یقین یہی ہو کہ اگر مین اپنی ماتا کا چرنامرت (ماتا کا لفظ کہتے ہوے اُس نے بڑی تعظیم سے پرنام کیا) دونون وقت پیون اور صبح و شام انھین پرنام کرسکون تو میرا یہ مرض بالکل دور ہوجائیگا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اس مرتبہ میرا بچنا مشکل ہی ہے۔"

یہ کہکر اس نے اپنی آنکھین آنسوؤن سے بھرلین۔

مین نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد کہا "جہان تک میرا خیال ہو میری بیوی دونون وقت اپنے پاؤن چھوانے اور انھین دُھلا کر اس کا پانی آپ کو پینے کے لیئے دینے مین رضامند نہ ہوگی۔"

ٹھیک اُسی وقت وہ بڑے زور سے کھانسنے لگا۔ اس کے خشک مرجھائے ہوے چہرے کو دیکھکر میرے دل مین رحم آیا اور مین نے دلمین سوچا "بے چارہ واقعی قابل رحم ہو جسطرح بھی بن پڑے گا مین اپنی بیوی کو اس بات پر رضامند کرونگا کہ وہ اسکے کہے کے مطابق اسے صحت حاصل کرنے مین مدد دے۔ دُنیا مین لوگ محتاجون کی کئی طرح پر امداد کرتے ہین۔ اگر اس ذرا سی بات سے اسکی جان بچ سکے تو ضرور اسے بچانے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ اسکے سولراج سے مخاطب ہوکر مین نے کہا "تم نیچے جاکر نوکرون کے کمرے مین بیٹھو مین ابھی بلوا بھیجونگا۔"

اسکے چلے جانے پر مین اپنی بیوی کے کمرے مین گیا۔ خادمہ سے معلوم ہوا کہ وہ غسل خانے مین ہو۔ باہر آتے آتے اس نے آدھ گھنٹہ صرف کردیا۔ غسل خانے سے نکلکر وہ دالان مین ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنے بالون کو خشک کرنے لگی۔ مین نے قریب کھڑے ہوکر کہا "سولراج پھر آیا ہو۔"

اس نے حیرت سے پوچھا "وہی اسٹیمر والا سولراج؟ اب پھر کیون آیا ہے؟"

مین اپنی بیوی کی زبردست قوت حافظہ کا تہ دل سے مداح ہون۔ اول مرتبہ جب مین نے اس شخص کا نام سلیٹ پر لکھا ہوا دیکھا تو یہ نہین سمجھ سکا تھا کہ وہ کون ہو۔

مندرجۂ بالا سوال کے جواب مین مین نے کہا "اس کی کھانسی پھر بڑھ گئی ہے۔"

وہ کہنے لگی "مین تو اب اپنے پاؤن کا دھوون نہ دے سکون گی۔ ایک ہی بار دیکر مین نے اپنے عقیدے کے خلاف کیا ہو۔ مین کوئی پیر یا ولی نہین ہون کہ میرے پاؤن کے دھوون سے اسکا مرض دور ہوجائے؟"

مین نے ہنسکر کہا "ساری دُنیا تمھاری طرح اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نئی روشنی کی نہین ہو۔ اگر اُسکا اسی پر یقین ہو تو ممکن ہو اسی سے صحت یاب ہوجائے۔ وہ کہتا بھی ہو کہ پہلے مین اس سے صحت یاب ہوگیا تھا۔"

مین بھانپ گیا کہ اب کے اسے منانے مین ضرور دقت پیش آئے گی۔ اسکی باتون سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سمجھ رہی ہو کہ اس مرتبہ بھی ایک پیالہ دھوون دیکر چھٹکارا ہوجائے گا۔ اگر اس نے یہ سُنا کہ یہ بیش قیمت چیز اُسے دو بار باقاعدہ دینا پڑے گی تو شاید اسکا تحمل جاتا رہیگا۔ باوجود اس کے مین نے حوصلہ کرکے کہہ ہی ڈالا۔

مجھے جسقدر مخالفت کی امید تھی اُتنی ظہور مین نہین آئی۔ وہ حیران ہوکر بولی "کیا اسے ڈاکٹر، حکیم، بید کسی پر یقین نہین ہو۔ دونون وقت میرا دھوون پیئے گا اور اس سے اچھا ہوجائے گا؟"

مین نے ملائمت سے جواب دیا "وہ تو یہی کہتا ہے۔ اسکا بیان ہے کہ اگر مجھے ہر روز دو وقت چرنامرت نہ ملا تو ابکے مین نہ بچون گا جسطرح بن پڑے غریب کی آس پوری کرو۔"

وہ خاموش رہی جس سے مین نے "نیم رضا" کا اندازہ کرلیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونون نیچے آئے جب مین نے مولراج کو یہ خوش خبری سنائی تو وہ مارے خوشی کے پھولا نہ سمایا۔ لیکن چند ہی منٹ بعد ایک آہ بھر کر بولا "افسوس میرا یہان کوئی نہین!"

مین نے پوچھا "پھر تم کہان رہوگے؟"

وہ میری طرف دیکھ کر کہنے لگا "کیا آپ ازراہ عنایت مجھے یہین تھوڑی سی جگہ نہ دے سکین گے؟" اتنا کہکر وہ خاموش ہوگیا۔

مین نے کہا "تم اگر چاہو تو شاگرد پیشہ کے مکانات مین رہ سکتے ہو۔"

وہ کہنے لگا "اگر آپ مجھے اس کی اجازت دین تو اور کس بات کی ضرورت ہے۔ کل رات مین نے وہین کھانا کھایا تھا۔"

اتنا کہکر وہ پھر زور زور سے کھانسنے لگا جب کھانسی کا زور کسی قدر کم ہوا تو کہنے لگا "اگر آپ مجھے اجازت دین تو مین ماتاجی کے درشن کرآؤن۔"

مین اُسے اپنی بیوی کے پاس لے گیا۔ اس نے اسکے پاؤن چھوئے۔ میری اہلیہ اسکے چہرے کی طرف ترحم کی نظر سے دیکھنے لگی۔

میز پر گلاس مین پانی رکھا تھا مولراج نے اس مین سے تھوڑا پانی ہاتھ مین لے مٹی پر ٹیکر چرنامرت لیا اور اسکا جو حصہ باقی رہگیا اسے سر اور آنکھون پر لگایا۔

اسیطرح اس نے دو تین دن گذار دیے۔ لیکن مجھے اسکا مرض کسیطرح کم ہوتا نظر نہ آیا۔ آخر وہ ایک دن مجھ سے کہنے لگا "کیا ماتاجی مجھے اپنے من سے چرنامرت نہین دے رہی ہین؟ کیا بات ہے مین اسکے اچھا نہین ہوتا؟" اتنا کہتے ہی اسے اس زور کی کھانسی چھڑی کہ آنسو بہنے لگے۔

اس بات کا ذکر رات کو مین نے اپنی بیوی سے کہا۔ وہ بولی "کمبخت دوا دارو تو پیتا نہین کہین خالی دھودن پینے سے مرض دور ہوا کرتے ہین۔ اسکی بھی عجیب ضد ہے!"

مین نے کہا "قوت ارادی سے بہت سے کام پورے ہوجایا کرتے ہین جس وقت اُسے اپنے پاؤن کا دھودن دینے لگو تو اس بات کا دل مین پختہ ارادہ کرلیا کرو کہ اس سے اس کے مرض کو افاقہ ہوگا۔"

میری بیوی نے ہنسکر جواب دیا "دن بدن تم ایک سوانگ بن رہے ہو۔ کیا مین ہی غلطی کرتی ہون یا تم ہی روز بروز سماجک خیالات کو چھوڑ کر سناتنک توہمات مین پھنستے جارہے ہو۔ تمھارے ترقی یافتہ خیالات پر پردہ پڑتا جارہا ہے"

مین نے کہا "تعجب ہے تمھارے ترقی یافتہ خیالات نے میرے ترقی یافتہ خیالات کو کیون خارج کرنا شروع کردیا۔"

وہ بولی "یہ تو مین جانتی نہین مگر ہان اب ولایتی مور کا پر تمھارے بدن سے گرا جارہا ہے۔"

مین نے کسی قدر بناوٹی غرور کے ساتھ جواب دیا "تم نے ایک طرح مجھ کو اپنایا۔ اگر مین ایساہی کالا تھا تو بیاہ کس لیے کیا تھا؟"

اس پر وہ کچھ ناراض نہین ہوئی بلکہ کہنے لگی "جی ہان معلوم ہوا! اگر تمھارے ایسے سبھی کالے ہوتے تو پھر کیا تھا"

یہ بات کچھ جھوٹ نہ تھی۔ مین درحقیقت ایک شکیل اور وجیہ آدمی ہون جسکی تصدیق ولایتی سوسائٹی کی لیڈیون سے بھی ہوسکتی ہے۔

(۳)

اس دن کے بعد مولراج کی حالت روز بروز روبہ اصلاح ہوتی گئی۔ اسکی کھانسی بھی کم ہوگئی۔ منہ کی زردی بھی دور ہوگئی۔ آنکھین جو اندر

کو گھسی ہوئی تھین بھرنے اور روشن ہونے لگین - مجھے یہ دیکھکر بہت خوشی ہوئی اور مین نے دیکھا کہ میری بیوی بھی بہت مطمئن ہے - وہ مولراج سے گاہ بگاہ گھر کا کام بھی لیا کرتی تھی - جس کام پر بھیجنے کے لیے کوئی معتبر نوکر نظر نہ آتا اس پر مولراج کو بھیجدیا جاتا تھا - ۲۷ جنوری کو میرے ایک دوست کے ہان شادی تھی - وہان سے ہم لوگ بہت رات گئے لوٹنے والے تھے - بات یہ تھی کہ رسوم شادی کے بعد ناٹک ہونے والا تھا جسکی وجہ سے ہم رات کے ۲ بجے سے پہلے کسی طرح گھر واپس نہ آسکتے تھے مین نے اسکا ذکر اپنے نوکرون سے کر دیا - اس سے چند روز پہلے مین نے اپنے کتب خانے کا انتظام مولراج کے سپرد کیا تھا - اس روز سے مین نے اس سے کہا "تم آج کتب خانہ ہی مین سونا اور ذرا ہوشیار رہنا"

اس نے جواب دیا "آپ بے فکر رہین جب تک آپ واپس نہ آئین گے مین جاگتا ہی رہونگا"

بعد مین جو کچھ ہوا اس سے یہ بات ثابت بھی ہوگئی کہ وہ سچ مچ جاگتا ہی رہا تھا -

باوجود بہت سی دوڑ دھوپ کے ہم لوگ رات کے ۳ بجے سے پہلے گھر نہ آسکے - واپسی پر میری بیوی کپڑے بدلنے اندر گئی اور مین نے خوابگاہ کا دروازہ کھولا - دروازہ کھولتے ہی جو نظارہ مجھے دکھائی دیا اس نے ایک دم مجھے حیران و ششدر کر دیا -

دیکھتا کیا ہون کہ مولراج بڑے صندوق کے سامنے بیٹھا ہوا ہے اسکے چارون طرف سونے چاندی کے برتن پھیلے پڑے ہین - برتن والی الماری کے دونون پٹ کھلے ہین - مجھے کمرے مین داخل ہوتا دیکھکر وہ "بتاجی" "بتاجی" کہکر چلانے لگا -

قریب جاکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ بندھا ہوا ہے - درحقیقت اس صندوق مین ایک خاص کَل لگی ہوئی تھی جسکا ذکر اس جگہ ضروری معلوم ہوتا ہے - جن دنون مین ولایت مین تھا نیلام مین یہ صندوق کسیقدر گران قیمت پر خریدا تھا - اس مین کسی قسم کا قفل بالکل نہ تھا - اس کے بجائے ایک چھوٹی سی کل لگی ہوئی تھی جو مختلف دھاتون کے چھوٹے چھوٹے گول ٹکڑون سے مرکب تھی اور جس پر چند حروف کندہ تھے - ان حرفون کو ملا کر ایک خاص نام بنانا پڑتا تھا - جب یہ نام بنجاتا تو کل کو کھینچنے سے صندوق خود بخود کھل جاتا تھا - اس کل کے ساتھ ایک چھوٹی سی پن لگی ہوئی تھی جسے صندوق کو کھولنے سے پہلے ہٹا لینا ضروری تھا اگر کوئی شخص پن کو ہٹائے بغیر صندوق کھولنے کی کوشش کرتا تو دو طرف سے کمانیان نکلکر کھولنے والے کے ہاتھون کو جکڑ لیتی تھین -

معلوم ہوتا ہے کہ کسی روز میری بیوی کی عدم توجہی کے باعث مولراج نے صندوق کو کھولنے کا نام تو معلوم کر لیا مگر پن کی کاریگری معلوم نہ کر سکا -

مولراج کو اس حالت مین دیکھکر میری آنکھون مین خون اتر آیا - دل نے کہا دنیا مین کسی پر اعتبار کرکے راحت نہین ملتی - مولراج کی بیوقوفون ایسی صورت کو دیکھکر کون جان سکتا تھا کہ اس مین یہ گن بھی موجود ہون گے - اس وقت کے بعد میرا عقیدہ ہے کہ جو لوگ کسی کا چہرہ دیکھکر اسکی سیرت کا اندازہ کرنے کے دعویدار ہین وہ بیوقوف ہین -

مین نے اس کے قریب جاکر غصے کے لہجے مین کہا "موے بدبخت یہ کیا حرکت ہے؟ کیا بیٹے باپ کے ساتھ یہی سلوک کیا کرتے ہین؟"

جوش و غضب سے میرا سارا بدن کانپ رہا تھا - مولراج نے روتے روتے کہا "بتاجی میرا قصور نہین"

اسکی زبان سے یہ سنتے ہی جی مین آئی کہ منھ پر زور سے ایک طمانچہ دون لیکن مین نے اس ضبط سے کام لیکر جو میرا خاصہ ہے اپنے آپ کو سنبھالا -

ٹھیک اسی وقت میری بیوی بھی اسی کمرے مین داخل ہوئی - مولراج کو اس حالت مین دیکھکر وہ بھی حیران رہ گئی اور میری طرف

مخاطب ہو کر بولی "یہ کیا معاملہ ہے؟"
اسے دیکھکر مولراج نے اور بھی زور زور سے رونا شروع کیا مین نے غصہ سے کہا "چپ رہ سور مارتے مارتے ہڈی پسلی توڑ دونگا"
میری بیوی نے کہا "چلو اُس کمرے مین چلین" یہ کہکر اور میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لے چلی۔ دوسرے کمرے مین جا کر وہ ایک کوچ پر بیٹھ گئی اور پوچھنے لگی "اب کیا ہوگا؟"
مین نے جواب دیا "ہونا کیا ہے۔ بدذات کو پولیس کے حوالہ کردونگا"
وہ تھوڑی دیر چپ چاپ بیٹھی رہی۔ پھر بولی "دیکھو پولیس مین دینے سے کچھ حاصل نہین۔ میری مانو تو اسے چھوڑ دو۔ اسنے لالچ کے بس مین آکر یہ حرکت کی ہے۔ یہ اسکا پہلا جرم ہے اور اسکی خطا قابل عفو معلوم ہوتی ہے۔ اسے اس کا موقع ملنا چاہیئے کہ اپنے آپکو سدھارنے کی کوشش کرے۔ اگر اسے پولیس کے حوالہ کردو گے تو اسکی زندگی تباہ ہو جائے گی"
مین نے دل مین سوچا مولراج اگر چوری کرکے بھاگ جاتا تو اسپر رحم کرنا ناممکن تھا لیکن اسکا کام ناتمام ہی رہ گیا۔ مناسب ہے کہ اسکی پہلی خطا پر درگذر کیا جائے لیکن پھر خیال پیدا ہوا کہ ایسا کرنے سے کہین سوسائٹی مین حرف گیری نہو۔ اسکا ذکر مین نے اپنی بیوی سے بھی کیا۔
وہ بولی "نہین اسے حوالہ پولیس کرنے مین زیادہ چرچا ہوگا۔ ایک ذراسی بات کے لیے کسی شخص کی زندگی تباہ کر دینا کوئی قابل داد کام نہین ہے"
تھوڑی غور کے بعد مین نے مولراج کو چھوڑ دیا۔
اس واقعہ کے تین سال بعد مولراج کا ایک خط ملا۔ ان دنون وہ لدھیانہ میونسپلٹی مین ٹیکس داروغہ کا کام کرتا تھا۔ اس خط سے معلوم ہوا کہ اس کے مامون نے ۵۰۰ روپیہ ضمانت داخل کر کے اُسے یہ آسامی دلائی ہے۔ کچھ دنون اسے بہت تکلیف برداشت کرنا پڑی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر سے بھیک مانگ کر گذارہ کیا کرتا تھا۔ ہماری سابقہ عنایات کا ذکر کرنے کے بعد اس نے لکھا تھا کہ میرا پرانا مرض پھر عود کر آیا ہے۔ اُبکے شاید نہ بچ سکون گا۔ کئی بار ارادہ کرتا ہون کہ آپکی خدمت مین حاضر ہون لیکن صورت دکھانے کا حوصلہ نہین۔ خط کے آخر مین لکھا تھا:-

اگر مین دوبارہ آپ کی خدمت مین رہکر ماتاجی کا چرنامرت پی سکتا تو شاید میری ناپاک روح اس کثیف جسم کے ساتھ چندے اور وابستہ رہتی۔ لیکن اب مین کس مُنھ سے آپ کے سامنے حاضر ہون۔ میرے کرمون کی یہی سزا ہے کہ مین قبل از وقت مرجاؤن۔

میری بیوی نے اس خط کو سنکر کہا "میری ایک بات مانوگے؟"
مین نے پوچھا "کیا؟"
کہنے لگی "مولراج کو یہان آنے کو لکھدو"
مین نے کہا "وہ تو نوکری کر رہا ہے۔ یہان آکر کیا کریگا؟"
کہنے لگی "لکھدو چھٹی لیکر چلا آئے"
مین نے مذاقیہ لہجے مین کہا "چرنامرت دینا چاہتی ہو؟ یہی خواہش ہے تو دو چار اونس کی شیشی مین بند کرکے پارسل کردو"
وہ بولی "نہین نہین۔ اُسے دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ تم جانتے ہو وہ اپنی زندگی کے لیے میرا ممنون ہے۔ اسے چونکہ مجھ سے فائدہ پہنچا ہے اسلیئے قدرتی طور پر مجھے اس کے ساتھ گونہ دلچسپی ہے۔ گو مین مانتی ہون کہ یہ بھی ایک انسانی کمزوری ہے"
مین نے کسی قدر سنجیدہ لہجے مین جواب دیا "مین مبارک ہون جسکی بیوی ایسی ہے جس کا چرنامرت پی کر لوگ نئی زندگی پاتے ہین"
وہ بولی "مذاق کیون کرتے ہو۔ مین یہ تو نہین کہتی کہ اس نے چرنامرت پی کر نئی زندگی حاصل کی ہے میری مراد در اصل اس معاملے سے ہے کہ اگر تم اُس روز میری بات نہ مان کر اسے پولیس کے حوالے کردیتے تو یقیناً اسکی زندگی ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جاتی"

مین نے جواب دیا "اس اخلاقی زندگی سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو نفس زندگی کے لیے بھی وہ تمھارا ہی ممنون احسان ہے۔ اگر تم اسے اپنا چرنامرت نہ دیتین تو وہ کبھی کا مر چکا ہوتا۔"

میری بیوی یہ سنکر خوب ہنسی۔ مین اسکی اس ہنسی کا مطلب بالکل نہ سمجھ سکا اور حیران ہوکر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ جب اسکی ہنسی کسی قدر کم ہوئی تو مین نے وجہ دریافت کی وہ کہنے لگی "تم شاید ابھی تک یہی سمجھ رہے ہو کہ مولراج میرا چرنامرت پی کر اچھا ہوگیا تھا؟"

مین نے جواب دیا "چرنامرت پینے سے نہین تو کیا تمھارے پاؤن کو ہاتھ لگانے سے؟"

بولی "جی نہین۔ یہ ایک چھپا ہوا معاملہ ہے۔"

مین نے نہایت حیران ہوکر پوچھا "وہ کیا؟ وہ کیا؟"

کہنے لگی "بات در اصل یہ ہے کہ جب مین نے پہلے دو تین روز کے اندر دیکھا کہ اسے میرے چرنامرت سے کچھ فائدہ نہین ہوتا تو مین نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ دونون وقت اُس مین ایک ہومیوپیتھک دوا کی چند بوندین ڈالدیا کرتی تھی۔ وہ اسے خالی پانی کا دھوون سمجھ کر پی جاتا تھا۔"

مین اپنی بیوی کی عقل و دور اندیشی کا قائل ہوگیا۔

چند روز بعد مین نے مولراج کو لاہور چلے آنے کے لیئے لکھا۔ مگر اس نے جواب دیا "مین نہین چاہتا ہون کہ کالا منھ آپ لوگونکو دکھاؤن۔" مجبوراً مین نے ہومیوپیتھک دوا خرید کر اس کے پاس بھیجدی۔

اس کے ہفتہ بعد پارسل لوٹ آیا۔ اُسی روز شام کے وقت پولیس کا ایک اہلکار مجھ سے دفتر مین ملاقات کرنے آیا۔ اس سے میری پہلے کی جان پہچان تھی۔ مین نے مولراج کے نام جو خط لکھا تھا اسے نکالکر اُس نے پوچھا "آپ کو اِس شخص کا کچھ پتہ معلوم ہے؟" باعث دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مولراج میونسپلٹی کا بارہ ہزار روپیہ لیکر مفقود الخبر ہوگیا ہے۔

جب اس بات کا ذکر مین نے رات کے وقت اپنی بیوی سے کیا تو اُس نے یہ کہکر ٹالدیا "ہرے رام! اِس بیچارے پر کتنی بڑی تہمت لگائی گئی ہے۔"

روشن لال

کلام شاد

ازمہاراجہ بہادر سر راجہ کشن پرشاد صاحب بالقابہم

دست از دنیا و از اہل کرم باید کشید — رخت ہستی را بمیدان عدم باید کشید
از یقین داند دلت گر ثَمَّ وَجْہُ اللہ را — دست از دیر و کلیسا و حرم باید کشید
طالب دیدار باشد گر کسے از صدق دل — یک نفس در یاد جانان صبحدم باید کشید
تا بکے داری بزیر سنگ دست خویشتن — چند بار منت اہل کرم باید کشید

گردن خود از فرمان قضا ہرگز متاب
شاد رو خود نہ از جف القلم باید کشید

تصویرِ خموشی[له]

(۱)

یہ حسنِ دلپذیر یہ دلکش ادا کی شان   ملتی ہوئی گلوں سے رخِ خوشنما کی شان
حیرت نما وہاں سکوت آشنا کی شان   ہی سحر یا نون تک تیری صورتِ خدا کی شان

اندازِ خامشی نے بڑھایا دہن کا حسن
ایسے سکوتِ ناز پہ صدقے سخن کا حسن

کس سوچ مین کھڑی ہی کہ ہی یون نڈھال تو   کیون ہی غریقِ فکر و رہین ملال تو
اے خوش جمال کچھ تو بتا اپنا حال تو   تصویر ہی سکوت کی اِک بے مثال تو

ڈوبی ہوئی ہی بحرِ تفکر مین اسقدر
خود اپنی ہی تجھے نہین اسنا زمین خبر

کسکے خیال نے تجھے بیخود کیا ہی اَب   محویت و سکوت کا انداز ہی عجب
رکھی ہی کس ادا سے یہ انگشت زیرِ لب   اس حسن پر ہی یہ تری وارفتگی غضب

آخر نگاہِ ناز ہی کس سے لڑی ہوئی
حیرت سے دیکھتی ہی کسے تو کھڑی ہوئی

تو اپنے منھ سے کچھ نہ کہے پر بھی گلعذار   اسوقت کے سکوت سے حالت ہی آشکار
پلکین نہین جھپکتی ہین حیرت سے ہین دو چار   کچھ اور خاموشی سے بڑھا حسن کا وقار

کیفیتِ دلی کو چھپایا تو کیا ہوا
رنگِ پریدہ رُخ کا حقیقت نما ہوا

گو دل ہجومِ فکر و تردد سے ہی فگار   جوشِ شباب سے ہی مگر حسنِ پُر بہار
رعنائیان ہین صورتِ زیبا سے آشکار   لب لعل اور لالے کے پھول ہین عذار

سانچے مین ہی ڈھلا ہوا نازک بدن ترا
وارفتگی مین بھی ہی وہی بانکپن ترا

باغِ جہان مین کون کرے تجھ سے ہمسری   فطرت نے تجھکو حسن دیا عیب سے بری
ہر عضو ہر ادا سے نمایان ہے دلبری   رنگت خدا نے خوب ترے حسن مین بھری

تو صفحۂ جہان پہ ہی اِک نقش دلنشین
یان جلوہ گاہِ دہر مین تجھسے بھی کم حسین

کھنی ٹکی ہی شیر پہ یہ ناز قہر ہے   آنچل ڈھلک رہا ہی یہ اندازِ قہر ہے
آنکھین بلا ہین قدِ سرافراز قہر ہے   رُوے حسین کا حسنِ خداساز قہر ہے

ساری کی چنتون نے بڑھائی ہی شانِ حسن
ہر سطر ہر شکن مین رقم داستانِ حسن

مالا ہی موتیون کا گلے مین گران بہا   ہاتھون مین یہ طلائی کڑے بھی ہین دلربا
پوشاک جسمِ صاف پہ بیحد ہی خوشنما   تلوے کے ٹیکنے کی بھی ہی دلنشین ادا

خود رفتگی نہین ہی یہ ہی جانِ دلبری
محوی کو بھا گئی ہی تری شانِ دلبری

محوی لکھنوی

(۲)

خموشی سے ہمیشہ آبرو و عزت بشر پائے   کرے جب حبسِ دم غواص دریا مین گہر پائے
جو دریا دل ہی خاموشی سے ہم آغوش رہتا ہی   سمندر مین گیا سیلاب تو خاموش رہتا ہی
لبِ خاموش ہین محفوظ آفاتِ جہانی سے   گلِ تصویر مرجھاتا نہین بادِ خزانی سے
زبان چلکر رفاقت چھین لیجائیگی مردم سے   بشر کے دو دلون مین تفرقہ ہوگا تکلم سے
لبِ خاموش کا دونون جہان مین بول بالا ہی   وہی آرام سے ہی جسکے دروازے مین تالا ہی
نہوتی گر زبانِ شمع تو گُل گیر کیا کرتا   نہوتی گر زبانِ خامہ قط زن کیون رہا کرتا
مے تابِ خموشی سے بشر مدہوش ہو جائے   سراپا چشم بن جائے ہمہ تن گوش ہو جائے
بلا تحریک کے ناقوس کب کچھ منھ سے کہتا ہی   وہ اپنی بے زبانی سے سدا ہنستا ہی رہتا ہی
جو ہی اہلِ نظر قفلِ زبان ہرگز نہ کھولیگا   مثالِ مردمک سب دیکھکر بھی کچھ نہ بولیگا
ضیائے لمپِ چمنی مین بہت پُر تاب ہوتی ہی   صدف منھ بند رکھتی ہی تو گوہر یاب ہوتی ہی
سکوتِ شب بشر کو خوابِ راحت مین سلاتا ہی   سکوتِ لب مزہ حسنِ تخیل کا بڑھاتا ہے
طریقِ بیخودی سے سلسلہ ہی حق پرستی سے   عجب کیا گر خدا ملجائے اندازِ خموشی سے
دربر ملا جگاڑی ہی وہی نظر دینے بڑھتی ہی   سبیلِ گفتگو مین کم سخن کی بات بڑھتی ہی

له گذشتہ نمبر کی رنگین تصویر ملاحظہ ہو (اڈیٹر)

کھلے گی جب کلی تو پھولکر ڈالی سے ٹوٹے گی — زبان سے جب نکل آئیگی بیشک بات پھوٹے گی
رہ قلت کلامی مین سر افرازی کی گھاتین ہین — زیادہ بولنے سے بات بنتی ہی بیباتین ہین
معزز ہون اگر طولِ سخن عورات کم کر دین — ہماری بات کو تخیل مین باندھین بات کم کر دین
زبان جسکی ہی قابو مین اُسے دُنیا سے کیا ڈر ہی — یہی یاجوج یا وہ گولی کو سدِ سکندر ہی
دلِ فرزانہ جو پُرتاب ہی نورِ خموشی سے — شرر کیطرح پتھر مین رہیگا گرمجوشی سے
جہالت کی کثافت دستِ خاموشی سے جاتی ہی — دہن کی گندگی منھ بند رکھنے ہی سے جاتی ہی
کٹے سر شمع کا جب اُسکے منھ سے پھول جھڑتے ہین — شکر گفتار توتے، خاص کر پنجرو مین پڑتے ہین
زیادہ بولنا گویا سخن کی قدر کھونا ہے — لبِ گفتار چاندی ہی لبِ خاموش سونا ہی
خموشی سو بلائین ٹالتی ہی یہ مسلّم ہے — حقیقت مین مقولہ داجبی من سکت سلم ہی
کوئی دلسوز ہمدم بے ضرورت لب کھولیگا — ہمارا بے زبان حقّہ بلانے ہی سے بولے گا
زبان کھولے گا عالی ظرف مطلب کی ندا پا کر — صدائے بازگشت آئیگی گنبد سے صدا پا کر
سناتا ہی یہ شعر فارسی کس گرمجوشی سے — مئی کا پرچۂ العصر تصویرِ خموشی سے

تبسم ہیچ مضمون۔ زلب بستن نمی آید
خموشی معنی دارد کہ درگفتن نمی آید

طالب بنارسی

بہار دکن[1]

جوبن پہ وہ گلشنِ دکن ہی — شہرہ ہر سو چمن چمن ہی
بہتی ہوئی سلسبیل صہبا — ڈوبا ہوا دامنِ تمنّا
میخوارون مین شغلِ مے پرستی — آنکھون سے عیان سیاہ مستی
قربان نسیمِ ہر نفس پہ — رنگِ عشرت رُخِ ہوس پہ
مخمورِ طرب نگاہِ نرگس — مسرورِ عجب نگاہِ نرگس
مستی مین جو آکے جھومتی ہے — مُنھ غنچہ دہن کا چومتی ہے
پیمانۂ گُل ہے اور مے بھی — قلبِ بُلبل ہے اور مے بھی
اُڑ اُڑ کے ہوا مین زلفِ سنبل — بنجاتی ہے چترِ شاہِ گُل
ڈالی ڈالی ہری بھری ہی — نظرون مین ہر اک چمن پری ہی
گلشن مین ہین دیدنی گُلِ تر — دل کی صورت روش روش پر
تحریکِ ہوا سے چل رہے ہین — گلگون کوتل ٹہل رہے ہین
غنچون کی چٹک مین یہ صدا ہی — عثمان کا دور آگیا ہے
پردہ مین چھپی کھڑی ہی شوخی — آنکھون مین حیا بنی ہی شوخی
تاثیر کی جھلکیان دعائین — اُڑتی ہوئین بیرقین ہوائین
تسلیم کو بلبلین کھڑی ہین — گلزار مین پلٹنین جمی ہین
خاموش ہر ایک شخص بالکل — آوازِ نقیب صوتِ بلبل
دربار ہے شاہ رشکِ جم کا — غل ہے تو نگاہ بر قدم کا
غنچون کی نظر بھی راہ پر ہے — اور رندر کو منھیون مین زر ہی

ساقی مے جانفزا پلا دے — بگڑے ہوے بخت کو بنا دے
وہ مے جو ہے حُسنِ حق پرستی — وہ مے کہ فدا ہے جسپہ مستی
تکلیفِ خمار سے بری ہو — وہ مے ہو کہ کشتِ دل ہری ہو
شیشے سے پری وہ بنکے نکلے — ارمان دل سے تنکے نکلے
ہان جام پہ جام اَب دیے جا — سرکار ہوئے جلوس فرما

وہ کون کہ خسروِ معظم — مقبولِ زمانہ جانِ عالم
حسن مہ چرخ دولت و مال — اورنگ نشین جاہ و اقبال
سُلطانِ دکن کریم و باذل — حامی غربا کے شاہِ عادل
رونق دہ مسندِ حکومت — ظلِّ خالق سپئے رعیت
زخمِ دلِ بیکسان کا مرہم — آفاق مین دستگیرِ عالم
مشکل مین ہر ایک کا ہے حامی — عثمان علی ہے نام نامی

[1] یہ نظم حضور نظام کی مسند نشینی کے موقعہ پر کہی گئی تھی۔ اُسوقت کہین شائع نہو سکی۔ اِس ماہ چونکہ حضور کی سالگرہ کا جشن منایا جارہا ہی۔ لہذا امید ہی کہ اسکی اشاعت بیموقع نہ سمجھی جائیگی ۱۲ منہ

اللہ اللہ ہے کیا حکومت   اقبال فدا تو صدقے دولت
حشمت بھی خوشی مین جھومتی ہے   جھک جھک کے قدم کو چومتی ہے
مسرور ہے جمال سے ہے   گویا یہ زبانِ حال سے ہے
یہ ساز یہ زینت ہو مبارک   یہ تخت یہ بخت ہو مبارک

غنچون نے جو دیکھی شکل پیاری   ٹوپی بہرِ سلام اُتاری
گردن شاخون نے بھی جھکا دی   تسلیم و رضا کی خو دکھا دی
بلبل کے ہین چار سو ترانے   بجتے ہین خوشی کے شادیانے
حسنِ رُخِ شاہ تا فلک ہے   نشترانِ نگاہ مردمک ہے
جاری ہے دعا یہ ہر زبان پر   یارب دائم رہین یہ سرور
جب تک کہ زمین پہ آسمان ہو
عثمان علی ہون او رجہان ہو

سلام

اُردو کیا ہے

فصاحت او ر بلاغت کی جان ہے اُردو   قسم خدا کی انوکھی زبان ہے اُردو
غلط نہین مرا دعویٰ یہ مدعی سُن لین   عزیزِ خلق ہے میٹھی زبان ہے اُردو
سلیس ایسی کہ چڑھ جاتی ہے زبانون پر   نفیس ایسی کہ مُلکی زبان ہے اُردو
محیط ایسی کہ ہندوستان مین پھیلی ہے   ہر ایک شخص کی پیاری زبان ہے اُردو
ادیب ایسی کہ علم ادب سکھاتی ہے   وسیع ایسی کہ سب کی زبان ہے اُردو
ظفر نے دھوم مچا دی ہے اس زمانے مین   کہ فتح اُسکی ہے جسکی زبان ہے اُردو
خراب اسکو نہ لے دو ستو اے ردِ ہرگز   بری ہے عیب سے اچھی زبان ہے اُردو
بدل کے قافیہ تکرار نظم کرتا ہون مین   کہ اسپہ قابو ہے میری زبان ہے اُردو
فلک سے آتی ہین مبہم صدائین کانون مین   زمین شعر پر اک آسمان ہے اُردو
محاورات ہین اسکے کہ لعل کے ٹکڑے   غرض ضرور فصاحت کی کان ہے اُردو
بہت سڈول ہین الفاظ اسکے جتنے ہین   جدید طرز کی گویا کہ سان ہے اُردو
ستاؤ اسکو نہ بہرِ خدا نہ ظلم کرو   کہ گھر مین آپ کے یہ میہمان ہے اُردو
غلط ہے یہ کہ ہے الفاظ کی کمی اسمین   بہت وسیع ہماری زبان ہے اُردو
حریف اسکو کبھی زیر کر نہین سکتا   یہ رزمگاہ مین وہ پہلوان ہے اُردو
اُنھین سے لونگا فصاحت کی داد آزاد آج
جو کہہ رہے ہین کہ میری زبان ہے اُردو

زوّار الہ آبادی

تصویرِ جاناں

اللہ اللہ کسقدر دلکش تری تصویر ہے   جسکی خاموشی مین لطف شوخی تقریر ہے
عارضِ روشن ترا والشمس کی تفسیر ہے   یا بیاضِ صبح کی پھیلی ہوئی تنویر ہے
حسن کی دیوی ہے یا کوئی پری پیکر ہے تو
کاغذی ہے پیرہن تیرا عجب دلبر ہے تو
بے زبان ہے تجھ مین وہ اندازِ گویائی نہین   وہ لبِ جان بخش و اعجازِ مسیحائی نہین
وہ گُلِ رخسار کی دلچسپ رعنائی نہین   حسنِ عالم سوز کی وہ عالم آرائی نہین
وہ ترا نقشا نہین نقاش نے کھینچا جسے
نقل تیری وہ نہین ہو اصل کا دعویٰ جسے
کاش گویائی بھی ہوتی پیکرِ تصویر مین   کاش ہوتی ضوفشانی حسنِ پُر تنویر مین
کاش ہوتا سحرِ بابل کا اثر تقریر مین   ہوتی زینت اس سے بزمِ عاشقِ دلگیر مین
تو دکھا دیتی تماشا اک نیا اے جانِ حسن
اور ہو جاتی دو بالا اس سے تیری شانِ حسن
پیکرِ تصویر کے انداز بھی کچھ کم نہین   بزمِ ہستی کی ہے رونق تجھ سے اے ماہ مبین
شانِ رعنائی بھی معشوقوں سی جاتی ہے کہین   حسنِ پُر تنویر تیرا خوشنما و دلنشین
باغِ عالم مین شگفتہ اک گلِ شاداب ہے
اے مہِ خوبی تو رشکِ مہرِ عالمتاب ہے
اُف رے تیری شرم اُف رے ترا اندازِ حجاب   روے روشن کو چھپایا زیرِ دامانِ نقاب

کیون ہوئی جاتی ہے تجھ قطرۂ حیا سے آب آب   زلف بھی شانے پہ تیرے کھا رہی ہے پیچ و تاب

آسمانِ حسن پر ہے یہ گھٹا چھائی ہوئی

یا ترے شانے پہ ہے زلف رسا آئی ہوئی

فتنۂ محشر سے بڑھکر ہے قدِ رعنا ترا   بوٹا بوٹا سایۂ قد سے صنوبر ہو گیا

روے روشن دیکھکر آئینہ کو سکتا ہوا   محوِ حیرت بنکے پہرون شوق سے دیکھا کیا

آئینہ بھی ہے ترے رُخ کی صفائی پر نثار

لعل صدقے لب پہ دندان پہ ترے گوہر نثار

نرگس شہلا تری آنکھیں ہین یا چشم غزال   صورتِ آئینہ حیران مین بنا ہون ڈال

مین تری چشمِ فسون گر سے ہوا ہون پائمال   برشِ تیغِ نگہ نے کر دیا مجکو حلال

ترچھی چتون سے جو دیکھا اک نئے انداز سے

دل ہوا بسمل ترے تیرِ نگاہِ ناز سے

واہ واصل علی کیا دلکشا تصویر ہے   اسمین شان دلبری ہے دلربا تصویر ہے

سچ تو یہ ہے اوؔج یہ معجز نما تصویر ہے   عکس بول اُٹھتا ہے خود دیکھو تو کیا تصویر ہے

ہے مصور دنگ آئینہ بھی حیران دیکھکر

مانی و بہزاد دونون ہین پشیمان دیکھکر

اوؔج۔ گیاوی

نشۂ شباب

(اس نمبر کی رنگین تصویر ملاحظہ ہو)

کیفِ دورانِ جوانی نشۂ دورِ شباب   پردۂ ایوانِ قدرت اخوابِ ہوشِ شباب

رنگ افروزِ رخِ حسن سیہ مستی شباب   زندگی کا عین جوبن جوہرِ ہستی شباب

رہزنِ ہوش فراست دیدۂ مستِ شباب   دیکھیے کیسی بھری ہے دو کٹورون مین شراب

ہمرہِ جوشِ جوانی۔ سرکشی کی لاگ ہے   ظلم پر یہ ظلم۔ گویا اک مین اور آگ ہے!

یہ تغافل ایسا اترہ پن۔ یہ استغنا کہان؟   جلوۂ حسن آفرین ہے اس جوانی مین عیان

ہانگ باہو نہین سراسر ماہِ تابان ارین   ہے خطِ نقرہ محک پر۔ برقِ خندان ابر مین

ہے جو بالائے جبین صندل کا ٹیکا اشکار   نونِ ابرو کا ہے نقطہ نقطۂ باغِ بہار

دیدۂ مخمور ساقی کہہ رہا ہے رات دن   نشہ ہر دم ایک بوتل کا چڑھا ہے رات دن

پھر تو آنکھین دکھائے دیدۂ آفت نظر   آئینہ کو منھ چڑھائے چہرۂ رشکِ قمر

بادۂ بے داد جب یار جوان ہو جائیگا   آسمان اک اور زیرِ آسمان ہو جائیگا

طرزِ خود رائی سے خطرہ اس جوانی مین کہان   عاقبت بینی کا جلوہ اس جوانی مین کہان

دانشِ ایامِ پیری۔ اس جوانی مین کہان   صبح کاذب پہلے ہے پھر صبح صادق ہے عیان

کم سخن ہو کر گل خورسندگی چنتا ہے کون   اپنی خوش فہمی کے آگے اور کی سنتا ہے کون

ہے جوانی مین اگرچہ لازم ہے یہ نورانی صفات   ہے مگر جوشِ جوانی مین یہ سب کہنے کی بات

خانۂ دلمین مہیا ہے یہان سامانِ عشق   حسن گوری گات مین ہے ہات مین دامانِ عشق

ہے جوانی کی سیہ مستی شبِ رنج و بلا   یہ تصور کب ہوا جوشِ جوانی مین بھلا

دشمنِ دین دشمنِ دل۔ دشمنِ فرزانگی   ہے جوانی زندگانی مین گھڑی دیوانگی

دامنِ دریا سے افزون کوزۂ دل کی ترنگ   طارمِ گردون سے بالا بامِ خاطر کی اُمنگ

ہے کمال اس عہد کا سارے جہان کیواسطے   ہے زوال اسکا وبال اپنی ہی جان کیواسطے

اُس جوانی مین خوشی کی کیون فراوانی نہو   جسکے ہاتھون عہد پیری مین پشیمانی نہو!

روشنی لازم ہے صبحِ زندگانی کے لیے   ماہِ عفت چاہیے شامِ جوانی کے لیے

ہین مگر نازِ و تبختر اس جوانی کے چراغ   کہہ گئے ہین شعر کیا ہی بے بدل اُستاد داغ

ہے ادا مستانہ سر سے پانون تک چھائی ہوئی

اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

حضرت فصیح الملک داغ دہلوی [illegible]

طالب بنارسی

جذبات وفا

قوم مین جو آجکل فیشن کا پھیلا روگ ہے   اے اپنی کم نصیبی کا یہ خاصا سوگ ہے

اب مسلمان آریہ سب ہمزبان کہتے ہین   یوگ کے بدلے مسل نازک بدن کا جوگ ہے

کچھ نہین پروا اگر اطفال و زن بھوکون مرین   گھر مین کھانے کو نہو لیکن بڑا سا پیٹ ہو

جان جائے قرض کے غم مین بلا سے ہو فیشن   ہاتھ مین تپلی چھڑی، کوٹ اور پتلون ہیٹ ہو

درہم تو نہین جیب مین مغرور رہین ہم   برہم ہین کہ مفلوک ہین، مجبور رہین ہم
عسرت ہی بہت قوم مین بجید ہی نفاق   افسوس کہ مین خوار تو مسرور رہین ہم

دیکھنے جاتے ہین ہر روز مسلمان تھیٹر   کب تلک دیکھین گے بربادی کا اپنی اثر
اب خدا رحم کرے اپنی یہ حالت ہو وفا   بڑھ گیا حد سے بہت قوم کا تھرمامیٹر

خواری و ذلت اُٹھائی لیڈرونسے قوم نے   لیگ مسلم اِک طرف، اور انکی گھاتی اِک طرف
یہ مثل آتی ہی صادق ایسی حالت پر وفا   سب خدائی اِک طرف جورو کا بھائی اِک طرف

مرشد ہین بنے جب سے یہ سب کٹھ مُلّا   دیتے ہین مرید کو بہشتی حُلّہ
تسبیح زبان پر ہے، مگر دلمین یہ ہی   گھر بار مرید کا ہو غائب غلّہ

بیکار اُمیدوار کو آس بھی ہی   اِک طرح سے اُس کا ستیاناس بھی ہی
بیچارہ شکایت جو کرے حاکم سے   ملتا ہی جواب "تو ڈل پاس بھی ہی؟"

جبکہ ہم فیشن کے شائق ہین تو پھر کیا دیر ہی   بوجھ سے اُسکے ہوے بھاڑے کے ٹٹو بھی سہی
واٹ اِیس، نو طرز مین دخل اپنا دیکھیے   بال ہون البرٹ فیشن ایک جٹو بھی سہی

وحشت ہے یہ تہذیب، نہ تہذیب کی دُم   اے ہندیو! شرماؤ۔ یہ کیا کرتے ہو تم
تہذیب کی تقلید اسے کہتے ہین   معشوق ہے ساتھ، لنڈھین خم کے خم

انسان کی بربادی مین اِک آز بھی ہی   کر دینے کو بسمل نظر ناز بھی ہے
کہتا ہی گلا پھاڑ کے اُبھرا جوبن   معشوق طرحدار ہی، ہم باز بھی ہے

غلام محمد وفا۔

موعظت حسنہ

دُنیا ہی کیا؟ سرا ہی کب ٹھہرنے کی جا ہی   عالم سراب کا ہی رکھا ہی اسمین کیا ہی
پتلا یہ خاک کا ہی انسان مین جان کیا ہی   دم اس مین گزرا ہی پانی کا بُلبلا ہی
ہر چیز کو فنا ہے یارب! تجھے بقا ہی   تو مالکِ حقیقی دُنیا جہان کا ہی
ایذا دہی بُری ہی ایذا رسان بُرا ہی   کبر اور ہو بشر مین کیا تجھ کو ہو گیا ہی
مٹی کے پتلے ہر دم کیون خاک چھانتا ہی   ہی چاہ تیرے آگے دُنیا کی چاہ کیا ہی
احسان مین جب غرض ہو احسان ہی وہ کیا ہی   کیون نام کی ہی خواہش کس کا نشان رہا ہی
کل پر نہ اُسکو رکھو جو کام آج کا ہی   نیرنگیون سے جا بچو رنگ زمانہ کیا ہی
گر ہو نہ آدمیت وہ آدمی ہی کیا ہی   جو بیکسونکو پوچھے کیا اُس کا پوچھنا ہی
دے ساتھ وقت بد مین کون ایسا آشنا ہی   ہے قابل پرستش جو یار باوفا ہی
نیکی ہی حق کی رحمت لیکن بدی بلا ہی   دلمین بدی کا آنا آفت کا سامنا ہی
بیدار سب ہین عاقل غافل تو سو رہا ہی   برباد ہو گا اِک دن سر مین اگر ہوا ہی
کر ترک زر کی خواہش یہ آفت و بلا ہی   ہی وقت مال و دولت تو مفت کھو رہا ہی
عزت کا پاس رکھو یہ پیٹ گو بُرا ہے   ہی زندگی اُسیکی جس شخص مین حیا ہی
بے کس کی آہ سے ڈر یہ مار بے صدا ہی   ہان! باعثِ تباہی بے رحمی و جفا ہی
ہونا ہی جو وہ ہو گا کیون رنج کر رہا ہی   ہی عمر تیری کتنی؟ کیون غم مین مبتلا ہی
صحبت بُرون کی صحبت اِک آفت اِک بلا ہی   عزلت مین جو ہی عزت کامل ہی جانتا ہی
درد آشنا سے پوچھو اُلفت مین لطف کیا ہی   ہی لطف زندگی کا دلمین اگر وفا ہی
جو کام سب کے آئے ہادی ہے رہنما ہی   نیکی بدون سے کرنی نیکی کا اقتضا ہی
دو رنگیِ جہان دیکھ اِک منعم اِک گدا ہی   ہے ساتھ عیش کے غم دُنیا مین اور کیا ہی
چشمِ کرم بشر سے؟ ذلت کا سامنا ہی   اللہ سے طلب کر جو تجھ کو مانگنا ہی
اُس کا دیا ہی روشن جس شخص نے دیا ہی   ہی ایک خلق تابع احسان و خلق کیا ہی
گر دل نہ ہو مکدر جامِ جہان نما ہی   حالِ سیہ کاران عبرت کا آئنا ہی
ہر چیز ہے مؤدب چشمِ خرد جو وا ہی   سنتے تھے حالِ دُنیا دیکھا نہین کیا ہی

ہو جہان میں اس کا لب کوئی آشنا ہو
یا رب اذہین کو بس تیرا ہی آسرا ہو

غلام مصطفٰے ذہین

خدا کا شکر ہے

لاٹ صاحب کو ہوئی صحت خدا کا شکر ہے
خیریت سے ٹل گئی آفت خدا کا شکر ہے

ہو مبارک غسل صحت ہو گیا ممدوح کا
منھ ترا اُجلا ہوا بھارت خدا کا شکر ہے

مرحبا شاباش لیڈی ہارڈنگ صد آفرین
ایسے خطرہ مین بھی یہ ہمت خدا کا شکر ہے

لاٹ صاحب بچ گئے صدمے سے غم کے بال بال
آگئی آڑے تری عصمت خدا کا شکر ہے

کھیل ہی سارا بگڑ جاتا بگڑ جاتا جو یہ
بنگیا ہاتھی اچل پربت خدا کا شکر ہے

بنگیا ملعون قاتل کر کے بے لذت گناہ
رہگیا ناکام بدنیت خدا کا شکر ہے

کیا عدو کے وار کا ہوتا اثر ممدوح پر
ہمقدم تھی وار کے رحمت خدا کا شکر ہے

اپنے آقا پر ہوا قربان ہو جنت نصیب
چھتری والے نے بھی کی ہمت خدا کا شکر ہے

جارج پنجم کے ہوا اقبال کا سارا طفیل
بم کی زد سے بچ گئی خلقت خدا کا شکر ہے

لاٹ صاحب کی اولوالعزمی ہے یہ جو ہند سے
ہو سوا پہلے سے اب الفت خدا کا شکر ہے

باغ ہستی لاٹ صاحب کا رہے پھولا پھلا
مانگتی ہے یہ دعا خلقت خدا کا شکر ہے

کیون نہو ہر شعر تیرا مہر مصری کی ڈلی
ہو تری شیرین زبان شربت خدا کا شکر ہے

شکھ دیو پرشاد مہر

العصر کا خیر مقدم

ساقی بزم سخن مین لا جام سخن
العصر نے زندہ کر دیا نام سخن

ہین صورت نردبان مضامین تمام
چڑھ جاؤ کہ اب دور نہین بام سخن

قرآن بھی ادیب بھی زمانہ بھی پڑھا
اور علم ادب نیا پرانا بھی پڑھا

العصر جو ہاتھ مین ہمارے آیا
باقی تھا سخن کا جو خزانہ بھی پڑھا

العصر کی شان ہے نرالی بیشک
بندش بے مثل طرز عالی بیشک

سالی کہ نکوست از بہارش پیداست
ہین اس کے مضامین لآلی بیشک

بہزاد کا نقش ہے کہ مانی کا نگار
العصر ہے باغ علم مین فصل بہار

دلچسپ ہے دلپسند ہے دلکش ہے
حاسد کی نظر مین ہو یہ یارب خار

العصر رسالون مین نرالا ہو جائے
سب مین لاثانی یہ رسالہ ہو جائے

اختر کی دعا ہے کرے ہر ایک پسند
شاکر کا جہان مین بول بالا ہو جائے

اختر کشنوی

تازہ غزلین

مجدد الوقت مولانا سید احمد حسن صاحب شوکت (میرٹھی)

جھونکا چلے جو رحمت حق کی نسیم کا
ہر شعلہ باغ خلد ہو نار جحیم کا

تردامنی پہ اپنی مین آب آب جبکہ ہون
داغ گناہ پھول ہے باغ نعیم کا

کانٹے کا پلہ رحمت حق نے جھکا دیا
ہلکا رہا نہ بار گناہ عظیم کا

لغزش کا پاؤن کو نہ الم تھا صراط پر
ہاتھون مین تھا عصا جو الف لام میم کا

حمد خدا و نعت محمد سے ربط ہے
نغمہ صریر کلک مین ہے حا و میم کا

رحمت کے آگے پاؤن نہ محشر مین جم سکے
لشکر شکست کھا گیا امید و بیم کا

گزرا شباب شیب مین سجدے ہوئے نصیب
قد جھک کے حلقہ بنگیا باب کریم کا

اے شیخ رو رہا ہون مین زمزم کی چاہ مین
گرتا نظر سے دیکھ کے دُرِّ یتیم کا

مجھکو ہوا بتاؤ نگا اے شہپر ہما
ہے سایہ میرے سر پہ حرم کی حطیم کا

جلتا ہون مین جو ساقی کوثر کے عشق مین
دل سرد روز حشر ہے نار جحیم کا

مانند برق کوند گیا بام عرش پر
یہ جرم تھا براق کے عزم صمیم کا

شوکت کو دھیان اب نہ نور خدا کا ہے
عالم ہے اُسکے قلب مین ماہ دو نیم کا

مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی

وفائی داد گر دینا تو یون او بیوفا دینا   مرا دل توڑ کر رسم محبت کو اُٹھا دینا
یہ تاثیر بیان لائے کہان سے اہل الفت ہم   جہان جا بیٹھنا محفل کی محفل کو رُلا دینا
نہ ہے محدود موسی تاکنے شورش لن ترانی کی   ہمارے شوق کی بھی داد ہمکو اے خدا دینا
رسا زخم جگر ا ن سار کی انگڑائی لی مین نے   قیامت گر گیا نشے مین تیرا مسکرا دینا
میان بزم ساقی کون سنتا ہے فقیر دل کی   ہمارا کام یہ ہے ہر در آنا اور دعا دینا
مذاق اہل دل خلوت مین اک مرد حقیقی کا   کبھی کچھ اشک بھر لانا کبھی کچھ مسکرا دینا
تمنائے وصال اک یک نفس ہے یہ تو ہے   جہان تک جلد ہو سرمایہ ہستی مٹا دینا
وصال دوست کا راز حقیقی کھل گیا آخر   وہ آنا نزع مین تجلی وہ مسکرا دینا
اجل کا پوچھنا کیا عام ہے سارے زمانہ مین   تم اپنے منھ سے درد دل کی ہماد حد بتا دینا
مرے اشکونکی سوز ہجر مین گرم رفتاری   گریبان مین لگا کر آگ دامن تک جلا دینا
الٰہی خیر ہو پھر لے چلا شوق اُسکی محفل مین   کہ حسن وضع ہے جسکا ہم ایسونکو اُٹھا دینا
دم قصد فغان اب ہاتھ رکھ لیتا ہون سینے پر   گئے وہ دن کہ جب تھا سہل دنیا کو ہلا دینا
ہمارا درد دل گویا کہ شرح لن ترانی ہو   کسی صورت سے ممکن ہی نہین جسکا دکھا دینا
نہ جانے خط مین سمجھا ہے کیا ہے فرط ناکامی   کہ پہرون بیٹھکر لکھنا گھڑی بھر مین مٹا دینا
کوئی پہلے پہل قاتل بنے گا ہوتی ہے زینت   ہمارے خون کا سا رنگ تو بھی اے حنا دینا

وہ خود ہی روتے ہین بس رونا کامی پہ محشر
جنھین کچھ بھی نہ تھا دشوار روتے کو ہنسا دینا

سید امین الحسن صاحب بسمل

جلوہ ریز رعنائی خود ہوا نکھار اپنا   عشق کے گلے ڈالا حسن نے جو ہار اپنا
اب خزان کو فرصت ہے ہو چکا جو تھا ہونا   کام کر چکا پورا موسم بہار اپنا
کیون کسیکی امیدین خاک مین ملائین آپ   جھوٹے وعدے کر کے کیون کھو دیئے وقار اپنا
شوق نے کیا بیخود وہ تھی خواب شیرین مین   آج ہو گیا رخصت ہم سے اعتبار اپنا

آزمائین تمکین کو آؤ ایک ستمگر کی   آج چلکے دکھلائین اُن کو حال زار اپنا
مرے جھک کے ملنے پر رحم آگیا اُن کو
کام دے گیا بسمل آج انکسار اپنا

مولوی ضمیر الدین صاحب عرش گیاوی

فقط دل مین ہو لئے آج یاد رفتگان باقی   نہین تو نام باقی ہے نہ ہے انکا نشان باقی
مٹا ڈالا اُسے بھی ہائے رفتار زمانہ نے   وہ جو اک نام کو تھا نقش پائے رہروان باقی
مٹانے کو ہے بس اک جنبش موج ہوا مجکو   بسان نقش پا ہے نقش ہستی کا نشان باقی
نہ ہے وہ اوج موج اپنی طبیعت مین وہ گرمی   نہ دریا ہے نہ اب دریا کنارے ہے دھوان باقی
مٹایا مجکو کیا عالم نے اپنے کو مٹایا ہے   گل و بلبل کے دم تک ہے بھی بہار گلستان باقی
تن لاغر کے بدلے خاک تھوڑی سی ہے تربت مین   کہین تو چل بسے ہے نام کو انکا نشان باقی
گھٹا چھائی ہے چھائے غم غلط کرنیکی کیا صورت   نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیمانہ وہ مے کی دکان باقی
ستمگر نے در و دیوار کو کانٹو سے ڈھا ڈالا ہے   بتانے کو پتہ لیکن ہے سنگ آستان باقی
یہان رونے کا بھی موقع نہین اظہار ماتم کو   کہ روتے روتے آنکھو مین نہین اشک روان باقی
جلا دو شمع جا کر شام کو گور غریبان مین   اسی سے اب تو گمنامون کا ہے نام و نشان باقی

دم پیری طبیعت مین ہے گرمی عرش فتنے کی
سحر کو شمع مردہ مین ہو جیسے کچھ دھوان باقی

منشی محمد عبد الغنی صاحب صادق

دل غیر کا ہوگا کہ نہ مرے دل کے برابر   تارا بھی ہوا ہے مہ کامل کے برابر
اے چارہ گر درد بتاؤن تجھے کیا کیا   بیتاب جگر بھی ہے مرے دل کے برابر
خونریزی عاشق نے یہ تاثیر دکھائی   بیتاب جگر بھی ہے مرے دل کے برابر
کیا دیکھ لیا ہے یہ کسی شوخ ادا کو   ہاتھون جو اُچھلتا ہے جگر دل کے برابر
ٹھوکر وہ لگا کر مری تربت پہ یہ بولے   یہ کیون ہے ہوئی خاک مین مل مل کے برابر
عاشق کیلئے منزل اُلفت مین کوئی اور   خضر رہ مقصد نہین دل کے برابر
اُس غم کی شرکت کہین آسان ہے صادق
مشکل بھی نہین ہے تو ہے مشکل کے برابر

ایڈیٹوریل

العصر کا خیر مقدم جس جوش و خروش اور فراخدلی کے ساتھ کیا گیا ہو وہ ہمارے لئے نہایت حوصلہ افزا ہو۔ ملک کے مقتدر اُردو و انگریزی اخبارات نے اس علمی و ادبی خدمت کو نہ صرف مفید بتایا بلکہ اس رسالے کی ضرورت بھی تسلیم کی ہو۔ بعض ایسے حضرات نے بھی ہماری محنت و کوشش کی داد دی ہو جو ادبی معاملات میں خاص تجربہ و بصیرت رکھتے ہیں۔ البتہ الناظر نے العصر کی اشاعت کو بے موقعہ اور غیر ضروری بتایا ہو۔ ممکن ہو کہ یہ رائے درست ہو۔ مگر ان آراء کے مقابلہ میں جو کثرت کے ساتھ العصر کے اظہار پسندیدگی میں آئی ہیں، الناظر کی رائے کو ہم قابل وقعت نہیں سمجھتے۔

اول نمبر میں ہم نہایت وضاحت کے ساتھ بتا چکے ہیں کہ العصر کا نصب العین یا مابہ الامتیاز کیا ہوگا۔ کسی پرچہ کے صرف ایک ہی نمبر کو پیش نظر رکھکر اُسکی آئندہ روش کے متعلق قطعی فتویٰ صادر کر دینا ہم نہیں سمجھتے کہ کہاں تک مستحسن خیال کیا جا سکتا ہو۔ جائز نکتہ چینی کے ہم ہرگز مخالف نہیں، مگر ہاں یہ ہم ضرور چاہتے ہیں کہ العصر کے متعلق جو رائے قائم کی جائے وہ محض مخالفانہ نہو۔

ابتدائی نمبر کی اشاعت پر یہ عام طور پر کہا گیا تھا کہ "یہ نمبر صرف نمونہ ہی ثابت نہو بلکہ کوشش کی جائے کہ اسکی موجودہ حالت قائم رہے"۔ ہم سمجھتے ہیں کہ العصر کے آئندہ نمبروں سے یہ بدگمانی رفع ہو گئی ہوگی۔ تاہم یہ بتا دینا ضروری ہو کہ العصر کی نہ صرف موجودہ حالت ہی قائم رکھی جائیگی بلکہ قدر دانوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ اسکے حجم اور تصاویر کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا رہیگا۔ العصر کی خصوصیات قائم رکھنے کے ہم ذمہ دار ہیں، اور اس کے کثیر اخراجات کی کفالت قدر دانانِ علم ادب پر فرض ہو۔ اگر دونوں اپنی اپنی ذمہ داریاں محسوس کرتے رہیں تو کچھ شک نہیں کہ العصر بہت جلد اپنی ارتقائی منازل کو طے کرے گا

عام طور پر مشہور ہو کہ "ہندوستان کا باوا آدم نرالا ہو"۔ یہاں کام کرنے والے کے کام کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہو کہ اُسکا مذہب کیا ہو۔ آپ مُلکی کام کیجیے خواہ قومی، علمی خدمات انجام دیجیے خواہ ادبی مگر یہ ناممکن ہو کہ اہل ہند مذہبی سوال درمیان میں نہ لائیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو اُنکے ہندوستانی ہونے ہی میں شک ہوگا۔ خواجہ حسن نظامی صاحب نے "توحید" کے پہلے پرچہ میں العصر پر ریویو کیا ہو۔ آپ فرماتے ہیں کہ چونکہ مصر کے مسیحی پرچوں میں مذہبی تصاویر بھی ہوتی ہیں، لہذا العصر میں بھی مذہبی تصاویر ہونی چاہئیں۔ گویا آپ کی رائے میں العصر مسیحی پرچہ ہو اور اسکی وجہ سوا اسکے اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ اس کا ایڈیٹر مسیحی ہو۔ انھیں تنگ خیالوں نے ہندوستان کو تباہ کیا ہو اور تاوقتیکہ یہ مذہبی سوال درمیان سے اُٹھ نہ جائے ہندوستان ہرگز ترقی کا منہ نہیں دیکھ سکے گا۔

العصر میں ابتک کوئی ایسا مضمون نہیں شائع ہوا ہو جسکی نسبت یہ کہا جاسکے کہ وہ مسیحی نقطۂ خیال سے لکھا گیا ہو۔ اگر کہیں اس قسم کا کوئی مضمون چھپ جاتا تو نہیں معلوم خواجہ صاحب کیا فتویٰ صادر فرماتے۔ لیکن اگر العصر میں مذہبی مضامین بھی شائع ہوں تو اسمیں کیا گناہ ہو۔ مذہب "ہوا" نہیں ہے کہ اُس سے خوف کھایا جائے، بلکہ مذہب اُس تعلق کا نام ہو جو انسان اپنے سے کسی اعلیٰ ہستی کے ساتھ رکھتا ہو، خواہ اسکی بنیاد خوف پر ہو یا ذاتی کمزوری پر جو بیرونی امداد کی تلاش کرتی ہو یا اُس خواہش پر جو اپنے سے بہتر کے ساتھ میل جول رکھنے میں اپنی بہبودی اور ترقی سمجھتی ہو یا اُس حسِ باطنی پر جو ایک اعلیٰ ہستی کے ساتھ اپنا رشتہ محسوس کر کے اُس سے کامل طور پر پیوند ہونا چاہتی ہو۔ جب ہم مختلف مذاہب پر نظر کرتے ہیں تو انمیں اسی تعلق کا اظہار مختلف صورتوں میں پاتے ہیں۔ انسان کیا ہو؟ وہ اعلیٰ ہستی جسکے ساتھ وہ تعلق ڈھونڈھتا ہو کیا ہو؟ اور اس تعلق کی شرائط یا حقیقت کیا ہیں؟ اخلاقی قوانین اور طریق عبادت محض فروعی باتیں ہیں، جو ان اُصولی اُمور سے مستنبط ہوتے ہیں۔

سچی ترقی کی اصلی جڑ سچا مذہب ہے۔ کیونکہ ترقی جوں جوں نشوونما پاتی ہو اُسکی شاخیں ہر طرف پھیلتی جاتی ہیں۔ اسکا تعلق نہ صرف خاندان سے بلکہ قوم اور ملک سے بھی ہو۔ اُس سے فقط ظاہری حالت ہی نہیں سدھرتی بلکہ اخلاقی اور

تمدنی حالت بھی۔ اسکا اثر نہ صرف تجارت اعلم و ہنر اور صنعت و حرفت مین پایا جاتا ہی بلکہ تعلیم اور علم ادب مین بھی۔ اور اس صورت مین یہ نہایت نامناسب ہی کہ مذہب کا نام سنتے ہی ہم آتش زیر پا ہو جائین۔ دُنیا مین جو نئی نئی دریافتین مادی یا ذہنی، اخلاقی یا روحانی عالم مین ہو رہی ہین اُنمین کل بنی آدم کا حصہ ہی اور وہ سبکے فائدے کے لیے ہین اور فی الحقیقت ہم سب اُن سے فائدہ اُٹھاتے ہین سائنس کے ایجادات سے بھی ہم متمتع ہو رہے ہین۔ اخلاقی دریافتین رفتہ رفتہ قبول کر لی جاتی ہین، پھر کیا وجہ ہی کہ روحانی دریافتون سے ہم دور بھاگین۔

اَب وقت آگیا ہی کہ ہم اِن تنگ خیالیون کو ترک کرین اور ٹھنڈے دل سے مطالعہ مذاہب پر کمر بستہ ہون۔ محض مذہبی حمایت کو نہین بلکہ حق کی دریافت کو اپنا اصلی مقصد ٹھہرائین۔ مذہب کا مطالعہ علمی اُصول کے مطابق شروع کرین اور اُن خصوصیات کو معلوم کرکے جو مذہب کی بنیاد ہین اور جنکا فطرتِ انسانی کے ساتھ گہرا تعلق ہی تاریخی اور فلسفی اور سائنٹفک نظر سے مذاہب عالم پر نظر ڈالین تب ہم پر ان اُمور کی حقیقت کھلے گی۔ محض سطحی نظر سے دوسرے مذاہب کو دیکھنا، اُن کو بُرا کہنا، اور اُن پر بہتان باندھنا سراسر ظلم ہی۔

العصر کی پالیسی کے متعلق بعض حضرات کو سخت غلط فہمی ہوئی ہی۔ مذہبی مباحث اور موجودہ پالٹیکس سے علیحدگی کے یہ معنی نہین ہین کہ اسمین مذہبی اور ملکی معاملات سے بحث نہین کی جائیگی، بلکہ وہ مذہبی معرکہ آرائیان جو ملکی ترقی کی رفتار مین سنگ راہ ہین العصر مین نہین چھیڑی جائین گی، اور حکومت وقت کے طرزِ عمل پر کسی قسم کی نکتہ چینی روا نہ رکھی جائیگی۔ اِن اُمور سے قطع نظر کرکے تمام اُن مذہبی اور ملکی معاملات کے لیئے جو دائرہ ادب کے اندر ہون اور جن سے ابنائے ملک فائدہ اُٹھا سکین العصر کے صفحات مین کافی گنجائش ہی۔

باوجودیکہ بہت کثرت سے العصر کے متعلق تعریفی آرا موصول ہوئی ہین مگر ہم اَب بھی یہی سمجھتے ہین کہ ہمین اور آگے قدم بڑھانا چاہیئے۔ اگرچہ ہماری بے مائگی اور بے بساطی ہمین اس امر کی اجازت نہین دیتی کہ ہم اپنے بعض دیگر معاصرین کیطرح بھاری وعدے کرکے یا بڑے بڑے انعام دیکر لوگونکو العصر کی خریداری کی ترغیب دین، مگر ہم انھین یقین دلانا چاہتے ہین کہ ہماری دلی خواہش ہی کہ کہ ہم بجائے اس قسم کے انعامون کے خود العصر کو ایک ایسا عمدہ انعام ثابت کرین کہ لوگ ایسے انعامات کی طمع سے نہین بلکہ خود اسکی خاطر اسکی قدردانی کرنے پر مجبور ہون

کسی پرچے کی عمدگی کی دلیل اُسکے مضامین ہوتے ہین اور یہ ظاہر ہی کہ عمدہ مضامین ہمیشہ مفت نہین ملا کرتے جسقدر مضامین ابتک العصر مین شائع ہو چکے اگرچہ اُنمین بھی زیادہ تر اُجرتی ہی تھے تاہم اَب ہم عام طور پر اعلان کرتے ہین کہ عمدہ مضامین کے لیئے العصر کی حیثیت کے مطابق ہم نقد معاوضہ بھی نذر کرنے کو تیار ہین۔ معاوضہ کی شرح بلحاظ مضمون نگار کی ادبی شہرت یا نوعیت مضامین کے دو ہونگی یعنی ایک روپیہ فی صفحہ اور آٹھ آنہ فی صفحہ۔ یہ معاوضہ صرف اوریجنل مضامین کے لیے دیا جائیگا۔ تراجم کے لیے بذریعہ خط و کتابت فیصلہ کرنا چاہیئے۔

ہم نے چند خاص عنوان بھی تجویز کیئے ہین جن کے تحت مین التزاماً ہر ماہ العصر مین مضامین درج ہوا کرینگے۔ جو صاحب ہماری ہدایت کے مطابق اس سلسلہ مین ہماری امداد فرمانا چاہین، ہم سے خط و کتابت کرین۔ کام کی نوعیت کے لحاظ سے نقد معاوضہ بھی پیش کیا جائے گا۔

اس ماہ کے اوائل مین اعلیحضرت شہنشاہ معظم دام ملکہ کا جشن سالگرہ تمام برٹش گورنمنٹ مین نہایت جوش و خروش کے ساتھ منایا گیا ہی۔ اس مبارک تقریب کی خوشی مین ہم حضور ملک معظم و جناب ملکہ معظمہ کی تصاویر ہدیۂ ناظرین کرتے ہین۔ صرف ہماری نہین بلکہ تمام رعایائے ہند کی یہ دلی دعا ہی کہ خدا حضور کو عمر صد سالہ تک سلامت با کرامت رکھے اور اہل ہند آپکے سایۂ عاطفت مین ہر طرح پھولین پھلین آمین

ماہ رجب المرجب کی پہلی تاریخ (۱۰ جون) اعلیحضرت قدر قدرت بندگان عالی متعالی مدظلہ العالی کی سالگرہ مبارک کا روز مسعود ہی جو رعایائے دکن کے لیے عید سے بھی بڑھکر مسرت بخش ہی امسال بھی اس موقعہ پر رعایائے دکن نے خوب خوب

جشن منائے اور اپنی دلی مسرت و عقیدتمندی کا اظہار کیا۔ ہم بھی اس نمبر مین حضرت اقدس و اعلیٰ کی تصویر اُسی لی شکرگزاری کے ساتھ شائع کرتے ہین جو حضور کی علمی سرپرستی سے العصر پر فرض ہی۔ اِس پرآشوب زمانہ مین صرف حیدرآباد ہی ایک ایسی ریاست ہی جہان ہمیشہ امورِ خیراور علم و فضل کی اشاعت و معاونت ہوتی رہی ہے۔ ناچیز العصر کی بھی بہت سی توقعات حضرت اقدس و اعلیٰ کی ذات ستودہ صفات سے وابستہ ہین حضور ہی کی ادنیٰ توجہ سے یہ معرضِ وجود مین آیا اور حضور ہی کی التفات توجہ مبارک پر اسکی زندگی کا انحصار ہی۔

تمام وابستگان و بہی خواہانِ دولتِ آصفیہ کی یہ دلی تمنا و دُعا ہی کہ آپ کا عہد دکن اور کُل ہندوستان کے حق مین اُمید اور توقع سے بڑھکر روشن اور بابرکت ہو، اور آپ کا سایۂ ہما پایہ عرصہ دراز تک قائم رہے۔ آمین!

شاہون مین وہ آصف کا ہی عالی پایہ صادق ہی ادلوا لامر کا جس پر آیہ
رحمت ہی اگر ذاتِ مبارک اے نورؔ ہے ظلِ ہمایون بھی خدا کا سایہ

---

۲۰ جون کو لارڈ ہارڈنگ بہادر بالقابہ وائسرائے ہند کی صحتیابی کا جشن تمام ہندوستان مین نہایت دھوم دھام سے منایا گیا۔ ناظرین کو وہ مکروہ حادثہ یاد ہوگا جو ۲۳- دسمبر ۱۹۱۲ء کو دہلی مین پیش آیا تھا کہ کسی شقی القلب نے حضور وائسرائے پر جبکہ وہ شاہانہ جلوس کے ساتھ ہاتھی پر چاندنی چوک سے گزر رہے تھے بم سے حملہ کیا۔ دو ہندوستانی قربان ہوگئے اور حضور وائسرائے کو بھی صدمۂ شدید پہنچا۔ لیڈی ہارڈنگ صاحبہ بال بال بچ گئین اور اس موقعہ پر آپ نے غضب کا استقلال دکھایا۔ یہ ایسا واقعہ ہی کہ اسکی نظیر دُنیا کی تاریخ مین نہ ملیگی سو بار بدستور کیا گیا جسمین حضور وائسرائے کی جگہ نواب لفٹننٹ گورنر بہادر پنجاب نے تقریر پڑھی جسمین صاف طور پر کہا گیا کہ "مجھے ہندوستانی رعایا پر کامل اعتماد ہی اور کہ اس مکروہ حادثہ سے گورنمنٹ ہند کی پالیسی مین کوئی فرق نہ آئے گا" اس سے ظاہر ہی کہ آپ طبعاً کسقدر رحمدل اور متحمل المزاج ہین فوری واقعات یکایک آپکی طبع کو مشتعل نہین کرسکتے۔ بیشک ایک وائسرائے کی شان ایسی ہی ہونا چاہیے۔

ہندوستانیون کے ساتھ آپکی ہمدردی، محبت، سچی خیرخواہی اور بہبود کی کوشش ایسی باتین ہین جنکے ذریعہ سے آپ بیحد ہردلعزیزی حاصل کرسکے ہین صوبجات بہار و اڑیسہ کی علیحدگی، ہندوستانیون کو سیلف گورنمنٹ ملنے کا امکان، اور تعلیمی توسیع بھی ایسی باتین ہین کہ ہندوستانی عرصۂ دراز تک نہ بھولین گے۔

آپ سنہ ۱۸۵۸ء مین پیدا ہوئے۔ ہیرو اور ٹرنٹی کالج کیمبرج مین تعلیم پائی اور بعد تکمیل تعلیم سنہ ۱۸۸۰ء مین منصب سفارت پر مامور ہوئے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک لارڈ روزبری کے پرائیوٹ سکرٹری کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور پھر منصب سفارت پر واپس آکر بالترتیب برلن، واشنگٹن، قسطنطنیہ، صوفیہ، پیرس مین برٹش سفیر کی حیثیت سے کارنمایان انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد سنہ ۱۸۹۶ء سے برٹش سفارت طہران کے سکرٹری اور سنہ ۱۸۹۸ء مین سینٹ پیٹرسبرگ (دارالخلافہ روس) کے برٹش سفیر بنے۔ اور سنہ ۱۹۰۴ء تک اُسی خدمت پر مامور رہے۔ یہ وہ نازک زمانہ تھا جبکہ روس اور جاپان کے درمیان خوفناک جنگ جاری تھی، اور پولیٹکل مسائل نہایت پیچیدگی اور اہمیت پیدا کر رہے تھے۔ مگر آپ نے اس موقع پر اعلیٰ تدبر، معاملہ فہمی اور کامل دوراندیشی کا ثبوت دیا۔ اور یہ آپ ہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا کہ سنہ ۱۹۰۷ء مین روس اور برٹش گورنمنٹ کے درمیان معاہدہ ہوکر ان دونون سلطنتون کے مابین تمام نزاع باحسن الوجوہ معدوم اور تمام غلط فہمیان دفع ہوکر دوستانہ تعلقات قائم ہوگئے۔ اس کے بعد آپ نائب وزیر معاملات خارجہ بنائے گئے، اور ہندوستان کی وائسرائلٹی کے منصب پر سرفراز ہونے کے دن تک اسی منصب پر مامور رہے۔

آپکی شادی کتھرائن لارڈ ایلنگٹن بہادر کی دختر نیک اختر آنریبل وینفریڈا اسٹوارٹ کے ساتھ سنہ ۱۸۹۰ء مین ہوئی۔ آپکی اولاد مین دو لڑکے اور ایک لڑکی ہی۔ آپ کے خاندان کا ہندوستان سے بہت پُرانا تعلق ہی چنانچہ آپ کے جد بزرگوار لارڈ ہارڈنگ بہادر سنہ ۱۸۴۴ء مین گورنر جنرل کی حیثیت سے ہندوستان تشریف لائے تھے، اور سکھون کی دوسری جنگ مین انگریزی فوج کی کمان پر مامور تھے جسکے صلہ مین اُنکو "بیرن ہارڈنگ آف لاہور" کا خطاب عطا ہوا تھا۔ ہمارے وائسرائے بہادر نہ صرف انگلستان کے اعلیٰ خطابات سے ممتاز ہین بلکہ روس، اسپین، ہسپانیہ، ناروے اور جرمنی مین بھی آپکا خاص اعزاز کیا جاتا ہی۔



تد بیرالدوله سید مظفرعلي خان " اسیر " لکهنوي

"Alhilal" Press, Calcutta.

العصر

کیا زمین کی حرکت سُست ہو رہی ہی؟

جدید علمی تحقیقات کے حیرت انگیز انکشافات مین سے ایک وہ ہی جس سے ہمارے عنوان کے سوال کا جواب اثبات مین ملتا ہی۔ علمی دُنیا مین یہ بات عام طور پر مانی جاتی ہی کہ ہمارے دن رات آہستہ آہستہ لیکن متواتر لمبے ہو رہے ہین یا بالفاظ دیگر یون کہیے کہ آج کا دن گذشتہ دن سے کسی قدر زیادہ لمبا ہی اور آئندہ سے کسی قدر کم۔ اسکا امکان اُسی وقت ہو سکتا ہی جب زمین کی محوری حرکت جس کے باعث ذرات کی گردش ہوتی ہی سُست ہو رہی ہو اور ایک گردش کی تکمیل مین دن بدن زیادہ وقفہ درکار ہوتا ہو۔ ایک شبانہ روز کی لمبائی کلیتہً زمین کی محوری حرکت پر منحصر ہی اور جہان تک سائنس نے آج تک ترقی کی ہی زمین کی محوری حرکت کا اسکی سالانہ حرکت کے ساتھ کوئی تعلق نہین ہی۔ سال مین ایک دفعہ کرۂ زمین سورج کے گرد پورا چکّر کاٹتا ہی اور یہی سالانہ گردش موسمون کی تبدیلی وغیرہ کی ذمہ وار ہی۔ سردست ہمارا شمسی سال تین سو سوا پینسٹھ دن سے کچھ زیادہ بڑا ہوتا ہی لیکن جب تک زمین اور سورج کے بُعد اور اِن دونون کی علیحدہ علیحدہ مقدار مادہ مین کسی قسم کی تبدیلی واقع نہ ہو سال کی میعاد ایک معین میعاد ہو جسے دن رات کی لمبائی سے براہ راست کچھ تعلق نہین۔ اگر ہماری زمین اپنے محور کے گرد ۱۲ گھنٹہ مین ایک چکر کاٹتی تو ہمارا سال ہمارے جدید دن رات کی میعاد کے مطابق سات سو ساڑھے تیس دن سے کچھ زیادہ بڑا ہوتا۔ لہذا زمین کی محوری حرکت کے سُست ہونے کے دو نتائج ہین۔ ایک طرف تو دن رات بڑے ہو رہے ہین اور دوسری طرف سال چھوٹا ہو رہا ہی۔ سال کے چھوٹا ہونے سے مراد یہ ہی کہ آئندہ سال مین موجودہ سال کی نسبت سورج کا طلوع و غروب کم دفعہ ہوگا۔ وگرنہ فی الاصل جیسا ہم ابھی ذکر کر چکے ہین سال کی اصلی میعاد کا زمین کی محوری حرکت سے کوئی تعلق نہین۔ اور اس لیے جس وقفہ کا نام بہ نظر سہولت ہم نے ایک سال رکھا ہی اس مین بذاتہ کوئی کمی بیشی نہ ہوگی۔ فرق صرف تناسب مین ہوگا۔ اگر اکائی بڑھ جائے تو باقی اعداد اسی تناسب سے گھٹ جائینگے۔ جو فاصلہ انچون مین ۳۶ عدد کہلاتا ہی وہی فاصلہ فٹون مین ۳ کہلاتا ہی۔ فاصلہ تو وہی ہی لیکن اکائی یا یونٹ (Unit) کی تبدیلی سے اس کے معیار مین تبدیلی ہوتی ہی اسطرح

موجودہ حالات مین ہم موجودہ دن رات کے وقفہ کو اکائی مان کر سال کے وقفہ کو ایک خاص عدد سے تعبیر کرتے ہین گویا اس خاص عدد اور موجودہ دن رات کے وقفہ کا حاصل ضرب سال کا وقفہ ہی۔ اب اگر حاصل ضرب مین کمی بیشی نہ ہو اور ضرب شدہ اعداد مین سے ایک بڑھ جائے تو دوسرا لامحالہ کم ہوگا۔ لہذا ماننا پڑے گا کہ اگر دن رات کا وقفہ بڑھ رہا ہی تو سال کے وقفہ کا معیار (دن رات کے بڑھتے ہوئے وقفہ کو اکائی مانکر) گھٹ رہا ہے۔

اس امر کا ثبوت کہ زمین کی حرکت فی الواقع سُست ہو رہی ہی تین مختلف طریقون سے دیا جا سکتا ہی جن مین سے ہر ثبوت اس بات کا مستحق ہی کہ اس پر شرح و بسط کے ساتھ بحث کی جائے۔ دلائل کی پختگی اور استدلال کی نفاست کے لحاظ سے یہ بحث ہمین بہت سے مفید مطلب سبق سکھا سکتی ہی ہم بہ نظر اختصار ان تینون ثبوتون کو موجودہ مضمون مین محدود کرنیکی کوشش کرین گے۔

زمین ایک گول کرہ ہی جو فضائے بسیط مین معلق ہی اور اپنے محور کے گرد تقریباً ۲۴ گھنٹہ مین ایک دفعہ گھومتی ہی۔ زمین کا محور زمین کے مرکز مین سے ہو کر گذرتا ہی۔ اس کے انتہائی سرون کو قطبین یعنی قطب شمالی اور قطب جنوبی کہتے ہین۔ محور محض ایک سمت کا نام ہی۔ جب یہ کہا جاتا ہی کہ زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہی تو محور سے مراد کوئی ٹھوس مضبوط سلاخ نہین ہوتی بلکہ اُس خط مستقیم کی طرف اشارہ ہوتا ہی جو زمین کے مرکز سے گذرتا ہوا شمالی جنوبی سمت مین واقع ہی۔ آپنے بازارون مین شعبدہ بازون کو دیکھا ہوگا جو ایک تھالی کو چھڑی کے اوپر تول کر دو رکی گردش کے بعد ہوا مین اُچھال دیتے ہین جہان تھوڑی دیر کے لیے ہوا مین معلق رہکر تھالی ایک محور کے گرد گھومتی رہتی ہی جس کی سمت حرکت دہندہ چھڑی کی لمبائی ہوتی ہی۔ اسیطرح افریقہ کے حبشی چابک کی ضربون سے گول لٹو ہوا مین گھماتے ہین جتنی دیر لٹو کی حرکت کافی تیز رہتی ہی لٹو ایک محور کے گرد ہوا مین گھومتا رہتا ہی۔ کرۂ زمین کی محوری حرکت کی مثال ایک اور طریقہ سے بھی دیجا سکتی ہی۔ کمہار کا بھاری چاک جب وہ اُسے لکڑی کے ساتھ تیز حرکت دینے کے بعد چھوڑ دیتا ہی ایک حد تک زمین کے مشابہ ہوتا ہی۔ دونون کی حرکت مین فرق صرف یہ ہی کہ چاک ہوا کی مزاحمت کی وجہ سے تھوڑی دیر گھومنے کے بعد ساکن ہوجاتا ہی لیکن زمین کے اردگرد ہوا کے بجائے ایک ایسا رقیق جسم (ایتھر) ہی کہ قرنون مین بھی اسکی رگڑ اور مزاحمت کا اثر محسوس نہین ہوتا۔ زیادہ تر فرق شکل مین ہی۔ اگر ہم چاک کے بجائے ایک مدور کرہ فرض کرین جسے پہیہ کی طرح گھماکر چھوڑ دیا جائے تو وہ بجنسہ زمین کے مشابہ ہوگا لیکن زمین کی حرکت اس کے مقابلے مین نہایت سُست ہوگی اس لیے کہ دونون کے حجم مین بہت بڑا فرق ہی۔ زمین کا قطر تقریباً آٹھ ہزار میل ہی حالانکہ ہمارے مثالی کرہ کا حجم گز بھر سے زیادہ نہین ہوتا۔ اب اگر آپ نے یہ فرق صحیح طور پر سمجھ لیا ہی تو زمین کی حرکت کے کم ہونے کا پہلا ثبوت بآسانی ذہن نشین ہو سکتا ہی۔ فرض کیجئے کہ کمہار چاک کو یکسان طاقت کے ساتھ گھما رہا ہی یعنی ہوا کی مزاحمت سے چاک کی رفتار مین جو کمی[1] تعویق پیدا ہوتی ہی اس کی تلافی کرتا جاتا ہی یہ بھی فرض کر لیجیئے کہ کمہار اپنی طاقت اس یکسان تناسب کے ساتھ دیر تک صرف کر سکتا ہی۔ اب اگر آپ چاک کے اوپر آہستہ آہستہ خاک پھینکتے جائین تو اُس کو چونکہ اپنی گردش مین مادہ کی زیادہ مقدار اُٹھانا پڑتی ہی اس کی رفتار سُست ہو جائے گی تاوقتیکہ کمہار جون جون چاک پر مادہ کی مقدار زیادہ ہوتی جاتی ہی زیادہ طاقت نہ صرف کرے۔ بعینہ یہی حالت کرۂ زمین کی گردش کی ہی۔ آسمانی خاک اور ٹوٹنے والے ستارون کے ریزے ہر لحظہ زمین کی سطح پر گر رہے ہین

[1] زمین کی حرکت کے متعلق مفصل معلومات ہمنے اپنے سابقہ مضمون "حرکت کا پہلا قانون" مین حرکت کے پہلے قانون کی تشریح کرتے ہوے بہم پہنچائے ہین۔ ان اصطلاحات اور مطلب کی تفہیم کے لیے اس مضمون کا مطالعہ لابدی ہے۔

اور جون جون زمین اپنی سالانہ گردش کرتی ہوئی نئے نئے مقامات پر سے گذرتی ہے آسمانی خاک کی نہ ختم ہونیوالی بارش اس کے حجم اور وزن کو بڑہاتی رہتی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہر سال باہر سے زمین پر ایک کروڑ ٹن یعنی تقریباً ۲۴ کروڑ من خاک گرتی ہے۔ گویا ہر سال زمین کا وزن ۲۴ کروڑ من بڑہ رہا ہے جیسا ہم نے اوپر ذکر کیا اگر ہم چاہتے ہین کہ ہمارے مثالی چاک کی رفتار یکسان رہے تو جون جون اسکا وزن زیادہ ہو کمہار کو زیادہ طاقت لگانی چاہیئے۔ لیکن اگر کمہار صرف ہوا کی مزاحمت اور محور کی رگڑ وغیرہ کی تلافی پورا کرنے کے لیے کافی طاقت صرف کرے تو لحظہ بہ لحظہ چکر کی رفتار سست ہوتی جائیگی۔ زمین کی حالت مین کوئی بیرونی طاقت اسکی حرکت کے قیام کے لیے درکار نہین ہے لیکن جو زائد مادہ اس کے بوجھ مین اضافہ کر رہا ہے اسکی وجہ سے حرکت مین جو کمی واقع ہو رہی ہے اسکی تلافی بھی کوئی طاقت نہین کر رہی۔ نتیجہ یہ ہے کہ زمین کی حرکت سست ہو رہی ہے یہان اس امر کا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ زمین کا مجموعی وزن ارہا کروڑ من[۱۵] ہے اور اس عظیم الشان بوجھ کے مقابلے مین ۲۴ کروڑ من کی زیادتی بالکل ہیچ ہے لہذا کسی قلیل عرصہ مین محض اسی سبب سے زمین کی گردش مین بہت تھوڑی کمی واقع ہونے کا امکان ہے۔ اتنی تھوڑی کمی کہ اس کا اندازہ لگانا بھی انسانی طاقت سے باہر ہے۔ لیکن اس مقام پر ایک نہایت غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ اگر یہی حالت مدت دراز تک رہے تو فی سال ۲۴ کروڑ من کا اضافہ آخرالامر اپنا اثر دکھائے بغیر نہین رہیگا۔ اُس وقت تک زمین کی حرکت مین ضرور ایک نمایان تبدیلی ہوگئی ہوگی۔

دوسرا سبب ایسا ہے کہ اس کا اثر پہلے سبب کے اثر سے کہین زیادہ ہے اور ان دونون اسباب کے مجموعی اثر کی نظری بحث کے بعد ہم تیسرے ثبوت کا یعنی حرکت کی کمی کی عملی تصدیق کا ذکر کرینگے جس سے یہ امر بوضاحت ثابت ہو جاتا ہے کہ پہلے دو اسباب مین جو دلائل اور طریقہ استدلال اختیار کیا گیا ہے وہ بالکل صحیح اور درست ہے۔

چاند کی کشش سے سمندر کا پانی مد و جزر کی شکل مین کھینچا جاتا ہے۔ پانی کا مد و جزر جو سطح زمین کے اوپر ہوتا ہے زمین کی محوری حرکت کو روکتا ہے یون سمجھیے کہ جس طرح چلتی گاڑی کو بریک باندھنے سے روک کیا جاتا ہے اسی طرح جوار بھاٹا کا عمل زمین کی محوری حرکت کے لیئے ایک کمزور بریک کا حکم رکھتا ہے جس کا تدریجی قلیل اثر اگر سالون مین نہین تو ہزارہا صدیون مین ضرور نمایان طور پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل ہم کسی دوسرے مضمون کے لیے اُٹھا رکھتے ہین۔ یہان مختصراً مد و جزر کے متعلق چند ایک اُمور بطور اشارات تحریر کرتے ہین۔

سب سے پہلے اس امر کو ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ مد و جزر کا چاند کے ساتھ کیا تعلق ہے اور یہ تعلق کیسے دریافت ہوا جن لوگون کو ساحل سمندر پر جانے یا بحری سفر کا اتفاق نہین ہوا ان کے لیے مد و جزر ایک نئی چیز ہوگی لیکن سمندر کے قریب رہنے والون کے لیے مد و جزر ویسی ہی معمولی چیز ہے جیسے خشکی پر رہنے والون کے لیے چاند کا گھٹنا بڑھنا۔ غالباً سب سے پہلے یہ امر مشاہدہ مین آیا ہوگا کہ نئے چاند اور بدر کے موقع پر مد و جزر نہایت شدت کے ساتھ ہوتا ہے اور پہلے ربع اور تیسرے ربع کے موقع پر نہایت کمزور ہوتا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ مضبوط تعلق یہ معلوم ہوا ہوگا کہ ایک شبانہ روز کے دو متواتر جوار بھاٹون کا درمیانی وقفہ بجائے ۲۴ گھنٹے کے ایک شمسی دن رات ہونے کے ۲۴ گھنٹہ اکاون منٹ کا ایک قمری دن ہوتا ہے۔ چاند بوجہ اپنی ماہواری گردش کے ایک دن رات مین سورج

---

[۱۵] ہم نے اپنے ایک سابقہ مضمون "کرہ ہوائی کے متعلق دلچسپ معلومات" مین کرہ ہوائی کا مجموعی وزن دریافت کرنے کے لیے زمین کا وزن مختصراً یون دریافت کیا تھا۔ زمین کا نصف قطر تقریباً ۴۰۰۰ میل ہے لہذا اسکا حجم $\frac{4}{3} \times \frac{22}{7} \times (4000)^3$ مکعب میل ہے چونکہ زمین کی کثافت اضافی بمقابلہ پانی کے $5\frac{1}{2}$ ہے اس لیے زمین کا وزن $\frac{4}{3} \times \frac{22}{7} \times (4000)^3 \times \frac{11}{2}$ مکعب میل پانی کے وزن کے برابر ہے۔ ایک مکعب فٹ پانی کا وزن ۔ ۱ سیر ہے اس لیے زمین کا کل وزن [illegible] من ہے۔

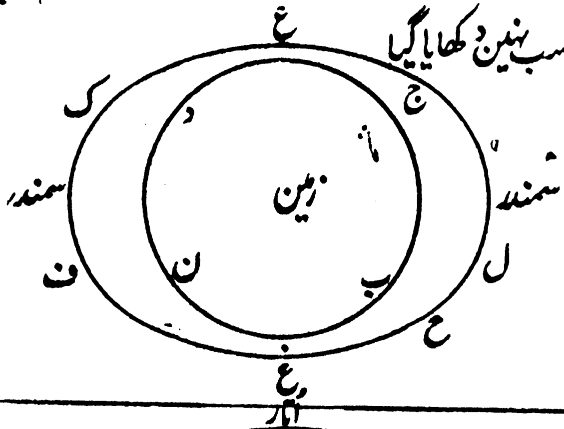
سے اکاون منٹ پیچھے رہ جاتا ہی اور مد و جزر بھی اسی مقدار وقت کے ساتھ لگاتار شمسی دن سے پیچھے ہٹتا جاتا ہی۔ سمندر کے پانی مین مد و جزر کے متعلق ایک دلچسپ لیکن شروع مین پریشان کرنیوالی بات یہ بھی ہی کہ ہر بندرگاہ مین ایک قمری دن مین ایک دفعہ پانی اُترنے چڑھنے کے بجائے دو دفعہ اُترتا چڑھتا ہی گویا ۲۴ گھنٹہ ۵۱ منٹ مین دو دفعہ سمندر مین پانی کی سطح معمول سے زیادہ اونچی اور دو دفعہ معمول سے زیادہ نیچی ہوتی ہی۔ اگر ہم سہولت کے خیال سے یہ مان لین کہ تمام کرہ زمین کے گرد یکسان گہرائی کی پانی کی ایک تہ ہی تو یہ بات بادی النظر مین زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہی کہ اگر چاند کی کشش سے (دیکھو شکل نمبر ۱) سمندر کے اس حصہ ل ح کا پانی جو چاند کے قریب ہی چاند کی طرف کھنچا جاتا ہی تو دوسرے حصہ ک ف مین چاہیئے کہ پانی کم رہجانے کی وجہ سے پانی کا غیر معمولی اُتار ہوتا او رسطرح سے ہر قمری دن مین صرف ایک دفعہ کسی مقام پر پانی کا چڑھاؤ ہوتا اور ایک دفعہ اُتار۔ لیکن جیسا کہ شکل اول مین دکھایا گیا ہی حالات واقعی اس نقطۂ خیال سے ایک معمہ کی سی صورت پیش کرتے ہین۔ اگر بامعان نظر غور کی جائے تو چاند کے نیچے سطح زمین پر دو بالمقابل مقامات پر پانی کا چڑھاؤ ہوتا اور چاند کی سمت سے زاویہ قائمہ بناتے ہوئے دو مقامات پر پانی کا اُتار ہونا فوراً ایک معقول پیرایہ سے سمجھا جا سکتا ہی۔ جسطرح سمندر کے حصہ ل ح کا پانی زمین کی نسبت چاند سے زیادہ قریب ہونے کی بدولت زمین سے زیادہ چاند کی طرف کھنچ جاتا ہی اور وہان چڑھاؤ کی حالت ہوتی ہے اسی طرح زمین کا قریب حصہ ب ج بعید حصہ د ن کی نسبت چاند سے آٹھ ہزار میل کے قرب کی وجہ سے سمندر کے پانی ک ف سے پرے ہٹ جاتا ہی اور وہان بھی پانی کا چڑھاؤ ہوتا ہی اور اس لیے سمندر کے ان دو حصون مین جو ع غ کی جگہ ہین اُتار کی حالت ہوتی ہی۔ اس تشریح سے ہر قمری دن مین دو دفعہ اُتار چڑھاؤ ہونا بآسانی سمجھ مین آ سکتا ہی۔ اب صرف یہ امر محتاج تشریح ہی کہ کیون نئے چاند اور بدر کی حالت مین اُتار چڑھاؤ معمول سے زیادہ ہوتا ہی اور کیون پہلے اور تیسرے ربع پر معمول سے کم۔ جیسا کہ ہم کسی دوسری جگہ زمین کی سالانہ گردش کا ذکر کرتے ہوئے بیان کر آئے ہین، زمین سورج سے بہت چھوٹی ہی اور اسی وجہ سے سورج کی کشش اس پر غالب ہی کہ یہ سورج کے گرد گھومتی ہی۔ لیکن گو سورج بہت بڑا ہی تاہم بوجہ اپنے بُعد کے اس کی جوار بھاٹا پیدا کرنے کی طاقت چاند کی نسبت نصف سے بھی کم ہے۔

شکل اول کی تشریح کو مدنظر رکھکر شکل دوم اور سوم سے بخوبی واضح ہوتا ہی کہ کیون نئے اور پورے چاند کی تاریخون پر اُتار چڑھاؤ معمول سے زیادہ ہوتا ہی۔ ان دونون حالتون مین چاند اور سورج کی کشش مل کر کام کرتی ہی اور نتیجہ اسی تناسب سے بڑا ہوتا ہی۔ پہلے اور تیسرے ربع کی حالت شکل چہارم سے واضح ہوتی ہی۔ اس حالت مین سورج کی کشش چاند کی کشش کے خلاف عمل کرتی ہی۔ جن مقامات پر چاند کی کشش محض سے اُتار ہونا چاہیئے وہان سورج کی کشش سے چڑھاؤ ہوتا ہی۔ اور برعکس اس کے جہان چاند کی کشش سے چڑھاؤ ہوتا ہی وہان سورج کی کشش سے اُتار ہوتا ہی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ اُتار چڑھاؤ معمول سے کم ہوتے ہین اس لیئے کہ سورج کی کشش چاند کے اثر کو نصف سے کچھ کم زائل کر دیتی ہی۔

ہم یہان مد و جزر کے وسیع نظریہ کے متعلق کچھ نہین لکھنا چاہتے۔ ہمین یہان صرف یہ دکھانا مقصود ہی کہ پانی کے اُتار چڑھاؤ کا اثر زمین کی حرکت کو کم کرتا ہی بعینہٖ اُسی طرح جس طرح کہ ایک کمزور بریک کسی تیزی سے حرکت کرنے والے جسم کی حرکت کو کم کرتی ہی۔ اول چار شکلون سے یہ غلط نتیجہ نکالا جا سکتا ہی کہ ہر مقام پر پانی کا زیادہ سے زیادہ چڑھاؤ دن مین ایک دفعہ اُسوقت ہوتا ہی جب کہ چاند اس مقام کے اوپر سب سے زیادہ بلندی پر ہو اور دوسری دفعہ اس سے بارہ گھنٹہ اور ۲۵ منٹ بعد لیکن واقعی مشاہدات اس سادہ حالت کے بالکل خلاف ہین۔ مختلف بندرگاہون مین پانی کے چڑھاؤ کا وقت چاند کے سب سے زیادہ

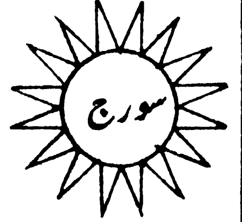
نوٹ۔ ان اشکال مین زمین سورج اور چاند کے حجم اور فاصلہ کا اصلی تناسب نہین دکھایا گیا

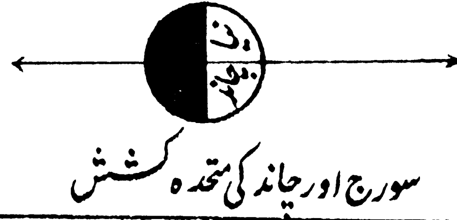


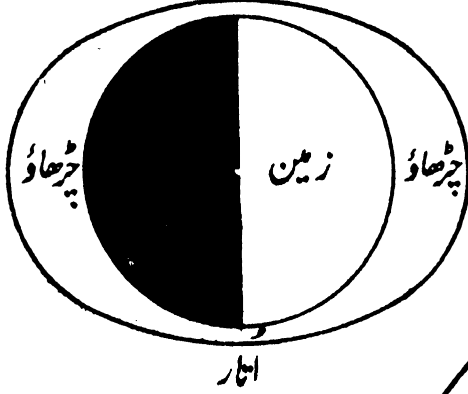


شکل اول

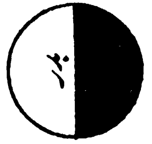
شکل دوم

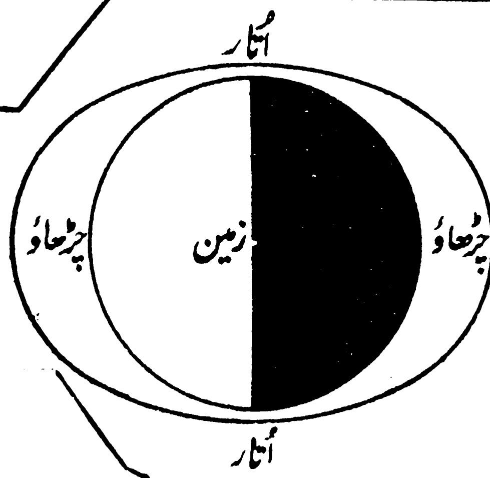


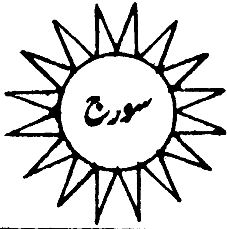




شکل سوم



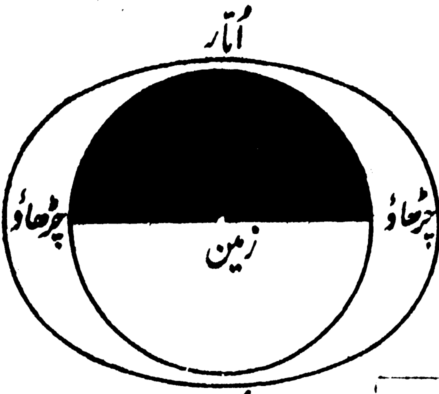


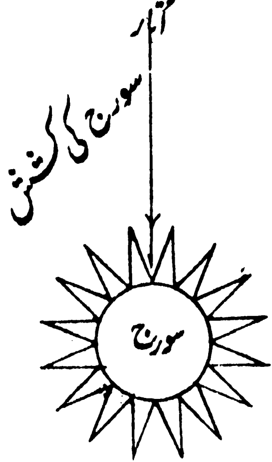


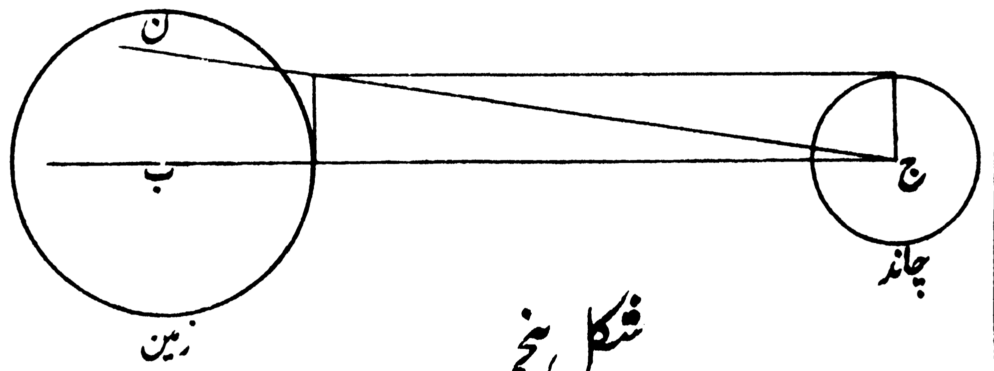
شکل چہارم



چاند کی کشش







شکل پنجم

بلندی پر ہونے کے وقت کے بعد (مختلف وقفون کے بعد) ہوتا ہے۔ بعض مین ایک گھنٹہ کا فرق ہے بعض مین پانچ گھنٹہ کا وغیرہ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چاند کے پیچھے پیچھے سمندر کا پانی دوڑتا پھرتا ہے اور چونکہ پانی کی یہ حرکت زمین کی محوری حرکت کے خلاف ہوتی ہے اس لیے چاند کی کشش سے زمین کی حرکت ضائع ہوتی رہتی ہے۔

سمندر کے پانی کا چاند کی کشش کی سمت سے پیچھے رہنے کا باعث زمین کے خلاف پانی کی رگڑ ہے اور کچھ حد تک پانی کی اندرونی رگڑ بھی۔ ہم اِس نتیجہ کو شکل نجم کی مدد سے بآسانی سمجھ سکتے ہین۔ اگر کسی قسم کی رگڑ نہ ہوتی تو چاند کی کشش کا اثر زمین کے مرکز ب کی سمت مین ظاہر ہوتا، لیکن رگڑ کی وجہ سے کشش کا اثر اس کے بجائے سمت ج ن مین ہوتا ہے جو زمین کے مرکز مین سے نہین گذرتی۔ سمت ج ن مین عمل کرنے والی طاقت دو سمتون مین منقسم کیجا سکتی ہے۔ ایک جز عمودی سمت مین اور ایک اُفقی مین۔ اِن مین سے ایک جز زمین کی حرکت کم کرتا ہے اور دوسرا چونکہ زمین کے مرکز مین سے گذرتا ہے لہذا اس کا اثر زمین کی حرکت پر کچھ نہین ہوتا۔

طوالت کے خوف سے ہم اس دلچسپ بحث کو نہین چھوڑ دیتے ہین لیکن اس بات کا ایک عملی ثبوت کہ مدوجزر کی رگڑ فی الواقع کسی جسم کی حرکت روکنے کے لیے کافی ہو سکتی ہے، ہمین چاند کی حالت مین ملتا ہے۔ چونکہ زمین چاند سے بہت بڑی ہے اس لیے جب چاند زمانہ سابقہ مین سیال حالت مین تھا تو زمین کی کشش سے چاند کی سطح پر نہایت شدت کے ساتھ اُتار چڑھاؤ ہوتا تھا۔ آپ نے بارہا سُنا ہوگا کہ چاند ہمیشہ اپنا ایک ہی رُخ زمین کو دکھاتا ہے۔ کبھی انسانی آنکھ نے چاند کا دوسرا رُخ نہین دیکھا۔ صرف کبھی کبھی اس رُخ کے چھوٹے سے حصہ کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ دوسرے لفظون مین نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ چاند اپنے محور کے گرد اسی عرصہ مین ایک کامل گردش پوری کرتا ہے جتنے عرصے مین وہ زمین کے گرد ایک دفعہ گھومتا ہے۔ گویا چاند کا دن اور مہینہ ایک برابر ہین۔ یہ کیون ہین؟ محض اس لئے کہ زمین کی کشش سے چاند کی سطح پر جو مدوجزر ہوتے تھے اِن کی بدولت چاند کی محوری حرکت بمقابلہ زمین کے بند ہوگئی۔ یہی حالت زمین کی حرکت کی آج سے بہت عرصے کے بعد ہوگی تب ہمارا دن اور قمری مہینے برابر ہونگے اور چاند والے زمین کا صرف ایک ہی رُخ دیکھ سکین گے۔

ہم نے اِس مضمون کے شروع مین کہا تھا کہ علاوہ اِن دو نظری دلائل کے جو ہم ابھی ختم کر چکے ہین زمین کی رفتار کے کم ہونے کی ایک عملی تصدیق بھی موجود ہے۔ زمانۂ حال اور ماضی کے مشاہداتِ فلکی کا موازنہ کرنے سے ہم دن رات کی لمبائی معلوم کر سکتے ہین۔ لارڈ کیلون نے اِس حصۂ مضمون کو نہایت عمدگی کے ساتھ ادا کیا ہے۔ ہم یہان اس کی مثال پر اکتفا کرین گے۔ ۱۹۔ مارچ ۷۲۱ قبل از مسیح یعنی آج سے ۲۶۳۴ سال پہلے قدیم بابل (Babylon) مین چاند گرہن ہوا تھا۔ بابل کا ایک ہیئت دان اپنی تحریر چھوڑ گیا ہے کہ اس نے گرہن کو شروع ہوتے پہلی دفعہ جس وقت دیکھا اس وقت چاند کے طلوع کے بعد کامل ایک گھنٹہ گذر چکا تھا۔ ہم شکل سوم اور چہارم کے متعلق ایک نوٹ مین جتا چکے ہین کہ چاند گرہن ہمیشہ بدر کی حالت مین ہوتا ہے۔ علاوہ ازین چاند اور سورج کے طلوع و غروب کا وقت زمین کی محوری گردش پر منحصر ہے۔

چاند گرہن کے متعلق یہ ایک دلچسپ معلومات ہے کہ ہر ۱۹ سال اور ۱۱ دن (۶۵۸۵ دن) یا زیادہ صحیح طور پر ہر ۶۵۸۵ دن اور ۸ گھنٹہ کے وقفہ کے بعد چاند گرہنون کا ایک جدید دور شروع ہوتا ہے۔ مثلاً اگر آج سے ۱۹ سال اور ۱۱ دن تک کے تمام چاند گرہنون کا وقت اور کیفیت درج کر لیجائے تو آج سے پہلے اور بعد کے کل چاند گرہن اُسی وقت اور کیفیت کے مطابق ہونگے۔ اسی قاعدہ کی مدد سے قدیم ہیئت دان پہلے سے چاند گرہن کے اوقات دُنیا کے سامنے شائع کر دیتے تھے حالانکہ اُن

زمانہ مین چاند کی حرکت کا مطالعہ کامل طور پر نہین کیا گیا تھا۔ اب ہم اگر یہ مان لین کہ زمین اس تمام عرصہ مین یکسان رفتار کے ساتھ حرکت کرتی رہی ہی تو ہم اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہین کہ بابل مین چاندگرہن ۱۹ مارچ کو ۲۷ صدی پہلے کس وقت شروع ہوا ہوگا۔ اس اندازہ سے معلوم ہوتا ہی کہ چاندگرہن کے شروع ہونے مین تقریباً ۵ گھنٹہ کی غلطی ہی یعنی اگر زمین کی رفتار کو یکسان مانا جائے تو ہیئت دان کی تحریر مین پانچ گھنٹہ کی غلطی پائی جائیگی کیونکہ حسابی اندازہ سے چاندگرہن ۵ گھنٹہ پہلے شروع ہونا چاہئیے۔ اس لیئے زمین ان ۲۶۳۴ برس مین مجموعی طور پر ۵ گھنٹے پیچھے ہوگئی ہی اور بیسوین صدی عیسوی مین زمین کی حرکت اتنی سست ہوگئی ہی کہ آٹھوین صدی قبل از مسیح کی نسبت ۳۶۵ یومیہ گردشین کرنے مین یہ ۱۳ ثانیہ زائد دیر کرتی ہی گویا آجکل ہر ایک دن عہد بابل کے دنون سے ایک ثانیہ کا اٹھائیسوان حصہ زیادہ بڑا ہوا اور ہمارا سال عہد بابل کے سال سے ۱۳ ثانیہ بڑا ہوتا ہی۔

اس قسم کی اور بہت سی مثالون سے اندازہ لگایا گیا ہی کہ زمین کی رفتار ہر صدی مین نصف ثانیہ فی سال کم ہو رہی ہی یعنی ۱۹۱۳ء مین ۳۶۵ محوری گردشون کے لیے ۱۸۱۳ء کی نسبت نصف ثانیہ زیادہ درکار رہی۔ یہان اس امر کی توضیح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہی کہ زمین کی رفتار کی تبدیلی زمانہ ماضی اور زمانہ حال کے وقت کے مجموعی فرق سے بالکل جدا ہی۔ فی سال زمین کی رفتار ۱/۲۰۰ ثانیہ سست ہوتی ہی۔ اسطرح ہر ایک دن گزشتہ دن کی نسبت ثانیہ کا سات ہزاروان حصہ لمبا ہوتا ہی اور آنے والے دن سے اتنا ہی چھوٹا ہوتا ہی۔ فی صدی زمین کی رفتار ۱/۲ ثانیہ سست ہوتی ہی اسطرح ساٹھ صدیون کے بعد دن رات حال سے نصف منٹ لمبا ہو جائیگا۔ یہ اعداد بالکل خفیف اور بے بضاعت معلوم ہوتے ہین لیکن جسوقت ہم قرنہائے دراز مین اپنی نظر کو وسعت دیتے ہین اور زمین کی پوری تواریخ ابتدا سے انتہا تک معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہین تو حرکت محوری مین یہ قلیل کمی عالیشان نتائج کا پیش خیمہ بن جاتی ہی۔ ہم اس موضوع پر آئندہ ایک جداگانہ مضمون مین (بعنوان زمین کی محوری حرکت کے بعض اہم نتائج) بحث کرینگے اور دکھائین گے کہ کس طرح ہم زمانہ ماضی مین دوربین نظر کے ساتھ چاند کو زمین سے علیحدہ ہوتے ہوئے دیکھ سکتے ہین۔

بہت سے صحاب شاید اس امر کو آسانی سے نہ سمجھ سکین کہ اگر زمین کی رفتار فی صدی نصف ثانیہ کی قلیل مقدار سے کم ہو رہی ہی تو کس طرح ۲۶۳۴ سال کے عرصے مین زمین نے تقریباً ۵ گھنٹے ضائع کر دیئے ہین جیسا کہ ہم نے بابل والے چاندگرہن کی مثال مین ذکر کیا ہی۔ اس بات کو آسانی سے ذہن نشین کرنے کے لیے فرض کیجیئے کہ آج سے ۲۶۳۴ سال پہلے بابل مین ایک صحیح گھڑی قائم کی گئی تھی جو آج تک بالکل صحیح طور پر چل رہی ہی۔ سوال صرف یہ ہی کہ بمقابلہ اس صحیح گھڑی کی زمین کتنے گھنٹے پیچھے رہ گئی ہی۔ ہماری مثال کے مطابق اگر وہ قدیم گھڑی عین نصف النہار کے وقت چلائی گئی تھی یعنی شروع مین دوپہر کے وقت اس گھڑی مین ٹھیک بارہ بجے تھے تو موجودہ صدی مین دوپہر کے وقت اس صحیح گھڑی مین بجائے ۱۲ کے سہ پہر کے ۵ بجے ہونگے اگر ہم مشاہدہ کے بجائے گذشتہ ۲۶۳۴ سال کے ہر ایک سال کی کمی جمع کرتے جائین تو اسی نتیجہ پر پہنچین گے۔ مثلاً پہلی صدی کے پہلے سال مین زمین نے ۱/۲۰۰ ثانیہ کھوئے دوسرے سال مین ۲/۲۰۰ ثانیہ ۔۔۔۔ پچاس سال مین ۵۰/۲۰۰ ثانیہ اور سوین سال مین ۱۰۰/۲۰۰ ثانیہ۔ ان اعداد کے جمع[1] کرنے سے معلوم

[1] جمع کرنے کا ایک آسان قاعدہ یون حاصل ہو سکتا ہی۔ پہلے ۴ عدد کی جمع ۱۰ برابر ہی $\frac{1}{2} \times 4 (4+1) = 1 + 2 + 3 + 4$ پہلے پانچ اعداد کی جمع ۱۵ ہی یعنی $\frac{1}{2} \times 5 (5+1) = 1 + 2 + 3 + 4 + 5 = 15$ کے برابر ہی۔ عام قاعدہ جس کا آسان الجبری ثبوت دیا جا سکتا ہی یہ ہی کہ جتنے اعداد اکائی کے بعد جمع کیئے جائین۔ ان کی تعداد مین ایک بڑھا کر دو سے تقسیم کرو اور حاصل تقسیم کو آخری عدد سے ضرب دیدو۔ پہلی صدی مین وقت کا مجموعی نقصان اس قاعدہ سے $\frac{100}{200} \times \frac{101}{2}$ یعنی $\frac{101}{4} = 25\frac{1}{4}$ ثانیہ ہوتا ہی اسطرح دو صدیون کا مجموعی نقصان $\frac{200}{200} \times \frac{201}{2} = 100\frac{1}{2}$ ثانیہ ہی اور ۲۷ صدیون کا مجموعی نقصان ۲۷۰۱ کو ضرب تقسیم کی سہولت کے لیے ۲۷۰۰ یعنی ۲۷۰۰ + ۱ مان لیا جائے تو $\frac{2700}{200} \times \frac{2701}{2} = 18225 + 6\frac{3}{4}$ ثانیہ ہوتا ہی۔

ہوتا ہی کہ پہلی صدی مین زمین گھڑی سے ۲۵ ثانیہ پیچھے رہ گئی اسطرح دوسری صدی کے پہلے سال مین زمین نے نصف ثانیہ کھویا۔ دوسرے سال مین ۱٫۰۱/۲ ثانیہ اور سوین سال مین پورا ایک ثانیہ۔ گویا صرف دوسری صدی مین گھڑی سے ۷۵ ثانیہ پیچھے رہ گئی اور اسطرح دوسری صدی کے اختتام پر زمین گھڑی سے ۱۰۰ ثانیہ پیچھے ہو گئی۔ اس طرح ہر صدی مین زمین گھڑی سے زیادہ زیادہ پیچھے ہوتی گئی۔ ستائیسوین صدی کے شروع سال مین زمین نے ۱۳ ثانیہ ضائع کئے۔ دوسرے سال مین ۱۳ ۱/۲ ثانیہ علی ہذا القیاس ساری صدی مین ۱۳۲۵ ثانیہ ضائع گئے۔ اب اگر ہر صدی کے نقصان کو جمع کرین تو مجموعی نقصان کا پتہ چل جائیگا یعنی یہ معلوم ہوگا کہ آج زمین گھڑی سے کسقدر پیچھے ہو گئی ہی۔ حاصل جمع یون ملے گی:۔

(۲۵+۷۵+۱۲۵+۱۷۵+ - - - ۱۳۲۵) ثانیہ

=۲۵(۱+۳+۵+۷ - - - - - ۵۳) ثانیہ

=۲۵×۵۴×۲۷/۲ = ۲۵×۲۷×۲۷ ثانیہ = ۵ گھنٹہ ۳ منٹ ۴۵ ثانیہ۔

فیروز الدین مراد

تاریخی تصوّرات کا انقلاب

اُنیسوین صدی کی علمی کوششون اور ترقیون نے جہان ہمارے اور خیالات پر گہرا اثر ڈالا اور ہمارے تخیل کا رُخ بدل دیا ہی وہان ہمارے تاریخی تصورات مین بھی اہم انقلاب واقع ہوا ہی۔ اٹھارھوین صدی کی دُنیا بہت محدود تھی اور کرۂ ارض دوشیزہ معلوم ہوتی تھی۔ تاریخی زمانے بالکل کم سن بچّے تھے، لیکن جب ان پر اُنیسوین صدی کے اکتشافات کی روشنی مین نگاہ ڈالی جائے تو وہ نوعمر نہین بلکہ ضعیفُ العمر اور سفید ریش نظر آتے ہین۔ تاریخی زمانہ صغیر سن بچہ نہین بلکہ پختہ جوان اور نشۂ شباب مین سرشار نظر آتا ہے۔

دُنیا کی چھ ہزار سال عمر کا خیال

دُنیا کو چھ ہزار سال سے قائم سمجھنا ایک معمولی بات تھی اور لوگ لکیر کے فقیر اور بزرگون کی آرا کے ایسے پابند تھے کہ چون وچرا کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ یورپ جو تمام علمی ترقیون کا مصدر و مسکن ہی دُنیا کو چند ہزار برس سے سمجھتا تھا۔ اسکی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ سترھوین صدی مین آئرلینڈ کے آرچ بشپ صاحب اشر نے بائبل مین جن بزرگون کا ذکر آیا ہی انکی نسلون کو جمع کرکے انکی ولادت اور موجودگی کا ایک زمانہ قرار دیا اور مسیحی دین کے بانی کی پیدائش سے چار ہزار سال قبل دُنیا کا وجود پذیر ہونا ٹھہرایا۔ یہ تاریخ بعض بائبلون کے حاشیہ پر مطبوع ہو کر مروج رہی۔ اس طرح سے دُنیا کی عمر چھ سات ہزار سال شمار ہونے لگی۔ لیکن اُنیسوین صدی سائنس کی تحقیقات، عالمانہ تنقید اور محققانہ طریقۂ استدلال کے لیے اپنی سابقہ بہنون پر ہمیشہ ممتاز رہیگی۔ مخالفون کے ایک گروہ نے بشپ اشر کے تخمینہ کو تہ و بالا کرکے بالکل ناقابل اعتبار قرار دیا۔

سائنسی اکتشافات سے ہمارے خیالات پر بہت گہرا اثر ہوا ہی اور پُرانے تصورات بالکل بدل گئے ہین۔ اسکے کئی وجوہ ہین اور سب سے بڑی وجہ علوم طبیعی کی غیر معمولی ترقی ہی۔ اس سے ہماری مراد ارضیات، طبعیات، کیمسٹری، فلکیات، اور اثریات (آرکیالوجی) سے ہی۔ علم مذاہب، علم انواع انسان، اور علم السنہ کی ترقیون نے بھی اس انقلاب مین بڑا بھاری حصہ لیا ہی۔ مگر تاریخی تصورات کی تبدیلی کا سہرا سب سے پہلے اثریات پھر ارضیات، اور اخیر مین علم المعاشرت (سوشیالوجی) کے دو شعبون علم نوع انسان اور علم مذہب کے سر بندھا، اور تاریخی زمانہ کی توسیع کی نیکنامی کا طرہ اثریات کے محققون اور عالمون کی دستار فضیلت

مین لگنا چاہیے۔ انسان کی قدامت اور دُنیا کی عمر کے باب مین جو قوی شہادت بہم پہنچی ہی وہ اثریات سے نہین بلکہ ارضیات در (Palæntology) پیلیئین ٹالوجی یعنی علم متحجرات حیوانی اور (Anthropology) انتھروپولاجی یعنی علم الانسان اور ایتھنالوجی (Ethnology) یعنی علم الاقوام کے اکتشافات سے ہاتھ لگی ہی لیکن حقیقت یہ ہی کہ اثریات نہایت وسیع معنی مین انسان کی نہایت پُرانی تاریخ کے ہر شعبہ پر حاوی ہی جو تقدمات (Antiquities) سے متعلق ہو چاہے وہ ذخیرہ بالٹک کے کنارے کے یادگاری پشتے ہون یا فرانس کی متحجر کھوپڑیان اور منقش ہڈیان، یا چقماق کے اوزار، مٹی کے برتن، مصر کی سومیات، عراق عرب کی خشتی لوحین، اور اُبھرے کام کی اشیا، یونان اور روم کے سکے اور سنگ تراشی کے نمونے ہون یا کتبے، یا لاکھ کی لوحین، چرمی تحریرین، یا پٹیلہ گھاس پر لکھے ہوئے نسخے، الغرض زمانۂ مقدم التاریخ کی بابت جو خیالات ہم قائم کرتے ہین وہ پُرانے زمانے کے پشتون، غارون، روضون، مقبرون جھیل کے اندر مکانون کے آثارون نہایت قدیم زمانے کے برنجی یا سنگین اوزارون، انسان کی کھوپڑیون اور پنجرون سے جو معدوم جانورون کے پہلو بہ پہلو پائی گئی ہین، ابتدائی انسان کے اوضاع واطوار اور اس کے تمدن پر معقول روشنی پڑتی ہی اور ہم نہایت قدیم زمانہ کے آدمیون کی طرز زیست کا اندازہ لگا سکتے ہین۔

زمین اور انسان کی قدامت

زمین کی عمر کے باب مین جو تغیر ہمارے خیال مین واقع ہوا ہی اسکی وجہ ارضیات اور پیلیئین ٹالوجی کے محققون کی کوششون کا نتیجہ ہی جسے اثریات سے بالواسطہ تحریک اور مدد پہنچی ہی۔ ایک انگریز عالم جیمز ہٹن نے اٹھارھوین صدی کے آخری ایام مین صلاح شروع کی ولیم اسمتھ نے انگلستان مین اور کوویر نے فرانس مین اسے بہت ترقی دی لیکن زمین کو بہت پُرانی قرار دینے والا سر چارلس لائل انگلستان کا ماہر ارضیات تھا جسنے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "اُصول ارضیات" مین اپنے خیالات کو خوب واضح کیا تھا۔ یہ کتاب ملکۂ وکٹوریہ کے تخت نشین ہونے سے چند سال قبل شائع کی گئی تھی۔ اسمین اسنے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ قرون ارضی کی داستان اُسی وقت بخوبی سمجھ مین آسکتی ہی جب طبقات الارض کی ترکیب وساخت کے لیے وسیع زمانے قرار دیے جائین۔ اس پُرانے خیال کے حامیون اور سر چارلس لائل وغیرہ کے طرفدارون مین ایک عرصہ تک حیص بیص جاری رہی۔ آخر کار انیسوین صدی کے وسط مین نیا خیال غالب آیا۔ مگر اسکے ساتھ بالواسطہ یہ سوال پیدا ہو گیا کہ انسان کی قدامت بھی بہت وسیع سمجھی جائے۔ لائل نے اس کام کو بھی اپنے ذمہ لیا اور ۱۸۶۳ء مین "قدامت انسان" کے نام سے اپنی دوسری زمانہ خیز کتاب شائع کی۔ انسان کی قدامت کے متعلق جرمن محقق اینتھروپالوجی شمرلنگ (Schmrling) اور بوشر دے پرتس (Boucher de Parthes) اور کئی دیگر علما نے بھی بہت کام کیا تھا۔ اُنھون نے انسانی ساخت کے وہ اوزار نکالے جو معدوم جانورون کی ہڈیون کے پہلو بہ پہلو غارون اور کھوہون مین پائے گئے۔ اور اسی قسم کی دیگر پُرانی چیزین دریاؤن کے دہانون اور تہ نشین خاک کے نیچے سے نکالی گئین۔ ان کے اوپر جو ریت کی تہ چڑھ گئی تھی، اسکی موٹائی سے اگلے زمانے کا تخمینہ کیا گیا۔ الغرض اثریات مقدم التاریخ کی اشیا بہم پہنچا کر محققون نے بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے انسان کی عمر کا اندازہ لگایا۔ اسکے متعلق بھی بہت سی رد وکد ہوئی لیکن آخر کار علماء کے خیالات غالب آئے اور انسان کی قدامت مسلمہ ٹھہری۔

بابل اور مصر کے پُرانے کتبے

اگر کوئی پوچھے کہ ۱۸۵۰ء سے پیشتر عالمون اور مورخون کو نہایت قدیم مصر اور میسوپوٹیمیا (عراق عرب) اور ایشیائے کوچک کی تاریخ کا کیا علم تھا؟ تو جواب مین یہ کہنا پڑتا ہی کہ اس وقت ان ممالک کے نہایت

پُرانے حالات سے ہم ناواقف تھے۔ مصر قدیم کے تاریخی اسرار کی کُنجی علما کو معلوم تھی جبکی شاباش ٹامس ینگ اور موسیو شتون پالیون کو ملنا چاہیئے۔ مصر ست جو کتبے برآمد ہوئے تھے اِن کے پڑھنے کا طریقہ معلوم ہوگیا تھا مگر اسمین ترقی بہت تھوڑی ہوئی تھی اور اس زمانے کی تاریخ کا کچھ ضمنی ذکر بابل کے اوراق مین اور کچھ یونانی مورخ ہیرودٹس (Herodotus) اور دیودرس (Diodorus) کی تصانیف مین تھا۔ اگر اُس وقت کوئی عالم یہ کہتا کہ عنقریب پُرانے زمانے کی ایسی چیزین برآمد ہونگی جنکی بدولت قدیم زمانہ کی تاریخ پر نہایت زبردست روشنی پڑے گی اور عجیب وغریب حالات معلوم ہونگے تو اُسے پنڈو خانے کی گپ سے زیادہ وقعت ہرگز نہ دی جاتی۔ مگر بعد کے واقعات سے جو کچھ عیان ہوا وہ حیرت مین ڈالنے والا ہے خشتی کتابون اور کتبون اور مصوری کے نمونون سے ایک نئی دُنیا وجود مین آئی۔ جن قومون اور ملکون کا یونانی مورخون نے بڑے ادب و احترام سے ذکر کرکے انھین تمدن کے مخترع قرار دیا تھا انکی تمدنی ترقیون کے ثبوت دستیاب ہوگئے اور اس سے تاریخ قدیم کے نامعلوم مگر نہایت شاندار دور کا آغاز ہوا۔ قیاسات اور روایات شاندار تاریخی واقعات اور معتبر حالات مین تبدیل ہوگئے۔ ملک معظم ایڈورڈ ہفتم مرحوم ابھی غون غان کرنے کے قابل بھی نہین ہوئے تھے کہ فرانس کے دل چلے محقق، بوٹہ (Botta) نے نینوہ کے پُرانے محل وقوع پر جاکر کھنڈرون کو تہ و بالا کرنا شروع کردیا اور اس تاریخی کام مین سرہنری لیرڈ نے بھی اسکا ہاتھ بٹایا محققون کی محنت ٹھکانے لگی۔ بہت جلد بیسیون قسم کی پُرانی چیزین نکل آئین جس سے یہ امر ثابت ہوگیا کہ آسوریہ کے دارالحکومت کی شان و شوکت قیاسی نہین بلکہ حقیقی تھی اور اسکا تمدن بہت اعلی درجے پر پہنچا ہوا تھا سنگتراشی کے رنگین اور سادہ نمونے اور کھدائی کی چیزین دستیاب ہوئین جس سے یہ ظاہر ہوا کہ اہل اسوریہ نے اِس فن مین بڑی ترقی کی تھی۔ نہ صرف یہی بلکہ خشتی کتابون کے تودے کے تودے برآمد ہوئے۔ چوڑی چپٹی لمبی گول، اینٹون پر عجیب قسم کے حروف کندہ پائے گئے۔ یہ اینٹین آوے کے اندر پکائی گئی تھین۔ اِن حرفون کو کوئی نہ سمجھ سکتا تھا مگر عالم اسے ایک قسم کا رسم الخط سمجھتے تھے۔ اِن اینٹون کے انبار سے کتب خانے ظاہر ہوئے۔ بہتون نے خیال کیا کہ جو کچھ اینٹون پر لکھا ہے وہ ہمیشہ اسرار رہیگا۔ اور بات بھی یہی ہے کہ اس زبان کے بولنے والے اور لکھنے والے دو ہزار سال قبل صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہوچکے تھے اور اسکا پتہ لگانا معجزہ سے کم نہ تھا۔ لیکن عالمون کی دماغ سوزی کامیاب ہوئی۔ اِن حرفون کے پڑھنے کی داستان بڑی دلچسپ ہے اسے کسی اور موقع کیلئے اُٹھا رکھتا ہون لیکن یہان پر اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ اسوری حروف کو قدیم ایرانیون نے بھی اختیار کرلیا تھا یہ "خط میخی" کے نام سے مشہور ہے اور ایران مین کئی جگہ اِن حرفون کے کتبے پائے گئے جنھین جرمنی کے نامی ماہر السنہ گروٹے فنڈ (Grotefend) نے عجیب وغریب دانائی کے ساتھ پڑھکر غیر فانی شہرت حاصل کی بہستون مین ایک کتبہ ایک چٹان پر کندہ تھا، جسے بعض دارا اور بعض ملکہ سمی رامس (بیگم نینوہ) سے منسوب کرتے تھے۔ یہ کتبہ تین زبانون مین تھا۔ ایک اسوری، دوسری ساسانی، تیسری پہلوی، اور کتبہ دارا کا تھا۔ اور یہ بھی خیال کیا گیا تھا کہ تینون کی زبان ایک ہی ہے۔ سرہنری رالنسن نے بعد ازان معلوم کیا کہ ایرانی زبان کے کتبے مین اسمائے معرفہ بہت ہین۔ ایک نام بار بار حروف میخی مین آتا تھا جب ایک لفظ پڑھا گیا تو رفتہ رفتہ باقی حروف بھی پہچان لئے گئے۔ اسطرح کتبہ پڑھ لیا اور حروف میخی اختراع ہوئے پھر اسوری کتبے اور خشتی کتابین پڑھنے مین کوئی رُکاوٹ پیش نہ آئی۔ ۱۸۵۷ء مین سرجان کارنوال لوس اور فرانس کے نامی مورخ موسیو ارنسٹ رینان نے یہ دعوی کیا کہ اسوری زبان اور علم محض یارون کی تراش ہے۔ مگر رالنسن، ہنکس، اوپرٹ، اور فوکس ٹالبٹ نے ایک اسوری عبارت کا ترجمہ ایک دوسرے سے الگ الگ

رہکر کیا اور نمونے رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے پاس بھیجے گئے جسکا صدر، جارج گروٹ ایسا فاضل تھا اسنے ترجمے دیکھکر یہ قرار دیا کہ حروف میخی بناوٹی نہین بلکہ اصل زبان ہی اور یہ اسوری کتبے پڑھنے مین سچ مچ کامیابی حاصل ہوئی ہی۔ وہان سے اسیریالوجی (Assyriology) یعنی علم آثار قدیمہ اسوریہ کی بُنیاد پڑی۔

نینوہ کے کھنڈر خوب کھودے گئے۔ بابل مین تحقیقات ہوئی اور کئی پرانے مقامات کی دیکھ بھال ہوئی۔ سیکڑون کتابین اور بیسیون کتبے برآمد ہوئے اور وہ پڑھ لئے گئے بعض کتابون اور تحریرون پر تاریخ ہی اور تاریخی حالات قلم بند ہین۔ ان خشتی تحریرون سے اب پرانی تاریخ بہت واضح ہو گئی ہی جن بادشاہون کا وجود محض خیالی سمجھا گیا تھا وہ اب تاریخی اور حقیقی آدمی ظاہر ہوتے ہین اور ان کے کارنامون کی داستانین ان کے کتبون مین موجود ہین۔

عراق عرب کا تمدن

اسمین کچھ شک نہین کہ قدیم زمانے کی تاریخ کے زمانون اور واقعات کے سلسلے کی تمام کڑیان نہین ملتی ہین۔ خالدیہ (Chaldea) کے قدیم زمانے کے حالات بہت معتبر نہین ہین۔ مگر سارگون (شاہ اسوریہ) [illegible] مین تھا۔ گو اس سے وہ پہلے قیاسی شخص سمجھا گیا تھا عجائب خانہ برطانیہ مین بعض لوحین ایسی ہین جن کے اوپر شہادتین منقش ہی۔ امریکہ کی نامی یونیورسٹی پنسلونیہ تحقیقاتی مہم بابل کو بھیجی تھی اسنے پرانے کھنڈرون کے ڈھیر کے نیچے سے ایسی چیزین نکالی ہین جنکی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہی کہ عراق عرب مین نو ہزار سال پیشتر تمدن عروج پر تھا۔

مصری آثار قدیمہ اور ان کی شہادت

عالمون کا ایک گروہ مصر کے کھنڈرون کی غور و پرداخت مین مصروف تھا۔ اُنھون نے اُس خط تصویر کو پڑھا جو مصر قدیم مین مروج تھا۔ ینگ اور شون پالیون کے کام کو جرمن محقق لپ سئیس اور برگش، دروئرا، لنارمن، برچ، ماریوت، ماسپرو اور رازمن نے تکمیل پر پہنچایا۔ ان کے ساتھ اور کئی مشہور محققون مثلاً گارڈنر ولکنس، پروفیسر فلنڈرس پٹری نے مختلف کھنڈرون کے نیچے سے بہت سی چیزین نکالین جو تاریخی اعتبار سے نہایت قابل قدر اور قیمتی ہین۔ طالمی بادشاہون کے راج پروہت منتو (Manetho) نے مصر قدیم کی ایک تاریخ لکھی تھی اسنے جو فہرست بادشاہون کی لکھی تھی وہ مدت تک بالکل بناوٹی شمار ہوتی رہی لیکن پروفیسر پیٹری کی کوشش سے کئی تحریرین ایسی برآمد ہوئی ہین جن سے منتو کے بیان کی تائید و تصدیق ہو گئی ہی۔ اسکی کتاب ضائع ہو گئی تھی مگر یونانی مورخون نے اس کا ذکر کیا ہی اور کئی اقتباس بھی دیے ہین۔ مصر کی پرانی تاریخ کے واقعات ایسی صحت اور درستی سے واقع نہین ہوتے جیسے بابل اور اسوریہ کے ہو سکتے ہین۔ تاہم پروفیسر فلنڈرس پیری کی تحقیقات سے پانچ چھ ہزار سال قبل مسیح کے واقعات کا کچھ کچھ پتہ چلتا ہی بابل اسوریہ اور مصر کی پرانی تحریرون اور آثار قدیمہ سے یہ امر بخوبی ظاہر ہو گیا ہی کہ وہان پر تمدن کئی ہزار سال سے رائج ہی۔

تاریخ جدید کا ابتدائی باب

اس سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ مذکورہ ممالک کے آثار قدیم سے ہمارے تاریخی خیالات نے کیسا پلٹا کھایا ہی۔ اثریات کے انکشافات کے ساتھ ایک ایسی دُنیا وجود مین آگئی ہی جسکی ہستی کے نشانات مدتون تک پرانے شہرون کے کھنڈرون کے نیچے مدفون رہے اور صرف چند سال سے انکا پتہ لگا ہی۔ انکی بنا پر ہمین اپنے تاریخی تصورات قطع و برید کرنیکی اشد ضرورت لاحق ہوئی ہی۔ اگر آٹھ نو ہزار سال تمدن کا سورج نصف النہار پر تھا تو ہم زمانہ تاریخ کے طلوع کو کہان ڈھونڈھنے جائین۔ اگر اس معیار سے دیکھا جائے تو اہل روما ہمارے ہم عصر اور یونان کا "ست جگ" صرف کل کی بات ٹھہرتا ہی اور صرف اہرام مصری (Pyramids)

کے بنانے والے قدرے دور افتادہ زمانہ کے معلوم ہوتے ہین - فرض کرو جن لوگون نے ۹۰۰۰ ق م مین نیپور (متصل بابل) مین بیل دیوتا کا مندر بنایا تھا وہ خود کو تمدن اور شائستگی کے اوج پر سمجھتے ہونگے - پروفیسر ہلفی کا خیال یہ ہی کہ اہرام مصری کی تعمیر کا زمانہ تمدن کی خزان سمجھنا چاہیئے - لیکن سوال پیدا ہوتا ہی کہ تمدن کا موسم بہار کونسا زمانہ ہی؟ اسکا جواب علم اثریات مقدم التاریخ بہم پہنچا سکتا ہی جسے اُن روضون اور قدیمی یادگارون سے حاصل کرنا چاہیئے جو مفصل نیپور اور نینوہ سے برآمد ہوئے ہین اور انکی بنا پر صرف دس ہزار سال کا زمانہ تمدن قرار دیا گیا ہی جس کو تاریخ جدید کے ابتدائی باب مین شامل کیا جاتا ہی -

مصری تمدنی زمانہ کی ابتدا

اگرچہ اس مسئلہ پر وضاحت و صراحت سے لکھنا دشوار ہی مگر محققون کے خیالات کا اجمالی ذکر مناسب ہی - مصر کے پُرانے کھنڈرون سے جو کتبے اور سکے، مصوری اور سنگتراشی کے نمونے، اور دیگر اشیا برآمد ہوئی ہین انکی بنا پر وہان کی تمدنی حالت اور تمدن کی ابتدا کا تخمینہ کیا گیا ہی - چنانچہ پروفیسر فلنڈرس پیٹری جو مصر کے آثار قدیمہ کے ماہر ہین کہتے ہین:-

تاریخی تحریرون اور قبرستانون کو دیکھنے کے بعد رائے قائم کی گئی ہی کہ مصر کے مسلسل تمدن کی ابتدا دس ہزار برس پیشتر یعنی ۸۰۰۰ ق م مین ہوئی تھی سوال یہ ہی کہ اُسوقت کی حالت اور موجودہ حالت مین کتنی مشابہت ہی؟ اگر جغرافیائی حیثیت سے ملک کی آج کی حالت بالکل بدلی ہوئی ہی کیونکہ نیل کے سیلابون کے سبب سے اسکے اردگرد جو مٹی جمتی رہتی ہی اس سے بہت فرق واقع ہو گیا ہی - اسکی بابت علماء کا اندازہ ہی کہ بالاوسط پانچ انچہ زمین ایک صدی مین بنتی ہی اور اسکی گہرائی ۲۶ فٹ اور بعض جگہ ۶۲ فٹ پائی گئی ہی - اس کے نیچے گارے کے بجائے ریت نکلتی ہی جسکی وجہ سے اوسط عمق زمین ۳۹ فٹ بہت زیادہ ہی اسے ۳۵ فٹ قرار دینا اچھا ہی - اب مٹی کی اتنی موٹی تہ جمنے کے لیے پانچ انچ فی صدی کے حساب سے چھ ہزار سال کا عرصہ چاہیئے لیکن اس اندازہ مین ایک قباحت بھی ہی - ہوسکتا ہی کہ مٹی جمنے کا عمل آہستہ آہستہ ہوا ہو اور ممکن ہی کہ جلد ہوا ہو - پاتال توڑ مشینون کے ذریعہ سے نیل کے کنارے مختلف مقامات پر اسکا اندازہ کیا گیا ہی - اسکے لیے سات اور پندرہ ہزار سال کا عرصہ درکار رہا ہوگا - ہوسکتا ہی کہ اسکے کنارے کے طبقات ایک لاکھ سال سے شروع ہوئے ہون - اس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہی کہ جب زمین قابل کاشت ہوئی تو اسکے ساتھ مصر مین تمدنی طرز معاشرت کی بھی ابتدا ہوئی - نیل کی طغیانیون سے پیشتر بارش کے ذریعہ سے روئیدگی قائم رہتی ہوگی -

آثار سے مصر کی تہذیب ۸۰۰۰ ق م سے مسلسل چلی آتی ہی - اس ملک کی تحریری تاریخ اول شاہی خاندان کا پتہ دیتی ہی جو ۵۵۰۰ ق م مین حکمران تھا - اور جس سے پیشتر کا زمانہ مقدم التاریخ کتنا تھا؟ اسکی بابت یقین اور صحت کے ساتھ بیان کرنا دشوار ہی مگر اُس زمانے کی قبرین تاریخی زمانے کے برابر پائی گئی ہین اسلیئے اسے دو تین ہزار برس قرار دینا چاہیئے[۵۱]-

ایک ہزار قسم کے ظروف چینی و روغنی مصر سے برآمد ہوئے ہین جو اسکے تمدن کے مختلف قرنون مین بنے تھے - سنگ پلرمو کے نام سے ایک کتبہ مشہور ہی جو چند سال ہوئے مصر سے نکلا تھا - اسمین ۴۸۰۵ ق م کے سالانہ واقعات کا ذکر ہی - ایک قطار مین دریائے نیل کے چڑھاؤ، اور دوسرے مین جہازون کا عرض و طول اور رفتار دیا ہی - لکھا ہی:-

ایک جہاز ایک سو ستر فٹ لمبا اور ساٹھ جہاز سو سو فٹ لمبے لمبے بنائے گئے تھے حبشی مغلوب ہوئے - ان کے چار ہزار مرد، تین ہزار مستورات، اور دو لاکھ مویشی بطور مال غنیمت ہاتھ لگے - بادشاہ سنفیرو (Snefrue) کے محل کے اردگرد ایک بڑی دیوار بنائی گئی - اسوریہ سے صنوبر کی لکڑی جہازون کے واسطے لائی گئی - ۳۵ مکانات شکارگاہون مین اور ۱۲۲ تالاب مویشیون کے لیے بنائے تھے اور ساتوین مویشی شماری ہوئی -

بادشاہون کے حجرون سے آبنوس اور ہاتھی دانت کی لوحون پر لکھے

---

۵۱ "ہارمس ورتھ ہسٹری آف دی ورلڈ"، جلد اول صفحہ ۲۳۳ -

ہوئے سالانہ واقعات کے کتبے برآمد ہوئے ہین اور انمین سب سے پُرانا ۵۵۰۰ ق م کا بادشاہ مینا (Mena) کے عہد کا ہی۔ اس زمانے مین اہرام بنتے تھے اسوقت مصری تمدن عالم شباب مین تھا اور سب سے پہلا مخروطی مینار خوفو (Khufu) یا چیوپس (Cheops) کا ہی قارہ کا ہرم ۴۹۰۰ ق م مین بادشاہ نیطرخت (Netarkhet) نے بنوایا تھا جو تیسرے خاندان شاہی سے متعلق تھا۔

مصر کے کتبون اور پیپلیہ گھاس کی تحریرون و تصویرون سے جو تحریر کے نمونے اور اظہار مافی الضمیر کے اشارات برآمد ہوئے ہین وہ نمونے قریب ہین۔ اور یہ مصر کے تمدن کے مختلف زمانون مین مروج تھے۔ اور عبرانی فنکی یونانی حروف آہنی نشانات سے ماخوذ ہوئے ہین اور اس لحاظ سے یورپ کے حروف تہجی کا مبدا مصری اشارات تحریر مین مشابہت کے اعتبار سے ان کی ترتیب دی گئی ہی۔ ۱۴۰ اشارات مین سے ۱۹ ۱۲۰۰ ق م اور ۱۸۰۰ ق م کے مابین ۴۲ ۳۰۰۰ ق م اور ۲۰ ۵۵۰۰ ق م مین اور ۱۳ ۷۰۰۰ ق م مین رائج تھے۔

بابل کا تمدن

پروفیسر پیٹری کی رائے مین بابل کا تمدن اتنا پرانا نہین ہی جتنا مصر کا ہی منتو کے بیانات کی تصدیق اور تحریرون سے ہوگئی ہی مگر بابل دیوتا کے پجاری براسوس (Berasus) کے بیانات سے صرف چھ ہزار سال قبل مسیح کا پتہ چلتا ہی۔ مگر وہ بھی ایسی صحت اور درستی کے ساتھ نہین جیسے مصر کے بادشاہون کا حال معلوم ہوتا ہی۔ ملک بابل مین شروع مین ایک پہاڑی قوم آباد تھی جو اکاد (Akkad) کے نام سے مشہور ہی۔ اسکے ظروف اور دستکاریون کے نمونے ظاہر کرتے ہین کہ اسکا تمدن بہت پرانا ہی۔ اور کہ بابل نے اسی سے تمدن حاصل کیا تھا۔ اس کے ساتھ سمیری قوم کا تمدن بھی شامل ہے۔ یہ قوم بابلیون سے پیشتر گذری ہی۔ اسکے لٹریچر کے نمونے موجود ہین سمیری زبان مسیح سے چار ہزار سال پہلے رائج تھی۔ پھر جب سامیون نے اسپر حملہ کیا تو اُسوقت بھی سمیری زبان کچھ عرصے تک مروج رہی اور اسکا لٹریچر اہل شام نے اپنی زبان مین ترجمہ کیا اور مفتوح قوم کی بہت سی شائستہ باتین اختیار کرلین۔ سرکاری کاغذات دینی صحائف سمیری اور سامی زبانون مین پہلو بہ پہلو لکھے جاتے تھے ۲۱۰۰ ق م مین سمیری زبان بالکل معدوم ہوگئی۔ سمیری رسم الخط تصویردار تھا مگر ہوتے ہوتے وہ خط میخی تبدیل ہوگیا۔ سنگتراشی صناعی کا ایک نمونہ دستیاب ہوا ہی جو بہت ہی عمدہ ہی وہ ۲۸۰۰ ق م کا ہی۔ اسمین بادشاہ نارام سین (Naramsin) کی ایک فتح کا منظر دکھایا گیا ہی۔ یہ اس زمانے پر دال ہی جب سامی اور سمیری صناعی آپسمین خلط ملط ہو رہی تھی عناصر سے ایک کار چوبی صنعت کا نمونہ برآمد ہوا ہی جو ۲۷۰۰ ق م کا ہی۔ اسمین بابلیون کے آلات حرب دکھائے گئے ہین چھ لا سات فٹ لمبا ڈھال گردن سے پانون تک خود کلغی دار تھا جس سے گردن بھی ڈھک جاتی تھی۔ چہرہ کے لیے خود الگ تھا۔

بابل والون کے لٹریچر (جو بابل اور نینوہ وغیرہ پرانے کھنڈرون کے نیچے سے برآمد ہوا ہی) کے حال کا پورا پورا بیان دشوار ہی۔ مگر مختصر یہ ہی کہ خشتی کتابین حسب ذیل علوم پر پائی گئی ہین :-

(۱) الٰہیات۔ اور جادو ٹونا (۲) تاریخ (۳) خط و کتابت اور مراسلات (۴) زبان اور ترجمہ (۵) ریاضیات (۶) فلکیات (۷) علم جغرافیہ اور تاریخ طبعی (۸) طب۔ قصے کہانیان۔ اور نظم اس ذخیرہ سے معدوم ہی برعکس اسکے مصر مین ایسی کتابین بکثرت پائی گئی ہین

دس ہزار سال پیشتر کے واقعات

یہان پر مناسب ہے کہ دس ہزار سال[۱] پیشتر کی متمدن قومون کی ملکی اور تمدنی تاریخ مین جو واقعات گذرے اور جنکا کچھ حال کتبون سے ملتا ہی مختصر ذکر کیا جائے :-

۸۰۰۰ ق م مصر کے زمانہ مقدم التاریخ کے تمدن کا باقاعدہ سلسلہ

---

[۱] ماخوذ از ہارمس ورتھ ہسٹری آف دی ورلڈ۔ جلد اول۔

شروع ہوتا ہی۔ اس ملک کے آثار قدیمہ سے اسکا کھوج ہوسکتا ہی ہرام سے پیشتر کی حالت۔

سنہ ۶۰۰۰ ق م مصر کے اوپر مغربی ایشیا کی قومون نے حملہ کیا۔

سنہ ۵۵۰۰ ق م اس قوم نے حملہ کیا جسنے مصر کے شاہی خاندانون کی بنیاد ڈالی۔

سنہ ۵۵۰۰ ق م مینا تمام مصر کو فتح کرکے اسکا مطلق العنان بادشاہ بنجاتا ہی۔

سنہ ۴۰۰۰ ق م خوفو بادشاہ ہرم اعظم کی تعمیر شروع کرتا ہی۔

سنہ ۳۰۰۰ ق م شمال کی طرف سے مصر پر حملہ ہوتا ہی۔

سنہ ۳۴۰۰ ق م وسطی بادشاہت قائم ہوتی اور بارھوان خاندان برسر حکومت آتا ہے۔

سنہ ۲۰۰۰ ق م بدو سامی یعنی ہکساس لوگ مصر پر حملہ کرتے اور پندرھوین شاہی خاندان کی بنیاد پڑتی ہے۔

سنہ ۲۲۵۰ ق م ہکساس لوگون کی دوسری حرکت یعنی مصر کے وسیع حصہ پر انکی حکومت پھیل جاتی ہے۔

سنہ ۱۴۰۰ ق م تل الامرنہ خطوط لکھے گئے جواب ویسے کے ویسے ہی برآمد ہوگئے ہین۔

بابل کی تاریخ کے واقعات

سنہ ۶۰۰۰ ق م شہر سوزا (Susa) کی بنیاد قائم ہوئی۔

سنہ ۵۰۰۰ ق م بادشاہ ایا (Ea) اریدو کی بنیاد ڈالتا اور اس ملک کو مہذب بنانے کی کوشش کرتا ہی۔

سنہ ۴۷۰۰ ق م بادشاہونکی قدیم ترین یادگارین جو حال مین معلوم ہوئی ہین انکی بنیاد اسوقت پڑتی تھی۔

سنہ ۴۵۰۰ ق م اُرینا۔

سنہ ۳۸۰۰ ق م سامی بادشاہ سارگون اور نارام سین کا عہد سامی حکومت قائم ہوتی ہے۔

سنہ ۲۵۰۰ ق م گدیہ کی حکومت بابل مین قائم ہوتی ہے۔

سنہ ۲۲۸۰ ق م علامی لوگ بابل کو فتح کرتے ہین

سنہ ۲۱۲۹ ق م (امرغل) ہم ربی برسر حکومت آتا اور اپنا قانون نافذ کرتا ہی۔

سنہ ۱۷۸۰ ق م خاندان کاسیہ حکمرانی کرتا ہی۔

سنہ ۱۳۰۰ ق م برنابرایش کی حکومت شروع ہوتی ہی۔

سنہ ۷۹۰ ق م کسنے چرب کے عہد کا آغاز ہوتا ہی۔

سنہ ۵۶۰-۳۸ ق م بنوناد کا زمانہ اور بابل کا زوال شروع ہوتا ہی۔

ہندوستان قدیم
کے تمدن کی بابت عالمون کی رائے[1]

بابل اور مصر کے آثار قدیمہ اور انکی بنا پر محققون نے جو آرا قائم کی ہین انکی بحث کے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہی کہ ہندوستان کے پرانے تمدن اور اسکے نشانات کی بنا پر اسکی قدامت کا بھی مختصر ذکر کیا جائے ہم نے شروع مین کہا تھا کہ سنسکرت لٹریچر کے ذریعے سے ہمارے تاریخی تصورات کے انقلاب کو زبردست تحریک پہنچی ہے۔

جرمنی کا مشہور محقق سیکس ڈونکر "تاریخ تقدمات" کی جلد چہارم مین لکھتا ہے:۔

سپ تمبس (جو شاید دیانی سیوس [Deonyisius] کا دوسرا نام ہی) نے سنہ ۶۷۰۰ ق م مین اپنی سلطنت شروع کی تھی سمت یہ ہشتری کی بابت کہا جاتا ہی کہ وہ بکرمی سمت سے ۳۰۴۴ برس پہلے شروع ہوا تھا اور اس اعتبار سے یہ ہشتری سمت کا آغاز سنہ ۳۱۰۲ ق م مین ہوا تھا۔

ناروے کا محقق رئیس کاونٹ بارن جرن (Byornstjerna) "تھیا گنی آف دی ہندوز" مین لکھتا ہے:۔

میگستھنیز جو سکندر اعظم کی طرف سے دربار چندر گپت مین ایلچی مقرر تھا اسنے پاٹلی پتر (پٹنہ) مین جو اسکا دار السلطنت تھا ۱۵۳ راجاؤن کی فہرست پائی جنھون نے سپ تمبس سے لیکر چندر گپت کے زمانے تک حکمرانی کی تھی اسمین

[1] مضمون کا یہ حصہ ہندو سپریارٹی کے ایک باب سے ماخوذ ہے۔

ہر ایک کا نام اور عہد حکومت کی میعاد دی گئی ہو جو ۴۶۰ برس ہوتی ہو۔ اس سے سپ تبس کی حکم رانی کا زمانہ ۶۷۷۶ قم مین شروع ہوتا ہو۔ اِس اعتبار سے وہ مصر کے سب سے پہلے بادشاہ سے جسکا ذکر منتو نے کیا ہو، ایک ہزار برس پیشتر گدی پر ۵۵۰۰ قم مین تخت پر بیٹھا تھا اور مصر کے حکمران سوفی سے دو ہزار برس پہلے جسنے ہرم غزہ کی بنیاد ڈالی تھی۔

پھر ایک اور جگہہ وہی عالم لکھتا ہے:۔

ہندوؤن کے تمدن کی قدامت کے اور بھی زبردست ثبوت موجود ہین اور وہ الی فنٹہ ایلورہ اور دیگر مقامات کے سنگلاخ مندر ہین جن پر عجیب و غریب ہنر مندی اور دانائی صرف ہوئی ہو وہ مصر کے اہرام سے فن تعمیر کے اعتبار سے بڑھ چڑھ کر ہین

جرمن عالم پروفیسر ہیرن (Hern) کہتا ہے:۔

سپ تبس اور چندر گپت کے درمیان ۶۴۰۲ سال کا فاصلہ ہو۔

روما کا مشہور عالم پلینی کہتا ہے:۔

بکس (Bacchus) سے لیکر سکندر مقدونی کے زمانے تک ہندوستان مین ۱۵۴ بادشاہ حکم ران ہوے۔ اور ان کا زمانہ ۶۴۵۱ سال ہوتا ہے۔

ایک باختری نسخہ دبستان کے نام سے مشہور ہو جو کشمیر سے برآمد ہوا تھا۔ اُسے سر ولیم جونز یورپ لے گئے تھے۔ اسمین ان بادشاہون کا ذکر ہو جو باختر مین حکم ران تھے اور مہابدری کہلاتے تھے۔ اِس سلسلے کے پہلے بادشاہ نے سکندر اعظم کے حملۂ ہند سے ۵۶۰۰ برس پہلے حکومت کی تھی اور یہ بادشاہ ہندو تھے جبکو ٹل نے بھی اپنی تاریخ ہند کی دوسری جلد مین تسلیم کیا ہو۔ دبستان سے ظاہر ہو کہ ۶۰۰۰ ق م مین ہندوستان کا تمدن عروج پر تھا۔ ہندوستان کے مختلف مقامات سے جو سکّے پُرانے زمانے کے نکلے ہین اُنسے بھی ہندو تمدن پر روشنی پڑتی ہو اور وہ بہت پُرانا ٹھہرتا ہو۔ الفنسٹن نے اسکا کھلے الفاظ مین اعتراف کیا ہے۔

لیکن جس قوم کے ہان برہم دن اور برہم راتری کے سلسلے اور اسکے مختلف زمانے یگون چتر یگون، مہا یگون، منونترون اور کلپون مین بٹے ہوئے ہون، اور پھر ہر ایک زمانہ کئی کئی لاکھ برس قرار دیا گیا اسکے لیے دس پانچ ہزار سال محض ایسے ہین جیسے بڑے گھڑے مین پانی کا ایک چمچہ۔

نتیجہ

اِس ساری بحث کا لُب لباب یہ ہو کہ زمانۂ حال کے اثری اکتشافات اور علمی تحقیقات نے ہمارے تمام خیالات کو اُلٹ پلٹ کر دیا ہو اور تاریخی زمانہ جو پہلے محدود تھا اب بہت وسیع ہو گیا ہو۔ پُرانی چیزونکی بنا پر آٹھ دس ہزار سال کے تمدن کا پتہ لگتا ہو جس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہو کہ ابتدائی وحشیانہ حالت سے رہائی حاصل کرنے مین انسان کو ضرور کچھ عرصہ درکار ہوا ہوگا اور چونکہ ابتدائی ترقی بہت آہستہ آہستہ ہوا کرتی ہو اسوجہ سے دو چار ہزار سال اسکے لیے بھی مخصوص ہونے چاہئین۔

جے آر رائے جرنلسٹ لاہور

این چنین گردن دعوی نہ فراز د چکنند | بمبئی گرہمہ برخویش نیاز د چکنند
غیر ازین ہیچ متاعے نبود عاشق را | در قمار تو دل ازنیست نہ باز د چکنند
عاشق از بسکہ بہ پیش تو ز تو محروم است | دست اگر سوی تو گستاخ نہ یاز د چکنند
بسکہ در دمن از اندازہ درمان بگذشت | چارہ گر با من بیچارہ چہ ساز د چکنند

شبلی دل زدہ، در وادی غم دیر رسید
گرم اگر در رہِ عشق تو نہ تاز د چکنند

شبلی نعمانی

اجودھیا

صفحہ ہستی پر بہت سے ایسے خطہ ہیں جن کی قسمت میں نیچر نے اپنے فیاض ہاتھوں سے ہمیشگی کی سرسبزی و شادابی لکھدی ہی اور اس دلآویزی کے ساتھ ساتھ اہل دنیا کی ندیدی آنکھیں کچھ ایسی پڑتی رہتی ہیں کہ وہ کبھی اپنے سے انکو جدا نہیں ہونے دیتی۔ گو زمانہ کے انقلابات اپنا اثر ڈال ہی چھوڑتے ہیں لیکن ہر نئے روپ میں دلگیری اور دل فریبی دوچار درجہ اور ہی بڑھجاتی ہی۔ اور زمانہ زرین کے بھولے بھالے بسنے والوں نے مذہبی پہلو کی شق کچھ ایسی دانائی سے ان شہروں کے ساتھ لگا دی ہی جس سے ان کی آبادانی کو اور بھی اچھا موقع ملتا رہتا ہی۔ دنیا نے بہت سے پلٹے کھائے متعدد قالب بدلے لیکن مذہب و اہل مذہب ایسے شہزور ہوتے ہیں کہ ہر آنیوالی مصیبت کا مقابلہ دلیرانہ کرکے موقع پاتے ہی اپنے متبرک مقامات کو اُسی زیب و زینت سے آراستہ کر دیتے ہیں۔

اِن گنتی کے چند مقدس و خوش نصیب خطوں میں سے آودھ کا مشرقی حصہ ہی جسکو شاہی میں آودھ اور اس زمانہ میں اجودھیا کے نام سے پکارتے ہیں۔ اسکی شکل ایک جزیرہ نما کی سی واقع ہوئی ہی۔ ہر سہ طرف دریائے گھاگرہ جسکو سرجو بھی کہتے ہیں اپنے نہ تھمنے والے بہاؤ کے ساتھ خدا کی یاد میں رہنے والوں کے دلوں کو دنیاوی کدورتوں سے صاف کیا کرتا ہی۔

نیچر نے قدرتی صناعیوں اور دلفریب منظروں سے اسکو مالا مال کر دیا ہی۔ آب و ہوا کے لحاظ سے بھی یہ مقام نہایت اچھا ہی۔ قدرتی ٹیلے جو کسی زمانہ میں قلعوں یا گڑھیوں کا کام دیا کرتے تھے اور جن پر خودرو درخت کثرت سے اُگ آئے ہیں جو چھوٹی چھوٹی پہاڑی سلسلوں کا لطف دے جاتے ہیں دریا کے کنارے و نیز وسط شہر میں ہزارہا مندر و معبد خانے ذی حوصلہ مہاراجگان ہند کی مذہبی قدر دانی کی داد زبان حال سے کھڑے دے رہے ہیں۔ اجودھیا اپنی قدامت کے لحاظ سے دنیا کے تمام شہروں سے گوے سبقت لیگیا ہی۔ اسی مقام میں مذہب برہمن کو کمال ترقی ہوئی ہی۔ اسی گھدیشہ میں برہمنی مذہب ایک سادہ مذہب سے شاندار مذہب بنگیا۔ اسی جگہ ایک سادہ اور سیدھے مذہب میں وہ شاندار رسومات اور تقریبات شامل ہوئی ہیں جن پر آج ہند کو فخر و مباہات اس درجہ ہی۔ اسی مقام پر مذہب برہمنی حد درجہ کو پہنچکر دوسرے آنے والے مذہب کے روبرو کچھ دنوں کے واسطے گمنامی کی چادر میں لپٹ گیا تھا۔ ایک معمولی پنچایتی طریقہ حکومت سے عظیم الشان اور باسطوت حکومت کی بنیاد اسی جگہ پڑی، جسکے جانباز سپاہیوں اور دلیر سرداروں نے جنوبی ہند کو اپنے قدموں سے پامال کر ڈالا تھا اور ہمیشہ سے سنسکرت بولنے والی قوم کا یہ مرجع رہا ہے۔

تاریخی حیثیت سے اجودھیا پر نگاہ ڈالنے سے ہمکو ہندو مائتھالوجی کے پُرلطف قصص و روایات جو غیر معمولی الفاظ سے بیان کیے گئے ہیں دیکھنے میں آتے ہیں۔ ایک قصہ مشہور ہی کہ مبنی یا وینی پسر آنگہ حاکم اجودھیا پر برہمنوں کا عتاب نازل ہوا جس سے مبنی بغیر اولاد مرگیا لیکن اسکی چتا سے دو لڑکے پیدا ہوے۔ اوّل نکھد جو اُسکے پیروں سے نکلا اور وحشی اقوام کا مورث اعلےٰ بنا اور دوسرا پرتھو جو مبنی کے بازوؤں سے نکلا جسکو اجودھیا کے اوّل سورج بنسی راجہ ہونے کا افتخار حاصل ہوا اور اس سے تمام آبادی کی بنیاد پڑی جسکا پتہ منو اور مہابھارت سے چلتا ہی۔

لیکن ایک دوسری جگہ ایک دوسرے پرتھو کا نام آتا ہی اور ایک دیگر شخص بنام اِستواکو کی بابت گمان غالب ہی کہ وہی پہلا بادشاہ سورج بنسی خاندان کا گذرا ہی اور اجودھیا کی حکومت کا تاج اول اول اسی کے سر پر رکھا گیا۔ اِستواکو کو حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا ہمعصر بتاتے ہیں۔ اسکے بعد راجہ سراوست کا نام آتا ہی لیکن اس خاندان میں حکومت معمولی طریقہ سے رہی اور کوئی پولیٹکل تقریبات و ملکی امور قابل فکر پیش نہیں آئے۔ اس خاندان کے لوگ

تقریباً سب کے سب مذہبی زندگی بسر کرتے تھے اور علائق دنیاوی سے بہت کم واسطہ رکھتے تھے لیکن زمانہ گذرنے پر ایسے بھی لوگ پیدا ہونے لگے جو اپنی جواں مردی و دلیری کے لیے شہرۂ آفاق ہوئے یا کسی مہتم بالشان مہم کے سر کرنے یا ملکی پیچیدگی کی گتھی سلجھانے کے لیے تاریخی حیثیت سے قابلِ ذکر ہوئے ہیں۔ راجہ رامچندر کے خاندان میں اس قسم کے لوگ زیادہ پائے جاتے ہیں جنھوں نے کمزور خاندان والوں کو زیر کرکے اپنی سطوت کے ڈنکے بجا دیے اور سلطنت کے دائرہ کو وسیع کرکے ہند کے بڑے حصہ پر قابض ہو گئے۔ ایک جگہ پر درگھابو اور رگھیو کا جو کمزور شاخ سے متعلق ہے ذکر ہے جو رامچندر کے خاندان والوں سے شکست کھا کر جلاوطن ہو گئے۔

لیکن آنشواکو اور دوسروں کو ویسا ہی روایتی رہنے دو جیسے وہ مذہبی تھے اور درگھابو اور رگھیو کو روما کے رومولس و ہیلن شمار کرو۔ راجہ رامچندر کے تذکرہ میں راجہ جسرت قابل ذکر کیرکٹر ہیں اور رام تو بلاشک دنیا کے غیر معمولی اشخاص میں شمول ہونے کے قابل ہیں جس نے اپنی خداداد قوتوں اور فطرتی بہادری سے اجودھیا کو اس قابل بنایا کہ اسکا ذکر تاریخ عالم میں جلی قلم سے کیا جائے۔ اس راجہ کے زمانہ میں سورج بنسیوں کے ہتھیار شمالی ہند میں پہنچ گئے اور سمندر پار لنکا میں اجودھا کے جانبازوں نے اپنی تلواروں کو میانوں میں کیا۔ مذہبی حیثیت سے بھی یہ ایک غیر معمولی شخص تھا جو مذہبی کتب سے متعلق ہے۔ لیکن راجہ رامچندر کے زمانہ حکومت کی آب و تاب صرف ڈوبتے ہوئے آفتاب کی آخری جھلک کے مشابہ ہے کیونکہ انکے مرنے کے بعد سلطنت کا چراغ لب بام ہو گیا۔ گو ساکھیہ منی (جسکو بدھ گوتم کے نام سے منسوب کرتے ہیں) کے وقت تک عنانِ حکومت رامچندر ہی کے خاندان میں رہی لیکن پہلی سی بات نہ قائم رہ سکی اور سورج بنسی سورما سیتھین سرداروں کے حملوں کی تاب نہ لاسکے اور تھوڑے ہی عرصہ میں رام کے خاندان والوں کو شیشناگک خاندان والوں کے لیے جگہ خالی کرنا پڑی۔ اسوقت سے گدھ میں تاریخ اجودھا شامل ہو گئی جس سلطنت کا کہ وہ جزو بنگئی۔ اس زمانہ میں بقول لوکل (مقامی) روایات کے اجودھیا ایک جنگل بنگیا تھا۔ زاں بعد راجہ وکرما دیتہ کا نام تاریخ کے صفحوں پر نظر آتا ہے جس نے برہمنی مذہب کو دوبارہ زندہ کرکے ہند کا قومی مذہب قرار دیا اور اسکے پیدائشی مقام یعنے اجودھا کو دوبارہ آباد کرایا۔ اور اس متبرک مقام کو جو ملحدوں کے قیام سے خراب ہو گیا تھا پاک صاف کرکے تاریخی مذہبی مقامات کو از سر نو تعمیر کرایا خلاصہ یہ کہ شہر اجودھیا روایتاً دوبارہ درست کیا گیا اور برہمنوں کے طریقہ پر بسایا گیا۔ لیکن اب سے اسکو صرف مذہبی شہر ہونے کا اعزاز حاصل رہا یعنے پولیٹیکل دار الحکومت ہونے کی نوبت کبھی نہ آئی کیونکہ اسوقت سے اسکا کپیلہ کی سلطنت کو سالا سے الحاق کر دیا گیا۔

اب ہم یکایک اور تقریباً انجانے ایک نئے نظارہ پر نظر ڈالتے ہیں۔ سوشل جیالوجی (تمدنی طبقۃ الارض) کے ایک کلی زلزلے اور انوکھے قطعہ پر نظر نے سنبھالا لیا ہے جو خود بخود سطح کے اوپر برآمد ہو گیا ہے۔ اس طبقہ میں جس میں کہ اب ہم اپنے کو لیے جاتے ہیں۔ مسلمان بقول مبصرانِ طبقۃ الارض اُبھرنے والے مادہ کے مشابہ ہیں کیونکہ رسول عربی کی الوہی قوتوں اور غیر معمولی تلقینی لکچروں نے مغربی حصہ ایشیا میں ایک کھلبلی مچا دی تھی، جس سے گندھکی مادہ اس سرعت سے نیچے نیچے پھیلتا چلا جاتا تھا کہ دیکھنے والوں اور عمیق بینوں نے پہلے ہی سے ہند کو سنبھل جانے کی صلا منادی تھی لیکن اس آتشیں مادہ کو روکنا ذرا کارے دارد تھا۔ اسوقت اجودھیا بھی کوسالا سے نکلکر قنوج کے تحت کا ماتحت بنگیا تھا کیونکہ تاریخ چندردیو کو فاتح اجودھیا بتاتی ہے۔ مسلمانوں کے ہتوڑے کی ہند میں پہلی چوٹ محمود غزنوی کے زمانہ میں لگی۔

لیکن اجودھا کی کامل فتح شہاب الدین کے ہاتھوں ہوئی۔ قنوج و بنارسی حکومتیں دونوں سنہ ۱۱۹۴-۹۳ء میں زیر فرمان شہابی ہو گئیں اجودھیا میں اب بھی شاہ جوران غوری کا مزار موجود ہے جو شہاب الدین کا ایک لفٹنٹ تھا۔ یہاں کا حاکم شمس الدین التمش کا بڑا لڑکا نصیر الدین

جو بقول مسلمان مورخوں کے ایک غیر معمولی قابلیت اور لیاقت کا آدمی تھا، سنہ ۱۲۲۶ء میں مقرر ہوا۔ اس شہزادہ سے اہل اجودھیا کی بہت کچھ امیدیں وابستہ تھیں لیکن بے وقت کی موت نے سب پر خاک ڈالدی۔ اسکے مرنے کے بعد چند سال تک اس صوبہ کا حاکم اس کا ہمنام نصیر الدین طیا شی معزّی رہا۔ یہ صوبہ دار نہایت ہی وفادار اور خوش سلیقہ آدمی تھا اور اپنی حاکمہ سلطانہ رضیہ کی کمک کے لیے ایک جرار لشکر روانۂ دلّی کیا تھا لیکن بیچارہ اثنائے سفر میں خود ہی قید کر لیا گیا اور جیل میں باقیماندہ زندگی گذارنا پڑی۔ تاریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ نصیر الدین کے بعد قمر الدین کو یہاں کی گورنری عطا ہوئی تھی جس نے بلبن کو شاہنشاہ کے خلاف ہتھیار اُٹھانے کو بہت کچھ اُکسایا تھا۔ گو مصنف طبقات ناصری اور منہاج السراج نے اس گورنر کی بہت کچھ تعریف کی ہی لیکن کوئی غیر معمولی کام اسنے اپنے زمانہ حکومت میں نہیں کر دکھائے۔ بعد ازاں تغلق خان کا نام آتا ہی جو ملکۂ آں جہانی کا شوہر تھا۔ اسنے بھی مثل دوسروں کے با اختیار ہونیکی کوشش کی تھی لیکن شروع ہی میں گردن مروڑ دی گئی۔ بعد کو ارسلا خاں، امیر غیاث خاں و دیگر صوبہ داران اودھ میں آتے رہے لیکن سب کے سب تہِ تیغ ہوتے رہے۔

اب تاریخ اجودھیا ایک نیا سین پیش کرتی ہی۔ بغرا خاں و کیقباد کے لشکری سپاہی دریائے سرجو کے دونوں کناروں پر خیمہ ڈالے نظر آتے ہیں باپ بیٹے میں اَن بن ہو گئی ہی۔ بغرا خاں اپنے بیٹے کی تادیب پر تُلا ہوا ہی اور بیٹا معز الدین درباریوں کے بھڑکانے پر اپنے باپ کے خون کا پیاسا بنگیا ہی۔ ملک داری کی خواہش نے اسکی آنکھوں پر لالچ و عصبیت کی چادر ڈال دی ہی اور وہ اپنے پیارے باپ کے محبت و وقار کو خیرباد کہہ کر میدان جنگ میں صف آرا ہو گیا ہی۔ لیکن چند ہی روز گذرنے پائے تھے کہ نشۂ جہانبانی و ملک گیری کا فور ہو گیا اور کیقباد اپنی سمجھ میں آگیا محبت پدری کی رگ جوش میں آئی اور بے اختیار ندامت سے چور پیارے باپ کے قدموں پر گر پڑا اور عنان حکومت و تاج شاہی اپنے باپ کو سپرد کر دینے پر آمادہ ہو گیا۔ بغرا خاں بیٹے کی حالت زار دیکھکر آٹھ آٹھ آنسو رونے لگا اور بیٹے کی خطا معاف کر کے دلّی کی سلطنت اُسکو بخش دی اور خود بنگال کی گورنری پر واپس گیا۔

دلّی پہنچکر کیقباد نے امیر خسرو کو اجودھیا کی گورنری پر مامور کر کے روانہ سوبے اودھ کیا لیکن امیر خسرو چونکہ درباری آدمی تھے اس لیے دو ہی برس کے بعد پھر طلب کر لیے گئے اور انکی جگہ امیر علی گورنر اودھ نامزد ہوا۔ لیکن جب خلجیونکا دور دورہ دلّی میں ہوا تو علاء الدین کو جنت نشان اودھ کی حکومت عطا ہوئی لیکن فوراً ہی علاء الدین کو دیوگڑھ کی طرف رخ کرنا پڑا اور اپنی جگہ علاء الملک کو عارضی طور پر کام کرنے کے لیے چھوڑ گیا جو سنہ ۱۲۹۶ء میں مستقل طور پر حاکم صوبۂ اودھ و کڑہ علاء الدین کے سریر آرائے سلطنت ہونے پر مقرر ہو گیا۔ اسکے بعد اب پھر تاریخ خاموش ہی۔ البتہ محمود تغلق کے عہد میں آئین الملک کا نام اجودھیا کے ذکر میں آتا ہی جو غالباً یہاں گورنر تھا۔ یہ شخص نہایت ہی خیر خواہ تخت و ہمدرد رعایا تھا اور ایک قابل جنرل و تجربہ کار گورنر ثابت ہوا۔

لیکن جیسا کہ اندنوں عام قاعدہ تھا آئین الملک کچھ ہی دنوں حکومت کرنے پایا تھا کہ درباری ہیچیدگیوں نے اسکو گورنری چھوڑ کر پایۂ تخت حاضر ہونے پر مجبور کیا صرف اس الزام پر کہ اسنے غلطی سے دو چار درباری مفرورین کو اپنے صوبہ میں پناہ دے دی تھی۔ لیکن تھا سمجھدار اور چلتا ہوا دلّی سے تو حیلہ کر کے چلا آیا اور اجودھیا پہنچکر اپنی فوج کو مسلح کر کے شاہی فوج کے مقابلہ پر آمادہ ہو گیا۔ لیکن شاہی جرار لشکر کا مقابلہ کرنا سہل نہ تھا خوب جی توڑ کے لڑا اور اس جنگ میں اسکے کئی بھائی کام آئے بالآخر اطاعت قبول ہی کرنی پڑی اور اپنی معافی کا ملتجی ہوا۔ بعد اسکے اودھ کی گورنری حسام الملک کو ملی۔ لیکن اسکے بعد دلّی ہی کی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور سارا ہندوستان مختلف خود مختار سلطنتوں میں منقسم ہو گیا۔ اور

اودھ شرقی خاندان جونپوری کے پالے پڑا۔ اجودھیا بھی ایک صدی تک انھیں حکمرانوں کے تحت میں رہا۔ اور گمان غالب ہے کہ دو ایک بادشاہوں نے اپنی عمریں سرجو کے کنارے گذاریں جس کے ثبوت میں صرف ایک بادشاہ کا مقبرہ باقی رہگیا ہے لیکن وہ بھی گر گرا کر زمین کا پیوند ہوگیا ہے؛ اور کتبہ تک کا پتہ نہیں ہے۔

سلطان بہلول کی تقسیم سلطنت کے تذکرہ میں لکھنؤ، کٹرہ وغیرہ کا ذکر ہے لیکن اودھ اپنی غیر موجودگی کی وجہ سے ممتاز ہے اسکی وجہ صرف یہی معلوم ہوتی ہے کہ اجودھیا کے بجائے پایۂ تخت ٹانڈہ کو ہٹا دیا تھا جیسے علاءالدین کے زمانہ میں جونپور میں مشمول ہوگیا تھا۔

لیکن اب ہند سے کئی صدی کے لیے طوائف الملوکی رخصت ہونیوالی تھی اور مغل قبضہ (تلوار) کی ہیبت اودھ میں بھی ظاہر ہونیوالی تھی چنانچہ بابر نے بذات خود اودھ کا رخ کیا اور نانامؤ کے گھاٹ پر گنگا پار کرکے کوچ بر کوچ کرتا سنہ ۱۵۲۸ء میں اجودھیا کے دروازوں پر گھوڑے کی باگ روکی۔ بابر کے ہمرکاب فتح و نصرت تو تھی ہی پہنچتے ہی چند افغانیوں کو جو اسوقت اجودھیا کو لوٹ رہے تھے بھگا دیا اور باقاعدہ حکومت قائم کی۔ چونکہ ایک عرصہ سے کسی حاکم کے نہ ہونے سے بدنظمی غایت درجہ پھیلی ہوئی تھی اسلیے انتظامی مشین کو باقاعدہ طور پر درست بنانے کے لیے بابر نے چند روز اجودھیا ہی میں قیام کیا لیکن افسوس کہ اس نے اپنی کمزوری اور بیجا تعصب کو رام جنم بھون میں مسجد بنوا کر ہمیشہ کے لیے اپنے نام کے ساتھ جگہ دیدی یہ ایک ایسا دھبّہ بابر کے کیرکٹر پر لگ گیا ہے جو احکام شرعی اور پولٹیکل سیاسی عقلمندی کے بالکل خلاف تھا اور ایک عرصۂ دراز تک اسکے پاک دامن پر دُور سے نظر آتا رہیگا۔ ہمایوں شیرشاہ کی وجہ سے اجودھیا کو اپنے قدموں سے سرفراز نہ کرسکا لیکن اکبر نے اس سرزمین کو ضرور زینت بخشی جبکہ وہ سکندر خاں کے مقابل لشکر آرا ہوا تھا۔ اس ممتاز بادشاہ کی آمد کی یادگار میں کئی قصبے آباد کیے گئے تھے اور اکبر نے بھی مثل بابر کے اپنی تشریف کی یادگار میں ایک مسجد تعمیر کرائی لیکن اس میں اُس تعصب کا نام تک نہ تھا جو بابر نے ظاہر کیا تھا۔ ایک علیحدہ جگہ پر چھوٹی سی مسجد اپنے ہم مذہبوں کے لیے بنوادی تھی اور ہندوؤں کے کسی معبد میں دست برد نہ کی۔

سلطنت مغلیہ کے زمانہ میں امن و امان کے باعث لوگوں کو سفر کرنے اور جگہ بہ جگہ آنے جانے کا خیال پیدا ہوچلا تھا اور لوگ کثرت سے اجودھیا میں آباد ہوتے جاتے تھے۔ مغربی بہاؤ کے ہمراہ مغربی تمدن اور مغربی علوم و فنون بھی ہند کے سب سے پرانے شہر میں کثرت سے پھیلتے جاتے تھے۔ چنانچہ نئی ساخت کی عمارات، بڑے بڑے میناروں اور بیضاوی گنبدوں والی مسجدیں سرعت کے ساتھ اس شہر میں بنتی چلی جاتی تھیں لیکن اس لحاظ سے کہ ہنود کے دل نہ دُکھیں مسجد و مقابر وغیرہ بیرون شہر عموماً تعمیر ہوتے تھے جنھوں نے رفتہ رفتہ ایک اور دوسرے شہر کی صورت قبول کرلی۔

سعادت خاں کی آمد نے نئے سرے سے ایک دوسرے ہی شہر کی بنیاد ڈال دی جو زیادہ تر اسلامی عمارات سے مزین ہوتا گیا اور اجودھیا صوبہ کی دار الحکومت کی حیثیت سے تبدیل ہوکر صرف ایک ہندوؤں کا تیرتھ گاہ رہگیا اور یہ عزت اسکو اسوقت تک حاصل ہے۔ آخری دَور میں مغربی تمدن نے بھی اس کی بہت کچھ یاری کی اور مرحوم راجہ سر پرتاب نرائن سنگھ بہادر نے اس کو رشک فردوس بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ ہماری بھی دعا ہے کہ خدا اسکو راجہ رامچندر جیسی عظمت مغربی پیرایہ میں عطا کرے

عزیز

در عشق چو بابِ توبہ بستم! بستم　　رندم ز مے نگار مستم! مستم

آزردہ مکن دلم تو اے واعظِ شہر　　بگذار و برو کہ ہرچہ ہستم! ہستم

حمید کوٹلوی

اصولِ زندگی

دنیا میں اُس قوم سے بڑھکر قابل الزام کوئی قوم نہیں جو زندگی کے اصول گم کردے، یا ضروریاتِ حیات کی طرف سے ایسی غلط فہمیوں کا شکار ہو جائے جس سے نحوست و نکبت، نفاق و نفرت، تنزل و افلاس، اور تعصب جہالت اُسے چاروں طرف سے آکر گھیر لیں۔

تاریخ ہمیں جہاں تک مدد دے سکتی ہو اُس سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہوتی ہو کہ نوع انسان کے جس گروہ نے جس وقت زندگی کے شایستہ اصول اور اُسکی لازمی ضرورتوں سے بے نیازی شروع کر دی اُسی وقت نمایاں معلوم طور پر اُس میں زوال و نکبت کے اسباب پیدا ہو گئے حتی کہ وہ گھٹتے گھٹتے چند گمنام اور بیکار افراد کا مجموعہ رہگیا اور پھر اُسنے اُبھرنا بھی چاہا تو اُبھر نہ سکا۔

کتابِ عالم کے بیانِ ہستی کا سیاق و سباق ہمیں ہندوستان میں بھی اپنے افراد ملک و قوم کا یہی خلاصہ پیش کرتا ہو اور ہم اپنی مجموعی حالت کو معیار زندگی سے بہت کچھ گرا ہوا علمی، عملی، اخلاقی اور تمدنی خصوصیتوں سے بالکل معرا پاتے ہیں۔ بہرکیف اس وقت ہندوستان کے وسیع برِّ اعظم میں برٹش حکومت کے زیر اثر ہم تمام ہندو اور مسلمان جس آزادی اور آسایش و راحت سے بسر کر رہے ہیں اسکا اعتراف نہ کرنا ایک قسم کا کفرانِ نعمت ہو لیکن اگر ہم سے یہ سوال کیا جائے کہ ہمنے اس پُرامن زمانہ میں کیا کیا اپنی زندگی کو کامیاب بنانے میں کون سے اصول جدید قائم کیے تو جواب یہ ہوگا کہ ہمنے قدیم اصول بھی کھو دیے۔ وا رے ہم! افسوس!! صد افسوس!!! قدیم و جدید کی بحث یہاں بے محل ہوگی۔ ہر سمجھدار شخص تھوڑے سے غور کے ساتھ اپنی زندگی کی لازمی ضرورتوں اور اُسکی علمی، عملی، جسمانی، یا تمدنی ہیئتوں کو سمجھ سکتا ہو۔ لیکن بیحد افسوس ہو کہ ہمنے جس قدر اُنھیں سمجھنے کی کوشش کیں ہمارا ہر قدم پیچھے کو پڑا ہو۔ جس ترقی کو ہم ترقی کہتے ہیں در اصل وہ ترقی معکوس ہو۔ کیونکہ اخلاق و اعمال کی درستی کے بغیر کسی قوم کا نظام قومیت اور امن معاشرت درست و پائدار نہیں ہو سکتا، اور جب تک کسی مُلک کے افراد میں بلا اختلاف عقائد و خیال یکجہتی اور ہم آہنگی کے ساتھ اتفاق و محبت کا مبارک عنصر پیدا نہ ہو، اور نیز یہ کہ وہ حق مساوات کو ملحوظ رکھکر زندگی کے چند مختصر مگر مستقل اصول کے پابند نہ ہوں، زندگی کی سچی برکات ہرگز حاصل نہیں کر سکتے۔

اختلاف عقائد و خیال کوئی تعجب انگیز امر نہیں۔ انسانی قلوب و طبائع کا تخالف ایک قدرتی بات ہو اور یہ ہر ملک میں پایا جاتا ہو۔ لیکن جس قسم کا اختلاف بدقسمتی سے ہم نے ملک و وطن میں پاتے ہیں وہ نہایت حیرت انگیز بلکہ قابل افسوس ہو، کہ ہم اُسکے باعث اپنی گرانمایہ زندگی کی کسی برکت و سعادت کا مُنھ نہیں دیکھ سکتے۔ بعض اوقات یہ اختلاف ایسی افسوسناک صورتیں اختیار کر لیتا ہو کہ ہم ایک دوسرے سے ملنے کی عوض ہٹتے ہٹتے بعد المشرقین پر جا گرتے ہیں۔ الغرض ہمکو اب تک اسی طفلانہ روش کے انداز نے کسی سمت راہ پر چلا کر منزل مقصود تک پہنچنے نہیں دیا، مگر ہم ہیں کہ ہمیں اُسکا احساس تک نہیں!

اس امر کا ٹھیک پتہ لگانا دقت طلب ہوگا کہ حضرت انسان نے اس پُرشوکت کائنات میں کب سے آکر آنکھیں کھولی ہیں اور اسکی زندگی کی بنا کس وقت یا کس زمانہ سے شروع ہوئی ہو۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ آنکھیں کھولتے ہی اُسے ایک ایسا عالم نظر آیا جس میں اُسکے محسوسات اور مدرکات کے لیے غیر محدود وسعت تھی۔ وہ ایک چیز کی جنبش کے سبب کا پتہ لگاتے ہوے اسباب کے عظیم الشان سلسلہ تک پہنچا اور اسی طرح رفتہ رفتہ اُسکے دل میں سب سے پہلے جس چیز کا احساس زیادہ اثر انداز ہوا وہ اُس ہستی کا احساس تھا جسے جاننے کی اب تک بڑی بڑی رفیع الشان کوششیں ہو چکی ہیں لیکن وہ ابھی تک بہت کچھ نامعلوم ہے

در رہِ عشق نشد ہیچ کسے محرمِ راز
ہر کسے بر حسبِ فہم گمانے دارد

مگر اُس مقدس ہستی برتر کے دانش آموز خیال نے مختلف ممالک کے مختلف الخیال انسانوں میں مختلف اسما و آثار سے جلوہ گری کی ہے۔ انکار کسی کو نہیں۔ مذہب کا یہ ہیولائے مقدس کچھ ایسے اندازوں سے اُٹھا جسکے لیے اُسکی صوری تراش خراش میں انسان کو متخیلہ نے بہت کام دیا اور اپنی سمجھ کے مطابق ابتدائی صدیوں میں شجر و حجر اور برق و باد کے سامنے سرنگوں ہوتا رہا۔

لیکن انسان کی زندگی ایسی چیز نہ تھی جو دوسرے حیوانات کی طرح محض کھانے پینے، چلنے پھرنے، اور سونے جاگنے، تک محدود رہتی کیونکہ انسانی نفس ناطقہ کی پروازیں اُس خالقِ اکبر نے اپنی بالغہ حکمتوں سے بڑے وسیع پیمانہ پر ارفع اور بلند رکھی تھیں، چنانچہ انسان زندگی کے مختلف مراحل طے کرتے ہوئے حسیات سے گزر کر آخر آج علم کے اس درجہ پر پہنچے ہیں کہ دنیا کی تمام مخلوقات سے ہمیں اپنا استحقاق شرافت بداہتاً فائق و بالا معلوم ہو رہا ہے، اور علم کے اس مبارک انکشاف پر ہم تمام مقدس بزرگوں اور رہنماؤں کے صدق دل سے شکور ہیں جنھوں نے ہمارے اسلاف کی دستگیریاں کی ہیں اور ہم بھی اُنکے نام لیوا ہیں۔

لیکن چونکہ انتظام قدرت کچھ ایسا اعلیٰ اور بالا ہے کہ اُس میں کوئی چیز مہمل یا بیوقت ظاہر نہیں ہوتی لہذا علم کا یہ ہوش افزا مکاشفہ بھی حضرتِ انسان پر زندگی کی بے انتہا کوششوں اور ان تھک موشگافیوں کے بعد ٹھیک اُس وقت ہوا جبکہ وہ آثار علوم و تمدن اور انوار تہذیب اخلاق سے بہرہ ور ہونے کے لیے قدرتاً اہل ہو چکا تھا۔

خیالات کی اس تجدید نے انسان کے سابقہ توہمات اور قدیم مفروضات کی بہت کچھ اصلاح کی اور اُسے موجودات کی غلامیوں سے خود بخود ایک قسم کی نفرت محسوس ہونے لگی حتیٰ کہ وہ انسانی غلامی کی قید سے بھی آزاد ہو گیا۔ انسان کی اسی فطری حریت نے نظام حکومت کو شخصیت سے بدلکر جمہوریت پر لا ٹھیرایا اور اُس نے اپنی زندگی کے اصولوں کو جانچا، مذہب کو زیادہ گہری نگاہوں سے دیکھا، اور اُسکی ضروریات یا اصلیت کو بھی سمجھا۔

جس کا تمام لب لباب اور ما حصل سچائی اور صداقت، معاملات کی درستی ایفاے عہد، ایثار نفس، ایک دوسرے کی ہمدردی، اور کردار و اعمال کی اصلاح پر ٹھیرتا ہے۔ ان چیزوں کو اگر آج بھی ہم اپنی زندگی سے علیحدہ کر دیں تو ہماری تمام جمعیت جانوروں کا گلہ اور ہماری زندگی محض وحشیانہ اور ابلہانہ ہو جائیگی۔

یہ موٹی موٹی چند باتیں ہیں ہمیں ہر مذہب سکھاتا ہے۔ یہ چند اصول ہمیں ہر آسمانی کتاب سے ملتے ہیں۔ اور زندگی میں ہمیں امن و امان یا سلامتی کے ساتھ جینے کے لیے انکی سخت ضرورت ہے۔ اگر یہ باتیں عقائد و خیال سے اُٹھا دی جائیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ ہماری شب بیداریاں، ریاضتیں، مجاہدے، اور تمام اقسام کی عبادتیں کچھ کام آسکیں گی۔ ہرگز نہیں، کسی بزرگ نے خوب کہا ہے ؎

مباش در پے آزار ہر چہ خواہی کن
کہ در طریقتِ ما بیش ازیں گناہے نیست

لیکن تمام مقدس کتابوں اور آسمانی نوشتوں میں روحانیات کے مبحث کی بعض پیچیدگیوں نے انسان کو محنت شاقہ یا محض روحانیات کی جن اُلجھنوں میں اُلجھایا وہ تار و پود نہایت عجیب شان سے صدیوں بنی نوع انسان پر تنا رہا بلکہ ہم اہل ایشیا پر اب تک تنا ہوا ہے۔ حالانکہ روحانیات کے تمام مکاشفات کا اصل مقصود اصلاح اخلاق و عمل پر مبنی تھا نہ کہ شعبدہ اور کراماتوں پر۔ کیونکہ خرق عادات کے تمام مظاہر ضروریات حیات سے خارج اور زندگی کے لازمی اصولوں سے بالکل جداگانہ چیز ہیں۔ علامہ غزالی اسی لیے اپنے ملفوظات میں لکھتے ہیں کہ "ایک شخص اگر آسمان پر اُڑ کر چلے یا فضا میں تیرتا پھرے لیکن اُسکے اخلاق اچھے نہ ہوں تو سمجھو کہ ایک تنکا ہے جو ہوا میں اُڑ رہا ہے"۔ انھیں خصائص حیات کو سمجھ کر کسی دانا نے یہ کہا ہے ؎

تو کار زمین را نکو ساختی   کہ با آسمان نیز پرداختی

آج یورپ میں جا بجا ہوائی جہازوں کا زور ہے۔ لیکن اُنھیں بھی یہ خیال ریل، اسٹیمر، موٹر کار، اور بائیسکلیں بنا لینے کے بعد پیدا ہوا۔ مگر حیرت ہے ہم لوگوں پر کہ ہم دفعتاً زمین چھوڑ کر عرش اعظم پر پہنچنا چاہتے ہیں اور اپنی زندگی کو کسی مفید اصول کی پابندی کے بغیر محض اوہام اور بعض مفروضات عجیبہ کی پیروی میں گذار دینے کے عادی ہو رہے ہیں۔

بیشک انسان کا شرف و کمال انسان ہونے میں ہے نہ فرشتہ ہونے میں۔ یہی وجہ تھی جس کے باعث خداوند نے فرشتوں کو آفرینش آدم کے وقت شانِ جلالی کے ساتھ ڈانٹ کر فرمادیا کہ چپ ہو! آفرینش آدم کے معاملہ میں جو کچھ میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ بات بھی سچی تھی کیونکہ فرشتوں کو روحانیت کے اعتبارات سے خواہ کیسا ہی اعلیٰ درجوں پر سمجھ لیا جائے مگر وہ اپنی فطرت کی خاص نوعیت کے باعث انسانی آفرینش کی اہمیت یا اُسکی اغراض کو سمجھنے سے معذور تھے۔ چنانچہ علّم آدم الاسماء کلھا کے بعد یا اشارہ ثم عرضھم علی الملائکۃ اس امر کی صاف شہادت ہے کہ انسان خداوند کی نظر میں فرشتوں سے بڑھ کر عزیز اور محبوب تھا اور اس شرف و قبول کی وجہ صرف کمال روحانیت نہیں بلکہ اکتساب علوم و فنون اور محاسن اعمال و اخلاق کے ساتھ زندگی میں امتحانات حیات کی وہ غیر محدود کشمکش تھی جس میں رہ کر حضرت انسان نے اپنا کمال و شرف علمی، اخلاقی، تمدنی، عقلی، اور عملی صورتوں سے ثابت کیا ہے اور یہ وہ بات ہے جو فرشتوں کو نصیب نہیں ہوئی۔

مگر قطع ازیں اس ملکوتی روحانیت کا خیال بوجوہ چند در چند تمام ساسانی، کیانی، کلدانی، عبرانی، اور آرین نسلوں میں راسخ رہ چکا ہے بلکہ اب تک ہم اسے موجود پاتے ہیں۔ ایشیا کا ہر عالم اور نکتہ رس خصوصیت سے بھی بال کی کھال کھینچتا رہا جس پر فرشتے ناز کرکے خجل ہو چکے تھے۔ لیکن ہمارے یہاں تو ہوتے ہوتے اُس بال کی کھال بھی یہاں تک کھینچی ہے کہ بال بھی باقی نہیں بچا یعنی یہی روحانیت بھی ہمارے پاس نہ رہی ع

ہمہ حیرتم کہ دہقان بچہ کار کشت مارا

تمام مذاہب بلاشبہ واجب التعظیم اور تمام آسمانی صحائف یقیناً واجب الاحترام ہیں۔ خداوند کے جلال کا کوئی بیان اور اُس انیک روپی پرم آتما کی عظمت کا کوئی حرف جس کاغذ پر لکھا ہوا ہے اُسے چوم کر آنکھوں سے لگانا ہماری زندگی کا دستور العمل ہونا چاہیے۔ ہم ہندوستانیوں کا یہ فخر ہے کہ ہم لوگ سچائی، صداقت، گرگیان اور ست پر جان دیتے ہیں۔ لیکن باوجودیکہ زندگی کے بے شمار ربانی انعامات علوم و فنون کی مختلف صورتوں میں ہمارے سامنے پڑے ہیں ہم تا حال روحانیت کے جس گورکھ دھندے میں آنکھیں بند کیے پھنسے ہیں اُس سے نکلنا یا خداوند کی پرشوکت کائنات کو نگاہ بصیرت سے دیکھ کر نمایاں طور پر اپنے فرائض حیات کو سمجھنا ہمارے امکان سے باہر ہو رہا ہے اور ہم اُس عالم روحانیت کو اس عالم جسمانیت سے بالکل علیحدہ سمجھتے ہیں حالانکہ ؎

جہانِ صورت کا ذرہ ذرہ جمال معنی کا آئینہ ہے
مگر اُنھیں کو جو دیکھتے ہیں جو جانتے ہیں نگاہ کرنا

ناظرین معاف فرمائیں۔ ان الفاظ سے ہمارا مقصد خدانخواستہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ روحانیت بے کار چیز ہے۔ یورپ کی ترقی کو ہم خود ناقص سمجھتے ہیں کیونکہ اُن میں بے انتہا مادیت کا زور ہوتا جاتا ہے۔ یورپ کے ایوان اخلاق کا ستون بھی مدت ہوئی کہ مرکز ثقل سے ہٹ چکا ہے۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ روحانیت کے مسائل کو ہم لوگوں نے اپنی مخصوص خوش فہمیوں اور عقیدت مندیوں سے جس نوعیت سے سمجھ کر بیکاری اور خیالی دینداری کے سہارے میں چپ سادھ لی ہے وہ نہایت افسوس انگیز ہے۔

دنیا میں انسانی زندگی کو اصول و نظام کا پابند کرکے ٹھیک طریقہ سے درست رفتار کے ساتھ چلانا مذہب کا کام ہے اور مذہب جب حشو و زوائد سے پاک و درست حالت میں رہتا ہے وہ اپنی غرض کی تکمیل میں کبھی قاصر نہیں رہتا۔ لیکن جب اس میں مرور ایام کے باعث بعض عجائب پسند انسانوں

اور اندھے عقیدت مندوں کی عقیدت کا ہیولیٰ مختلف آمیزشیں کردیتا ہے تو مذہب کی صورت بھی بگڑجاتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ زندگی کے اہم مقاصد کو گم کرکے نظام قومیت اور اصولِ حیات سے علٰحدہ ہوکر اوہام کے غاروں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ کرنے کے ضروری اور مفید کاموں کو چھوڑ کر عنقا و ہُما کا شکار کرنا کمالِ انسانی سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ لکھنے والے عاقل نکتہ رس لوگوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ ؎

عنقا شکار کس نہ شود دام باز چیں
کاینجا ہمیشہ باد بدست دام را

اے عزیزانِ وطن! اگر ہماری ضروریاتِ حیات کسی دوسرے شخص کی جسمانی، علمی، اور تمدنی، محنتوں سے پوری ہوتی ہیں، اگر ہم اوروں کے دیے لیے پر گذر اوقات کرکے روحانی فضائل کے نغمے سناتے ہیں، تو ہمارے تمام مجاہدے، اور یوگ کے سارے آسن یا نشستیں بالکل بیکار ہیں۔

اے برادرانِ قوم! اگر ہم خداوند کی بے انتہا نعمتوں، دولتوں، اور برکتوں سے جو ہر وقت ہمارے تمہارے آس پاس وسعت سے پھیلی ہوئی ہیں فائدہ اُٹھا کر مشکلاتِ حیات کو حل نہیں کرسکتے تو ہماری دینداری محض افسانہ ہے۔ اے محترم بزرگو! اگر ہم نے اپنی گراں مایہ زندگی کے فرائض کو محض چند گھنٹوں کی وظیفہ خوانی تک محدود سمجھ رکھا ہے تو ہم بیش از بیش ممکن ہے فرشتہ ہوجائیں مگر ہمارے لیے انسان ہونا زیادہ باعث فخر ہوگا۔ انسانیت بہت بڑی چیز ہے۔

زمانہ کبھی نہیں بدلتا۔ اُسے جس نہج پہ قدرت نے رکھا ہے چل رہا ہے۔ مگر ہاں انسانی ضرورتیں اُسکے علم و عقل، ادراک و خیال، کی رفعت و پستی کے زیر اثر ہمیشہ بدل جاتی ہیں۔ آج دنیا میں امن و عزت کی زندگی گذارنے کے لیے جن وسائل و اسباب کی ضرورت ہے اُن سے چشم پوشی کرکے اگر ہم محض اپنے اسلاف ہی کے کارناموں کے قصہ خوان بنے رہے تو ہماری تمام آوازیں بیکار ہونگی اور ہمارے سب رشتے ٹوٹ جائیں گے۔ تاج و تخت کی قیمت اگرچہ جوتی ہے، لیکن اگر جوتی بھی پاؤں میں نہ رہی تو سخت مشکل ہے۔ تخت و تاج نہ سہی مگر کم از کم دنیا میں اگر ہم وجود رکھتے ہیں تو ہمیں اُن لوازم کی سخت ضرورت ہے، جن کا مہیا کرنا جسمانی اور روحانی ضرورتوں کے واسطے نہایت ضروری ہے۔ لیکن ہم ان اسباب کو جمع کرنے کے لیے اُس وقت تک ہرگز قابل نہیں بن سکتے جب تک ہم اپنی زندگی کو چند ایسے اصولوں کا پابند نہ بنالیں جنکی پابندی کا یقینی نتیجہ سعادت اور برکت مانا جاتا ہے۔ اگرچہ ہماری مقدس کتابیں ان ہدایات سے بھری پڑی ہیں لیکن میں اپنے خیال ناقص کے مطابق چند باتیں عرض کرتا ہوں۔ منوانا میرا کام نہیں ہر اہل بصیرت خود نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے۔

(۱) ہم ہر انسان کو انسان ہونے کے لحاظ سے دیکھیں اور لیں نہ کہ باعتبار مذہب۔ کیونکہ مذہب کی کوئی خصوصیت کسی کی پیشانی پر لکھی ہوئی نہیں۔ سب انسان انسان ہیں اور سب لوگ اخلاق و عمل تمدن و تہذیب کی ضرورتوں میں مساوی ہیں۔

(۲) ہر شخص کی شرافت عزت اور فضیلت کا معیار اخلاق و تہذیب اور علم و عقل کے مقدس نور کی جلوہ گری پر قائم ہونا چاہیے نہ کہ دولت، امارت یا خاندانی وجاہت پر۔

(۳) شوالوں، گردواروں، مندروں، سماجوں، مسجدوں، اور کلیساؤں کو ہم احترام و ادب کے ایک درجہ پر لائیں کیونکہ ان سب میں بالواسطہ یا بلاواسطہ اُسی خداوند برتر کی ستایشیں اور پرستشیں ہوتی ہیں جو ہر متنفس کا خالق اور ہم سب کا مالک ہے۔

(۴) تعلیم کو نہایت اچھے اسلوب کے ساتھ لڑکیوں اور لڑکوں کے لیے لازمی قرار دیا جائے اور اُنکے نصاب تعلیم کو ہر دو سال کے بعد معلومات جدید سے زیادہ بہتر بناتے رہنے کی کوشش جاری رکھی جائے کیونکہ تمام کائنات قدرتاً اصول ارتقا کے ماتحت ہے۔

(۵) کسی پیشہ و حرفت کے شخص کو ذلیل نہ سمجھا جائے بلکہ اہل علم

مفید علمی معلومات سے اُنکی مدد کریں۔ بالذات نجس یا ذلیل کوئی نہیں، تمام ذلتوں اور نجاستوں کی جڑ جہالت ہے اور وہ دور ہو سکتی ہے۔

(۶) گروہ اناث کا ہر جگہ بلا اختلاف عقائد و ملّت احترام کیا جائے۔ ۸۰ سالہ ضعیفہ اور پانچ سالہ لڑکی دونوں یکساں عزت کی مستحق ہیں کیوں کہ ہماری موجودہ بچیاں آیندہ نسلوں کی مائیں ہیں۔ عورت کو خداوند نے بقائے نسل کی وہ اہلیت اور خدمت عطا کی ہے جسے مرد ہرگز انجام نہیں دے سکتا اور اسی لیے وہ قابل احترام ہے نہ کہ لائق حقارت و صعوبت۔

(۷) زانی اور فاسق و فاجر اگرچہ قانونی گرفت سے آزاد ہیں مگر ضرورت ہے کہ ہم اپنا اخلاقی قانون زندہ کریں اور ایسے اشخاص کو جن پر زانی ہونے کا گمان ہو انھیں سوسائٹی میں یہاں تک ذلیل و حقیر سمجھا جائے کہ وہ اپنی ذلت کو محسوس کریں اور اصلاح حال کے لیے تیار ہوں۔

(۸) معاملات میں راستی، صداقت، دیانت، باہمی محبت و الفت کے ساتھ معذور الحالوں کی امداد، اور ایک دوسرے کی جائز ہمدردی کو ہم ہر جگہ اپنا ایک انسانی فرض قرار دیں۔ مگر پیشہ ور گداؤں، بھک منگوں، اور مفت خوروں کی طرف التفات نہ کریں۔

(۹) شادی اور نکاح کے لیے سختی سے لڑکیوں اور لڑکوں کی بلوغت، اہلیت، قابلیت، اور صحت کا خیال رکھا جائے۔ نابالغی کی شادیاں، یا شتر گربہ جوڑ ہرگز مستحسن نہ سمجھے جائیں۔ والدین کو اس امر کا خیال اپنا فرض سمجھنا چاہیے۔

(۱۰) زانیہ یا فاسقہ مستورات کو سختی سے ناقابل التفات سمجھا جائے اور اسکے لیے مردوں کو اپنے اخلاق و عمل کی اصلاح کرنے کی سخت ضرورت ہے کیونکہ عورت مرد ہی کے خیالات سے متاثر ہونیوالی ہستی ہے۔ عورتوں کے بگاڑ کا الزام بہت کچھ مردوں کے سر ہے۔

پیارے عزیزان وطن! تم ان باتوں کو جس نقطۂ نگاہ سے دیکھو تمھیں اختیار ہے۔ لیکن جہاں تک انسان ہونے کی حیثیت سے ضمیر ہدایت کر سکتا ہے یہ تمام مذکور الصدر باتیں ایسی دشوار العمل ہرگز نہیں کہ ان پر ہم عمل پیرا نہیں ہو سکتے اور اگر ایسا ہی ہے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ ہم کچھ بھی کر نہیں سکتے اور نہ ہمسے آیندہ کچھ ہوگا۔

اے عزیزو! اگر ہمیں سچے دل سے خداوند کو پیار کرنے کی تعلیم دیگئی ہے اور اُسے ہم ہر انسانی وجود میں جلوہ افروز مانتے ہیں تو ضرورت ہے کہ ہم ہر آدمی سے باخلاق و محبت پیش آئیں۔ اور اس محبت کا ثبوت ہر شخص کے طرز عمل یا اندازِ معاشرت اور لوگوں کے ساتھ روزانہ زندگی کے معاملات سے ظاہر ہو سکتا ہے۔

فی الحقیقت جو شخص خداوند کی نظر آنیوالی مخلوق انسانی سے پیار و محبت نہیں کرتا وہ اُس نظر نہ آنیوالی ہستی سے جسے خدا کہتے ہیں کیا محبت کر سکتا ہے۔ آہ! جس کا ظاہری انداز اور حال یہ ہو کہ وہ بندگان آلہی سے نفرت و کدورت برتے اُسکے باطن کی کیفیتوں کو سمجھنے کے لیے کسی زیادہ کوشش کی ضرورت نہیں۔

اے پیارے عزیزان ملک و قوم! اس وقت ہماری زندگی بالکل بے نظام ہو کر علمی، عملی، تمدنی، روحانی اور جسمانی حیثیتوں سے معرض خطر میں آئی ہوئی ہے۔ اقوام مغرب نے علوم و فنون یا باہمی اتحاد و محبت کی مقدس شمع جلا کر اپنے مقامات کو جس روشنی سے روشن کیا ہے یہ کوئی انوکھی بات نہیں یہ ہمارے ہی گھروں کی دبی بجھی آگ تھی جس نے ایک دنیا کی دنیا کو آج گرما دیا ہے مگر افسوس کہ ہم سرد ہو کر حیرت کے ساتھ آج اُن آتش افروزوں کا منھ تکتے ہیں۔ پیارے عزیزو! آج وہ وقت نہیں کہ محض لنکا اور دُوارکا کی تعریفیں ہمارے کام آسکیں۔ وہ زمانہ نہیں کہ "پدرم سلطان بود" کی منطق سے کچھ عقدہ کشائی ہو سکے۔ آج بمقتضائے وقت اس امر کی سخت ضرورت آپڑی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنی زندگی کو عملی، اخلاقی، علمی، تمدنی، اور روحانی اعتبارات سے ذاتی کوششوں کے ساتھ منفردہ طور پر ثابت کرکے دکھلائے کہ ہم زندہ ہیں مردہ نہیں۔

آئے دن کے مذہبی جھگڑے اور مقدس بیکاریں بیکار ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس گئے گزرے حال پر بھی ہمارے دلوں میں ست کی عزت، سچائی کا احساس، گیان کی جستجو، دانش کی تلاش، اور رفعت و کمال کا ذوق موجود ہے اور بیشک ہم اہل ہند کا یہ فخر ہے کہ ہم ست پر جان دیتے ہیں۔

مگر کیا ست پیندرہ یا میں ہو سکتے ہیں؟ کیا سچائی جھگڑا پیدا کراتی ہے؟ کیا سچ کو پاکر انسان کے دل میں بغض و عناد غصہ و غرور یا دوسروں کی حقارت و نفرت کا مواد فاسد باقی رہ سکتا ہے؟ اگر اسکا جواب ہر ذی ہوش نفی میں دیتا ہے تو پھر کس قدر قابل الزام و حیرت ہے ہم کہ یہ تمام باتیں ہم میں موجود ہیں اور سخت رنج کا مقام ہے کہ ہم آئے دن ہندو اور مسلمان عزیزان وطن کی دلخراش الجھنوں کے قصے سنتے رہتے ہیں۔ اے بھائی جبکہ

رام ہو جاتے ہیں وحشی بھی یہاں اخلاق سے
ہمکو اپنے دل ملانے کس طرح دشوار ہیں؟

اے بھارت ماتا کے سپوت بیٹو! کیا تمہارے دلوں سے ایثار نفس کی وہ تمام شانیں گم ہو چکی ہیں؟ جو کبھی تمہارے لیے نشان امتیاز تھیں۔ اور اے اسلام کے محترم نام لیوا افراد! کیا آپ نے اُن تمام اخلاقی محاسن و علمی فضائل کو بھلا دیا ہے جو تمہارے اسلاف کو کبھی باعث صد ناز تھے؟ آہ! اگر ایسا ہے تو ہماری حالت لایق افسوس و مذمت ہی نہیں بلکہ قابل ملامت بھی ہے۔ مگر ہم اُس واقعہ کو کیوں کر بھول سکتے ہیں جبکہ سری رام چندر جی نے باوجود مستحق تخت و تاج ہونے کے منتھرا کی تحریک اور اپنی چچی کیکئی کے کہنے سے اپنے چچازاد بھائی بھرت کے لیے خندہ پیشانی کے ساتھ حکومت سے ہاتھ اُٹھا کر بن باس اختیار کر کے جنگل کو میل دیے تھے!

اور کس قدر متاثر کرنیوالا ہے یہ منظر کہ اسلامی حکومت کے عہد میں قرطبہ کا ایک مسلمان امیر (صمعان ابن جریر) رات کو اپنے مکان کے صحن میں بیٹھا ہے۔ دفعۃً کیا دیکھتا ہے کہ ایک شخص دیوار پھاند کر صحن میں کودا ہے اور گرتے ہی اُس نے کہا کہ خدا کے لیے مجھے پناہ دو۔ میرے پیچھے ڈھونڈھنے والے پھر رہے ہیں کیونکہ مجھ سے ایک خون ہو گیا ہے۔ یہ بات سن کر امیر چونک اُٹھتا ہے کہ قتل تو گناہ عظیم ہے لیکن اچھا جب تک تمہاری زندگی ہے تم بلاشبہ جیو گے اور میں تمہارے راز کو فاش نہ کروں گا۔ کھانا کھاتے وقت یہ مسلمان امیر اُس قاتل کو اپنے ساتھ شریک کرتا ہے کہ محبت راسخ ہو جائے لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد اُس امیر کو خبر ملتی ہے کہ تمہارا لایق اور جوان بیٹا کسی سفری کے ہاتھوں بازار میں مارا گیا ہے۔ لاش پڑی ہے۔ یہ سُن کر اُس قاتل کے پیروں تلے سے زمین نکل جاتی ہے اور امیر پر ایک سکتہ کا عالم طاری رہتا ہے۔ لیکن امیر فوراً ہی سنبھل جاتا ہے اور انّا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر اُس شخص کو کہتا ہے کہ اے شخص تم کچھ ہراس نہ کرو۔ میں تم سے جو عہد کر چکا ہوں وہ نہ توڑونگا۔ مگر بہتر ہے کہ تم اب یہاں سے چلے جاؤ ورنہ ممکن ہے کہ میرے دل میں بتقاضائے بشریت جوش انتقام پیدا ہو جائے۔ یہ کہکر وہ امیر اُٹھتا ہے اور اُس قاتل مہمان کو ایک جوڑا اور چند اشرفیاں اور ایک تیز رو گھوڑا دیتا ہے کہ اسپر بیٹھ کر تمہیں یہاں سے نکلجانے میں آسانی ہوگی۔ قاتل سخت ندامت و خفت کے ساتھ معذرت طلب کرتا ہے۔ آخر امیر نے رخصت ہوتے وقت کسی خاص روحانی خیال سے متاثر ہو کر اُسے کہا کہ ٹھیرو میں تمہاری پیشانی تو چوم لوں کیونکہ تم میرے مہمان تھے اور پھر خدا حافظ کہکر اُسے رخصت کرتا ہے۔ بیٹے کی تجہیز و تکفین بعد میں کیجاتی ہے۔ اللہ اللہ! کیا لوگ تھے۔

بہر کیف یہ باتیں فوق الفطرت نہیں۔ ہم انسان ہیں، اگر ہمارے شریف محسوسات آج بھی زندہ ہو جائیں تو ہم سب ایسے ایثار اور اسی قسم کی محبت و ہمدردی کا ظہور ہونے لگ جائے۔ ہمیں خداوند نے وہ اعزاز بخشا ہے جو فرشتوں کو بھی نصیب نہ ہوا۔ لیکن اس اعزاز کو زبانی طور پر نہیں بلکہ عملی و اخلاقی طور سے دنیا پر آشکارا کرنے کی ضرورت ہے اگر ہم عملاً مذہب کے اُس نور مقدس کو جو روحانی اور جسمانی طور پر حُسنِ اعمال اور باہمی الفت و اتحاد کے ناگزیر تعلقات سے وابستہ ہے ظاہر نہیں کر سکتے تو نہیں معلوم کہ ہم لوگ اپنے اپنے خیال میں کون سے سرگ، بیکنٹھ اور فردوس و خلد کے خواب دیکھتے ہیں۔ آہ! ہمیں کون سمجھائے کہ یہ زندگی نہایت گراں قدر دولت اور خداوند کی بے نظیر نعمت ہے۔ اسے خواہ مخواہ کی جنگ و پیکار میں صرف جور و ستم کرنا ہمیں منزلِ مقصود پر ہرگز نہ پہنچائیگا۔ مبارک ہیں وہ نفوس جنھوں نے تعلیم کی اصلی غایت زندگی کے حقیقی مقصد، اور اپنی ہستی کے مہتم بالشان غرض کو سمجھکر بغض و عداوت اور

کدورت و نفرت کے عنصر کو اپنے دل سے نکال دیا ہو۔ وہ یقیناً نجات پائیں گے۔ اُن کے واسطے ہر جگہ نور ہی نور پھیلا ہو۔ وہ قدرت کے ہر منظر اور دنیا کے ہر مشاہدہ سے لازوال سرور حاصل کر سکتے ہیں اور اُنھیں کی زندگی زندگی ہو۔ کیوں کہ وہ اُن پائدار اصولوں کے پابند ہیں جن میں لیل و نہار کی کوئی گردش کسی قسم کی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتی۔ اُنکا ہر کام علم و عقل کے ضابطوں کے ماتحت انجام پاتا ہو۔ سلیئے کہ اُنھوں نے گیان اور دانش کو سمجھ کر اپنا دل روشن کیا ہو۔ ایسے لوگ مر کر زندہ رہتے ہیں بلکہ زیادہ نام پاتے ہیں، اگرچہ اُن کی زندگی کا اصول شہرت یا ناموری کے خیالوں سے بالکل الگ ہوتا ہو۔ کاش ایسی سچی سادہ اور خوش انجام زندگی ہم سب کو نصیب ہو، ورنہ اس زندگی اور بے اصول زندگی سے موت بہتر ہو تاکہ ہم کسی کی دل آزاری نہ کر سکیں۔

چو بکعبہ سر نہادم ز درون ندا بر آمد
تو برونِ در چہ کردی کہ درونِ خانہ آئی

ق ۔ ح ۔ ا

دولابۂ راستی کش

لندن کے ایک فیشن ایبل حصہ میں چند نوجوان جمع ہیں۔ بعض کھیتی امرا ہیں جو زمانہ بھر کی سیر و تفریح اور لندن و پیرس کے عشرت خانوں اور تماشہ گاہوں سے سیر ہو کر بیاں آئے ہیں، کچھ بحری اور بری فوج کے افسر ہیں، چند منچلے ممبر پارلیمنٹ بھی ہیں، اور ایک دو وزیران سلطنت کی صورتیں بھی نظر آتی ہیں۔ ڈیوک آف ڈورچیسٹر، صدر انجمن نے حاضرین جلسہ کو مخاطب کر کے بیان کیا:۔

مائی لارڈز اینڈ جنٹلمین! آج تک ہمارے کلب کے کسی ممبر نے شہرت پسندی کی نازیبا اور مکروہ عادت اختیار نہیں کی ہو۔ اور نہ ہم کسی ممبر کو شہرت طلبی کا ملزم قرار دے سکتے ہیں۔ ایسی حالت میں اخبار ڈیلی ٹکلر میں ہماری نسبت مضمون رائی خالی از اندیشہ نہیں۔

چاروں طرف سے "شرم شرم" کی آوازیں آئیں اور مضمون پڑھنے کا تقاضا ہوا۔ صدر انجمن نے فرمایا۔

کل کے اخبار میں مندرجۂ ذیل مضمون ایڈیٹوریل کالم میں شایع ہوا ہو:۔

گذشتہ بارہ ماہ میں اسکاٹ لینڈ یارڈ کی پولیس نے ایک نئی وضع کے ملزم کا سراغ لگایا ہو۔ یعنی ایسا نقب زن جو دوسرے ہی دن مال مسروقہ مالک کو واپس کر دیتا ہو۔ علمی حلقوں میں اسکی توضیح یوں کی گئی ہو کہ آج کل کی تہذیب و تعلیم نے جرائم پیشہ لوگوں کی ہیئت کذائی بالکل بدل دی ہو۔ پہلے زمانہ میں مرد العمر ارتکاب جرائم کرنے کے بعد نقب زن شاذ و نادر بڑھاپے میں اپنے افعال قبیحہ پر نادم ہوا کرتے تھے، لیکن آج صرف چوبیس گھنٹہ میں کانشنس (نورایمان) کی چٹکیاں مجرم کے دل کو موم کر دیتی ہیں اور وہ اپنی حرکت پر نادم و پشیمان ہو کر لوٹ کا مال واپس بھیج دیتا ہو۔ لیکن اسکاٹ لینڈ یارڈ کے ممبر، ماہران سائنس کی اس تشخیص پر مسکراتے ہیں، ان کے نزدیک اس پردۂ زنگاری میں کوئی دوسری ہی صورت پوشیدہ ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ جدید نقب زن اونچی سوسائٹی کے لوگ ہیں جو اجر منفعت کے خیال سے نہیں بلکہ محض تفنن طبع کی غرض سے نقب زنی کرتے ہیں اور پیشہ ور نقب زنوں کی طرح تمام خطروں کو برداشت کر کے لطف اُٹھاتے ہیں۔ اگرچہ بعض آدمی اسے انگریزی قوم کے تنزل و انحطاط کی علامت بتلاتے ہیں لیکن ہم اس رائے کے خلاف ہیں اور اس جدت کو فال نیک سمجھتے ہیں۔ کھیلوں اور تفریح کے معاملات میں پیشہ ور کھلاڑیوں کی زیادتی پر کون انگریز ہو جو افسوس نہیں کرتا۔ ایسی صورت میں ہم صدق دل سے اس اولوالعزم گروہ کا پیشہ نقب زنی میں خیر مقدم کرتے ہیں جس طرح پیشہ ور کھلاڑیوں نے ہمارے قومی کھیلوں کو کم وقعت کر دیا اسی طرح ہمیں امید ہو کہ یہ آزاد منش نقب زن پیشہ ور مجرموں کی اصلاح میں مدد و معاون ہونگے۔ جو نقب زن چوری کا مال چوبیس گھنٹہ میں واپس کر دے، اس قابل ہو کہ اسکی

حوصلہ افزائی کیجائے۔ کیونکہ ہمیں امید ہو کہ جو شاں آزاد نقب زن قائم کرتے ہیں آپکی تقلید جرائم پیشہ چور آج نہیں تو کل ضرور کریں گے۔

جنٹلمین! خوش قسمتی سے ہم اب تک پولیس کی زد سے بچے رہے ہیں، لیکن اخبار ڈیلی ٹلگراف کے حوصلہ افزا مضمون کی وجہ سے ہمیں پھونک پھونک کر قدم رکھنا لازم ہے۔ میں جملہ ممبران کو حد درجہ کی احتیاط اور دور اندیشی برتنے کی نصیحت کرتا ہوں۔ نہ صرف پولیس بلکہ اخبار نویس بھی ہمارے طریقہ کارروائی اور ہمارے درجہ سے ایک حد تک واقفیت رکھتے ہیں۔ ممکن ہو کہ پولیس ممبران کلب کے نام سے بھی آگاہ ہو۔

چاروں طرف سے صدائیں بلند ہوئیں کہ کل ہی سے ہم اس اخبار کا چندہ بند کر دیں گے۔ ڈیوک نے اس گرم جوشی کا شکریہ ادا کرکے کہا کہ مجھے آپکی اس تائید سے بڑی تقویت ہوئی۔ اب میں جلسہ کے ایجنڈا کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ اگرچہ ظاہر میں معلوم نہیں ہوتا مگر ہم آج کل سائنس اور علم کے زمانہ میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہمارے کلب نے اب تک سائنس کی طرف چنداں توجہ نہیں کی ہو، اگر کبھی توجہ کی بھی تو ایسی مادی چیزوں کے لیے جیسے ریڈیم یا ایروپلین (ہوائی جہاز)۔ سائیکالوجی (علم روحانیات) سے تو سوائے نام کے ہمیں کچھ بھی واقفیت نہیں ہو۔

کپتان کانبر بولا "میں تو اسکے ہجے بھی نہیں کرسکتا"۔

ڈیوک نے قطع کلام پر کچھ دھیان نہ کیا۔ "مجھے خیال ہوا کہ اپنے کلب کی اعلے خصوصیت قائم رکھتے ہوئے زمانۂ حال کے جدید ترین اختراع سے کچھ نفع بھی حاصل کریں۔ خوش قسمتی سے ہمیں موقع حاصل ہو۔ ڈیلی ٹلگراف کی اسی اشاعت میں تحریر ہو کہ جرمنی ڈاکٹر بام برجز پروفیسر یونیورسٹی برلش نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہو جس سے انسانی دل کے تمام پوشیدہ راز آئینہ کی طرح معلوم ہوجاتے ہیں اسکا نام گلوانکائی کلومیٹر یا دولابۂ راستی کش ہو۔ اسکا موجد آج کل لندن میں مقیم ہو۔ اور یہ بات بڑی دل خوش کن ہو کہ اس آلہ کا تمام سامان اس قدر مختصر ہو کہ باسانی ایک چھوٹے سے دستی بیگ میں سما جاتا ہو۔ آج لارڈ ریسی نے میجر گنگھم کی تائید سے ارل آف ڈنٹن کا نام کلب کی ممبری کے لیے تجویز کیا ہو۔ دولابۂ راستی کش سے ایک نتیجہ دو کاج کا کام لیا جائیگا۔ اوّل تو اُسے چرا کر ارل ڈنٹن بطور فیس داخلہ ممبری پیش کرسکیں گے دوم اسکی مدد سے ہم عالم ذہنیات و سائنس کے خرمن کی خوشہ چینی کرسکیں گے جس کی ہمیں بہت ضرورت ہو۔ میں یہ بھی تجویز کرتا ہوں کہ دولابۂ راستی کش حاصل ہوجانے کے بعد ہم میں سے ایک ممبر امتحان کے لیے چنیں۔ ڈاکٹر جس کسی کا نام نکلے تجویز کیا جائے اور آلہ لگا کر اُسکے دلی خیالات اور پوشیدہ راز جنہیں وہ اپنے ساتھ قبر میں چھپانے کا خواہشمند ہو معلوم کیے جائیں۔ اے حضرات! یہ خیالات نہ صرف ہماری دلچسپی اور خوش طبعی کا باعث ہونگے بلکہ شاید ہم سب کے لیے اخلاقی سبق کا کام دینگے۔

پریسیڈنٹ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر ہنسی کے قہقہوں اور تالیوں کے شور نے خاموش کردیا۔

ڈاکٹر بام برجز پروفیسر برلش یونیورسٹی قد و قامت کے لحاظ سے غیر معمولی آدمی تھا۔ اُنچائی میں چھ فٹ چھ انچ سے کم نہ تھا اور اسی تناسب سے جسامت کا خیال کرلینا چاہیے۔ جسمانی عرض طول کے ساتھ اُسکی دماغی قوت بھی ارفع و اعلی تھی جس کی تصدیق یونیورسٹی کی بیشمار ڈگریوں سے ہوتی تھی۔ وہ ذہنیات کے بیابان میں فیل مست کا درجہ رکھنے کے ساتھ عالم ایجادات و اختراعات میں ممتاز تھا۔ چنانچہ تارکول سے ارغوانی رنگ جسکی تلاش میں کیمیاگر پندرہ سو برس سے سرگرداں تھے اسی یگانۂ روزگار نے نکالا ہو۔ حال میں اس نے دولابۂ راستی کش ایجاد کیا ہو جس کے ذریعہ سے انسان کے پوشیدہ راز آنِ واحد میں معلوم ہوجاتے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف لندن میں رائل سوسائٹی اور افسران محکمۂ فوجداری کے روبرو اس دولابۂ راستی کش کی حیرت انگیز قوتوں کی تشریح کرنے کی غرض سے مقیم بھی ہو۔ ڈاکٹر بام برجز کی ذہانت یہیں تک محدود نہیں ہو، خود اُسکی روحانی قوت اس درجہ ترقی یافتہ ہو کہ بلا کسی آلہ کی مدد کے بھی اُسے ایسی بیشمار باتیں معلوم ہوجاتی ہیں جو دوسروں سے پوشیدہ

رہتی ہیں۔ اُس نے انتشاع نور کا ایک نظام مقرر کیا تھا۔ اسکے نزدیک ہر انسان کی شخصیت سے اُسکی دلی خیالات میں رنگی ہوئی شعاع خارج ہوتی رہتی ہے۔ اگر آدمی کے خیالات خراب ہیں تو شعاع بھورے رنگ کی نکلیگی۔ خیالات زیادہ فاسد ہیں تو اسی نسبت سے بھورا رنگ مائل بسیاہی ہوتا جائیگا۔ اگر کسی آدمی کا دل روحانیات کی جانب مائل ہے تو اُس کی شعاعیں آسمانی رنگ کی ہونگی۔ سبز شعاع بغض و حسد کی شہادت دیتی ہیں اور زرد رنگ سے نفاست مزاج ظاہر ہوتی ہے۔ غرضکہ اسی طرح مختلف رنگوں سے مختلف خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ اور تو اور وہ انسان کی شعاع بلا مدد آلہ کے بھی دیکھکر وہی خیالات معلوم کر لیتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ لوگ اُسکی صحبت سے احتراز کرتے تھے۔ خود اُسکی شعاعیں ایسی واقع ہوئی تھیں کہ وہ اپنے خلاف لوگوں کے خیالات فوراً محسوس کر لیتا تھا۔

یہ حالات معلوم کرنے کے بعد ہم بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ ایک رات ڈاکٹر بام برجز کے فلسفیانہ خواب کے سلسلہ میں عجیب بےچینی کے آثار ظاہر ہوئے! اہل جرمنی کی کفایت شعاری کی عادت ڈاکٹر موصوف میں بدرجۂ غایت موجود تھی اور وہ اپنی نیند کا بھی ایک لمحہ ضائع نہ کرتا تھا۔ جبکہ اُسکا جسم خاکی نیند کے آغوش میں استراحت و سکون کرتا تھا، اُسکی دماغی قوت جسم خاکی کے گراں بار تعلقات سے علیحدہ ہو کر برابر کام کرتی رہتی تھی۔ صرف یہی نہیں کہ معمولی آدمیوں کی طرح اُسکی روح بے ٹھور ٹھکانے اور پریشان خواب دیکھا کرتی ہو بلکہ اُسنے بڑی محنت اور دانشمندی کے ساتھ نیند کی حالت میں بھی اپنی روحانی قوت کو کسی خاص مسئلہ کے حل کرنے میں مصروف رکھنے کی طاقت حاصل کر لی تھی۔ سونے سے پہلے روح کے لیے ایک دقیق مسئلہ تجویز کیا جاتا اور تمام شب اُسکی روح فضائے عالم میں مسائل علمیہ کے حل و عقد میں مصروف رہتی اور جب صبح کو پروفیسر بستر استراحت سے تر و تازہ ہو کر اُٹھتا تو اُسکی روح اپنی شب باشی اور محنت کے نتائج کی رپورٹ کیا کرتی۔ حسب معمول آج کی رات علم حرکت اجسام کا ایک دقیق مسئلہ سونے سے پہلے روح کے حوالہ کیا گیا جس کے لیے حرکت جبریہ کی ایک مساوات کا حل لازمی تھا۔ اس نوخفتہ کے دماغ کے سامنے اس وقت ایک ہیبت ناک قطار آثار عجیبہ کی پیش تھی کہ یکایک اس مساوات میں شورش کا ایک عنصر شامل ہوا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اُسکی لیبرٹری واقع برٹش یونیورسٹی معرض خطر میں ہے۔ دریائے رائن سے ایک جہاز نکلا اور لیبرٹری سے ٹکرا گیا! اہل جرمن کی فوجی قوت میں زوال آگیا! غرضکہ ان خیالات نے اُسکی شعاع کی امداد سے اُسے بیدار ہونے پر مائل کیا۔ آخر کار دو بجے کے قریب ڈاکٹر موصوف نیند سے چونک پڑا۔ ایسے ضابطہ آدمی کے لیے یہ بیداری بالکل غیر معمولی تھی۔

بستر پر بیٹھکر سوچنے لگا کہ کیا اسرار ہے۔ سامنے کھڑکی سے ہو کر چاندنی کی روشنی کمرہ میں آرہی تھی مگر کہیں سے کوئی آواز نہ سنائی دیتی تھی! پھر اس شورش کی کیا وجہ؟ اُسکی شخصیت کی شعاع بیچینی سے تھرتھرانے لگی۔ شاید کسی دوردست مصیبت نے اثر کیا ہے۔ یا کسی قریبی آفت کا سامنا ہے۔ اُسے اپنے ملازمین کی طرف سے بالکل اطمینان تھا کیونکہ سب نوکر اپنے ساتھ لایا تھا اور ہر ایک کی شعاع اعلےٰ قسم کی تھی۔ ڈاکٹر بام برجز اُٹھ کھڑا ہوا اور ایک فرغل جسم پر ڈال لیا اور دروازہ کھولا اور ہر چہار طرف دیکھنے لگا۔

بالکل سکوت تھا اور کوئی آواز کان تک نہ پہنچی۔ لیکن ڈاکٹر موصوف کے دل کو اطمینان نہ ہوا۔ آہستہ آہستہ زینہ سے اُترا۔ سامنے کے کمرہ میں جہاں وہ علمی تجربات کیا کرتا تھا کچھ روشنی کی جھلک معلوم ہوئی۔ دروازہ کھولتے ہی حیران ہو گیا۔

کمرہ میں ایک آدمی تھا۔ پستہ قد، خوش رُو، ڈاڑھی ڈاکٹر کی ڈاڑھی سے ایک چوتھائی ہوگی۔ وہ مختلف چھوٹی چھوٹی چیزیں ایک دستی بیگ میں بمصروفیت تمام بھر رہا تھا۔

ڈاکٹر (چلا کر) "ڈونر ویٹر! تم کیا کرتے ہو۔ آلہ کو تباہ کر دو گے"!

اُس نے گلوانک لیمپ کو چور کے ہاتھ سے چھین لیا اور غضبناک ہو کر میز پر رکھدیا پھر دونوں آدمی ایک دوسرے کو خونخوار جانور کی طرح گھورنے لگے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ ایسی حالت میں یہ دونوں لڑنے لگتے۔ پستول چلاتے یا کم از کم الفاظ

ہی کے ذریعہ سے ڈراتے دھمکاتے مگر ڈاکٹر چور کی طرف اس قدر حیرت زدگی کے ساتھ دیکھ رہا تھا کہ چور گھبرا اُٹھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکٹر کی نگاہ اُسکے جسم کے پار کسی چیز پر جمی ہوئی ہو۔ اُس نے گھوم کر دیکھا مگر کچھ نظر نہ آیا۔ آخرکار ڈاکٹر چلایا " آہا! کیسی چت کبری شعاع ہی! میں نے ایسی شعاع پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ تم نہایت دلچسپ آدمی ہو"

نقب زن نے جھک کر فرشی سلام ادا کیا۔

ڈاکٹر (مزا لیکر) "نیلا اور پیلا! سبز اور ارغوانی! سب رنگ ایک ساتھ نظر آتے ہیں۔ بھورے رنگ کا بھی ایک ٹکڑا ہی مگر اس قدر بڑا نہیں جتنا ایک چور کی شعاع میں ہونا چاہیے۔ تم تو بالکل قوس قزح ہو! تم جیسا آدمی میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ تمھارے متعلق میں مزید حالات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ وہاں بیٹھ جاؤ" ایک بڑی آرام کرسی کی طرف اشارہ کرکے کہا اور جلدی جلدی بیگ سے چیزیں نکالنا شروع کیں۔

چور۔ "کس لیے بیٹھ جاؤں"

ڈاکٹر۔ "میں اپنے دولابۂ راستی کش کے ذریعہ سے تمھاری شخصیت کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔ تم بڑے دلچسپ آدمی ہو۔ اور اپنی جدید فہرست تجربات میں تمھارا حال پورے ایک صفحہ پر درج کروں گا"

چور۔ "معائنہ کرنے کے بعد کیا کروگے"

ڈاکٹر۔ "آرے۔ میں تو بھول ہی گیا تھا کہ تم چور ہو معائنہ کرنے کے بعد میں تمھیں پولیس کے حوالہ کروں گا۔ پولیس بڑی خوشی سے تمھیں حراست میں لیگی"

چور (لجاجت سے) "اگر میں آپ کو اپنا معائنہ کرنے دوں اور اس طرح آپ کی فہرست کی تیاری میں مدد ہوں۔ کیا آپ خیال نہین کرتے کہ ایسی حالت میں پولیس کے حوالہ کرنا سراسر ناشکرگذاری ہوگی"

ڈاکٹر (ہاتھ مل کر) "آہا! یہ نیلا رنگ بول رہا ہی! خیر۔ نہیں۔ میں تمھیں پولیس کے سپرد نہ کرونگا۔ مجھے پولیس یا اُسکی کارروائیوں سے بالکل نسبت نہین ہی۔ بس اب بیٹھ جاؤ" اُس نے زبردستی چور کو کرسی پر بٹھا دیا اور اپنا دولابہ ٹھیک جمانا شروع کیا اور گنگنا کر کہنے لگا۔ "آہا! کیا عجیب روشنی ہی! ایسی رنگ برنگی شعاع میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ میں چاہتا ہوں کہ شعاعوں کی تبدیلیاں دیکھنے کے لیے تمھیں ہر وقت اپنے ساتھ رکھوں دیکھو۔ میں تمھارا چور ہونا دل سے بھلا دونگا۔ تمھاری بھوری شعاع چنداں بین نہیں ہی۔ اور تمھیں ملازم رکھ لونگا۔ میں تمھیں دس روپیہ فی ہفتہ علاوہ خوراک اور مکان کے دیا کرونگا اور ہاں! بڑی نفیس وردی بھی بنوا دونگا"

چور نے سر ہلایا۔

ڈاکٹر (جوش میں آکر) "اچھا دس نہیں تو پندرہ سہی۔ یعنی پندرہ فی ہفتہ یا دن، کل سات سو اسی روپیہ سالانہ ہوے۔ پاک کمائی سے۔ اور وردی اور خوراک علاوہ۔ سب مل کر ۷۰ روپیہ ماہوار کے قریب ہوگا۔ موجودہ حالت میں تو تمھیں ستر روپیہ سال بھر میں بھی نقب زنی سے نہ ملتے ہونگے"

چور نے فوراً جواب دیا "نہیں میری آمدنی اس سے زیادہ ہے"

ڈاکٹر (تحیر سے) "مجھے تمھاری بات کا بالکل یقین نہیں۔ میں ایک منٹ میں یہ ثابت کر سکتا ہوں۔ تمام دنیا میں صرف میں ہی ایک شخص ہوں جسے تم دھوکا نہیں دے سکتے۔ اچھا آؤ آزمایش کریں۔ برقی قوت کا سلسلہ قائم کرنا چاہیے۔ اب ذرا اپنا ہاتھ اس جست کے ٹکڑے پر رکھو۔ یوں۔ دوسرا ہاتھ کاربن پر۔ اس طرح۔ اب برقی سلسلہ ٹھیک ہو گیا ہی۔ اب میں اپنے لیمپ کو اس طرح رکھتا ہوں کہ اُسکی روشنی اُس پردے پر پڑے جو تمھارے پیچھے ہی اور اُس پر ناپنے کے لیے نشان بنے ہیں۔ دیکھو اس پردے پر پوینٹ کے جاننے کے نشان بنے ہیں۔ اچھا دوست! اب میں تمھاری آمدنی معلوم کرونگا ستر روپیہ ماہوار کا لینا آسان نہیں ہی۔ اب میں تمھیں متحیر کروں گا۔ سنو۔ میں سوال کرتا جاؤنگا۔ تم کچھ جواب نہ دینا بلکہ لیمپ کی لَو پردے پر بتادیگی تمھاری شخصیت کے ذریعہ سے یہ لَو کام کریگی۔ سچ بات معلوم ہو جائیگی۔ اب تم ڈاکٹر بام برجز پروفیسر برٹش یونیورسٹی سے کچھ نہ چھپا سکوگے"

"آہا۔ اب میں اپنے فرض کو گھٹانا شروع کرتا ہوں۔ اور دولابہ سے

سوال کرتا ہوں کہ پچھلے سال چوری کے علاوہ تمھاری آمدنی کتنی تھی"

قرص نے آہستہ آہستہ گھومنا شروع کیا اور چراغ کی لو جوں جوں ہندسے سامنے آتے گئے اُچکنے لگی۔ اکائی کے بعد دہائیاں ختم ہوئیں پھر سیکڑے بھی۔ ہزاروں کے ہندسے آنے لگے مگر قرص برابر گھومتا رہا۔

اب تو ڈاکٹر بیتاب ہو کر چلایا "ہائے ہائے!! سلسلۂ برقی میں کچھ خرابی معلوم ہوتی ہے" اُسنے چور کے پاس جاکر دیکھا تو دونوں ہاتھ پلیٹوں پر رکھے تھے۔ پھر تاروں کا بغور معائنہ کیا مگر وہاں بھی کوئی خرابی نہ پائی سب چیزیں ٹھیک تھیں۔ پھر قرص کی طرف دیکھا تو تیس ہزار کے بعد تیس ہزار کی رقم گذری۔ مگر قرص برابر گھوم رہا تھا..... اب لو زیادہ متحرک ہونے لگی۔ چالیس ہزار پینتالیس ہزار پچاس ہزار۔ لو آٹھ انچ تک اُچکی اور قرص کا گھومنا بند ہوگیا۔

ڈاکٹر (حیرت میں آکر) "پچاس ہزار پونڈ پاک کمائی سے! اے خدا! لیکن یہ ناممکن ہے۔ کہیں میرا دولابہ راستی کش تو نہیں بگڑ گیا؟ آج سے پہلے کبھی اس نے جھوٹ نہیں بتلایا"

ڈاکٹر بڑی پریشانی کے ساتھ کمرہ میں ٹہلنے لگا۔ کبھی ڈاڑھی کھینچی کبھی سر کے بال نوچنے لگا۔ "ہائے! میں تو جمعہ کے دن رائل سوسائٹی کے سامنے اپنے آلہ کے کمالات دکھانیوالا ہوں۔ میری شہرت خاک میں ملجائیگی۔ اے خدا کیا کروں"

ڈاکٹر کی مایوسی اور بے چینی کا اثر چور پر بھی ہوا اور وہ کہنے لگا "جناب والا۔ آپ کو اپنے دولابہ کی صحت پر شبہہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اسکا بیان بالکل درست ہے۔ مجھے خود حیرت ہے۔ ہر ایک انکم ٹکس کے دفتر میں تشخیص ٹکس کے لیے یہ آلہ رہنا چاہیے۔ پچھلے سال میری آمدنی کی ٹھیک یہی مقدار تھی"

ڈاکٹر (طنز کے ساتھ) "کیا خوب! تو میں شاید شاہزادہ مانٹ کرسٹو سے باتیں کرنے کی عزت حاصل کر رہا ہوں"

چور (بے تکلفی سے) "نہیں۔ آپ پھر اپنے آلہ سے مدد لیجیے اور میرا رتبہ معلوم کیجیے۔ آپ کے لیے یہ بالکل آسان ہے"

ڈاکٹر "ہاں ٹھیک کہتے ہو۔ میں ایک مرتبہ اور اپنے دولابۂ راستی کش کا تجربہ کروں گا۔ اگر یہ اُسکا آخری جواب حیرت میں ڈالنے والا تھا تو میں اپنے دولابہ کا اعتبار کرنا چھوڑ دونگا۔ صاف معلوم ہو جائیگا۔ ایک مرتبہ غلطی کرنا ممکن ہے۔ بار بار نہیں ہو سکتی"

"پیشہ معلوم کرنے کی قرص کہاں ہے"

ڈاکٹر نے پہلی قرص نکال کر اس قرص کو اُسکی جگہ جمایا۔ اسپر سو سے زیادہ پیشوں کے نام بادشاہ سے لیکر حلال خور تک لکھے ہوے تھے۔

ڈاکٹر (منھ بسور کر) "اچھا اب برقی سلسلہ پھر قائم کرلو۔ سنو۔ میں سوال کرتا ہوں کہ تمھارا پیشہ جس کے ذریعہ سے تم ستر روپیہ سے زیادہ کماتے ہو۔ کیا ہے؟ بتلاؤ"

قرص آہستہ آہستہ گھومنے لگا اور چراغ کی لو ٹمٹمانے لگی۔ حلال خور کا نشان گزر گیا اور لو نہ اُٹھی۔ جہاز رانی پر لو تین انچ اونچی اُٹھی کیونکہ کسی زمانہ میں چور بحری فوج میں ملازم رہ چکا تھا۔ اسکے بعد قرص بدستور گھومتا رہا جب امراء کا طبقہ نزدیک آیا تو ڈاکٹر چلایا "اے غضب" ہائے میں کس طرح رائل سوسائٹی کو منھ دکھا سکوں گا۔ میرا دولابۂ راستی کش بڑا دعوے باز اور جھوٹا نکلا۔ ہائے ہائے۔ ارے باپ رے"۔ جس وقت امیرزادوں کا نشان سامنے آیا چراغ کی لو پھر اونچی اُٹھی اور قرص گھومنا بند ہوگیا۔

ڈاکٹر دھم سے کرسی پر گر پڑا۔ پسینہ کے بڑے بڑے قطرے پیشانی پر نمودار ہوے اور کہنے لگا "بڑے غضب کی بات ہے! رات کے وقت ایک نقب زن میرے گھر میں گھسا ہے لیکن میرا دولابۂ راستی کش کہتا ہے کہ یہ چور نہیں بلکہ امیرزادہ ہے جسکی سالانہ آمدنی پچاس ہزار پونڈ ہے"

چور کی طبیعت بڑی ہمدردانہ واقع ہوئی تھی اُسکی شعاع میں لطف وعنایت کے رنگ نے امتیازی درجہ پایا تھا۔ ڈاکٹر کی مایوسی اور پریشانی کو

دیکھکر فوراً تسلی تشفی کرنے لگا۔

چور۔ "آپ ہرگز اپنے آلہ کی صحت پر شک نہ کیجیے۔ میرے نزدیک تو یہ صحت کا پتلا ہے۔ اس مرتبہ پھر اس نے بالکل صحیح بات بتائی۔ اتفاق سے میں امیر زادہ ہوں۔"

ڈاکٹر نے نظر اُٹھا کے دیکھا تو کوئی خاص علامت امارت کی نظر نہ آئی پھر غور سے اُسکی شعاع پر دوبارہ توجہ کی۔ اطمینان نہ ہوا۔ سر ہلا کر کہنے لگا "تم امیرزادے نہیں ہو، کیونکہ اُمراء دو بجے رات کو لوگوں کے گھر میں گھس کر چوری نہیں کیا کرتے۔ پچاس ہزار آمدنی اور یہ حرکت! میرے دولابۂ راستی کش نے ضرور غلطی کی ہے۔"

چور۔ "جناب پروفیسر صاحب! آپ کی سمجھ کی خوبی ہے جو آپ آلہ کی صحت پر شک کرتے ہیں۔ شاید آپ کا دماغ مرکز ثقل سے ہٹ گیا ہے۔"

دماغی صحت کا اشارہ پاکر ڈاکٹر نے ایک دفعہ پھر غور سے دیکھا اور یکایک اُسکا چہرہ جگمگا اُٹھا۔ اور جوش کے ساتھ کہنے لگا "اخاہ! میں سمجھا۔ میں نے اسکا تجربہ پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔"

اپنی جگہ سے اُٹھا اور چور کی پیشانی پر ہاتھ پھیر کے نہایت نرمی سے بولا "کیوں بھئی! سچ کہنا۔ کبھی تمنے یہاں درد محسوس کیا ہے؟"

چور۔ "جی ہاں کبھی کبھی رات بھر گھومنے کے بعد۔"

ڈاکٹر۔ "میرا خیال صحیح ہے۔ بالکل یہی بات ہے۔ تم اس بات کا یقین رکھتے ہو کہ تم امیرزادے ہو اور تمھاری آمدنی پچاس ہزار پونڈ ہے؟ میرا دولابۂ راستی کش بالکل صحیح کہتا ہے!"

چور۔ "مجھے بہت خوشی ہوئی کہ آپ اس نتیجہ پر پہنچ گئے۔ اب اجازت ہو تو میں رخصت ہوں۔"

ڈاکٹر۔ "ہاں۔ بہت اچھا۔ میں تمھیں روکنا نہیں چاہتا۔ لیکن تمھارے ساتھ کسی آدمی کا جانا ضروری ہے جو بحفاظت تمام تمھیں تمھارے محل اور خزانہ تک پہنچا دے۔ کہو کسے بلاؤں؟"

چور۔ "تسلیم۔ بڑی مہربانی۔ میں رستہ جانتا ہوں اور خود بآسانی چلا جاؤں گا۔"

ڈاکٹر۔ "جی ہاں۔ ضرور۔ ضرور۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ مگر آپ جیسے امیرزادہ کا لندن کی گلیوں میں تن تنہا پھرنا خطرہ سے خالی نہیں۔ بہت سرا کے لیے کسی کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔ کیسی بھیانک اندھیری رات ہے! ایک لمحہ کی اجازت دیجیے۔"

یہ کہکر ڈاکٹر نے جلد جلد ٹیلیفون کی کتاب کی ورق گردانی کی۔ پھر ٹیلیفون میں بات کرنے لگا "پینتیس۔ چھتیس۔ نمبر چھتیس؟ یہاں سر ولیم تو نہیں ہیں ...... ہاں اس وقت نہ ہوں گے ... میں ڈاکٹر بام برجر ہوں جس نے کل اپنے دولابۂ راستی کش کے عجائبات دکھائے تھے۔ ... ہاں۔ اچھا۔ میرے یہاں ایک ناخواندہ مہمان آگیا ہے۔ میں اُسے معمولی چور سمجھتا ہوں مگر وہ اپنے آپ کو امیرزادہ اور پچاس ہزار پونڈ سالانہ کا دولتمند سمجھتا ہے۔ ..... سمجھے اسکا مطلب۔ ..... اچھا آپ آکر اُسے اُسکے گھر پہنچا دیجیے .... یہاں اور کوئی نہیں ہے۔"

ڈاکٹر موصوف مکالمۂ برقی کی جانب اس قدر مصروف تھے کہ اپنے مہمان چور کا دھیان نہ رہا۔ چور نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز سے ڈاکٹر اُس طرف متوجہ ہوا۔ فوراً ٹیلیفون ہاتھ سے پھینک کر چور کے پیچھے دوڑا۔ چور کو اتنی مہلت نہ ملی کہ زینہ کی طرف جاتا۔ جلدی سے سامنے کے کمرہ میں گھس کر اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ کمرے کے دوسری طرف کھڑکی کھولی تو حسن اتفاق سے پانی کا نل ملا جسے پکڑ کر نہایت پھرتی سے نیچے پھسلنا شروع کیا۔ بحری فوج کی ملازمت کی وجہ سے ایسے کاموں میں بڑا مشاق تھا۔ لیکن چور نے بجائے زمین پر اُترنے کے اپنے آپ کو ڈاکٹر کی گود میں پایا۔ جرمن قوم کی دوراندیشی کے خیال سے وہ پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ چور کھڑکی کے راستہ بھاگنے کی کوشش کریگا اور اس لیے زینہ کے راستہ سے ڈاکٹر وہاں پہلے سے پہنچ گیا تھا۔

ڈاکٹر (بلا اظہار ناراضی) "اس کرسی پر تشریف رکھیے - تھوڑی دیر میں ایک صاحب آئیں گے اور آپ کو بحفاظت تمام گھر پہنچا دینگے۔"

چور (غصہ سے) "مجھے کسی کی خبرگیری کی ضرورت نہیں ہے۔"

ڈاکٹر "بے شک نہیں ہے۔ اب میں مکالمہ ختم کروں - نمبر پینتیس نمبر چھتیس .... کوئی ہے .... میں ڈاکٹر بم برجز ہوں .... پانچ منٹ پہلے میں ہی باتیں کر رہا تھا .... بہتر ہے۔ کیا نام بتایا انسپکٹر مارول .... بہت خوب .... آئیے۔"

چور - (کھڑا ہو کر) "دیکھیے پروفیسر صاحب! آپ نے مجھ سے کیا وعدہ فرمایا تھا؟ پھر پولیس سے باتیں کرنے کے کیا معنی؟ میں آپ کو معزز اور شریف سمجھتا تھا۔"

ڈاکٹر "تم میری شرافت کے متعلق اپنا خیال نہ بدلو - میں تمہیں چور کی حیثیت سے پولیس کے حوالہ نہیں کرتا - صرف یہ چاہتا ہوں کہ پولیس تمہیں بحفاظت گھر پہنچا دے - آدھ گھنٹہ بعد تم اپنے محل میں اپنا خزانہ شمار کرنے لگوگے! جب تک پولیس افسر آئے خاموش بیٹھے رہو۔"

اسوقت ایک موٹر کار آئی اور پروفیسر کے دروازہ پر رکی - ڈاکٹر نے کھڑکی کھول کر پوچھا "کیا انسپکٹر مارول آ پہنچے؟"

"جی ہاں - میں حاضر ہوں۔"

ڈاکٹر - افسوس ہے میں اپنے معزز مہمان کو چھوڑ کر کواڑ کھولنے کیلئے خود نیچے نہیں آسکتا - مگر آپ ٹوٹے ہوئے شیشہ میں ہاتھ ڈال کے دروازہ کھول لیں اور یہاں آجائیں۔"

تین منٹ کے بعد لندن کا مشہور سراغ رساں انسپکٹر مارول کمرہ میں آ پہنچا۔

ڈاکٹر "انسپکٹر صاحب! میں نے بہت بیوقت آپ کو تکلیف دی۔ میرے یہاں اسوقت ایک عجیب غریب مہمان آیا ہے (چور کی طرف اشارہ کرکے) یہ صاحب اپنے آپ کو امیرزادہ کہتے ہیں اور پچاس ہزار پونڈ آمدنی بتلاتے ہیں"

پھر چپکے سے انسپکٹر مارول کے کان میں ڈاکٹر نے یہ بھی کہا کہ "یہ شخص پاگل ہے۔"

انسپکٹر مارول نے ڈاکٹر کی رائے سے اتفاق نہ کیا - چور کے پاس آکر کچھ دیر گھورتا رہا اور کہنے لگا کیا تم نقب زنوں کی کلب کے ممبر ہو؟"

چور "جی نہیں - میں اس عزت کا مستحق نہیں ہوں۔"

انسپکٹر "تو شاید آج رات کی کامیابی پر ممبر بنائے جاتے؟"

چور خاموش ہو رہا کچھ جواب نہ دیا -

انسپکٹر (فخریہ لہجہ میں) "میرا خیال صحیح نکلا!" (ڈاکٹر سے خطاب کرکے) آپ کے معزز مہمان نقب زنوں کی کلب سے تعلق رکھتے ہیں - کیا آپ نے ان حضرات کا حال اخبار ٹکلر میں نہیں پڑھا؟"

ڈاکٹر "میں ٹکلر نہیں پڑھتا - میں تو صرف علمی اخبارات دیکھتا ہوں - ان میں ان لوگوں کا کچھ تذکرہ نہ تھا۔"

انسپکٹر - بے شک علمی رسالوں میں یہ باتیں کہاں - یہاں بہت سے امیرزادے محض تفنن طبع کی غرض سے چوری اور نقب زنی کرتے ہیں۔"

ڈاکٹر "کیا میرے مہمان کی طرح یہ سب لوگ پاگل ہیں؟"

انسپکٹر "جی نہیں - آپ کی اور میری طرح بالکل باحواس اور صحیح الدماغ - ہم عرصہ سے انکی تلاش میں حیران و سرگرداں ہیں - شکر ہے کہ آج آپ کی عنایت کی بدولت یہ امیرزادہ ہمارے ہتھے چڑھا ہے - اب سب راز افشا ہو جائیگا - اگرچہ میں ان صاحب کو نہیں پہچانتا لیکن انکی شناخت بالکل آسان ہے - ڈاکٹر صاحب! میں اپنے تمام محکمہ کی جانب سے آپکا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس سنگین جرائم پیشہ حضرات کا غول توڑنے میں بیش قیمتی مدد دی ہے (چور سے مخاطب ہو کر) "مائی لارڈ! تشریف لے چلیے۔"

مگر چور اپنی جگہ سے نہ ہلا -

چور "ڈاکٹر بم برجز! میں آپ کو جنٹلمین سمجھتا ہوں اور آپکے وعدہ پر بھروسہ کرکے امید کرتا ہوں کہ آپ مجھے ہرگز پولیس کے حوالہ نہ کریں گے -

آپ نے صاف الفاظ میں مجھ سے وعدہ کیا ہے۔ اور میں نے دولابُراستی کش کے تجربہ میں امداد دیکر آپ کو آپکی عنایت کا مستحق بنالیا ہے"۔

ڈاکٹر (انسپکٹر بارول سے) "یہ بالکل صحیح ہے۔ بےشک میں نے وعدہ کیا ہے۔ اور بحیثیت ایک جرمن جنٹلمین کے ایفاے وعدہ مجھپر فرض ہے"۔

انسپکٹر۔ "آپ نے ایسے بیوقت مجھے اپنے مہمان کی خبرگیری کے لیے بُلایا تھا۔ اور میں اس خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ اور آپ کے معزز مہمان کو یہاں سے لیے جاتا ہوں" (چور کے شانہ پر ہاتھ رکھکر) "مائی لارڈ! بس اب تامل نہ کیجیے اور میرے ساتھ چلیے۔ موٹر کار حاضر ہے"۔

چور (غصہ سے) "میں تمھارے ساتھ کیوں چلنے لگا۔ خبردار مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ کیا تمھارے پاس میری گرفتاری کا کوئی وارنٹ ہے۔ کیا مین نے کوئی جرم کیا ہے۔ کیا کسی کی کوئی چیز چُرائی ہے۔ پھر کیوں جاؤں؟ ڈاکٹر صاحب! آپ مجھپر کوئی الزام تو نہیں لگاتے؟"

ڈاکٹر۔ "ہرگز نہیں! میں نے پولیس کو صرف اسلیے بُلایا تھا کہ مین آپ کو پاگل سمجھا تھا۔ اپنے دولابُراستی کش پر شک کرنے کا یہ خوب معاوضہ ملا۔ جناب انسپکٹر صاحب! میں اس جنٹلمین سے وعدہ کرچکا ہوں۔ یہ اگرچہ میرے ہاں اپنی خوشی سے آئے تاہم انھیں میں اپنا معزز مہمان سمجھتا ہوں"۔

انسپکٹر (جوش کے ساتھ) ڈاکٹر بم برجز! آپ اس معاملہ کی سنجیدگی کو نہیں سمجھتے۔ گذشتہ بارہ مہینہ سے ہم اس کلب کے ممبروں کی تلاش میں ہیں۔ آج نہایت عمدہ سُراغ ملا ہے۔ دو مرتبہ ہمنے ان کے ممبر کو پکڑتے پکڑتے چھوڑ دیا۔ ایک بار تو آپ ہی کے ایک ہم وطن کی اسی قسم کی ضد کی بدولت اب اسکا اعادہ نہیں ہوسکتا۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس امیرزادے کو آپ ملزم قرار دیکر قانون و امن عامہ کی امداد فرمائیے"۔

ڈاکٹر۔ مسٹر انسپکٹر! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو مرہون منت نہیں کرسکتا۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ آپ قاعدے قانون کے جانب دار ہیں اور یہ امیرزادہ نقض امن کا میری وجہ سے آج جو تکلیف آپ کو برداشت کرنا پڑی اُسکا مجھے سخت افسوس ہے لیکن میں کسی شخص کے ساتھ، خواہ وہ امیرزادہ نقض امن ہی کیوں نہو، وعدہ خلافی نہیں کرسکتا۔ مجھے آج تک کسی ایسے شخص سے سابقہ نہیں پڑا۔ یہ جنس صرف انگلستان ہی میں پائی جاتی ہے۔ میں برلن یونیورسٹی کے علما سے اسکا تذکرہ کرونگا اور غالباً وہ اس عجیب و غریب جنس کے حالات کا مطالعہ کرنا سبق آموز خیال کرینگے۔ زمانۂ حال کی ترقی کا یہ عجیب نتیجہ ہے۔ اور پروفیسر لمبرسو جو ماہر علم جرائم ہیں اسے معلوم کرکے بہت خوش ہونگے۔ مگر یہ جملہ معترضہ تھا۔ کیا میں آپ کی خدمت میں سگار اور جرمن ساز شراب پیش کرسکتا ہوں۔ موسلے اور ہوک کی ہیم کی بنی ہوئی نہایت خوش رنگ خوش ذائقہ شرابیں میرے ساتھ ہیں"۔

انسپکٹر بارول مارے غصہ کے کانپ رہا تھا اور برا بھلا کہنا چاہتا تھا مگر پی گیا۔ "ڈاکٹر صاحب آپ نے ...... بہت بہتر۔ میں صبح کو سرولیم سے تمام واقعہ بیان کرونگا۔ اب میں آپ کو اور آپ کے مہمان کو خدا حافظ کہتا ہوں"۔

انسپکٹر نے ڈاکٹر کی تواضع کا شکریہ بھی ادا نہ کیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

چور۔ "مجھے نہایت افسوس ہے کہ آپکو اس قدر تکلیف و زحمت اُٹھانی پڑی"۔

ڈاکٹر (غصہ سے۔ بات کاٹ کر) "بےشک تمھیں افسوس کرنا چاہیے۔ میں تم جیسے انگریزی امیرزادوں کی حرکات بالکل نہیں سمجھ سکتا، لیکن انسپکٹر بارول کی بات خوب سمجھتا ہوں۔ تمنے اُسکا آخری فقرہ سُنا؟ مجھے کامل اُمید تھی کہ لندن کی پولیس میرا دولابُراستی کش اپنے محکمہ میں جاری کریگی اب سرولیم خفا ہوجائینگے اور ایسا نہ کرینگے۔ اُمید ہے کہ تم اپنی رات کی کارگذاری پر مطمئن ہو۔ کیا تم اسے تفننِ طبع کہتے ہو؟"

ارل ڈونیٹی نے نہایت گرمجوشی اور سادگی سے کہا "ڈاکٹر بام برجز! میں آپ کی فیاضی کا بیحد شکر گذار ہوں۔ سر دست میں اسکی معافی چاہتا

ہوں کہ میں نے آپ کو خواب استراحت سے ناحق بیدار کیا۔ ناحق اس وجہ سے کہ مجھے خود کوئی نفع حاصل نہ ہوا۔ لیکن میں اطمینان دلاتا ہوں کہ آپ کو ایک اناڑی نقب زن سے ایفاے وعدہ کرنے سے جس نقصان عظیم کا خطرہ ہو وہ برداشت نہ کرنا پڑیگا۔ ممکن ہو کہ پولیس کسی قانونی بنا پر مجھے گرفتار کرنے کی فکر میں ہو اس لیے میں آپ سے رخصت چاہتا ہوں انسپکٹر مارول کا شوفر میرے تعاقب کیلیے نیچے موجود ہو۔ میں بیحد ممنون ہونگا اگر آپ مجھے چور دروازہ سے نکلجانے دینگے"

ایک گھنٹہ کے بعد انسپکٹر مارول وارنٹ لیکر لوٹا۔ مگر چور روانہ ہو چکا تھا۔ ارل ڈینٹی کو فیس داخلہ کے حاصل کرنے میں جو ناکامیابی ہوئی اسکی وجہ سے وہ کلب میں داخل نہ ہو سکے۔

ڈاکٹر بام برجر وطن مالوف کو خوش خرم و کامیاب واپس گیا۔ باوجود انسپکٹر مارول کی شکایت کے اسکاٹ لینڈ یارڈ اور رائل سوسائٹی نے ڈاکٹر موصوف کی سرپرستی اختیار کرلی اور اسکے عجیب غریب آلہ کا نفاذ منظور کرلیا۔ اسکے علاوہ اونچی سوسائٹی کے ایسے طبقوں سے ڈاکٹر کو دعوتیں دی گئیں جن کے ہاں پہنچنے کی اسے کبھی امید نہ تھی۔ ان تمام کامیابیوں کو وہ امیرزادہ نقب زن کے اثر پر محمول کرتا تھا۔ جب تک لندن میں رہا ہر جگہ اور ہر وقت دوبارہ ملاقات کا آرزومند رہا۔ مگر اسکی صورت پھر کبھی نظر نہ آئی۔

ڈاکٹر بام برجر نے برٹش یونیورسٹی میں واپس جاکر اپنے تجربات اور انگلستان کے امراء کے اس عجیب و غریب کلب پر نہایت دلچسپ لیکچر دیا۔ جس کا جرمنی میں مدتوں چرچا رہا اور ڈاکٹر اسے ہمیشہ یہ الفاظ کہہ کر یاد کیا کرتا ہے:۔

"اسکی شعاع کیسی چت کبری تھی"

(مترجمہ) **ظفر عمر**

تدبیر الدولہ سیّد مظفر علیخاں آسیر لکھنوی

مشہور قصبہ امیٹھی میں جو لکھنؤ سے چند کوس کے فاصلہ پر ہے آسیر کی ولادت ہوئی۔ لیکن بہت ہی صغرسنی میں وہ لکھنؤ چلے آئے اس لیے کہ اُن کے آبا و اجداد کا مسکن و ماویٰ لکھنؤ ہی تھا۔ آسیر کے والد ماجد اور دادا دربار شاہی سے تعلق رکھتے تھے۔ آسیر کے والد میر مدد علی صاحب علامۃ العصر تھے اور دادا بھی، اور وہی فضائل خاندانی آسیر میں موجود تھے آسیر عنفوان شباب ہی سے شاہی ملازمت میں داخل ہوے۔ انکے لیے شاہی ملازمت کوئی اہم کام نہ تھا اگر ان میں علمی قابلیت اعلیٰ درجہ کی نہ ہوتی تو بھی یہ عمدہ نوکری پا سکتے تھے لیکن چونکہ یہ خود عربی فارسی میں خاص امتیاز و تبحر رکھتے تھے لہذا نہایت اعزاز و وقار سے انکا تعلق دربار سے ہوا۔

آسیر نے اپنے والد میر مدد علی صاحب المتخلص بہ مائل سے اتنی قابلیت حاصل کی کہ خود دوسرے طلباء کو پڑھانے لگے اور انکی استادانہ قابلیت کو لوگ ماننے لگے۔ شاعری میں شاعرانہ شان پیدا ہوئی۔ آسیر نے اپنے والد مغفور کے سوا اپنے چچا میر سید علی صاحب سے بھی متواتر چار سال تک تعلیم حاصل کی۔ میر سیّد علیصاحب صرف و نحو، حکمت، منطق، حدیث وغیرہ میں خاص قابلیت رکھتے تھے۔ آسیر نے مولانا مرزا کاظم علی صاحب سے بھی استفادہ علم کیا، حدیقہ حکیم ثنائی انھیں سے پڑھا۔ مرزا صاحب بڑے متقی عالم تھے۔

جب واجد علیشاہ تخت نشین ہوے تو امین الدولہ وزیر ہوے - چونکہ وزیر موصوف اسیر کے خاص عنایت فرماتے تھے لہذا انکو میر منشی کا عہدہ دیا -

اتفاقاً ایک روز ایک شاہی خواص آیا اور اسیر کو دیوان خاص میں بلا لیگیا یہاں حضرت واجد علیشاہ رونق بخش سریر تھے - اسیر کو نہایت امتیازی حالت سے پاس بٹھایا اور ایک کتاب جو گل انتخاب تھی نظم کے لیے دی حضرت واجد علیشاہ اس نظم کو سنکر بہت محظوظ ہوے اور عزت افزائی کی - تدبیر الدولہ مدبر الملک بہادر جنگ کا خطاب عطا ہوا اور اصلاح سخن کا اعزاز بھی مرحمت ہوا حقیقت یہ ہی کہ بادشاہ اسیر پر خاص خسروانہ نوازش فرماتے تھے - اسیر کو بھی بادشاہ کے مزاج میں دخل تھا اور مفید مشورہ دیا کرتے تھے - اُن کا مزاج صرف مصاحبانہ تھا اسلیے کہ اکثر مصاحب صرف زرکشی اور ہاں میں ہاں ملانے والے ہوا کرتے ہیں مگر اسیر اپنے علم و فضل اور متقی و متشرع ہونے کے سبب سے حکیمانہ اور مدبرانہ اوصاف رکھتے تھے - چنانچہ جب امین الدولہ کی وزارت کو واجد علیشاہ نے تبدیل کیا اور اُنکی جگہ علی نقی خاں وزیر مقرر ہوے تو یہ بات اسیر کو ناگوار ہوئی اور اُنھوں نے کنایۃً اور کسی وقت صریحاً اپنے خیالات کا اظہار کیا - اسیر کی ہوشیاری اور مدبری سے علی نقی خاں بھی کھٹکتے تھے اور انکو سابق وزیر کا دوست سمجھکر علی نقی خاں نے ان سے اچھا برتاؤ نہیں کیا - حتیٰ کہ اسیر کچھ روز علی نقی خاں کی عنایت سے قید بھی رہے - الغرض علی نقی خاں کی وزارت کا جو انجام ہوا ظاہر ہی - جب واجد علیشاہ تخت اودھ سے معزول ہو کر کلکتہ روانہ ہونے لگے تو اسیر ان کے ساتھ کلکتہ اس وجہ سے نہیں گئے کہ بادشاہ نے انکی فہمایش پر عمل نہیں کیا - چنانچہ واجد علی شاہ نے اپنی ایک تحریر میں چند فقرات اسیر کے متعلق لکھے ہیں جن سے بادشاہ کی آزردگی خاطر اور نیز اُس دلی تعلق کا جو انکو اسیر سے تھا پتہ چلتا ہی :-

تدبیر الدولہ منشی مظفر علیخاں صاحب بہادر جنگ اسیر نوجوانی میں راقم (واجد علی شاہ) کا ہم پیالہ و ہم نوالہ رہا - اسکے باپ دادا میرے دربار کے قدیم نمکخوار رہے - اسیر میرا مصاحب اور دارو غہ کل تھا - لیکن جب میں لکھنؤ سے کلکتہ چلا تو یہ گھر میں جا چھپا اور مجھے چھوڑ کر نواب رامپور کو اپنا بادشاہ بنا لیا ....

ناظرین اس تحریر کے رنگ سے بادشاہ کے اندرونی جذبات کا اندازہ فرما سکتے ہیں -

جس زمانہ میں نواب محمد سعید خاں والی رامپور رونق فزاے لکھنؤ ہوے تھے آپ نے اسیر کو اپنے صاحبزادوں کی تعلیم کے واسطے منتخب فرمایا پھر نواب یوسف علی خاں خلد آشیاں کے عہد میں گھر بیٹھے وظیفہ خوار رہے - نواب کلب علی خاں بہادر نے جب منتخب روزگار شعرا کو یکجا کیا تو حضرت اسیر کو بھی بیش قرار تنخواہ پر طلب کیا -

اسیر محض غزل گو شاعر نہ تھے بلکہ ایک جید مصنف اور اصناف سخن پر قادر تھے - اُردو کے چھ دیوان علاوہ دیگر مصنفات فارسی و عربی کے ہیں - عروض دانی میں اسیر کو خاص دستگاہ حاصل تھی - اُردو فارسی کے علاوہ عربی میں بھی شاعری کی قابلیت موجود تھی - ان کا فارسی کلام بھی بہت صاف اور بامزہ ہی - گلشن تعشق (دیوان فارسی) اور ذوالسانین (قصائد مدحیہ نوابان رامپور) قابل دید و داد ہیں مصحفی کے شاگردوں میں اسیر و آتش خاص شہرت رکھتے ہیں -

اسیر کی پرگوئی یہاں تک مشہور ہی کہ انھوں نے بہتوں کو صاحب دیوان بنا دیا - اصلاح دینے میں جو مہارت انکو تھی وہ بہت کم اساتذہ میں سُنی گئی ہی - لیکن اس بات کا ضرور افسوس ہی کہ اسیر کے دیوان مطبوعہ بھی کمیاب ہیں - اسکا بڑا سبب یہ معلوم ہوتا ہی کہ متعدد دیوانوں کا چھاپنا اہل مطابع اہم کام جانتے ہیں - لیکن تاہم یہ شکایت اسیر کے بعض شاگردوں کو دُور کرنا تھی - انکا فرض تھا کہ انکے دیوان مطبوعہ فراہم کریں اور مناسب ہو تو اُنکا منتخب کلام جو ایک دو بڑے سے بڑے دیوانوں کے برابر ہوگا چھپوا دیں تاکہ شائقین کلام اسیر کا شوق پورا ہو - مین نے بعض شائقین کو اسیر کے دیوانوں کا متلاشی پایا -

لیکن بازار میں نہ ملنے سے انکو مایوسی ہوئی۔ جن لوگوں نے اسیر کے کلام کو توجہ اور غور سے دیکھا ہی وہ اس بات کو جانتے ہیں کہ اسیر کے یہاں ہر قسم اور ہر رنگ کا کلام موجود ہی۔

اسیر کے شاگرد بہت ہیں اور ان کے بعض تلامذہ خاص اُستادانہ قابلیت رکھتے ہیں۔ امیر مینائی، ماہر لکھنوی، شوق قدوائی، ظہور لکھنوی، یوسف لکھنوی، احمد، ریاض، سرشار، ابر، صفدر، وغیرہ اُستادانہ قابلیت کے لوگ ہیں۔ اسیر کی طبیعت بہت مرنجان مرنج تھی۔ انسے کبھی کسی سے مباحثہ اور معارضہ نہیں ہوا۔ دوسرے اُستادان فن غالب وغیرہ بھی اسیر سے معاصرانہ برتاؤ کرتے تھے۔

بعض خاص مشاعروں میں جب اسیر اپنی غزل پڑھتے تھے تو ان کے دو چار شعر ایسی اُستادانہ قابلیت کے ہوتے تھے کہ اہل مشاعرہ کو ان کے کمال کا معترف ہونا پڑتا تھا۔ بعض مشاعروں میں لوگوں نے اسیر کو فرط جوش ومسرت میں اُٹھا اُٹھا لیا ہی۔

اسیر کی وضع وتہذیب قدیم طرز کے بزرگوں کی تھی۔ مخملی گھیتلا، لمبا کرتہ، گول ٹوپی۔ وہ زیادہ تر فنس ہی پر سوار ہوتے تھے۔

اسیر سنہ ۱۲۲۹ھ میں پیدا ہوے اور سنہ ۱۲۹۹ھ میں انتقال کیا۔ انکی قبر انکے مکان کے قریب خاندانی مقبرہ میں ہی۔

اسیر کی شاعری

جو کم مایہ شاعر سطحی شاعری میں کچھ معمولی شوخیاں پیدا کرلینے کا مذاق و مہارت رکھتے ہیں وہ شاعری کی منتہاے فصاحت وبلاغت اور معنی آفرینی کو ناپسند کرتے ہیں اور نہ یہ کڑی منزل ان سے طے ہوسکتی ہی۔ اسلیے کہ یہ منزل وہی طے کرسکتا ہی جس نے تحصیل علوم کے ساتھ کامل شعراے فارسی وعربی کے کلام کی سیر کی ہی۔ فاضلانہ قابلیت کے بعد شاعر کی طبیعت ضرور ان مضامین کی جستجو کرتی ہی جو عامیانہ مذاق سے الگ ہوا کرتے ہیں۔ اسیر کے یہاں جہاں ہزاروں صاف وسادہ اشعار ہیں وہاں بکثرت ایسے اشعار بھی ہیں جن سے ان کی محققانہ فکر وتلاش کا پتہ چلتا ہی۔ انھوں نے اُردو میں فارسی شعرا کی نازک خیالیاں لطافت معنوی کے ساتھ دکھائی ہیں۔ درحقیقت اسیر کی شاعری ان کو ملک الشعرا ثابت کرتی ہی۔ انھوں نے ہر صنف شعر پر زور طبیعت دکھایا ہی۔ مشہور اساتذہ کے مشہور ومقبول اشعار کا جواب اس خوبی سے لکھا ہی کہ انکی قادر الکلامی میں شک نہیں رہتا۔ مثلاً شعرا نے اس طرح میں کہا ع "خدا سر دے تو سودا دے تری زلف پریشاں کا" کیسی کیسی نازک خیالیوں سے کام لیا ہی۔ گریبان کے قافیہ کو کن کن خوبیوں سے نظم کیا ہی نقادان سخن کو اساتذہ کے کچھ نہ کچھ شعر اس طرح میں ضرور یاد ہونگے۔ اسیر نے بھی اس طرح میں گریبان کا قافیہ کہا ہی اور جس خوبی سے کہا ہی اُسکو ناظرین ملاحظہ فرماکر داد دے سکتے ہیں۔ جنون اور چاک گریبانی کے ازلی تعلق کو کس خوبی سے ثابت کیا ہی۔ اسیر کے اس مطلع کو دوسرے اساتذہ سے معناً ملائیے۔ فرماتے ہیں ؎

ازل سے سلسلہ ہی اِس جنونِ فتنہ ساماں کا — شگافِ خامۂ کُن چاک ہی میرے گریباں کا

خامۂ کن کے شگاف کو کسی اُردو شاعر نے اپنے چاک گریباں سے شاید ہی تشبیہ دی ہو۔ چاک گل، چاک سحر وغیرہ سے البتہ چاک گریباں کو نسبت دی ہی جدت اور خیال آفرینی ہی سے کمال شاعری کا اندازہ ہوتا ہی۔ اسیر کا یہ شعر بھی کس پایہ کا ہی۔ ملاحظہ ہو ؎

نبضِ بیمارِ محبت کی مسیحا دیکھی — آج کیا آپ نے جاتی ہوئی دنیا دیکھی

زبان اور لطافت خیال کو دیکھیے کہ کتنا گہرا اثر دل پر پڑتا ہی۔ علیٰ ہذا اسیر کا یہ شعر لاجواب ہی۔ اس مضمون کو حافظ او تلسی داس بھی اس خوبی سے سے نظم نہ کرتے ؎

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی — ہزاروں اُٹھ گئے رونق وہی باقی ہی مجلس کی

ذیل کے شعر کی آمد وبیساختگی اور مصائب تیاوی کی حالت کو ملاحظہ فرمائیے ؎

میرے مردہ کو ہی کیوں آج اذیت تہِ خاک — آگئی قبر میں کیا عالمِ امکاں کی ہوا

نیچرل حالت، واقعہ کی صداقت اور ناصحانہ رنگ کو ذیل کے شعر میں ملاحظہ فرمائیے۔ مصرعہ اولیٰ میں عام کلیہ بیان کر دیا اور دوسرے مصرعہ میں ایک خاص مثال دے کر اپنے قول کو اس طرح ثابت کیا ہے جسکی تکذیب ہو ہی نہیں سکتی

دشمنی پر وہ الفت میں مزا دیتی ہے
خوں پیے طفل ہو مادر کا کلیجا ٹھنڈا

تصویر انقلاب

پہچانتے نہیں ہیں مجھے میرے آشنا　کیا انقلابِ دہر کی صورت بدل گئی

نازک خیالی

ترکِ مے کشی کی تنبیہ کو ذیل کے شعر میں ملاحظہ کیجیے۔ صائب کی روح کو پھڑکا دینے والا شعر ہے ؎

ڈرتا ہوں کہیں بادہ کشی ترک نہ ہو جائے
نقشہ ہے لبِ جام ہلالِ رمضاں کا

عبرت اور نصیحت

ہے بے ثبات گلشنِ گریاں ہے چشمِ شبنم　اے گل سمجھ کے ہنسنا موقع نہیں ہنسی کا

ضعف کی حد

ضعف سے پیوند میں ہر جا زمیں کا ہو گیا
مثلِ نقشِ پا جہاں بیٹھا وہیں کا ہو گیا

نئی موت

بوسہ ملا جو اُس لبِ شیریں کا مر گئے　دی جان ہم نے چشمۂ آبِ حیات پر

بہار کی تصویر کس نازک خیالی سے کھینچی۔ بہار کا جھولا کتنا نیا بنایا ہے ؎

لچک ہے شاخوں میں جنبش ہوا سے پھولوں میں　بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں

انقلاب کی نئی مثال

جب تڑپتا ہے دل میں ڈرتا ہوں　چرخ پر جا پڑے زمیں نہ کہیں

لطف زبان اور بول چال

پھیر دو دل جو نہیں دیتے ہو بوسہ نہ کیا　مال پر لوٹ بھی ہو دام لگاتے بھی نہیں

رندانہ زندگی

شیشہ ہے بغل میں جام شراب لب پہ　ساقی یہی مزا ہو دو دن کی زندگی کا

عالم نزع

چھوٹتے ہیں اقربا جاتے ہیں ہم سوئے عدم　بیکسی کا وقت ہے چھایا ہے عالم یاس کا

تلوّن

کس سے کہوں تلوّنِ ابنائے روزگار　دشمن وہ لاکھ بار ہوئے لاکھ بار دوست

نیا نشیمن

نشیمن طائرانِ روح کا ہے تیغِ جاناں پر　ہزاروں بلبلیں بیٹھی ہیں دیوارِ گلستاں پر

شوخی اور ادا بندی

دلِ مجروح کو کیا دیکھنے آئے ہو بے پردہ　چھپاؤ چہرہ دیکھو چاندنی پڑتی ہے بسمل پر

سفر عدم کی دقتیں

زنجیرِ تعلق مرے پاؤں سے تو نکلے　ہے فاصلہ دو گام کا ہستی سے عدم تک

شکوۂ حجاب

نہ اٹھا اُس رخِ روشن سے پردہ ہو چکا محشر　رہی شوقِ تماشا رہ گیا اہلِ تماشا کو

اخلاق

وہ کون ہیں جو دوست سے کرتے ہیں دشمنی　مجھکو تو دشمنوں سے محبت پسند ہے

صعوباتِ سفر

تھک چکے ہیں پاؤں اُسکا آستانہ دور ہے　دن ہے کم منزل کڑی ہے اور جانا دور ہے

غم سے گریز

کیا خوب ہو موت آئے جو سب سے مجھے پہلے　نازک ہے یہ دل داغِ عزیزاں نہ اٹھیگا

ترغیبِ محنت

بے مشقت نہیں ہوتی کوئی راحت حاصل　غرقِ دریا ہوا غوص تو گوہر پایا

فقدانِ سرور

میخانۂ جہاں میں نہ تھا بادۂ نشاط　بچ جائے تو بہ تیرے گنہ گار توڑ کر

ذیل کے شعر میں صداقت مضمون ملاحظہ ہو ؎

زیست کہتے ہیں جسے ہے اضطراب   موت کہتے ہیں جسے آرام ہے

شکوۂ بیرحمی

دل کو پکڑے ہوئے ہم سامنے آئے جو کبھی   تم نے اتنا نہ کہا حال تمہارا کیا ہے

ذیل کا شعر بالکل میر کے رنگ کا ہے ؎

جو عاقل ہے اُٹھا دل سے تعلق دہر فانی کا   دم آیا یا نہ آیا کیا بھروسا زندگانی کا

رندانہ شوخی

مستی میں اُمنگ آ گئی جب مست کو تیرے   زاہد کا عمامہ سر بازار اُتارا

معشوقانہ عتاب

مارا مرے سر صبح شب وصل بگڑ کر   مرجھائے ہوئے پھولوں کا جب ہار اتارا

عاشقانہ

اُٹھنا انھیں منظور ہے پہلو سے ہمارے   حیلہ ہے کہ دیکھی نہیں جاتی تپش دل

دھوم محشر میں ہوئی جب تری آمد آمد کی   بے گنہ مل گئے چھپ چھپ کے گنہگاروں میں

موحدانہ رنگ

نظر آتا ہے ترا چہرۂ زیبا کس کو   حسن بے پردہ ہے پر تاب تماشا کس کو

شوخی

ساغر ہمارے ہاتھ لب آب جو پیو   تنہا جو مے پیو تو ہمارا لہو پیو

کوئے قاتل کو جو چلتا ہوں تو سایہ ڈر کر   پوچھتا ہے لیے جاتے ہو کہاں تم مجھکو

جذبات عشق و محبت

کچھ تو الفت کی ترے کوچہ سے بو آتی ہے   گرد اُٹھکر مرے دامن سے لپٹ جاتی ہے

ذیل کا شعر جس پایہ کا ہے نقادان سخن اسکی داد دے سکتے ہیں ؎

آ گیا ضعف ہی کچھ کام کہ تربت میں اسیر   ہو گئی ختم قیامت مرے اُٹھتے اُٹھتے

متفرق و منتخب اشعار

صورت تری دکھا کے کہونگا یہ روز حشر   آنکھوں کا کچھ گناہ نہ دل کا قصور تھا

کیوں ملائیں وہ آنکھ اب ہم سے   لے بچے دل نکل گیا مطلب

تہی دستوں کو کیا خوف بلائے آسمانی ہے   کف افسوس مل کر رہ گئی برق اپنے خرمن پر

جب آئی گردش میں چشم ساقی اُڑا دیے ہوش میکشوں کے
نکل پڑے میکدہ سے باہر ہزاروں میکش بہک بہک کر

جو میں نے آنکھوں سے پوچھے آنسو ابل پڑے اور اشک خونیں
لہو کی دو بوتلیں بھری تھیں لگا جو ہاتھ آ رہیں ڈھلک کر

میں نے کہا بسمل ہوں میں بولے ہمیں تیغ دو دم   حسرت ہماری ہے ابھی باقی تمہارے دل کے پاس

کڑی ہے اس قدر منزل عدم کی   کہ مر مر کر پہنچتے ہیں وہاں تک

کہا جو میں نے کہ رُخ سے ذرا نقاب اُٹھاؤ   تو ہنس کے بولے کہ منظور قتل عام نہیں

اُنھیں کا مال تھا اچھا کیا دل لیلیا میرا   کوئی چھینے نہیں لیتا ہے اُنسے کیوں مکرتے ہیں

ملا کر خاک میں بھی ہائے شرم اُنکی نہیں جاتی   نگہ نیچی کیے وہ سامنے مدفن کے بیٹھے ہیں

در بار جانتے ہیں مزاروں کو بے خبر   مُردوں کو جا کے کرتے ہیں زندے سلام روز

دل میں اپنے ہے نگہ اُس بت کافر کی اسیر   نالۂ دل ہے کہ ناقوس صنمخانۂ عشق

ضد سے جتنا ہے یہاں کافر و دیندار میں فرق   زاہد اتنا تو نہیں سبحہ و زنار میں فرق

کعبہ ہے ایک بتکدہ زاہد گلی گلی   بُت لاکھ رنگ میں ہیں خدا ایک رنگ میں

معجز لب سے جلایا تم نے مردہ غیر کا   کیا ہماری لاش قابل ایک ٹھوکر کے نہیں

بسر کی ابتدا و انتہائے عمر ماتم میں   محرم میں ہوئے پیدا قضا آئی محرم میں

نا قبول خلق تھا ایسا بنا کافر جو میں   جتنے ہندو تھے مری ضد سے مسلماں ہو گئے

عبرت کا ہے مقام زمانہ کا انقلاب   تکیہ فقیر کا ہے لحد بادشاہ کی

خاصیت سیماب ہے عاشق میں تمہارے   کشتہ نہو جب تک اسے آرام کہاں ہے

دل جلا کر رُخ محبوب کا جلوا دیکھا   ہمنے گھر پھونک کے کیا خوب تماشا دیکھا

غریب خانہ میں آئے تو سرفراز کیا   خوشا نصیب قدم آپ کے مرے سر پر

جب تک ہے گوش ہوش فسانہ سُنیں ترا   جبتک رہے زبان تری گفتگو کریں

دیئے خدا نے عوض ایک ایک کی دس دس   کریم بانٹ کے زر صاحب خزانہ ہوا

بت کدہ کی میں سیر کر آیا   واں خدا ہی خدا نظر آیا

ہوں وہ بسمل کہ ہو نہیں عاشق ذرا   دل بھر آیا جو زخم بھر آیا

اب کہاں وہ لکھنؤ وہ ساکنانِ لکھنؤ
رہ گئی باقی زبان پر داستانِ لکھنؤ

پہلو میں وہ عیسیٰ ہے اجل سر پہ کھڑی ہے
کیا جان دمِ نزع کشاکش میں پڑی ہے

اس لیے دامن سے میرے اشک پونچھے یار نے
تا تمنا میں اسی لذت کے یہ رو دیا کرے

باقی ابھی ہے ترکِ تمنا کی آرزو
کیونکر کہوں کہ کوئی تمنا نہیں مجھے

ا۔ ز۔ لکھنوی

تنقید کتب

راج ترنگنی اس نام سے ٹھاکر اچھر چند صاحب شاہپوریہ نے زبان سنسکرت کی ایک "معرکۃ الآرا" کتاب کا ترجمہ دو ضخیم جلدوں میں کیا ہے۔ اس میں بقول ٹھاکر صاحب موصوف کے "قدیم فرمانروایانِ کشمیر کے مفصل حالات، معاصرا تعلقات اور اُن کے عروج و زوال کا نقشہ نہایت موثر الفاظ میں کھینچا گیا ہے" باوجودیکہ آج کل کے تخیل و مذاق کے خلاف اس میں بہت سی باتیں پائی جاتی ہیں تاہم اصل مطالب کے دلچسپ و مفید ہونے میں کلام نہیں۔ اس تاریخ کی ترتیب و تدوین "ہندوؤں کے چوٹی کے مورخ" کلّھن پنڈت سے منسوب کیجاتی ہے اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ مصنف نے اسے زیادہ تر ایک "نظم" کی حیثیت میں لکھا تھا۔ لیکن چونکہ اس میں قدیم فرمانروایانِ کشمیر کے حالات و واقعات بالاستیعاب قلمبند کیے گئے ہیں اس اعتبار سے اس میں تاریخ کی شان ضرور پیدا ہو گئی ہے۔ ٹھاکر اچھر چند کی یہ اولوالعزمی قابل داد ہے کہ آپ نے بصرف زرِ کثیر، محنت شاقہ برداشت کرکے اس کتاب کا مکمل ترجمہ اہل وطن کے فائدہ کی غرض سے کر دیا ہے۔ یوں بھی کوئی معقول وجہ نہ تھی کہ جس کتاب کا ترجمہ بعض یورپین زبانوں میں ہو گیا ہو اُس سے اُردو خواں طبقہ محروم رکھا جاتا۔

خواہ راج ترنگنی کو بعض وجوہ سے معتبر و مستند تاریخ کی حیثیت دینے میں احتیاط پسند طبائع متامل ہوں، لیکن یہ ضرور ہے کہ اسکی شہرت بحیثیت مجموعی عرصہ سے قائم ہے اور اکثر کتب میں اسکا حوالہ دیا گیا ہے۔ فی الحقیقت راج ترنگنی بجائے ایک تاریخ کے رزمیہ نظم کہلانے کی زیادہ مستحق ہے اور یہ امر بالکل قرین قیاس ہے کہ کلّھن پنڈت نے اپنی تصنیف میں تاریخی رنگ کی عوض "شاعری" کا رنگ چوکھا رکھنا پسند کیا ہو۔ اور غالباً یہی سبب ہے کہ اس میں بہت سی باتیں ایسی پائی جاتی ہیں جنھیں ایک "معرکۃ الآرا" تاریخی کتاب میں دیکھکر بیساختہ ہنسی آتی ہے۔ جا بجا ایسے واقعات و کوائف درج کیے گئے ہیں جو مافوق العادت ہونے کی وجہ سے بالکل غیر ضروری کہے جا سکتے ہیں اور جنھیں کوئی بالغ نظر تاریخی پہلو سے وزن دار خیال نہیں کریگا۔ بلکہ اسکے برخلاف، صاحب کتاب کی ضعیف الاعتقادی و سادہ لوحی کا اُسکو اقرار کرنا پڑیگا۔ ذاتی طور پر ہم اُن تمام روایات کی عزت، دل سے، کرنے کے لیے تیار ہیں جن کا تذکرہ مذہبی پیرایہ میں کیا گیا ہے لیکن تنقید نگاری کا فرض یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ تاریخ میں ان کا جوڑ نہایت بھونڈا نظر آتا ہے۔ اور ان باتوں کی وقعت اس زمانہ میں کلیتہً نہیں ہو سکتی جبکہ اوہام باطلہ اور مفرط حسن اعتقادی کے مضرات کا قلع و قمع تعلیم کی بدولت ہوتا جا رہا ہے مثلاً راجہ پرورسین ثانی کے حال میں شہر پرورپور کے آباد کرنے کا واقعہ سراپا خلاف فطرت ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ راجہ شہر کے لیے موقع تلاش کرتا ہوا ایک ندی کے کنارے پہنچتا ہے۔ جس کے دوسری طرف اُسے ایک دیو نظر آتا ہے جو راجہ کو دیکھکر قہقہہ لگاتا ہے اور کہتا ہے:۔

سوائے بکرماجیت، شودرک، اور آپ کے، جو دلیری میں بہت بڑھے ہوئے ہیں، کامل استقلال کی مثال اور کہیں مشکل سے نظر آتی ہے۔ ہے پرتھوی راج! آپ کی خواہش پوری کیجائے گی۔ آپ اس پشتہ پر سے گذر کے میرے پاس آئیے۔

یہ بکر دیو اپنا پیر پھیلاتا ہے جس سے سطح آب پر ایک پشتہ تیار ہو جاتا ہے۔ راجہ اپنے خنجر سے اس میں زینہ بناتا ہے اور ان کے ذریعہ سے ندی پار ہو جاتا ہے۔ ندی کے دوسرے کنارے دیو سے گفتگو ہوتی ہے اور وہ یہ کہکر غائب ہو جاتا ہے کہ

"اپنا شہر اس جگہ تیار کروانا جہاں کل تمھیں میرا لگایا ہوا نشان نظر آئے گا .... الخ" (جلد اول صفحہ ۲۴۵)

اکثر واقعات اسی قسم کے ہیں اور بلا شبہہ تاریخی حیثیت سے انکی وقعت رتی برابر نہیں ہو سکتی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ انکو مؤلف راج ترنگنی کی شاعرانہ خیال بندی یا جوش عقیدت فرض کرتے اور نکتہ چینی نہ ہوتی لیکن غضب تو یہی ہے کہ مترجم صاحب مُصر ہیں کہ ان دور از کار باتوں کو بدیہیات کی طرح تسلیم کرو۔ آپ فرماتے ہیں کہ

جو لوگ اپنی مذہبی کتابوں کے معجزات اور بادی النظر میں خلاف قیاس واقعات کی درستی کے قائل ہوتے ہیں انھیں کسی تاریخی کتاب کی تحریر میں محض اس بنا پر دست اندازی کا کوئی حق حاصل نہیں ہو سکتا کہ اسکے خاص خاص واقعات انکی سمجھ میں نہیں آتے یا اس قدر دقیق ہیں کہ ان تک انکی عقل کام نہیں دے سکتی۔

اس مقام پر مترجم نے نرالی منطق سے کام لیا ہے جسکی کُنہ تک پہنچنا عقل سلیم کو محال ہے۔ اگر راج ترنگنی کو رامائن و مہابھارت یا ویدوں کا درجہ آپ نے دیا ہوتا تو بحیثیت مذہبی کتاب ہونے کے اُسپر کسی کو "دست اندازی" کا حق حاصل نہ تھا۔ کیوں کہ عالم ارواح کی باتیں دنیا والوں کے لیے واقعی سربستہ راز ہوتی ہیں اور انکی تہ تک معمولی نگاہیں نہیں پہنچ سکتیں۔ لیکن مشکل تو یہی ہے کہ آپ اسکو تاریخ کی شکل میں پیش کر رہے ہیں جس میں اس قسم کے بعید از خیال واقعات کے اندراج نے اصل کتاب کی عظمت کو بہت گھٹا دیا ہے۔ یہ بھی خوب کہی کہ مافوق الفطرت اور خلاف قدرت واقعات کی عدم تفہیم کوتاہی عقل پر مبنی ہے۔ گویا اس لحاظ سے داستان امیر حمزہ، بوستان خیال، اور گلزار نسیم وغیرہ میں جو حیرت انگیز اور خلاف عقل طلسمات دکھائے گئے ہیں وہ سب کے سب تاریخی ہیں اور انکی صداقت مسلم۔ کیا ٹھاکر اچھر چند صاحب ان کتابوں کے مصنفوں کو، مورخین عالم کے دربار میں، گبن اور ڈیوڈ ہیوم، یا ابن خلدون اور ابو الفداء کے برابر برابر کرسی دلانے کی کوئی کامیاب کوشش کر سکتے ہیں؟

غور کرنے کی جگہ ہے کہ کلہن پنڈت "جوتی کا مورخ" بنا کر علمی دنیا میں لایا جاتا ہے اور انکی تصنیف کو "معرکۃ الآرا" تاریخ کا خطاب دیا جاتا ہے اور فرمایش یہ کیجاتی ہے کہ اسکو پڑھو لیکن جو کچھ تمھاری سمجھ میں نہ آئے اُسپر حرف گیری کی جرأت نہ کرو بلکہ اسے اپنے فہم کا قصور سمجھکر خاموش بیٹھ رہو۔ گویا راج ترنگنی بھی، قرآن، انجیل یا وید کی طرح کوئی الہامی کتاب ہے۔ کیونکہ اس کے برخلاف تاریخ ہی ایک ایسا فلسفہ ہے جسکے اصول اور جس کی ترتیب تمام کمال اسباب و علل اور مشاہدے اور تجربے پر ہوتی ہے اور اسمیں واقعات اس طرح قلمبند کیے جاتے ہیں کہ صداقت و صحت کا کوئی پہلو کمزور نہونے پائے۔

یہ خوبی راج ترنگنی میں بہت بڑی حد تک مفقود ہے اور غالباً یہ نقص ہندوؤں کی تمام قدیم تاریخوں میں عام طور پر پایا جاتا ہے جسکی بنا پر غیر اقوام کو ہندوؤں پر یہ الزام لگانے کا موقع ملتا ہے کہ انھیں من حیث القوم تاریخ نویسی کا شغف شروع سے نہ تھا۔ بادی النظر میں معلوم بھی یہی ہوتا ہے کہ انھوں نے باوجود تمدن و معاشرت کے مختلف شعبوں میں ترقی کرنے کے، فن تاریخ سے کوئی مستقل دلچسپی نہیں پیدا کی۔ اسی وجہ سے آج ہندوستان قدیم کے مستند حالات کا دستیاب ہونا اسدرجہ دشوار ہو گیا ہے کہ مسٹر رومیش چندر دت آں جہانی کو حسرت آمیز لہجہ میں کہنا پڑا کہ

"ہندوستان کے قدیم زمانہ کی مستقل تاریخ لکھے جانے کی اُمید نہیں"

مترجم صاحب راج ترنگنی اس بات کے ثبوت میں کہ ہندوؤں کو تاریخ نگاری کا غیر معمولی ملکہ تھا لکھتے ہیں :۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ قدیم ہند و صنعت و حرفت و دستکاری، معماری، سنگ تراشی، شاعری، موسیقی، ڈراما وغیرہ میں معراج کمال کو پہنچ چکے تھے۔ ریاضی و حساب میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اس حالت میں یہ کیسے

قرین قیاس ہو سکتا ہو کہ وہ تاریخ نگاری کے فن سے نابلد ہوں۔ بالخصوص اس صورت میں کہ بعض تاریخی کتابیں، جو زمانہ کی دست برد سے بچ رہی ہیں، اب تک دیکھی جا سکتی ہیں۔

اور اس کا جواب کہ اگر ہندوؤں نے تاریخیں لکھی تھیں وہ گئیں کہاں یہ دیا گیا ہو کہ

ہندوؤں کا بیان تو یہ ہو کہ قدیم ہندوستان کی تاریخیں لکھی ضرور گئی ہیں لیکن مسلمان حملہ آوروں نے کتبخانہ اسکندریہ کی طرح اُنھیں مع دیگر کارآمد کتب کے جلا کر برباد کر دیا۔

مترجم صاحب کا ذاتی خیال اس باب میں حسب ذیل ہو۔

کسی حق پسند کو اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مسلمان حملہ آوروں نے ہندوستان کے قدیم لٹریچر کو ضرور صدمہ پہنچایا ہے .... الخ

مندرجۂ بالا تینوں شقیں جا بجا تنقید نظر کی محتاج ہیں۔ مترجم صاحب کے پہلے اصول موضوعہ کے مطابق گویا ایک شخص کا کئی علوم میں دست رس رکھنا اس بات کا مترادف قرار دیا گیا ہو کہ وہ تمام علوم پر حاوی ہو۔ یعنی افلاطون فلسفی ہونے کے ساتھ ایک شاعر اور معمار، اور ہومر، شاعر ہونے کے ساتھ ایک اعلیٰ درجہ کا ریاضی داں اور مصور بھی تھا۔ یہ قاعدہ جس قدر پوچ ہے ظاہر ہو۔ اسی طرح مسلمان حملہ آوروں پر ہندوستان کی قدیم تاریخوں کے "جلا کر برباد" کرنے کا الزام اُسوقت تک ناقابل اعتماد ہو تاوقتیکہ مستند حوالوں سے یہ نہ ثابت کر دیا جائے کہ اسلامی فتوحات سے پہلے یہاں "تاریخوں" کا کوئی ذخیرہ تھا بھی۔ لیکن یہ حوالہ جات راج ترنگنی ایسی شاعرانہ تاریخ سے نہ ہونا چاہییں۔

یہ امر بھی غور طلب ہو کہ مسلمانوں کو، ہندوؤں کی تاریخی کتب کے ساتھ کوئی خاص دشمنی تھی۔ کیوں کہ سنسکرت لٹریچر کی وہ بیش قیمت کتابیں جن پر ہندو مذہب کا دارومدار سمجھا جا سکتا ہو اب تک موجود ہیں حالانکہ قدرتی طور پر سب سے پہلے مسلمانوں کو اُنھیں کیجانب متوجہ ہونا چاہیے تھا۔ بہرکیف حضرت مترجم نے بطور دفع دخل مقدر جو کچھ ارشاد فرمایا ہو اُسکی وقعت حملۂ معترضہ سے زیادہ نہیں اور حقیقت حال یہ ہو کہ ہندوؤں نے فنِ تاریخ سے اپنی مناسبت ثابت کرنے کی کوئی یادگاری کوشش نہیں کی۔ بلاشبہ اُنھیں تاریخی واقعات کو نظم و نثر کی صورت میں مدون کرنے کا شوق رہا ہو گا جیسا کہ متعدد زمیہ نظموں اور بیشمار کتبوں کے مطالعہ سے آشکار ہوتا ہو۔ لیکن دراصل اُن میں مذہبی رنگ اس درجہ غالب تھا کہ تمام چیزوں میں اُسکا پتہ چلتا ہو۔ اسکا اعتراف بابو نندلال دے، نے اپنی کتاب سویلزیشن ان انشینٹ انڈیا میں ان الفاظ کے ساتھ کیا ہو:-

غرضکہ علم نجوم و ہندسہ و جبر مقابلہ و صرف و نحو و موسیقی و فلسفہ و تعمیرات، جو معراج ترقی کو پہنچ گئے ان سب کا تعلق قدیم ہندوستان کے مذہب سے تھا لیکن علم کے دوسرے شعبے جن کو مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا اُنکی جانب لوگوں نے اسقدر توجہ نہیں کی۔

دوسری جگہ بابو صاحب موصوف پھر لکھتے ہیں:-

ہندوؤں کے دلوں پر مذہبی خیالات نے اس قدر تسلط کر رکھا تھا کہ بلا مبالغہ انکی دنیاوی کتابیں، مذہبی کتابوں کے مقابلہ میں بے انتہا کم تھیں۔

یہ انھیں مذہبی خیالات کا پرتو ہو جو راج ترنگنی میں خصوصیت سے پائے جاتے اور جسکی وجہ سے قدیم تاریخ ہند کے تمام واقعات علی العموم، مشکوک و مبہم نظر آتے ہیں۔

تاہم اگر ان نقائص سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو راج ترنگنی میں بعض خوبیاں بھی ہیں۔ اسکے مطالعہ سے قدیم کشمیر کی طرز معاشرت اور نظام تمدن پر کافی روشنی پڑتی ہو۔ انداز حکومت اور اُصول سلطنت پر کہیں کہیں اچھی بحث کی گئی ہو۔ اس کتاب کا مصنف شاعر بھی تھا بلکہ کہنا چاہیے کہ شاعر ہی تھا، اس وجہ سے اکثر مقامات پر شاعرانہ تلمیحات و استعارات کے استعمال سے انشا پردازی کی جھلک پیدا ہو گئی ہو۔ کہیں کہیں مناظرِ قدرت کا نقشہ نہایت مؤثر الفاظ میں دکھایا گیا ہو کہ بے اختیار تعریف کرنا پڑتی ہے۔

مترجم نے بھی کتاب کے مکمل و دلاویز بنانے میں غیر معمولی سعی کی ہو۔

کشمیر کا جغرافیہ، فرمانروایانِ کشمیر کے شجراتِ نسب مصنف راج ترنگنی کے سوانح عمری، یہ تمام چیزیں ٹھاکر اچھر چند صاحب کی بے لاگ محنت کی رہینِ منت ہیں۔ تفہیم مطالب میں آسانی پیدا کرنے کے خیال سے ایک ہزار سے زائد فٹ نوٹ بھی شامل کردیے گئے ہیں جن کی موجودگی یقینی طور پر فائدہ مند ہے۔ ڈیڑھ سو صفحات کا ایک طول دیباچہ ان سب پر طرہ ہے جس میں بحث و مباحثہ کی بہت گنجائش نکل سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ مترجم صاحب کا قلم رائے زنی کرتے ہوئے اپنی حد سے کہیں کہیں آگے نکل گیا ہے۔ تاہم اس خیال سے وہ قابل معافی ہیں کہ قومی طرفداری کے جذبات سے متاثر ہو کر کشمیر بڑے بڑے ثقہ بیتیں مورخ بھی رکیک حملوں پر اتر آتے ہیں۔

کتاب کی چھپائی کا اہتمام بھی کافی طور پر اچھا ہوا ہے۔ اور بلاشبہ پبلشر کو اسکے واسطے گرانبار خرچہ برداشت کرنا پڑا ہوگا۔ ہر دو جلد، جو جداگانہ طور پر مجلد ہیں اور جن کی صفحہ بندی بھی علیحدہ علیحدہ ہے، ان کی مجموعی قیمت آٹھ روپے اور محصول ڈاک عہ، ہے جو بہرحال مناسب و موزوں ہے ملنے کا پتہ یہ ہے:۔

ٹھاکر اچھر چند اینڈ کمپنی، کٹرہ پوربیاں، لاہور

نشاطِ عمر مولوی بشیر الدین احمد دہلوی کا نام نامی معرفی سے مستغنی ہے۔ آپ مولانا نذیر احمد ایسے نامور اور زندۂ جاوید باپ کی یادگار ہونے کے علاوہ خود بھی مصنف و مؤلف ہونے کا قابل فخر امتیاز رکھتے ہیں۔ اس وقت تک آپ کے قلم سے جو کتابیں نکلی ہیں، اگرچہ انکی تعداد چنداں زیادہ نہیں لیکن نوعیت و مفاد کے اعتبار سے آپ کی علمی کوشش مقبولیت کی سند حاصل کرچکی ہیں۔ "اقبال دلہن" سے جسکا پیرایۂ تحریر اور اندازِ بیان مولانا نذیر احمد کے طرز کا بہترین نمونہ ہے، اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ آپ کو اپنے والد بزرگوار کی طرح سوسائٹی کے معائب و محاسن کا تذکرہ دلآویز و موثر طریقہ پر کرنا بہت اچھی طرح آتا ہے۔ اسی طرح آپ کی بعض دوسری کتابیں کسی نہ کسی پہلو سے مفید و کارآمد ثابت ہو چکی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو ہندوستانی طرز معاشرت کی درستی و اصلاح کا کافی انہماک ہے اور یقیناً اسی غرض کو مدنظر رکھ کر آپ نے امریکہ کے مشہور مصنف ڈاکٹر سلونیس سٹال کے سلسلۂ "سلف اینڈ سیکس" کی بعض کتب کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ کتابیں امریکہ و یورپ میں غیر محدود شہرت و وقعت حاصل کرچکی ہیں اور چونکہ ان میں سلسلہ وار بچوں سے لیکر بوڑھوں تک کے واسطے نہایت بیش قیمت معاشرتی تلقینات قلمبند کی گئی ہیں اور اُن واقعات و معاملات پر، عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے جن سے کسی انسان کو چارہ نہیں، اس وجہ سے ان کتابوں کی قدر و قیمت آج کل وہاں بہت ہے۔ ہندوستان میں پنجاب ریلجس بک سوسائٹی (لاہور) کی مساعی جمیلہ سے اُردو میں اس سلسلہ کی اوّل تین کتابوں کا ترجمہ ہوگیا ہے اور وہ بجائے خود قابل تعریف ہیں لیکن اسکے باوجود مولوی بشیر الدین احمد کی یہ اُولوالعزمانہ علمی خدمت کسی طور سے فعل عبث نہیں قرار پا سکتی۔ مولوی صاحب نے ترجمہ تو ضرور کیا ہے لیکن ہندوستانی رسم و رواج اور ضروریات کو مدِنظر رکھکر اس میں ضروری اور مفید ترمیم کے لیے بھی گنجائش نکال لی ہے جو ہر طرح قابل داد ہے۔ گویا آپ نے اُن تمام امور کو، جن پر ڈاکٹر صاحب نے یورپین سوسائٹی کے نقطۂ خیال سے نگاہ ڈالی ہے ہندوستانی معاشرت کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ اسکے علاوہ آپ نے پیرایۂ تحریر عالمانہ و فاضلانہ رکھا ہے جا بجا آیات قرآنی اور احادیث نبوی کا جوڑ استناداً اس خوبی سے لگایا گیا ہے کہ کتاب کی شان دوبالا ہوگئی ہے۔ انکے ماسوا، قابل مترجم نے ثبوت کے طور پر اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کا تذکرہ کرکے مطالب میں غایت درجہ کی دلچسپی کا سامان پیدا کردیا ہے۔ پنجاب ریلجس بک سوسائٹی کے تراجم میں یہ تمام خوبیاں مفقود ہیں۔ اُن میں لفظی ترجمہ کی پابندی کیگئی ہے اور "نشاطِ عمر" اس قسم کی قید سے مطلقاً مبرا ہے۔ اصولاً بھی مولوی بشیر الدین کا یہ طرز عمل کسی طرح قابل گرفت نہیں بلکہ اسکے برخلاف کسی غیر زبان کی کتاب کا ترجمہ جب کیا جائے

تو اُس میں ترمیم و اضافہ کی آزادی مترجم کو اخلاقاً حاصل ہونا چاہیے۔ اُردو زبان میں اکثر ترجمے اس خصوصیت سے خالی ہوتے ہیں اور مبصرین کی نظر میں اُنکی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ بعض صورتوں میں تو لفظی ترجمہ کی قید دل آویز و مفید مطالب کا خون کر دیتی ہے اور مترجم کی محنت بجائے مشکور ہونے کے موردِ لعن و طعن قرار پاتی ہے۔ اُردو زبان میں مغربی لٹریچر کے بعض گرانمایہ جواہر کا اضافہ بذریعہ ترجمہ ہو رہا ہے اور اس سے دلدادگان ادب کو خاص طور پر مطمئن ہونا چاہیے لیکن اسی کے ساتھ اہل قلم گروہ کا فرض ہے کہ وہ اپنی سوشل اور تمدنی خصوصیات کو نظر انداز نہ ہونے دیں تاکہ انکی کوشش اہل ملک کے لیے نفع بخش ثابت ہو۔ مولوی بشیر الدین ان تمام وجوہ سے، مستحق مبارکباد ہیں کہ اُنھوں نے: صرف ایک کارآمد سلسلۂ کتب کا اُردو زبان میں ترجمہ کر کے اُردو خوان ناظرین کو اُس سے متمتع ہونے کا موقع دیا ہے بلکہ دوسروں کے لیے راستہ بھی کھول دیا ہے کہ غیروں کے مال و متاع کو، نیک نیتی کے ساتھ اپنے تصرف میں کس طرح لانا چاہیے۔

ڈاکٹر سلیونس سٹال صاحب نے اپنے اس مشہور و معروف سلسلہ میں کئی کتابیں لکھی ہیں۔ پہلی کتاب نوعمر لڑکوں کے متعلق ہے، دوسری نوجوانوں کے لیے، تیسری فلسفۂ ازدواج سے تعلق رکھتی ہے اور علیٰ ہذا القیاس۔ جن مباحث پر ڈاکٹر صاحب کی یہ تصانیف مبنی ہیں ان کی تفصیل تحصیل حاصل ہوگی۔ مختصر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جن امور کا، توالد و تناسل سے تعلق پایا گیا ہے ان سب پر آپ نے رائے زنی فرمائی ہے۔ لڑکوں کے متعلق ڈاکٹر صاحب کی پہلی کتاب جسمیں عاداتِ قبیحہ کے مضر نتائج کو نہایت خوبی سے ذہن نشین کرنے کے علاوہ اور بھی بہت سی بیش قیمت اخلاقی نصیحتیں بیان کیگئی ہیں اُسکا ترجمہ مولوی بشیر الدین احمد اس سے پیشتر "حرز طفلاں" کے پُر معنی و موزوں نام کے ساتھ شائع کر چکے ہیں اور "نشاط عمر" دوسری کتاب کا ترجمہ ہے۔ اسکے اندر کس قسم کے مضامین قلمبند کیے گئے ہیں، اسکا جواب مندرجۂ ذیل سرخیوں سے ملیگا جو اقتباساً درج ذیل کیجاتی ہیں: سرمایۂ زندگی، تزکیۂ نفس، جسمانی کمزوری، امراض خبیثہ اور انکے ہولناک نتائج، اعضائے توالد و تناسل اور اُن کی غرض، مرد و عورت کے تعلقات، شادی کا مقدس فریضہ، وغیرہم۔

بلاشبہ یہ مسائل جس قدر دقیق اور نازک ہیں اُسیقدر یہ انسانی زندگی پر موثر بھی ہیں۔ بعض باتیں ظاہر بیں نگاہوں میں شاید غیر مہذب یا مشتعل کُن دکھائی دیں لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ان باتوں پر رائے زنی کرنے کا اس سے زیادہ مہذب اور متین انداز ناممکن ہے۔ خود یورپ میں ایک جماعت ڈاکٹر سلیونس سٹال پر فحش و گندہ لٹریچر کی فراوانی کا سامان بہم پہنچانے کا الزام لگاتی ہے اور ممکن ہے کہ ہمارے بعض ہموطن مولوی بشیر الدین احمد کو بھی اس الزام کا بحصۂ رسدی مستحق سمجھیں۔ تاہم معمولی طور پر بھی اگر غور سے کام لیا جائے تو پتہ چل سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور مولوی صاحب، دونوں کی کوششیں رفاہ عام اور خیرخواہی انام پر مبنی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسئلۂ توالد و تناسل کی طرف ہمارے یہاں کسی کو توجہ کرنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ حالانکہ اسی پر قومی زندگانی کا انحصار ہے۔ "نشاط عمر" میں جو کچھ اور جیسی کچھ نصائح و ہدایات مندرج ہیں وہ عملی طور پر نوجوانوں کے لیے نہایت کارآمد ہیں اور اسکی ضرورت ہے کہ ملک کے نونہال انھیں آویزۂ گوش بنائیں۔ بقائے نسل کا مسئلہ نہایت درجہ اہم ہے۔ پس جو لوگ اپنی مذموم عادت کی بدولت اپنی نسل کو خراب کرتے ہیں وہ اخلاقی طور پر قوم اور مُلک کے گناہگار ہیں اور انھیں گناہگاروں کی ہدایت کیلیے "نشاط عمر" ایسی کتاب کی ضرورت تھی۔ خدا کرے اسکی اشاعت ہندوستان میں کافی طور پر ہو تاکہ جس مقصد کو پیشِ نظر رکھکر مولوی بشیر الدین احمد صاحب نے یہ خدمت انجام دی ہے وہ باحسن الوجوہ تکمیل کو پہنچے۔ اسکی قیمت مع خرچہ وی پی عہ ہے جو تقریباً ۳۰۰ صفحات کی کتاب کیلیے کچھ زیادہ نہیں کہی جاسکتی۔ ملنے کا پتہ:۔ مولوی بشیر الدین احمد صاحب، اول تعلقدار عثمان آباد، (ریاست حیدرآباد دکن)

بزم فرید اُردو لٹریچر کی خوش قسمتی ہو کہ اُس میں ہر پہلو سے نمایاں ترقی کے آثار پیدا ہیں - یہ ضرور ہو کہ کوششیں جو ہو رہی ہیں وہ محدود ہیں حالانکہ ہماری ضرورتیں اس بات کی متقاضی ہیں کہ ان کوششوں کا دائرہ وسیع کیا جائے - تاہم جو کچھ بھی ہو رہا ہو وہ بسا غنیمت ہو- یہ بالکل قرین قیاس ہو کہ جو بنیاد آج پڑ رہی ہو اُسپر کبھی عالیشان عمارتیں کھڑی ہو جائینگی- یعنی اُردو زبان میں تاریخ، فلسفۂ سائنس، ادب، شاعری، وغیرہم مباحث پر جو چھوٹی چھوٹی کتابیں اس زمانہ میں تصنیف یا تالیف یا ترجمہ ہو رہی ہیں وہ گویا ایک شاندار مستقبل کی خبر دیتی ہیں- تصوف کی ایک شاخ رہگئی تھی لیکن اس کمی کے پورے کرنے کی گرانبار ذمہ داری کارکنان "نظام المشائخ" نے اپنے سر لے لی ہو اور اسوقت تک اُن کی مساعی جمیلہ سے صوفیانہ مشرب کی کئی بیش قیمت کتابیں نکل چکی ہیں، جو اپنے محاسن ظاہری و باطنی کے اعتبار سے قابل تعریف و مستحق داد ہیں- اس باب میں ملا محمد الواحدی کی بے لاگ خدمات خصوصیت سے استحقاقِ اعتراف رکھتی ہیں، جن کے قلم سے، حال میں "بزم فرید" کے نام سے ایک مفید و دلچسپ کتاب کا ترجمہ شائع ہوا ہو-

"بزم فرید" جیسا کہ اسکے نام سے ظاہر ہو "حضرت بابا فرید شکر گنج قدس اللہ سرہ العزیز کے اعمال و اقوال کا مجموعہ ہو"، جسے حضرت سلطان الاولیا محبوب الٰہی (خواجہ نظام الدینؒ) نے زبان فارسی میں راحت القلوب کے نام سے ترتیب دیا تھا اور ملا محمد الواحدی نے اُسکا اُردو میں ترجمہ کیا ہو- حضرت محبوب الٰہیؒ، حضرت بابا فرید شکر گنجؒ کے راسخ الاعتقاد اور حضور رس و حاضر باش پیرو تھے - دوسرے بزرگان دین کی طرح باباصاحبؒ کا دربار بھی تقریباً روزانہ منعقد ہوا کرتا تھا، اور مختلف اذکار ہوا کرتے تھے جن کے اثنا میں سیکڑوں نکتے معرفت و حقیقت کے حل کیے جاتے تے- انھیں کار آمد باتوں کا مجموعہ "بزم فرید" ہو جو نہ صرف ایک گرانپایہ شیخ طریقت کے ملفوظ ہونے کے باعث بلکہ تصوف و اخلاق کے آبدار موتیوں کی ایک سلک ہونے کے لحاظ سے بھی طبقۂ صوفیہ میں جائز طور پر ہر دلعزیزی اور مقبولیت حاصل کرنے کا حق رکھتی ہو اور امید ہو کہ ملا صاحب کا یہ ترجمہ ہندوستان کے متصوفین کے لیے دلچسپی کا نیا سامان پیدا کریگا- آجکل جبکہ اخلاق و آداب کی کسادبازاری ہو رہی ہو اور تصوف کے حقیقی معنوں کے سمجھنے کی قابلیت عام طور پر مفقود ہوتی جا رہی ہو- اس قسم کی کتابیں قدردانی کی مستحق ہیں- ملا محمد الواحدی صاحب لائق مبارکباد ہیں کہ اُنھوں نے راحت القلوب کا ترجمہ نہایت خوبی سے کیا ہو اور عبارت و انداز بیان کی خوبیاں ہاتھ سے جانے نہیں پائیں بلکہ اسکے برخلاف طرز تحریر میں سلاست و روانی کا اسدرجہ خیال رکھا گیا ہو کہ پڑھنے والے کو اسکا خدشہ بھی نہیں ہوتا کہ یہ کسی غیر زبان کا ترجمہ ہو- زبان کی خوبیوں سے قطع نظر، مطالب کے اعتبار سے بھی "بزم فرید" غایت درجہ سبق آموز ہو- عالم تصوف کے اسرار، اخلاق و حکمت کے نکات، حُسنِ معاشرت کے متعلق ہدایتیں، اس کتاب کے صفحات میں کمال عمدگی سے قلمبند کیگئی ہیں اور اس لحاظ سے نہ صرف فرقۂ صوفیہ بلکہ عامۂ مسلمین کے لیے بھی اسکا مطالعہ عبث نہیں قرار دیا جاسکتا- یہ بالکل ممکن ہو کہ ظاہر بین اور دنیا پرست نگاہوں میں بعض باتیں قابل اعتراض ٹھیریں لیکن اس سے اور مفید باتوں کا اثر زائل نہیں ہو سکتا- حقیقت یہ ہو کہ روحانی دنیا کے ہر عجیب و غریب ہوتے ہیں اور انکا انکشاف دنیاداروں کی عقل سے محال ہو ان پر عبور کرنے کا صرف ایک طریقہ ہو اور وہ یہ ہو کہ "پہلے تم اپنی طبیعت کو اُسی رنگ میں رنگو اور پھر جب تم میں روحانی منازل کے طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائیگی تو اُسوقت یہ تمام مسائل، جو عقدۂ لاینحل اور راز سربستہ نظر آتے ہیں خود بخود حل ہو جائیں گے"- اس قسم کے مضامین، جو ہماری سمجھ میں نہ آئیں، انکے متعلق ہمارا طرز عمل یہ ہونا چاہیے کہ یا تو ہم انھیں اپنے ادراک سے بالا سمجھ کر اُنسے قطع نظر کریں یا بقول خواجہ حسن نظامی صاحب "انکی کوئی اچھی تاویل نکال کر دل کو سمجھا لینا چاہیے"-

مختصر یہ ہے کہ "بزم فرید" گوناگوں دلچسپیوں سے مملو ہے۔ اہل علم حضرات کو اسکی قدر دانی کرنا چاہیے تاکہ مترجم و پبلشر کی حوصلہ افزائی ہو۔ چھپائی کا غذ وغیرہ سب نہایت موزوں و مناسب ہے۔ ضخامت ۱۱۲ صفحے ہے جسکی قیمت مع محصول ڈاک و خرچہ وی پی ۱۰ سے زیادہ نہیں۔

دفتر نظام المشائخ، فیض بازار، دہلی سے طلب فرمائیے۔

عجیب و غریب صدی پنجاب ریلجیس بک سوسائٹی (انارکلی۔ لاہور) کیجانب سے جو مساعی جمیلہ اُردو علم ادب کے سنوارنے اور نکھارنے میں عمل میں آئی ہیں وہ اسکا حق رکھتی ہیں کہ انکا ذکر فخر و مباہات کے ساتھ کیا جائے۔ آئے دن اس سوسائٹی کی زیر نگرانی اچھی اچھی کتابیں نکلتی رہتی ہیں اور ان میں ایک مشترکہ خوبی یہ ہے کہ یہ ساری کتابیں، خواہ مستقل تصنیف ہوں یا تالیف و ترجمہ، مذاق جدید کے عین مطابق ہوتی ہیں جس سے ہماری علمی ضروریات کی تکمیل متصور ہے۔ حال میں اس سوسائٹی کی جانب سے آلفرڈ رسل والس کی دلچسپ و سبق آموز کتاب "دی ونڈر فل سنچری ریڈر" کا ترجمہ مندرجہ عنوان نام کے ساتھ شائع ہوا ہے، جس کے مفید و کارآمد ہونے میں شک کی گنجائش مطلق نہیں ہو سکتی۔

مہذب و متمدن حصص عالم میں آجکل ترقی و عروج کا دَور دَورہ ہے۔ مصر، روما، ہندوستان وغیرہ کی سرزمینیں اپنے اپنے وقت پر سرسبز ہوئیں، پھُولی پھلیں اور پھر اُنکی بہار کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اب یورپ و امریکہ کی باری ہے اور ان ممالک میں آج کل ایجاد و تحقیق کی بدولت جو جو عجائبات عالم ظہور میں آ رہے ہیں وہ بجائے خود حیرت انگیز و ہوش رُبا ہیں۔ بالخصوص اُنیسویں صدی عیسوی میں حکمت و سائنس کو جو عروج حاصل ہوا ہے اور اُسکی بدولت مادی و اقتصادی نتائج مستنبط ہوئے ہیں اُن پر عبور حاصل کرنا، اور اُن سے واقفیت بہم پہنچانا ہر اُس شخص کے لیے لازمی و لابدی ہے جسکو مبدء فیاض سے اپنے دل و دماغ سے کام لینے کا ذوق ودیعت ہوا ہے۔ "عجیب و غریب صدی" میں انکا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ گویا کتاب کیا ہے، بکھرے ہوئے موتیوں کی ایک لڑی ہے۔ اسکے مطالعہ سے اُن تمام اصلاحات و ترقیات کا مشرح، مورخانہ حال معلوم ہو سکتا ہے جو "تہذیب یورپ" کی تاریخ میں نمایاں درجہ رکھتی ہیں۔ یہ سب لوگ جانتے ہیں کہ آج کل نت نئی ایجادیں عجیب و غریب انکشافات، اور حیرت انگیز انتظامات ہوتے رہتے ہیں لیکن مشکل ہے کہ کوئی شخص ان کے متعلق صحیح اور مسلسل کیفیت بیان کر سکے۔ "عجیب و غریب صدی" اس مشکل کے حل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اصل کتاب میں، جو انگریزی میں ترتیب دی گئی ہے ہر قسم کی معلومات کو ایک جگہ فراہم کر دیا گیا ہے اور جس مسئلہ کو ہاتھ لگایا ہے اُس کے تمام مراحل عمدگی و خوش اسلوبی سے طے کیے ہیں۔ "عجیب و غریب صدی" ترجمہ ہونے کے لحاظ سے اُن تمام محاسن کی حصہ دار ہے جو اصل کتاب میں پائی جاتی ہیں۔ انگریزی میں یہ کتاب بچوں کیلیے لکھی گئی تھی لیکن ہندوستان میں اسکا ترجمہ نہ صرف نوعمر لڑکوں کے لیے کارآمد ہے بلکہ واقف کار اور تعلیم یافتہ نوجوان اور بوڑھے اسکے ذریعہ سے اپنی معلومات میں کافی اضافہ کر سکتے ہیں۔ بعض مضامین اس میں ایسے دقیق ہیں کہ تاوقتیکہ پڑھنے والا علم طبعیات میں مہارت نہ رکھتا ہو اُن سے حظ نہیں اُٹھا سکتا لیکن اسکے باوجود اُنکے مفید و دلچسپ ہونے میں شک نہیں۔ وہ مضامین، جن سے انسانی تہذیب و تمدن کے مختلف النوع مدارج پر روشنی پڑتی ہے، ازمنہ سابقہ و زمانہ موجودہ کی معاشرتی زندگی کا سبق آموز تقابل پیش کرتے ہیں اور اس قابل ہیں کہ انکا مطالعہ غور و خوض سے کیا جائے۔

اس ترجمہ کے متعلق صرف ایک شکایت ہے اور وہ یہ ہے کہ ترجمہ میں زبان کی خوبیاں بالکل جاتی رہی ہیں جسکی وجہ سے مضامین کی دلچسپی بہت کم ہو گئی ہے۔ کاش نظر ثانی کرکے اسکو بامحاورہ اور رواں کر دیا جاتا تو اسکی شان دوبالا ہو جاتی۔ پنجاب ریلجیس بک سوسائٹی کی طرف سے جتنے اور جسقدر بھی نادر الوجود تراجم شائع ہوئے ہیں اُنکے مفید و کارآمد ہونے میں کلام نہیں لیکن جہاں تک دیکھا گیا ہے اُن میں زیادہ تر خرابیاں زبان کی پائی

جاتی ہیں۔ سوسائٹی کے کارناموں کی عزت ہمارے دل میں بہت ہے اور اسی لیے سرسری طور پر ان نقائص کا ذکر کیا گیا ہے کہ کارپردازان سوسائٹی ان کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔ کسی کے عیوب کا افشا کرنا نہ فرائض میں شامل ہے نہ تنقید نگار کو کسی کی خردہ گیری کرنے سے کوئی ذاتی نفع حاصل ہوتا ہے بلکہ اس سے مقصود محض اصول کی پابندی و اصلاح طلبی ہے۔ اس اعتبار سے امید کرنا چاہیے کہ سوسائٹی اپنی ناچیز مشورہ کو اپنی عنایت توجہ سے محروم نہ رکھیگی۔

بحالت موجودہ بھی "عجیب و غریب صدی" قدردانی کا استحقاق رکھتی ہے قیمت ۶ر ۲۰۰ صفحے کی ایک جامع کتاب کے لیے بہت کم ہے۔

"سید القلم"

کلام شاد

(از مہاراجہ بہادر سر راجہ کشن پرشاد صاحب بالقابہ جی سی آئی ای)

جو وہ آجائے پہلو میں تو بیشک زندگی ہوگی — وگرنہ خاک میری اور اُس بت کی گلی ہوگی
اُسی کو کر رکھو اپنا تم اُس کے گر نہیں ہوتے — اگر وہ دشمن جاں ہو خدائی مدعی ہوگی
ترے پاؤں کی آہٹ تے بپا محشر کیا ظالم — لحد میں عاشق شیدا کے بھی ہل چل پڑی ہوگی
نہیں جب دوسرا کوئی دوئی کا ذکر پھر کیا ہے — یہ دعویٰ ہی غلط ٹھہرا خدائی دوسری ہوگی
خدا والے نہیں پابند کچھ مسجد کے اے واعظ — وہ بتخانے میں بھی جائیں تو اُسکی بندگی ہوگی
زمانہ سے نہیں مطلب ہے کچھ کام غیروں سے — فلک کیوں دشمن جاں ہو جو اُس سے دوستی ہوگی
ذرا آئینہ بنکر سامنے آجائیے اک دن — تصدق آپ پر اُس دن ہماری بیخودی ہوگی
طرفداری کریگا کس طرح وہ میری کہئے تو — زبان آشنا کیوں کر زبان مدعی ہوگی
نہ دے زاہد کو اے ساقی پلا دے بادہ خواروں کو — مزا وہ مے کا کیا جانے کبھی جسنے نہ پی ہوگی
نہیں چلتا کسی کا بس کریں گو لاکھ تدبیریں — وہی بات آئیگی آگے جو قسمت میں لکھی ہوگی
نشیلی آنکھ دکھلا دے ترے قربان اے ساقی — خودی میں سارا عالم اور اپنی بیخودی ہوگی
مقابل آئینہ بنکر جو آؤگے مزا ہوگا — ہماری آنکھ کی پتلی تماشا دیکھتی ہوگی
ستم کے آپ خوگر ہیں جفا کے آپ عادی ہیں — مگر یہ یاد رکھیے گا خدائی مدعی ہوگی
بجز میرے کہاں ہے غیر کوئی دونوں عالم میں — مری حیرت مگر میرا تماشا دیکھتی ہوگی

دکن میں اب نہ بہلے گی طبیعت شاد کی ہرگز
جو وہ اجمیر کو جائے تو پھر اُسکی خوشی ہوگی

مخمس

جو ندوۃ العلماء کے دار العلوم کی رسم فونڈیشن کے موقع پر ہز آنر سرجان ہیوٹ لفٹننٹ گورنر ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کی حضور مین پڑھنے کے لیے ایک دوست کی فرمائش سے لکھکر لکھنؤ بھیجا گیا تھا مگر کسی مصلحت سے وہان پڑھا نہین گیا اور ابتک شائع بھی نہین ہوا۔

ڈر حادثاتِ دہر کا پھر اس عمارت کو ہے کیا　　رکھی گئی ہو علم و صلاح پر جسکی بنا
ہون راج اور مزدور جسکے اہل علم و اتقا　　اور مستری جسکا بنے صوبے کا خود فرمانروا
ہیوٹ نے ڈالی تیری نیو اے ندوہ کر شکرِ خدا

اب مشکلین فضلِ خدا سے تیری سب آسان ہوئین　　سرجان جو تیرا مربی - قوم ہے تیری معین
رگ رگ کے آخر جھک پڑے ہین تیری جانب اہل دین　　اے ندوہ یہ سامان بجز تائیدِ ربانی نہین
پھر ڈر ہے اس بیڑے کو کیا جسکا خدا ہو ناخدا

بے گھر تھا تو اے ندوہ تجھکو گھر دیا سرجان نے　　ویرانہ تھا - آباد تجھکو کر دیا سرجان نے
موقع تجھے بہتر سے بہتر دیا سرجان نے　　خاکہ تھا اک تو - رنگ سمین بھر دیا سرجان نے
اب تو قدم آگے بڑھا - خواہش ہے گر ہے سوا

اُس ملک کو اہل ملک سمجھو خدا ہے مہربان　　آزاد ہون مذہب جہان آباد ہون معبد جہان
ہو سلطنت اُس قوم کی جو علم کی ہو قدردان　　جلسون مین پبلک کے شریک آکر ہون حکام زمان
دین تا کہ اپنے خلقِ شاہانہ سے دل سب کے بڑھا

دین علم کی ترغیب اُنھین جو علم سے بیزار ہون　　اُنکو جگائین نیند غفلت سے جو سرشار ہون
خیراد پر اُنکو چڑھائین جو کہ ناہموار ہون　　دین واجبی حق بے دریغ اُنکو کہ جو حقدار ہون
جس قوم کو دیکھین گرا دین دوڑ کر اُسکو اُٹھا

ممکن ہے کچھ دال اس حکومت مین نہ گل پاوے نہ ہون خرمن　　پر اس سے تو خالی حکومت کوئی عالم مین نہین
وہ بادشہ قبضے مین جسکے آسمان ہے اور زمین　　اُسکی حکومت مین بھی شادی ہے کہین ماتم کہین
بارانِ رحمت سے کہین رحمت کہین سیلِ بلا

حق یہ ہے جو جس ملک مین ہر قوم کی حالت جُدا　　ہر قوم کا مقصد الگ اُس قوم کی حاجت جُدا
رسمین جُدا ہر قوم کی مذہب جُدا ملت جُدا　　نقشہ جُدا رنگت جُدا صورت جُدا سیرت جُدا
ہو انتظام اُس ملک کا بس کام انگلش قوم کا

حالی

دردِ دل

منت کشِ سُرورِ خمارِ نگاہِ ناز　　یعنے دلِ حمید کہ ہے خوگرِ نیاز
سامانِ عیش چھوڑ کے ایذا طلب ہوا　　ہوتا ہے دردِ عشق مین جو کچھ وہ سب ہوا

منت پذیرِ نالۂ ناقوسِ برہمن　　نے شرمندۂ نوائے بخلوت در انجمن
شیرازۂ نظامِ نواہائے کائنات　　اک دردِ دل ہے جنبشِ گہوارۂ حیات
اقلیم عشق و حسن مین جسکی تمیز ہے　　وہ چیز دل مین راحتِ جان عزیز ہے

عاشق کی جان صوفیِ صافی کا رازِ دل　　اے دستِ ذوق بندشِ ترکیبِ آب و گل
اے ہمکنارِ لذتِ سامانِ آرزو　　تیری کسک سے موت مین بھی جانِ آرزو
جس دل مین تیرا فیض محیطِ روان رہا
دُنیا کی بزمِ عیش مین وہ سرگران رہا

اے درد تو نہان ہے یہان بزمِ راز مین　　خلوت کدے ترے ہین دلون کے گداز مین
دُنیا فریب خوردۂ ذوقِ مجاز ہے　　تیری حقیقتون سے جہان بے نیاز ہے
ظاہر پرستیون سے مٹی شوکتِ نیاز　　کس کو سنائین بزم مین یہ قصہ دراز
شیخِ حرم نشین ہے صنم سازِ انجمن　　مایا کے جال مین ہے گرفتار انجمن
ہے قحط گرچہ تیرے متاعِ گداز کا　　واقف نہین جہان ہی نوا ہائے راز کا
فیضِ ازل کا دستِ سخا ہے کھلا ہوا　　پلا ہے اُسکے فضل و کرم کا جھکا ہوا
مستلزمِ ممات بود زہرِ قیمتست
سرچشمۂ حیات بود آبِ دبے بہاست

افسوس ہے کہ حال دلون کا خراب ہے　　ذوقِ مجاز چشمِ خرد کا حجاب ہے

نظارہ بازِ عالمِ پنہان خموش ہین　　نے مستِ خمارِ ساغرِ صہبائے دوش ہین
محوِ جمالِ برقِ تجلیِ طورِ جان　　اُن کی نظر مین اور کی گنجائشین کہان
ترکش مین اُن کے آج بھی وہ تیر آہ ہے　　جو منزلِ حیات مین سامانِ راہ ہے

لے درد پھر دکھادے اسی سوز و ساز کو
پا جائین دوست شوکتِ عمرِ دراز کو

اور بزم کائنات گرفتارِ حرص و آز   بچنا کہ آنکھ ہے کسی مفسد کی فتنہ باز
کیون محو ماؤ من ہے حریم نگار مین   ہے شورِ اتحاد دلون کی پکار مین
رہنے دے فکر تفرقۂ غیر و خویش کو   کر درد کی دوا سے درست اپنے کیش کو
آنکھون سے اپنی پردۂ نخوت اُٹھاکے دیکھ   سوز و گداز درد کو دل سے لگاکے دیکھ
ہر زیر و بم کے سوز مین نغمہ ہے ساز کا   ہر سوز و ساز حادثہ پردہ ہے راز کا
تہذیبِ ظاہری نے مٹایا ہے نامِ درد   لیکن جہان جان مین ہین سب اہتمامِ درد

حاصل نہین ہی کچھ بھی طلسمِ نمود سے
پی جامِ درد میکدۂ ہست و بود سے

حمید کوٹلوی

کلام اکبر

غور سے دیکھو زمین و آسمان کو منکرد   چل بھی سکتا بے خدا کے انتظام انتا بڑا
سنتے ہین اکبر کو ہو عشق دہانِ تنگ بت   کام اتنا چھوٹا اور حضرت کا نام اتنا بڑا

خدا پرستی کا رُخ کہان ہی فقط باتین ہین لڑ گئے ہی   نمود ہی اور جنگ باہم گروہ بندی ہی لو وہ بیٹھے

مرے عمل سے نہ شیخ خوش ہین نہ بھائی خوش ہین نہ باپ خوش ہین
مگر مین سمجھا ہون اسکو اچھا۔ دلیل یہ ہی کہ آپ خوش ہین
جو دیکھا سائنس کا یہ چکر دھرم پکارا کہ اے برادر!
ہمارے دورے مین پُن گگن تھے تمھارے دورے مین باخوش ہین

چاہا تو بہت دل پہ مرے چوٹ نہ آئے   پر کیا کرون کہ میری طرف دوٹ نہ آئے

فلک کی گردش سے آج ہم کیا خراب و خستہ پڑے بڑے ہین
اُجڑ گئے ہین مگر کرین کیا جہان بسے تھے وہین پڑے ہین

نہ پائمالی سے ہو حفاظت نہ حس و حرکت کی ہم مین طاقت
ہدف ہین سایہ اگر گرے ہین بنے ہین دیوار گر کھڑے ہین
حرم کی صف مین شریک ہوکر نماز پڑھنے کا شوق رخصت
بتانِ ترسا کی جلوہ گاہون مین دست بستہ مگر کھڑے ہین

صفتِ عشق

از فصیح الملک بلبلِ ہندوستان نواب مرزا خان صاحب داغ دہلوی مرحوم

خوبیان عشق کی بیان کرون   کچھ طبیعت کا امتحان کرون
سب نے کی ہین بُرائیان اسکی   مین نے لکھین بھلائیان اسکی
دل بنا ہے اسی مزے کے لیئے   مین بنے یہ لطف جان دے کے لیئے
عشق تاب و توانِ عاشق ہے   شانِ عاشق نشانِ عاشق ہے
عشق ہی آرزوئے عاشق ہے   آرزو آبروئے عاشق ہے
عشق نعمت ہے آدمی کے لیے   عشق جنت ہے آدمی کے لیے
دل اسی سے جوان رہتا ہے   مرمٹون کا نشان رہتا ہے
عشق کا داغ غیرتِ گل ہے   دود فرہاد رشکِ سنبل ہے
عشق کیا کیا ابھار دیتا ہے   یہ دلون کو اُبھار دیتا ہے
بزدلون کو دلیر کرتا ہے   یہ دلیرون کو شیر کرتا ہے
عشق سے کس کا زور چلتا ہے   اِس سے رستم کا دم نکلتا ہے
خاک سے عشق پاک کرتا ہے   زندہ وہ ہے جو اسمین مرتا ہے
شیوۂ خاص ہے یہ عام نہین   جو نکمے ہین اُن کا کام نہین
اِس سے گمنام نام پاتے ہین   اس سے ناکام کام پاتے ہین
یون ہو مشہور قیس سا قلاش   یون ہو مشہور ایک سنگتراش
عشق کے نام پر نثار رہون مین   اس کے انجام پر نثار رہون مین
عشق کا درد راحتِ جان ہے   عشق کا زہر آبِ حیوان ہے
یہ ہے ٹکسال نقدِ جان کے لیے   یہ کسوٹی ہے امتحان کے لیے
اِس سے دل کا چراغ روشن ہی   آنکھ روشن دماغ روشن ہے

عشق سے رہتی ہے طبیعت گرم ۔ شعلہ رویون کے ساتھ صحبت گرم
عشق کے کھیل ہم نے کھیلے ہین ۔ سو پریزاد ہسم اکیلے ہین
عشق کے لطف ہم نے پائے ہین ۔ کیا کہین کیا مزے اڑائے ہین
عشق سے دل گداز ہوتا ہے ۔ ناز مین بھی نیاز ہوتا ہے
سو دوائین ہین اک کسک اسکی ۔ سو ادائین ہین اک لٹک اسکی
یہ ہے معشوق نوجوانون کا ۔ یہ ہے محبوب رازدانون کا
عشق سے آدمیت آتی ہے ۔ آدمی کو مروت آتی ہے
عشق سب بل نکال دیتا ہے ۔ عشق سانچے مین ڈھال دیتا ہے
ہے معلم ہزار مجنون کا ۔ سبق آموز ہے فلاطون کا
عشق کا لطف زندگانی ہے ۔ زندگی کا مزا جوانی ہے
عشق عاشق کو بخشواتا ہے ۔ عشق جنت مین لیکے جاتا ہے
عشق ایمان ہے خدا رکھے ۔ یہ مری جان ہے خدا رکھے
عشق باطن ہو عشق ظاہر ہو ۔ اس سے توبہ کرے تو کافر ہو
نالۂ عشق نغمۂ نے ہے ۔ اثر عشق نشۂ مے ہے
اس سے دل کو سرور ہوتا ہے
اس سے نشہ مین چور رہتا ہے

آنکھ کا طلسم

دنیا مین روے اہل نظر کی ہے شان آنکھ ۔ ہے طفل مردمک کا منور مکان آنکھ
شرم و مروت اور غضب کی ہے شان آنکھ ۔ تیغ نگاہ ناز بتان کی ہے سان آنکھ
اظہار گر الم کا کرے ابر تر بنے
کاجل لگی کوٹھری ہو جو عاشق کا گھر بنے
یہ آنکھ دشت خوبی رخ کا غزال ہے ۔ یہ آنکھ جام بادۂ حسن و جمال ہے
یہ آنکھ نرگس چمن انفعال ہے ۔ شرم و حیا و مہر کی مہر اسکا خال ہے
اعجاز عیسوی سے اگر سین مار دے
امرت کا گھونٹ خلق کے نیچے اتار دے
یہ آنکھ سنگ اخگر غیظ و غضب کو ہے ۔ یہ آنکھ آئینۂ رخ عیش و طرب کو ہے
دن کو یہ آفتاب ہے مہتاب شب کو ہے ۔ مخزن مروت اور حیا کا یہ سب کو ہے
طوطے کی آنکھ ہو جو وفا سے حذر کرے
دریا چڑھے شراب کا مستی جو گھر کرے
غصے مین ہو تو کھینچکے خنجر فلک اٹھے ۔ انگارہ تل ہو کوئے کی صورت سو بھک اٹھے
ڈھیلوں سے آگ شعلہ نظر سے بھڑک اٹھے ۔ سورج ہو ایک تیزی سے بجلی چمک اٹھے
کھیرے کی طرح کاٹ لے سر کو جو دیکھ لے
قیمہ بنا کے چھوڑے جگر کو جو دیکھ لے
موقع خوشی کا ہو تو بنے کشت زعفران ۔ خندہ دہان مردم دیدہ سے ہو عیان
غمگین ہو گر تو زخم کی صورت ہو خونفشان ۔ ہو ایک بوند پانی سے بحر روان روان
موقع حیا کا ہو تو نہ اون پر نظر اٹھائے
پتلی چھپے پلک مین نہ غیرت سے سر اٹھائے
کرتی ہے عیش و غم کے اثر کو قبول آنکھ ۔ باغ نشاط غیر سے چنتی ہے پھول آنکھ
ہوتی ہے رنج اہل الم سے ملول آنکھ ۔ بوتی ہے سات پردون مین اپنے ببول آنکھ
القصہ فرد جذب و اثر مین نگاہ ہے
مسمیریزم ہمارے بیان کا گواہ ہے
اگلے رشی منی جو خدا رس گذر گئے ۔ اس آنکھ سے ہزارون ہی اعجاز کر گئے
مردے گٹھی مین آئے تو زندہ وہ کر گئے ۔ دیکھا نگاہ قہر سے جنکو وہ مر گئے
معلوم ہے یہ اچھی طرح خاص و عام کو
پھونکا تھا شیو جی نے انھین آنکھون سے کام کو
غصے مین ہو تو عقل کے اوسان کھوئے یہ ۔ سیماب کے کنوئین مین بنکو ڈبوئے یہ
سارے بدن کا کسل مٹادے جو سوئے یہ ۔ کل جسم پر اداسی ہو طاری جو روئے یہ
دل سے شریک درد ہو اعضا کے روگ مین
گر حسرتون کا خون ہو بیٹھے یہ سوگ مین
سینہ ہو غم سے شق کہ جگر مین شگاف ہے ۔ اقرار دل کو جرم سے یا انحراف ہو

باطن سیاہ ہو کہ مکدر کہ صاف ہو یہ آنکھ حال جسم کا فوٹو گراف ہو
مانند نبض نقشۂ تقریر کھینچ دے
نظروں مین بات بات کی تصویر کھینچ دے

تاثیر سارے جسم کی اس پر ضرور ہو غمگین ہو یہ جو درد کا اسمین فتور ہو
پی لے جو مے دہن تو یہ نشہ مین چور ہو مستی بدن کو پھر اسے پہلے سرور ہو
محو بکا اگر ہو تو فوارہ چھوٹ جائے
دریائے اشک باڑھ پہ ہو بند ٹوٹ جائے

خواب اکثر اسکو غیب کی باتین بتاتے ہین جنکا نہو گمان وہ چیزین دکھاتے ہین
خواب اسکے ایک آن مین کعبہ بتاتے ہین بے کوڑی پیسے چین کی دیوار اٹھاتے ہین
کیفیت اچھے خواب کی لکھون یہ دم نہین
تفریح طبع کیلئے چھوٹے بھی کم نہین

سویا جو بیٹھی نیند مین محمود کا پدر دی خواب نے تولد محمود کی خبر
شاہجہان جو ہند کا تھا شاہ نامور دکھلائے اسکو مسجد جامع کے سقف و در
دہلی مین ٹھیک خواب کی تعبیر ہو گئی
مسجد اسی نمونہ کی تعمیر ہو گئی

ہر چیز کو بتاتی ہو کھوٹی کھری یہی حسن و جواہرات کی ہو جوہری یہی
کرتی ہو سبکی مثل خضر رہبری یہی جنس نفیس خوب کی ہو مشتری یہی
الفت کا دوسرے پر اثر دیکھنے سے ہو
بچون کو مہوشون کو نظر دیکھنے سے ہو

دنیا کا کام کوئی نہو آنکھ اگر نہ ہو لطف حیات نام کو بھی عمر بھر نہ ہو
دم بھر کسی طرح بھی خوشی سے بسر نہ ہو بیکار آنکھ بھی ہے جو اسمین نظر نہ ہو
قدر آنکھ کی وہ جانے اسے رو چکا ہو جو
خالق سے آنکھ پاکے نظر کھو چکا ہو جو

لازم ہو سب کو اسکی حفاظت کرین مدام فرمائین اپنے نور بصارت کی روک تھام
سرمہ لگائین کام لین عینک سے صبح و شام جسمین نظر پہ زور پڑے وہ کرین نہ کام
آنکھوں کا ضعف شکل نمائے زوال ہو
افسوسناک موت سے مرنیکی فال ہو

اس آنکھ کا ہو کام کہ دیکھے نہ مال غیر فرصت جو کچھ ملے کرے علمی کتب کی سیر
کعبے کو جاکے دیکھے کرے جاکے سیر دیر تیور بدل کے مول نلے ہمنظر سے بیر
عورت جو دیکھے غیر کی فی الفور بند ہو
دائم حیا پسند و مروت پسند ہو

آنکھیں ہی ہین نعمت افق ہمین تنگ نہین مٹی خراب ہو جو قمر مین چمک نہین
آنکھوں بغیر حرف غم و رنج حک نہین کندن کا لطف خاک نہین گر دمک نہین
ہر آنکھ مین الٰہی بصارت کا گھر رہے
جبتک کہ دم مین دم رہے قائم نظر رہے

افق لکھنوی

سیتا کی فریاد

تیرے ترکش مین ابھی تک وہ کماندار قضا! تیر باقی تھا کوئی مجھ پر چلانے کے لیے
کم تھی وہ صحرا نوردی؟ کم تھے وہ راون کے جور؟ آہ! یہ ایام بھی باقی تھے آنے کے لیے
وہ زمان جان گزا جب ہر گل باغ اشوک شعلۂ نار عقوبت تھا جلانے کے لیے
آہ اتھے اس قید مین سامان جہنم کے تمام تھی مگر امید دل کو گدگدانے کے لیے
روکتا جاں کو نکلنے سے کہ آئین گے ضرور دل سے یون کہتا کہ ہین تیار آنے کے لیے
ہائے مین مجبور اب کس پر رکھون چشم امید
جب ہوے آمادہ وہ آنکھیں چرانے کے لیے
آنسوؤنکا منہ کیون جاری ہو تھمین اب بتا تو تو کہتا تھا چلو گنگا نہانے کے لیے
کاش آنگنا تو ہمیشہ کے لیے لے لے مجھے یون اگر بیتاب تھی میری بلانے کے لیے
آرزو رشیون کے درشن کی بھی تھی بیشک مجھے پر نہ تھی تیار اس حالت مین آنے کے لیے
کیا کہونگی؟ کیون ہوئی آوارۂ دشت بلا ننگ ہون اب ہائے انکے آستانے کے لیے
داغ رسوائی جو فرضی دامن سیتا پہ ہے مٹ ہی جاؤن کاش مین اسکو مٹانے کے لیے
ہائے وہ دل کسطرح مجھ سے مکدر ہو گیا آئینہ تھا جو دل صافی زمانے کے لیے
جاننے والے ہین وہ اسرار کے اول تو پھر آتش سوزاں تھی کافی آزمانے کے لیے

رام کی خاطر زمانے بھر کو چھوڑا تھا۔ مگر — آہ مجھکو رام نے چھوڑا زمانے کے لیے
لب پہ شکوہ رام کا آئے تو کٹ جائے زبان — مجھکو پیدا ہی کیا صدمے اٹھانے کے لیے
بدگمان ہو رام مجھ سے یہ تو ممکن ہی نہ تھا — کس طرح آتا جو کچھ تھا پیش آنے کے لیے
مین نہ چھوڑونگی نہ چھوڑونگی خیالِ رام کو
گو مچلتا ہی رہے دامن چھڑانے کے لیے

آہ اے صحرا کے پھولو کس لیے ہنستے ہو تم — کسلئے ہنستے ہو تم؟ کسکو ہنسانے کے لیے
تم تھے وہ رشکِ خندان رام کا تھا ہی گلو! — اب ہنسو گے تم کسی کو خون رلانے کے لیے
اے ہنسو سیتا کی آنکھین ہین تو سیتا کا دل — دل ہے اب جلنے کو آنکھین خون بہانے کے لیے
لطفِ گلگشتِ چمن صحرا مین تھا ہمراہ رام — سبزہ زار و آئی ہون اب خاک اڑانے کے لیے
آہ اے بادِ صبا اٹھکیلیون کے دن گئے — اب چلیگی تو کیسی خاک اڑانے کے لیے
دل تڑپیگا کسکا اب کالی گھٹا کو دیکھکر
آئیگی تو آئیگی بجلی گرانے کے لیے

دھرتی ماتا کھول دے آغوشِ الفت کھول دے — ساری دُنیا اب ہے مجھکو کاٹ کھانے کے لیے
ہین کہان اے آسمان تیرے وہ اندازِ ستم؟ — ٹوٹ پڑ طرزِ جفا کو آزمانے کے لیے
پوچھتی پھرتی ہون تیرے گھر کو مرگِ ناگہان
مضطرب ہے آہ! جانِ زار جانے کے لیے

تلوک چند محروم

ہاتھ

خالق نے آدمی کو دیئے ہین عجیب ہاتھ — ایسے کہان کسی کو ہوئے ہین نصیب ہاتھ
تسکین مرض کو ہوتی ہے کیا کیا مریض کے — رکھتا ہے جبکہ نبض پر اپنا طبیب ہاتھ
مسند نشین صدر ہے اک صاحبِ وقار — باندھے کھڑا ہے سامنے کوئی غریب ہاتھ
مشہور ہو رہا ہے کہ بن جائے گا وہ کام — جس کام مین لگائے کوئی بدنصیب ہاتھ
ایجاد و اختراع زمانے مین کر گئے — کیا کیا دکھا گئے ہین ادیب و لبیب ہاتھ
دُنیا مین ہے جہان کہین لطف کا ظہور — ہین کام دور دور مگر ہین قریب ہاتھ
فرقت کے فراق مین نہ نکلے جان زار — دُنیا سے دھونہ جاے کہین عندلیب ہاتھ
اتنا مین روح پھونک رہا ہے اثر کی یہ — چارون طرف جو پھینک رہا ہے خطیب ہاتھ

رہتی ہے آرزو یہ صنعت کی رات دن — رکھے مری سخن پہ کوئی ادیب ہاتھ
یک بارگی یہ کیون ستاشی پھر کے اٹھا — آئی جو کوئی بات عجیب و غریب ہاتھ
کہتا ہے ایک دوسرے سے کیا حرج ترا — لگ جائیگی زمین مجھے دو جریب ہاتھ
ہاتھ آئے چار۔ ہاتھ لگے دو کبھی کہا — دن بھر مین پیچ بتا کے لگا کیا منیب ہاتھ
گرتی ہین بجلیان سی زمان فراق پر — دیتا ہے جبکہ ہاتھ مین کوئی حبیب ہاتھ
ہے آرزو کسی کی کسی پر نثار ہو — دھن ہے کسی کو آئے ہمارے رقیب ہاتھ
اب تو نکالتے ہین فلک کو بھی راستہ — جلوہ دکھا رہے ہین بعید و قریب ہاتھ
اے اشک پُر ہوئے نہ کبھی دستِ مفلسان
پھیلائے مر گئے یونہین سب بدنصیب ہاتھ

اشک بلند شہری

رُباعیات

حق کے لیے شیخ کو ترستا دیکھا — ویرانۂ دل کبھی نہ بستا دیکھا
تھا رہگذرِ دوست مین دل ہی رہبر — کب خضر تھا راہ ہمنے رستا دیکھا

گلشن سے نسیم بو اڑا لائی ہے — سوئے ہوئے فتنہ کو جگا لائی ہے
یہ سبز پری ہے اور پھلادا بنکر — گلفام کو کاندھے پہ اٹھا لائی ہے

کیا کوئی سُنے ستم کا فسانہ تیرا — کہ تو ہی کہان تھا آشیانہ تیرا
نادان سمجھ اپنے کو کہ دانا بُلبُل — لایا ہے قفس مین آب و دانہ تیرا

ہو طائرِ روح کیا ٹھکانہ تیرا — دنیا ہے سیاہ قید خانہ تیرا
کچھ بھی نہین یا شاخ مغیلان کے سوا — وان قافِ قدس تھا آشیانہ تیرا

واعظ کا مقولہ ہے کہ عقبیٰ مل جائے — منعم کی تمنا ہے کہ دُنیا مل جائے
دُنیا عقبیٰ یہ دونون چھوڑے ہم نے — ہم تو یہی کہتے ہین کہ مولیٰ مل جائے

حمید میرٹھی